

نعتیہ ادب: مسائل و مباحث

(مدیر نعت رنگ، صبیح رحمانی کے نام موصولہ مکاتیب کا موضوعاتی و تجزیاتی مطالعہ)

تہذیب و ترتیب

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

کتاب نعتیہ ادب: مسائل و مباحث

(مدیر نعت رنگ، صبیح رحمانی کے نام موصولہ مکاتیب کا موضوعاتی و تجزیاتی مطالعہ)

تہذیب و ترتیب ڈاکٹر ابرار عبدالسلام

اشاعت اول جمادی الثانی ۱۴۴۰ھ / مارچ ۲۰۱۹ء

صفحات ۲۸۸

تعداد ۵۰۰

کمپوزنگ محمد آصف (0331-3652042)

ناشر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی

قیمت ۷۰۰ روپے

B-306، بلاک 14، گلستان جوہر، کراچی

موبائل نمبر: 0332-2668266

sabeehrehmani@gmail.com

www.Naatresearchcenter.com

www.sabih-rehmani.com



انتساب

’نعت رنگ‘ کے روح رواں
سید صبیح الدین رحمانی
کے نام

حُسنِ ترتیب

- ۱۔ جدید نعت نگاری: مسائل و مباحث..... ڈاکٹر معین الدین عقیل ۹
- ۲۔ 'نعت رنگ' کے تنقیدی زاویے..... ڈاکٹر ابرار عبدالسلام ۱۳
- ۳۔ نعت: تعریف، تقاضے اور روایت..... ۱۲۱
- (۱) نعت (۲) نعت صنف سخن کی حیثیت سے (۳) مرثیہ اور نعت (۴) مماثلت کی چند جہتیں
- (۵) اردو میں نعتیہ ادب (۶) تخلیقی اظہار کی چند صورتیں (۷) تخلیق نعت کی خصوصیات
- (۸) نعت گوئی کی خصوصیات (۹) نعت گو/نعت گوئی کے لیے شرائط (۱۰) نعتیہ ادب اور احتیاط
- کے تقاضے (۱۱) نعت گوئی اور تربیت کے تقاضے (۱۲) نعت گوئی: چند تجاویز (۱۳) نعتیہ شاعری
- پس منظر اور روایت (۱۴) اردو زبان اور نعت (۱۵) عصری صورت حال اور نعت کی ضرورت اور
- اہمیت (۱۶) جدید اردو نعت (۱۷) پاکستان میں نعت گوئی (۱۸) نثری نظم اور نعت (۱۹) ہندوستانی
- اور پاکستانی نعت گو شعرا میں فرق (۲۰) سندھی ادب اور نعت (۲۱) فروغ نعت کے امکانات
- (۲۲) تنقید نعت اور احتیاط کے تقاضے (۲۳) اسلامی ادب اور نعت (۲۴) نعت نبوی اور سراپا نگاری
- (۲۵) نعت نبوی اور شعری مبالغہ (۲۶) نعت اور عربی الفاظ (۲۷) صحت تلفظ اور درست استعمال
- کے مسائل (۲۸) نعتیہ ادب کے فروغ کی کاوشیں (۲۹) نعت اور خود پسندی
- ۴۔ نعتیہ ادب: تحقیق و تنقید: ۱۶۰
- ۱۔ تحقیق:

- (۱) حقائق کی بازیافت (۲) نعتیہ گل دستے (۳) رحمت اللعالمین نمبرز (۴) قصیدہ بردہ
- (۵) قصیدہ ذوق فہمین (۶) منسوبات اور ان کی حقیقت (۷) اشعار کا انتساب اور ان کی حقیقت
- (۸) تخلیقات، تصانیف کا انتساب اور ان کی حقیقت (۱۰) قصیدہ: الصبح بدا من طلعة: کا
- خالق کون؟ (۱۱) خواجہ معین الدین چشتی کی شاعری (۱۲) امیر خسرو، قدسی اور سعدی سے
- منسوبات غزلیات اور تصنیف کی حقیقت (۱۳) تحقیقی تسامحات (۱۴) محسن کا کوری اور محسن

کا کوری حسان الہند: تحقیقی مطالعہ (۱۵) نعت گو شعرا کے اشعار (۱۶) تفہیم و تعبیر کی غلط فہمیاں

(۱۷) الفاظ اور اصطلاحات کا علمی پس منظر (۱۸) لفظ انھی کا استعمال (۱۹) لفظ اسلام کی

تحقیق (۲۰) لفظ مالک کی تحقیق (۲۱) لفظ خدا کی تحقیق (۲۲) لفظ مالک کی تحقیق (۲۳) توحید کی

حقیقت (۲۴) لفظ عشق کی حقیقت (۲۵) تصوف، صوفی اور ڈاکٹر شعیب گرامی (۲۶) تحقیق کے

آئینے میں (۲۷) غالب کی مثنوی 'ابر گہر بار' کا منظوم ترجمہ (۲۸) غالب کی مثنوی 'ابر گہر بار' اور

یگیٰ خلیط کی تنقید (۲۹) غالب کی مثنوی 'بیان معراج': اعتراضات اور ان کے جوابات

(۳۰) ذات محمدیہ اور حقیقت محمدیہ (۳۱) فارسی شعری روایت کے اردو حود و نعت پر اثرات

(۳۲) عربی کے ایک شعری تفہیم (۳۳) مسدس حالی کی بحر اور اس کا ایک شعر: غلط فہمی کا

ازالہ (۳۴) حضرت حسان رضی اللہ عنہ اور منبر رسول (۳۵) ایک غلط فہمی کا ازالہ: خالق اور مخلوق کا

باہمی تعلق (۳۶) ایک نقطہ نظر کی اصلاح (۳۷) استمداد، استعانت کا تصور اور ڈاکٹر

یگیٰ خلیط (۳۸) نواب صدیق حسن خاں کی تصنیفی زندگی: حقیقت یا افسانہ (۳۹) ثانوی

ماخذ کا استعمال: تحقیق کی معذوری؟ (۴۰) متر و کات (۴۱) عبدالعلیم آسی کا ایک متنازعہ شعر

(۴۲) رسول اکرم ﷺ اور علم غیب (۴۳) صلاح الدین پرویز اور جیلانی کامران کے مذہبی

خیالات پر تحقیقی نظر (۴۴) نعتیہ ادب: موضوعات کی چند جہتیں

ب۔ تنقید:

- (۱) شاعرانہ اور غیر شاعرانہ لفظیات: (شخص الرحمن فاروقی کا تنقیدی نقطہ نظر) (۲) تنقید نعت
- اور شعری تخلیقی رویے (۳) نعت غیر تخلیقی شاعری اور شاعرانہ حسن بیان (۴) عزیز احسن اور رشید
- وارثی (۵) شاعری اور بحر بیانی (۶) اقبال کی نظم ذوق و شوق: ایک مطالعہ (۷) تاثراتی تنقید کی
- جلوہ گری (۸) اسلوب بیانی تنقید: تخلیقی لفظیات کی باز آفرینی:

۳۔ نعت گوئی: اصلاح سخن کی چند نمایاں صورتیں: ۲۷۲

(۱) فنی تناظر:

- ۱۔ عروض اور تقطیع کے مسائل ب۔ قافیہ اور ردیف کے معائب (ج) زبان و بیان سے متعلق
- تسامحات (صرف نحو، فصاحت، تعقید، شتر گربہ) (د) تخلیقی اظہار کی معذوریات (اہمال،
- عدم مطابقت مصرعین، بحر بیان، نقص ابلاغ)

(۲) فکری تناظر: (شعرِ نعت کے معانی)

۱۔ غیر ادبی رویے، مقام رسالت کا بیان اور تخلیقی اظہار کی ناکامی ۲۔ فکری/ تاریخی تسامحات،

خلاف واقعہ بیان

۴۔ کتابیات (نعت سے متعلق کتابوں کا تعارف) ۳۶۸

(۱) ”اردو شاعری میں نعت“ سے ماخوذ کتب: (۲) ”اردو کی نعتیہ شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ“

(۳) ”اردو میں نعت گوئی: روایت اور ارتقا“: (۴) ”مفتی اعظم ہندو نوری بریلوی کی نعتیہ شاعری“

(۵) ’نعت کے جگنوؤں کے تعاقب‘: (۶) ”نعت میں کیسے کہوں!“: (۷) ”نعت کی تخلیقی

سچائیاں“، (۸) ”نعت رنگ اہل علم کی نظر میں“، (۹) ”اشاریہ نعت رنگ“، (۱۰) ”غالب اور

ثنائے خواجہ“، (۱۱) ”فہرست کتب نعت لائبریری“، (۱۲) "Reverence Unto His

Feet" (۱۳) بلغ اعلیٰ بکمالہ (۱۴) اردو کے نعتیہ ادب کے اعتقادی سرمایے کا تحقیقی

مطالعہ: (۱۵) ”کلام محسن کا کوروی: ادبی و فکری جہات“ اور ”اقبال کی نعت، فکری و اسلوبیاتی

مطالعہ“ مرتبہ صبیح رحمانی:

۵۔ شخصیات: ۳۸۶

(۱) اعلیٰ حضرت احمد رضا خان، اعلیٰ حضرت کی شاعری میں حسن طلب کی صورتیں، حدائق بخشش:

ایک مطالعہ، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور احمد رضا خان، اعلیٰ حضرت کی شاعری: فکری و فنی مطالعہ:

(اعتراضات اور رد اعتراضات کی روشنی میں)

(۲) ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی (۳) احمد فراز (۴) افضل بیگ (افضل الفت) (۵) محمد اکرم رضا

(۶) انجم نیازی (۷) جگن ناتھ آزاد (۸) جوہر قدسی (۹) حفیظ الرحمن احسن (۱۰) حفیظ تائب

(۱۱) حنیف اسعدی (۱۲) رحمن کیانی (۱۳) رزاق افسر (۱۴) رشید اختر خاں (۱۵) ریاض حسین

چودھری (۱۶) سلیم کوثر (۱۷) شاہ حسین نہری (۱۸) ڈاکٹر صابر سنبھلی (۱۹) صابر وسیم (۲۰) مولانا

عبدالعزیز شرقی (۲۱) حافظ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی (۲۲) قمر گوٹروی (۲۳) قمر وارثی (۲۴) ولی

اللہ ولی صدیقی عظیم آبادی

۶۔ متفرقات ۴۳۳

(۱) تخلیق کائنات اور باعث تخلیق کائنات (۲) حیات النبی اور متعلقات: چند غلط فہمیوں کے

ازالے (۳) عید میلاد النبی ۷ اور میلادنا سے (۴) اردو لوک گیتوں میں ذکر رسول صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم (۵) جگر مراد آبادی اور نعت گوئی (۶) خواب، ستیہ پال آنند اور رسول کرم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم (۷) افسانہ کروٹ کا محرک (۸) نئے نعتیہ مجلے کے اجرا کی ایک کاوش (۹) ریاض

حسین چودھری اور اسلوب کی جلوہ گری (۱۰) ڈاکٹر عاصی کرناٹی کا ایک شعر (۱۱) تخلیق نعت کی

ایک خوبصورت مثال (۱۲) ظریف نظام پوری کا ایک خوبصورت شعر (۱۳) متضاد خیالات کی

کارفرمائی (۱۴) علامہ فیض الحسن سہارن پوری کی نعتیہ شاعری اور مسئلہ استعانت (۱۵) نعت میں

ضماؤ کا استعمال (۱۶) القابات رسول ۷ اور معترضین (۱۷) نعت رنگ سے متعلق ایک نقطہ نظر

(۱۸) نعت اور قناعت رسول کی پیش کش (۱۹) نبی اکرم ۷ کا سایہ (۲۰) معراج سے متعلق

احادیث (۲۱) موضوع احادیث (۲۲) محسن کا قصیدہ لامیہ اور ہندو صمیمیات:

۷۔ نعت رنگ: خطوط کے آئینے میں ۴۵۹

(۱) ’نعت رنگ (۲)‘، ’نعت رنگ ایک تعارف (۳)‘، ’نعت رنگ‘ کی غرض و غایت (۴) ’نعت

رنگ‘ کی اہمیت (۵) اردو زبان اور ’نعت رنگ‘ (۶) ’نعت رنگ‘ اور تنقید نعت (۷) ناقدین نعت

سے چند گزارشیں (۸) ’نعت رنگ‘ کے ادبی و فکری رجحانات (۹) ’نعت رنگ‘ کی خدمات

(۱۰) ’نعت رنگ‘، چند تجاویز: (۱۱) مدیر ’نعت رنگ‘: معاصرین کی نظر میں

جدید نعت نگاری: مسائل و مباحث

اردو زبان کی تخلیقی شعری اصناف میں گزشتہ چند دہائیوں میں صنفِ نعت نے جس طرح اپنی حیثیت، نوعیت اور روایت کے لحاظ سے اپنے تخلیق کاروں اور اس کے نقادوں میں خود کو موضوع بنوایا ہے، یہ ہمارے فن اور روایتِ شاعری میں ایک مثال ہے۔ یہ اپنی مسلمہ و معروف روایتوں کے ساتھ بیسویں صدی کے وسط، بلکہ بعد تک بھی، ایک لگے بندھے راستے پر چل کر یہاں تک پہنچی تھی لیکن نعت نگاروں کے جذبہ و لگن کے سبب، جس میں قیام پاکستان کے بعد ایک آزاد اسلامی مملکت کے قیام کے احساس و شعور نے اور ایک اسلامی معاشرے کی تشکیل کے جذبے اور اسلامی ادب کی تحریک نے شاید شعرِ اکو تخلیق نعت کی جانب زیادہ خشوع و خضوع کے ساتھ راغب کیا ہے اور پھر عبدالعزیز خالد کے نعتیہ مجموعوں: ”مٹھنا“ اور ”فارقلیط“ نے اردو شاعری میں موضوعات و بہتیت کے نئے مباحث کو بھی جنم دیا، جس کے تحت نعت اور فنِ نعت کے مطالعات و پیش کش اور روایات کے جائزوں کے لیے یکے بعد دیگرے مخصوص رسائل کی بڑھتی ہوئی اشاعتی صورتِ حال نے بھی اس کے فن اور اس کے ارتقا کو ایک وسیع تر فروغ دیا ہے، جس میں ان دو تین دہائیوں میں صبیحِ رحمانی کی زیرِ ادارت وزیر سرپرستی منفرد رسالے ”نعت رنگ“ کے اجراء اور پھر اس کے چند سالوں کے بعد ”نعت ریسرچ سینٹر“ کے قیام اور اس کے تحت صنفِ نعت کے فروغ کو ایک بہت منفرد اور مقبول عام صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اردو نعت نگاری کی حالیہ مثالی اور حوصلہ بخش صورتِ حال کے پس پشت رسالہ ”نعت رنگ“ اور اس کے مدیر کی منفرد مثالی کاوشوں کی نوعیت اور نعت کے زمرے میں ان دونوں کے کردار و اثرات کا تعین اس صنف کے کسی نہ کسی نوعیت کے جائزوں اور مطالعات میں زیرِ گفتگو بھی آتا رہتا ہے۔ اس حوالے سے خود ”نعت رنگ“ کے صفحات ان دونوں کے کردار و اثرات پر اس

کے قارئین اور نعت سے خاص رغبت رکھنے والے اصحابِ قلم کے تاثرات اور اس بابت ان کے علی الخصوص تحریر کردہ مضامین اور تاثرات حالیہ عرصے میں نعت نگاری کے ارتقا کی صورتِ حال اور اردو نعت نگاری کے مسائل و مباحث کو متعین کرنے اور سمجھنے کے لیے واقعتاً ایک بنیادی اور درست وسیلہ ہیں۔ چنانچہ اس احساس کے تحت یہ اس کے فاضل مدیر کی روشن خیالی یا وسعتِ قلب بھی ہے کہ وہ ”نعت رنگ“ میں شائع ہونے والی تخلیقات اور خیالات سے، جو چاہے فاضل مدیر کو مختلف صورتوں میں بطور راست موضوعاتی مضامین اور تحریروں اور تاثراتی خطوط کی صورت میں موصول ہوتے رہتے ہیں، قارئین ”نعت رنگ“ کو ان سے واقفیت اور استفادے کے لیے ایک خاص اہتمام سے شائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ ”نعت رنگ“ کا ایک بڑا وصف و امتیاز ہے کہ تخلیقات اور مضامین کے ساتھ ساتھ قارئین کے تاثرات اور خیالات کو بھی رسالے میں شائع کرنے کا ایک مستقل اہتمام رہتا ہے جن کے باعث ایک خاصا مفید و پرکشش تنوع بھی رسالے میں جگہ پاتا ہے اور قارئین کے لیے قابلِ استفادہ بنتا ہے۔ اس لحاظ سے قارئین کے وہ خطوط بھی خاصے کی چیز ہوتے ہیں جو بالآخر ”نعت رنگ“ کے سبب ہی شماروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور جن کا مطالعہ ایک اضافی استفادے و تنوع کا سبب بنتا ہے۔

ان خطوط میں وہ سب ہی کچھ ہوتا ہے، جو چاہے نعت کے فنی مباحث ہوں، مطبوعہ نعتوں کے بارے میں احساسات و تاثرات ہوں یا مضامین میں بیان کردہ خیالات سے اتفاق و اختلاف ہی کیوں نہ ہوں، یہ سب ہی کچھ ان خطوط میں قارئین کے ملاحظے و استفادے کے لیے مہیا رہتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ان خطوط میں بالعموم وہ مسائل بھی زیرِ بحث آتے رہتے ہیں جو نعت نگاری کے فن و اسلوب اور اس کے رجحانات و موضوعات کے تعلق سے اہم ہیں اور نعت کے فن اور اس کے رجحانات و میلانات کو سمجھنے یا متعین کرنے کے لیے معاون ہو سکتے ہیں۔ یہ خطوط اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں مختلف نقاطِ نظر، اتفاق و اختلاف اور نعت کے تعلق سے سامنے آنے والے مسائل سب ہی ہمیں دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ خطوط بجائے خود اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ ان میں پیش کردہ خیالات و نظریات اور تاثرات کو موضوعاتی لحاظ سے دیکھا اور سمجھا جائے اور ان سے اخذ مطالب کیا جائے تاکہ نعت کے کل فنی و اسلوبیاتی اور ارتقائی امور اور ساتھ ہی مسائل بھی قارئین و شائقینِ نعت پر واضح رہیں۔

اس اہم ضرورت اور تقاضے کو عزیزِ ذاکٹر ابرار عبدالسلام نے خوب سمجھا اور اس ضمن

میں ایسی پیش رفت کی کہ انھوں نے وہ سارے خطوط جو اپنی اپنی مناسبت سے ”نعت رنگ“ میں مستقلاً شائع ہوتے رہے، ان کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہوئے ان کے ایک موضوعاتی اور تجزیاتی مطالعے اور جائزے کو ضروری سمجھا اور نہایت عرق ریزی کے ساتھ ان سارے خطوط کا مطالعہ کیا اور ان میں بیان کردہ مباحث و مطالب کو اس طرح موضوعاتی درجہ بندی یا تقسیم کے ساتھ اخذ کیا کہ ان کی روشنی میں اب نعت سے متعلق سارے ہی عصری مسائل و موضوعات اب اپنے اپنے عنوانات کے تحت مرتب صورت میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور ہم ابرار عبدالسلام کے خیالات و تجزیوں کے توسط سے خود بھی ان پر ایک رائے قائم کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

ہماری علمی اور ادبی ضرورتوں کے تحت مکتوب نویسی یا خطوط کو ہم ایک عرصے سے جائز و ضروری حیثیت و اہمیت دے کر ان کے مجموعے مرتب و شائع کرتے رہے ہیں اور ان پر تحقیقی ضرورتوں اور استناد کی خاطر حواشی و تعلیقات کا اہتمام بھی کرتے اور خطوط کو ایک راست اور بنیادی مآخذ کی حیثیت میں مزید قابل استفادہ بناتے رہے ہیں۔ لیکن شاید کوئی کام خطوط کے حوالے سے ایسا نہیں ہوا کہ انھیں یک جا و مرتب کرنے کے بجائے ان کا موضوعاتی اعتبار سے مطالعہ و تجزیہ کیا جائے اور اس مطالعے و تجزیے کی روشنی میں مطلوبہ معلومات حاصل کی جائیں یا ممکنہ نتائج تک پہنچا جائے۔ ابرار عبدالسلام صاحب نے یہاں یہ ایک انوکھا اور مزید قابل استفادہ کام کیا ہے کہ جو ہمیں ڈھیروں خطوط کے راست مطالعے سے بچاتے ہوئے ان میں موجود مطالب و مباحث کو ایک بہت مناسب و سنجیدہ تجزیے کے ساتھ اخذِ مطالب کی راہ دکھائی ہے جو بے حد قابل استفادہ اور لائق تحسین ہے۔ خطوط کے حوالے سے اس نوعیت کے اس اولین مطالعے و تجزیے کو ہمیں کھلے دل سے خوش آمدید کہنا چاہیے۔

اس ایک منفرد کام کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ ابرار عبدالسلام کے ذہن رسا میں ایسا کام کیوں کر آیا کہ جس کی ایسی کوئی نظیر کم از کم راقم کے مطالعے کی حد تک کوئی نہیں! ہم تو ابرار عبدالسلام کو ایک خالص و منفرد محقق کے طور پر جانتے ہیں جن کے مطالعے اور دل چسپیوں کا محور و مرکز کلاسیکی ادب رہا ہے اور ان کے کام، جو چاہے ان کے اعلیٰ پائے کے متعدد تحقیقی مقالات ہوں یا ”آبِ حیات“ کی بے مثال تدوین و تحقیق ہو، یا ہمارے اکابر تحقیق: ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کی مشترکہ تصنیف کردہ ”تاریخ ادب اردو“ جیسی اہم تاریخی و تحقیقی کاوش ہو، ابرار عبدالسلام نے ان کی اس تصنیف میں تحقیق و واقعات کی جن جن غلطیوں کی نشاندہی کی اور

استدراکات و تصحیحات کے انبار لگا کر ایک مستقل کتاب تصنیف کرنا ضروری سمجھا ہو کہ کہیں ڈاکٹر گیان چند اور سیدہ جعفر جیسے اکابر محققین کی پیش کردہ غلطیاں ہماری تاریخ ادب میں جگہ نہ پا جائیں، یہ ایسا کام کیا تھا کہ جو آج کے بڑے سے بڑے اور نامور محققین، یونیورسٹیوں کے صدور و شعبہ جات اردو اور شہرت و مناصب کے بام عروج پر رہنے والے پروفیسروں سے ممکن نہ تھا، یہ اور ایسے منفرد و مثالی کام ابرار عبدالسلام کی توجہ، جستجو اور سخت محنت و لگن کے باعث سامنے آئے ہیں اور ان کی کاوشوں کا ایک سرمایہ ہیں۔

زیر نظر منفرد اور انتہائی مفید و کارگر منصوبہ بھی ابرار عبدالسلام ہی کے ذہن رسا کے باعث ممکن تھا، جسے انھوں نے اس قدر محنت و لگن سے مکمل اور پیش کیا ہے اور جو اس قدر افادہ ہے کہ شاید ایسے مزید کاموں کے لیے یہ ایک مثال بن جائے اور محققین و مصنفین کو یہ راہ دکھائے کہ ہمارے ایسے دانشور اور ادیب و شاعر، بمثل اقبال، غالب، سید احمد خاں اور دیگر بیسیوں اکابر علم و ادب اور مشاہیر قوم و ملت کے خطوط کا ایسا مطالعہ کیا جائے جو ان کی فکر و دانش، ان کے عہد و معاصرین اور فن و اسلوب اور ان کی مجموعی خدمات اور ان کے اثرات کو اجاگر کر سکے۔

ابرار عبدالسلام کی اپنی اس ذہنی اچھ کے مطابق، اور ان کے اس منفرد کام کے سامنے لانے کا وسیلہ بھی ”نعت رنگ“ اور اس کے مدیر شیخ رحمانی کو بننا تھا کہ مقصد تو شاید صرف نعت کے مباحث و مطالب کو نمایاں کرنا تھا، اور جو یہ مقصد پوری طرح مکمل بھی ہوا ہے، لیکن اس طرح سوچنے اور لکھنے پڑھنے والوں کو ایک شہ بھی ملی ہے کہ خطوط کا مطالعہ مطلوبہ نتائج تک پہنچنے کے لیے اور مخصوص یا مطلوب موضوعات کو ان سے کس طور پر اخذ کیا جائے اور ان کا مطالعہ کس صورت میں کیا جانا چاہیے کہ ان میں موجود موضوعات و مباحث بھی سامنے آسکیں اور اس طرح لکھنے والے کے ذہن و نظر کو بھی سمجھنا آسان ہو جائے اور ان سب پر مستزاد اس صورت میں مطلوب و مقصود نتائج بھی سامنے آجائیں۔

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام

’نعت رنگ‘ کے تنقیدی زاویے (مدیر ’نعت رنگ‘ کے اداروں اور ان کے نام خطوط کی روشنی میں)

(۱)

ایک ایسی صنف سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مجلہ جاری کرنا، جس پر لکھنے والوں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہو اور جس صنف سے متعلق تخلیقی و تنقیدی امکانات بھی محدود سمجھے جاتے ہوں، ایک دیوانے کا خواب ہی محسوس ہوتا ہے جس کی تعبیر پانے کی خواہش کو خوش گمانی پر ہی محمول کیا جاسکتا ہے لیکن جب یہ خواب حقیقت کا روپ دھار چکا ہو اور اس کی اشاعت بھی اٹھائیس واں مرحلہ بخوبی طے کر چکی ہو تو اسے ایک کرامت ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ ادبی کرامت ’نعت رنگ‘ کی صورت میں جناب صبیح رحمانی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہو چکی ہے۔

۔ ایں سعادت بزور باز و نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جناب صبیح رحمانی کو سن شعور ہی سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے انتہا محبت رہی ہے۔ اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ انھیں پہلے پہل ثنا خوانی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سننے اور پھر ثنا خوانی کرنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ متذکرہ دونوں مراحل طے کرتے ہوئے انھیں ایک بات شدت سے پریشان کرتی رہی کہ معاصر عہد میں نعت کو پرکھنے کا کوئی تنقیدی معیار موجود کیوں نہیں؟ اور اگر موجود نہیں ہے تو اسے کس طرح بروئے کار لایا جاسکتا ہے؟ اس حوالے سے انھوں نے مختلف علما و ادبا سے تبادلہ خیال بھی کیا۔ (۱) اکثر اہل دانش کی طرف سے حوصلہ افزا جوابات موصول نہ ہوئے۔ کچھ نے موضوع کی نزاکت کا احساس دلایا تو کسی نے خوفِ فسادِ خلق کو اس راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ بتایا اور کسی نے مسلکی مناقشوں کے خطرے کی طرف نشان دہی

کر کے بالواسطہ اپنے ارادوں سے باز رہنے کا مشورہ بھی دیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے ثقہ محقق و نقاد نے تو نعت کی تنقید کو ہی نامناسب اور غیر ضروری قرار دے ڈالا۔ (۲) لیکن انھیں کچھ اہل علم ایسے بھی میسر آئے جنھوں نے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی اور ان کے خیالات کو سراہا بھی لیکن اس بھاری پتھر کو نہ خود اٹھانے کی ہامی بھری اور نہ ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا عندیہ دیا۔ چنانچہ نعت کے فروغ اور اس کا حقیقی منصب سامنے لانے کا بیڑا صبیح رحمانی کو دو چار ہم خیال دوستوں کے ساتھ ہی اٹھانا پڑا۔ ’نعت رنگ‘ کے اجرا کا خیال بعض لوگوں کے نزدیک ایک مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا اور اس کی کامیاب اشاعت کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ رشید احمد صدیقی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ بعض کام فرزانے نہیں صرف دیوانے کر سکتے ہیں۔ جناب صبیح رحمانی کی یہی دیوانگی ’نعت رنگ‘ کے اجرا کی صورت میں سامنے آئی اور آج یہ دیوانگی دودھائیوں سے زائد صحرائی مسافت طے کر چکی ہے اور اٹھائیس شماروں کا ذخیرہ بغل میں دبائے اپنی فرزانگی کا ثبوت بھی دے رہی ہے۔

کچھ عرصہ قبل تک نعت صرف ایک ثوابیہ صنف کے طور پر ہی جانی جاتی تھی اور نعت گو شعرا صرف عقیدت کے اظہار یا حصولِ ثواب کی خاطر ہی تخلیق نعت کا فریضہ سرانجام دیا کرتے تھے۔ جس طرح کلاسیکی عہد میں متصوفانہ خیالات منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے شاعری میں برتا جاتا تھا بعینہ نعت سے متعلق بھی شعرا کا رویہ کچھ اسی طرح کا رہا لیکن بطور ایک ادبی صنف اس کو دیکھنے، پرکھنے اور برتنے کا رواج بالکل نہ تھا۔ (۳) قدیم ادوار میں بھی کلاسیکی شعرا کا رویہ کچھ اس سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ کلاسیکی شعری روایت کا مطالعہ ایسے اکا دکا شعرا ہی سے ہماری ملاقات کروا سکتا ہے جنھوں نے نعت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہو۔ البتہ ایسے شعرا جنھوں نے نعت کو بطور تبرک، ثواب یا برائے گفتن شعر تخلیق کیا ہو، ان کی تعداد کو احاطہ قلم میں لانے کے لیے ایک عرصہ درکار ہے۔ کلاسیکی شاعری کا شاید ہی کوئی دیوان، کلیات، مثنوی اور انتخاب ایسا ہو جس میں نعت کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تخلیق نعت اور شاعری کی تاریخ ہم عمر ہونے کے باوجود تخلیق نعت کا ہونا کیوں سرسبز نہ ہو سکا؟ اور اس کی نشوونما کی راہ میں کون سے عوامل رکاوٹ کا باعث بنتے رہے؟ ان اسباب پر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی نے مفصل روشنی ڈالی ہے۔ ان کا بیان ہے:

”نعت کی پذیرائی زیادہ تر دینی حلقوں میں ہوئی۔ اس لیے عام ادبی حلقے اسے دینی ادب کا حصہ سمجھ کر علما و صوفیاء کے لیے خاص قرار دیتے رہے۔ چونکہ ادبی تخلیق میں مذہبی عنصر کے

وجود کو بالعموم ہماری ادبی تنقید دوسرے درجے کی چیز سمجھتی رہی ہے اس لیے ادبی حلقوں میں اسے پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ دوسری جانب دینی حلقے تھے۔ ان کے ہاں نعتیہ شاعری صرف وقتی آسودگی اور قلبی بے قراری کے لیے لمحاتی قرار کا باعث رہی۔ اس لیے ان کے ہاں بھی نعت کو مناسب مقام نہ مل سکا۔ نعتیہ شاعری کے فنی جائزے کے راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خوش عقیدگی اور خوفِ فسادِ خلق بنی کہ مقدس کلمات کو کس طرح نقد و نظر کے تختے پر چن دینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں نعتیہ ادب کا باقاعدہ اور سنجیدہ فنی محاکمہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس لیے جو رائے بھی قائم کی گئی وہ مفروضوں اور دل جوئیوں پر مبنی رہی۔ نعت کی شعری حیثیت کو خود نعت گو حضرات کے طرزِ عمل سے بھی نقصان پہنچا۔ شعری صلاحیت رکھنے والے عموماً وہ لوگ تھے جو دینی حلقوں میں قابلِ احترام شخصیتوں کے مالک تھے۔ وہ لوگ دربارِ نبوی کی نزاکتوں کو بھی سمجھتے تھے اور شاعری کے رموز و غوامض کو بھی مگر وہ نعت کی آواز اور اپنی عقیدت کا اظہار جان کر اس کی نمائش مستحسن نہ سمجھتے تھے۔ وہ خوف زدہ تھے مبادا یہ جذبہ ریاکاری کی زد میں آجائے۔ اس کے برعکس وہ اصحاب تھے جنہیں شعر اور جذبہ شعر کے تخلیقی اظہار پر قدرت حاصل نہ تھی یا ان کے ہاں جذبہ موجود تو تھا لیکن وہ اپنے اندر اس کے تخلیقی اظہار کی صلاحیت نہ پاتے تھے۔ بد قسمتی سے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ارادت کا اظہار شعر کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس طرح ہر وہ شخص جو وزن و قوافی کی عامیانہ سی شد بد بھی رکھتا تھا، شعر کہنے لگا۔ عوام نے محبت سے انھیں سنا، اور یوں یہ شعوری کاوش جو زیادہ تر تصنع کے ذیل میں آتی گئی، مقبول ہوتی گئی۔“ (۴)

نعت کے فروغ میں ’نعت رنگ‘ کے اجرا سے پہلے چند نعتیہ رسائل و جرائد ہی رونق محفل بنے ہوئے تھے۔ جن کی کوششوں کا محور تخلیق نعت کے فروغ تک محدود تھا۔ ان میں چند رسائل و جرائد ایسے بھی تھے جنہوں نے محدود سطح پر تنقید نعت کا فریضہ بھی ادا کیا۔ (۵) لیکن یہ اختصاص صرف ’نعت رنگ‘ کو ہی حاصل رہا کہ اس نے نعت کی تخلیق ہی نہیں تنقید اور تحقیق کے لیے بھی سنجیدہ کوششوں کا آغاز کیا اور اپنے گرد اہل قلم لکھاریوں کا ایسا حلقہ جمع کر لیا جو نعتیہ ادب کے حوالے سے سنجیدگی سے سوچ بھی رہا تھا اور اس سوچ کو عملی جامہ پہنا کر اپنی سنجیدگی کا ثبوت بھی فراہم کر رہا تھا۔ (۶) یہ حلقہ ایک دورِ روز میں تشکیل نہیں پایا بلکہ اس کی پشت پر برسوں کی محنت اور کاوش کا فرما رہی۔ نعتیہ ادب کے فروغ کے لیے صبیحِ رحمانی اپنے دل کے چراغ میں مسلسل آنکھوں کا تیل پکاتے رہے تب جا کر نعتیہ ادب کی تاریک راہ روشن ہو سکی۔ صبیحِ رحمانی کی انھی

کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اہل علم و دانش کے لیے ایسا ماحول تشکیل پا گیا جس میں نعت پر سوچنا، غور و فکر کرنا اور لکھنا غیر ادبی اور غیر تخلیقی فعل نہ رہا بلکہ وقت کی ضرورت بن گیا۔ مدیر ’نعت رنگ‘ نے اس ادبی فریضے کو بروئے کار لانے کے لیے اہل قلم و دانشوروں کو نعت پر لکھنے کی دعوت دی۔ یہ فقط زبانی کلامی اظہار نہیں تھا بلکہ اس خیال کو عملی شکل دینے کے لیے ’نعت رنگ‘ میں قارئین کے خطوط کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا جس سے نعت کے ادبی، فکری اور لسانی پہلوؤں پر آزادانہ مکالمے کا راستہ کھل گیا۔ مدیر نے صرف راستہ ہی فراہم نہیں کیا بلکہ فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نعت کے موضوع پر لکھے گئے مقالات کے حق اور مخالفت میں اہل علم قارئین کے تحریر کردہ تمام خطوط شائع بھی کر دیے (۷) اور ساتھ ہی اہل علم و دانش کو صلائے عام بھی دے ڈالی کہ وہ آئیں اور شریعت سے اکتساب کردہ قلب و نظر کی روشنی سے جادہ نعت کو روشن کریں اور نعت کا درست اور حقیقی مقام متعین کرنے میں اپنا عملی کردار بھی ادا کریں۔ (۸) اس سلسلے میں مدیر ’نعت رنگ‘ کی گزارش تھی کہ وہ نعت کے فکری اور فنی معائب کی نشان دہی ضرور کریں لیکن استدلال، متانت اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے ہرگز نہ چھوڑیں کیونکہ تضحیک کرنا، پگڑی اچھالنا، تحقیر آمیز رویہ اختیار کرنا یا جارحانہ انداز اپنانا نفاذ کا منصب نہیں۔ نفاذ تو تخلیق کو راستہ فراہم کرتا ہے۔ تخلیق کار کو غیر تخلیقی روشوں پر بھٹکنے سے بچاتا ہے اور اسے تنقیدی شع کی وہ روشنی فراہم کرتا ہے جو باشعور تخلیق کار کی معاون و مددگار ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ نفاذ، تنقید لکھتے ہوئے تخلیق کو بھی اور تخلیق کار کو بھی کشادہ دلی اور وسیع النظری سے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ (۹)

مدیر ’نعت رنگ‘ کی کوششوں کے نتیجے میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر قارئین کے لیے ’نعت رنگ‘ کے ذریعے ایسا پلیٹ فارم مہیا ہو گیا جہاں وہ اپنے خیالات اور افکار کو آزادانہ پیش کر سکتے تھے۔ اس سے ایک طرف تو روشن خیالی اور رواداری کی فضا پیدا ہوئی تو دوسری طرف مختلف مسالک اور مکاتبِ فکر کے افراد کے مابین ایک بامقصد اور صحت مند مکالماتی ماحول بھی میسر آ گیا۔ اب ہر شخص اپنے خیالات اور نقطہ نظر کو ’نعت رنگ‘ کے وسیلے سے خطوط کے ذریعے بلا خوف و خطر قارئین تک پہنچا سکتا تھا۔ خطوط میں آزادی اظہار کے ذریعے ذہنی دوریاں اور قلبی نفرتیں ختم ہونے کا راستہ ہموار ہو گیا اور مختلف مکاتبِ فکر کے افراد کے دلوں میں موجود عداوتیں اور ذہنوں میں موجود اشکالات رفع کرنے کا موقع ملا اور ساتھ ہی ایک دوسرے کو سمجھنے، سمجھانے، قائل کرنے اور قائل ہونے کی راہ بھی میسر آئی۔ اس طرح ایک طرف مکتوب نگاروں

کے اس آزادانہ اظہار سے ان کے لیے تذکیہ نفس کا سامان فراہم ہو گیا تو دوسری طرف نعتیہ ادب کے فروغ کے لیے سنجیدگی سے سوچنے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ (۱۰)

(۲)

ماضی میں، مکتوب نگاری دیگر اصنافِ نثر کی طرح ایک بھرپور صنفِ نثر تھی۔ اگر ہم ۱۸۵۷ء کو ایسا خط مان لیں جو دو زمانوں کو ملتا رہا ہے یا جدا کر رہا ہے تو ۱۸۵۷ء سے اُس طرف مکتوب نگاری کا غالب بلکہ مجموعی رجحان انشا پر دازی ہی رہا لیکن ۱۸۵۷ء سے ادھر غالب جیسے نابغہ کی کوششوں سے اس صنف کو اپنی قدیم روایت کے برعکس حیرت انگیز طور پر اپنی قلبِ ماہیت کرنے کا موقع ملا اور پھر یہ صنف بقول غالب ”نادر شاہی روشن“ (۱۱) کو چھوڑ کر مکالمے کی صورت اختیار کرنے لگی۔ اگرچہ اس دور میں بھی متذکرہ بالا روشیں جدید روشوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی رہیں لیکن زمانے کی تیز رفتاری اور بدلتی ہوئی اقدار سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث جلد ہی ان کی سانسیں پھولنا شروع ہو گئیں اور بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے وہ گوشہء گمنامی کا حصہ بن کر رہ گئیں۔

غالب اور معاصرین غالب کے خطوط اس حقیقت کا انکشاف بھی کرتے ہیں کہ اب مکتوب نگاری صرف مکالمہ نہ رہی تھی بلکہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر علمی حیثیت بھی اختیار کر گئی تھی۔ اب یہ معاشرتی تاریخ بھی تھی اور تہذیبی مرقع بھی۔ تنقیدی حیثیت کی حامل بھی تھی اور تحقیقی رویے کا اظہار بھی۔ چنانچہ خطوط کی اہمیت کے پیش نظر مکاتیب کے مجموعے شائع کرنے کا ایک نامحتمل سلسلہ شروع ہوا۔ آج تک سینکڑوں مکاتیب کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مجموعے شاعروں کے بھی ہیں اور نثر نگاروں کے بھی، مورخوں کے بھی ہیں اور محققوں کے بھی۔ مذہبی علما کے بھی ہیں اور صوفیاء کے بھی۔ پچھلی ڈیڑھ صدی میں معاشرے کے ہر طبقے (صوفیاء، علماء، شعراء، ادا، محقق، نقاد، مؤرخ، صحافی، سیاستدان وغیرہ) سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے خطوط کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

جدید دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے ایک طرف ہماری معاشرت، تہذیب اور ثقافت کو بدل کر رکھ دیا ہے، تو دوسری طرف ادبی صورت حال بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ قدیم اصناف میں سے بیشتر ایسی ہیں جو زمانے سے قدم سے قدم ملا کر نہ چل سکیں اور آخر

کار کسی گوشہء گمنامی میں جا چھپیں اور ان کی خالی کی ہوئی جگہوں پر نئی نئی اصناف نے قبضہ جما لیا ہے لیکن کچھ ادبی اصناف ایسی بھی ہیں جنہوں نے تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی اور معاشرے سے ہار نہ مانی بلکہ مزاحمت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اپنے ہونے کا احساس بھی دلایا۔ اس میں اگرچہ انہیں وقت کی ضرورتوں کے پیش نظر، احتسابی عمل سے گزرتے ہوئے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہونا پڑا لیکن انہوں نے اپنی بنیادی روح کو برقرار ہی رکھا۔ ایسی اصناف میں سے ایک مکتوب نگاری بھی ہے۔ آج کل باہمی خط و کتابت کی جگہ موبائل میسجز، ای میل، واٹس ایپ، اور فیس بک وغیرہ نے لے لی ہے۔ یہ درست ہے کہ ترسیل خیالات کے یہ تمام ذرائع موجودہ دور کا طرہء امتیاز بن کر سامنے آئے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں مکتوب نگاری کی سی اعصابی مضبوطی مفقود نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے مکتوب نگاری کا فن آج بھی اپنی شناخت کا ایک مضبوط حوالہ بن کر سامنے آ رہا ہے۔ مکتوب نگاری کی یہ روایت آج بھی زندہ ہے اور اپنی اہمیت کے باعث کل بھی زندہ رہے گی۔

اردو اخبارات اور رسائل میں خطوط کی اشاعت کی روایت تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔ اردو کے قدیم اخبارات میں اہل علم و ادب اور دور دراز مقیم خبر نگاروں کے خطوط شائع ہو کرتے تھے۔ ’اودھ اخبار‘، ’لکھنؤ اور دہلی اردو اخبار‘ دہلی میں بے شمار خطوط شائع ہوئے۔ ان خطوط کی نوعیت سیاسی بھی تھی، معاشرتی بھی اور علمی و ادبی بھی لیکن بالعموم خطوط کی نوعیت سیاسی اور معاشرتی ہوا کرتی تھی۔ (۱۲) سرسید احمد خان نے بھی ’تہذیب الاخلاق‘ میں خط و کتابت کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ وقتاً فوقتاً انھیں مراسلے موصول ہوتے رہتے تھے۔ وہ ان مراسلوں کو ’تہذیب الاخلاق‘ میں شائع کرتے پھر ان کے مفصل جواب لکھتے۔ ’تہذیب الاخلاق‘ کے ایک شمارے میں بالعموم ایک ہی مراسلہ شامل کیا جاتا تھا۔ ان مراسلوں میں شرعی مسائل اور مذہبی حقائق کے بارے میں استفسار کیا جاتا اور سوالات اٹھائے جاتے تھے۔ بعض اوقات تو سرسید احمد خان اپنے ’تہذیب الاخلاق‘ کے خلاف موصول ہونے والے خطوط بھی شائع کر دیا کرتے تھے اور بعض اوقات کسی فرد کے نام خود خط لکھ کر بھی اپنا موقف واضح کرتے تھے۔ مثلاً ایک شمارے میں سرسید نے مولوی سید مہدی علی کے نام اپنا ایک خط بھی شائع کیا ہے جس کا عنوان ’نسبت طیور متخفہ اہل کتاب‘ ہے۔ اس خط میں انھوں نے مولوی سید مہدی علی کے ’رسالہ طعام اہل کتاب‘ کے حوالے سے ان کے ایک اعتراض کا جواب دیا تھا۔ ان کا اعتراض تھا کہ اگرچہ اہل

کتاب کے ساتھ کھانا کھانا حرام تو نہیں لیکن اگر ان کے کھانے میں ایسی مرغی کا گوشت شامل ہو جسے ذبح کرنے کی بجائے اس کی گردن مروڑ کر مار دیا گیا ہو تو ان کے ساتھ اس قسم کا گوشت کھانا کس طرح جائز ہو؟ سرسید نے اس خط میں ان کے اس اعتراض کا مفصل جواب دیا ہے۔ (۱۳) احمد علی شوق کے اخبار 'آزاد لکھنؤ' میں ایک مستقل عنوان 'صیغہء مراسلات' کا بھی ہوتا تھا جس میں تعلیم اور زراعت وغیرہ کے مسائل پر اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ (۱۴) اسی طرح 'نورالآفاق' اخبار جو سرسید کے 'تہذیب الاخلاق' کی مخالفت میں جاری ہوا، اس میں 'بانی مدرسۃ العلوم مسلمانان' کے مذہبی عقائد پر خطوط کی صورت میں بحث و تکرار کی جاتی تھی۔ (۱۵)

بیسویں صدی کے آغاز کے اخبارات و رسائل میں ملی جلی صورت حال دیکھنے میں آتی ہے۔ مثال کے طور پر 'پیپہ اخبار'، 'صحیفہ نامی'، اور 'اخبار عام' وغیرہ میں 'خط کتابت' اور 'مراسلات' کے عنوانات کے تحت جو خطوط شائع ہوئے ان کا انداز متذکرہ بالا اخبارات میں شائع ہونے والے مکتوبات کا سا تھا (۱۶) لیکن بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں ہی ایسے اخبارات اور رسائل زیور طبع سے آراستہ ہونے لگے تھے جن میں شائع ہونے والے خطوط کی نوعیت معاشرتی اور سیاسی سے زیادہ علمی ہوا کرتی تھی۔ مارچ ۱۹۰۵ء میں پنڈت دیانند گنڈریشیم کی مثنوی 'گلزار نسیم' کے حوالے سے ایک مباحثے نے جنم لیا۔ یہ مباحثہ 'معرکہ چلبست و شرر' کہلاتا ہے۔ اس مباحثے میں پنڈت برج نرائن چلبست اور عبدالحمید شرر اور ان کے حامیوں نے اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ اس طرح کثیر تعداد میں 'گلزار نسیم' کے حق اور مخالفت میں مواد شائع ہوا۔ یہ تمام مواد 'اودھ پنچ'، 'اردوئے معلیٰ'، 'زمانہ'، 'دبدبہء آصفی'، 'دکن ریویو'، 'رسالہ تہذیب'، 'ریاض الاخبار گورکھپور'، 'تفریح'، 'اتحاد'، 'دل گداز' اور 'کشمیری درپن'، میں شائع ہوا۔ یہ ادبی معرکہ خطوط اور مضامین کی صورت میں ہی سامنے آیا۔ (۱۷) دلچسپ بات یہ ہے کہ اس معرکہ میں گلزار نسیم کے حق اور مخالفت میں جتنا بھی مواد سامنے آیا وہ یا تو مضامین کی صورت میں تھا یا خطوط کی صورت میں۔ اگر کسی ادیب نے خط میں کوئی اعتراض کیا یا سوال اٹھایا تو اس کا جواب مضمون کی صورت میں آیا اور اگر مضمون میں کوئی قابل اعتراض مواد موجود ہوتا تو خط میں اس کا جواب دیا جاتا۔ غرض یہ کہ عمل اور رد عمل کا یہ سلسلہ مدت مدید تک چلتا رہا۔

بیسویں صدی میں 'معارف'، 'اعظم گڑھ' نے تحقیقی حوالے سے اپنی شناخت کے معتبر حوالے پیدا کیے۔ اس مجلے سے وابستہ لکھنے والوں کا ایک ایسا طبقہ موجود رہا جسوں نے اپنے تحقیقی

مقالات اور خطوط کے ذریعے تحقیق کو ایک نئی جہت عطا کی۔ اشاعت کی غرض سے آنے والے خطوط 'استفسار و جواب' کے عنوان کے تحت مجلے میں شائع کیے جاتے تھے۔ ان خطوط کی نوعیت تمام تر علمی ہوا کرتی تھی۔ ان خطوط میں 'معارف' میں شائع شدہ مقالات میں موجود تسامحات کی تصحیح کی جاتی، مکتوب نگار 'معارف' میں شائع شدہ مقالات سے متعلق اپنا موقف پیش کرتا۔ اس کے علاوہ قارئین علمی اور تحقیقی موضوعات پر سوال بھی اٹھایا کرتے تھے۔ مدیر 'معارف' ان کا بالتفصیل جواب دیا کرتے تھے۔ ۱۹۰۷ء تک یہ سلسلہ بڑی شد و مد کے ساتھ جاری رہا۔ اگرچہ تقسیم ہند کے بعد وقفے وقفے سے خطوط کی اشاعت اور ان کے جوابات کا یہ سلسلہ چلتا تو رہا لیکن اس کا رخ 'وفیات' کی جانب مڑ گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطوط کی اشاعت برائے نام رہ گئی تھی البتہ کبھی کبھی بہت اہم خطوط بھی شائع ہو جاتے تھے لیکن اب مدیر کی توجہ 'وفیات' کے شعبے پر مرکوز ہو گئی تھی۔ اس عنوان کے تحت معروف اہل علم حضرات کی وفات پر ایک تعزیتی مضمون تحریر کیا جاتا تھا۔ (۱۸) ان وفیات کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 'معارف' میں شائع ہونے والے تمام تعزیتی مضامین کو بڑے سائز کی ۹۳ صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ (۱۹)

نیا فتح پوری نے 'نگار' کو ایک علمی، تحقیقی اور روشن خیالی کو فروغ دینے والا مجلہ بنانے میں بڑا اہم کردار کیا۔ اس رسالے میں 'باب المرسلۃ والمناظرہ'، 'باب الاستفسار' اور 'استفسارات' کے عنوانات کے تحت قارئین کے خطوط شائع ہوا کرتے تھے۔ ان خطوط کا زیادہ تر تعلق، تاریخ، مذہب، تہذیب، ثقافت، علم، ادب اور تحقیق سے ہوا کرتا تھا۔ مکتوب نویس، رسالہ نگار میں شائع شدہ مضامین سے متعلق استفسارات، استدراک یا تسامحات کی نشان دہی کیا کرتے اور کبھی خود کو درپیش علمی، تحقیقی مسائل سے متعلق سوالات لکھ کر 'نگار' کے مدیر کو بھیجا کرتے تھے۔ مدیر 'نگار' نیا فتح پوری ان کے مفصل علمی جواب اس رسالے میں تحریر کیا کرتے تھے۔ (۲۰)

رسالہ 'ندیم' گیا (۱۹۰۹ء-۱۹۳۱ء) میں بھی مشاہیر کے خطوط شائع ہوا کرتے تھے۔ اس رسالے میں اشاعت شدہ خطوط 'مکتوبات مشاہیر' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، فراق گورکھپوری، اکبر الہ آبادی، امداد امام اثر، محمد علی جوہر، شوکت علی جوہر، سید سلیمان ندوی، پنڈت موتی لعل نہرو، فضل حق وغیرہ جیسے مشاہیر کے خطوط شامل ہیں۔ (۲۱)

’ہماری زبان‘ نئی دہلی میں بھی خطوط کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس رسالے میں بالعموم ایک صفحہ خطوط کے لیے ’مراسلات‘ کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ جس میں ملک کے طول و عرض سے اہل علم کے خطوط شائع ہوتے تھے۔ اس صفحے میں رسالے میں شائع ہونے والے کسی مضمون سے متعلق مکتوب نگار کی رائے درج ہوتی تھی۔ سندی مقالے کی تحقیق کرنے والے طالب علم موضوع سے متعلق پیش آمدہ مسائل لکھ بھیجا کرتے تھے، کسی شعر یا غزل کے خالق کے بارے میں معلومات یا انتساب سے متعلق معلومات درکار ہوتی تھیں۔ بہت سے حقائق اور تسامحات کی نشان دہی کی جاتی تھی۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی پر دیوان غالب نسخہ امروہہ شائع ہوا تو اس رسالے میں اس دیوان سے متعلق کثیر تعداد میں اہل علم و ادب کے علمی و تحقیقی خطوط شائع ہوئے۔ (۲۲)

۱۹۵۸ء میں ترقی اردو بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو اس کے دو سال بعد ۱۹۶۰ء میں ’اردو نامہ‘ کے نام سے ایک تحقیقی مجلہ جاری کیا گیا۔ جس میں ایک طرف تحقیقی مقالات شائع کیے جاتے تھے تو دوسری طرف لغت اور زبان سے متعلق اہل علم کی آراء بھی طلب کی جاتی تھیں۔ ثانی الذکر کے حوالے سے مدیر مجلہ کے نام بیسیوں خطوط موصول ہوئے۔ (۲۳) اس مجلے میں اثر لکھنوی، افسر میرٹھی، اکبر علی خان، آمنہ خاتون، تحسین سروری، رشید حسن خان، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، ڈاکٹر سہیل بخاری، صفدر آہ، عبدالمجید دریابادی، قاضی عبدالودود، عرش مسلیانی، قدرت نقوی، نصیر الدین ہاشمی، ہارون خان شروانی، وغیرہ جیسی شخصیات کے علمی اور تحقیقی نوعیت کے حامل خطوط شائع ہوئے۔ (۲۴)

ان کے علاوہ کثیر تعداد میں ایسے رسائل و جرائد بھی شائع ہوتے رہے ہیں جن میں

خطوط کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا۔ ہندوستان کے رسائل و جرائد میں ’شب خون‘ (الہ آباد)، ماہنامہ ’سہیل‘ (گیا)، ’ہماری آواز‘ (بدایوں)، ’آج کل‘ (دہلی)، ’ایوان اردو‘ (دہلی)، ’فکر و تحقیق‘ (دہلی)، ’کتاب نما‘ (دہلی)، ’شاعر‘، (بمبئی)، ’اردو بک ریو‘ (دہلی)، ’اردو دنیا‘ (دہلی)، ’مباحثہ‘ (پٹنہ)، ’شان ہند‘ (دہلی)، اہمیت کے حامل ہیں اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں ’فنون‘ (لاہور)، ’وراق‘ (سرگودھا)، ’سیارہ‘ (لاہور)، ’مجلہ بدایوں‘ (کراچی)، ’چہار سو‘، (راولپنڈی)، ’طلوع افکار‘ (کراچی)، ’روشنائی‘، (کراچی)، ’آئندہ‘ (کراچی)، ’مکالمہ‘ (کراچی)، ’دنیا زاد‘ (کراچی)، ’افکار‘ (کراچی)، ’محزون‘ (لاہور)، ’الاقربا‘ (اسلام آباد)، اور نئی عبارت

(حیدر آباد) نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو میں نعتیہ صحافت کا بھی ایک گراں قدر ذخیرہ موجود ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں کثیر تعداد میں نعتیہ ماہنامے اور کتابی سلسلے جاری ہوئے۔ نعتیہ ماہناموں میں ’نوائے نعت‘ (کراچی)، ’نعت‘ (لاہور)، ’حمد و نعت‘ (کراچی)، ’کاروان نعت‘ (لاہور) اہمیت کے حامل ہیں۔ اسی طرح کتابی سلسلوں میں ’گل چیدہ‘ (لاہور)، ’ایوان نعت‘ (لاہور)، ’سفیر نعت‘ (کراچی)، ’دنیا نعت‘ (کراچی)، ’راہ نجات‘ (کراچی)، ’عقیدت‘ (سرگودھا)، ’نعت نیوز‘ (کراچی)، ’خوشبوئے نعت‘ (سرگودھا)، ’مدحت‘ (لاہور)، ’سہ ماہی‘، ’فروغ نعت‘ (انک)، ’ارمغانِ حمد‘ (کراچی) کے علاوہ ہندوستان کے رسائل میں ’جہان نعت‘ اور ’دستان نعت‘ نے بھی نعت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اخبارات کے ساتھ ساتھ رسائل و جرائد میں بھی نعت کے گوشے اور خاص نمبر شائع ہوئے (۲۵) لیکن ان تمام رسائل و جرائد میں خواہ وہ نعت سے متعلق ہوں یا دیگر ادبی موضوعات و اصناف سے متعلق، ان میں نعت سے متعلق خطوط شائع تو ہوئے لیکن کسی میں بھی توازن اور تنبیہ کی گنجائش نہ تھی۔ نعت کو موضوع بحث نہیں بنایا گیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے بیشتر خطوط کی نوعیت محض رسمی اور رسیدی ہی رہی۔ البتہ کسی کسی شمارے میں ایسے خطوط ضرور دیکھنے میں آتے ہیں جن میں نعت پر ادبی، فکری اور فنی حوالوں سے اظہار خیال کیا گیا ہے مگر ان کی حیثیت راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کی طرح رہی ہے۔ یہ چنگاریاں قارئین کے لیے مستقل حرارت یا روشنی کا سامان فراہم نہ کر سکیں۔ نعتیہ صحافت میں دبی ہوئی ان چنگاریوں کا مقدر راکھ ہی میں دفن ہو جانا تھا لیکن خوش قسمتی سے انھیں ’نعت رنگ‘ کی صورت میں ایسا آتش دان میسر آ گیا جس نے ان چنگاریوں کو بجھنے نہیں دیا۔ مدیر نعت رنگ نے راکھ میں دبی ہوئی ان چنگاریوں کو جستہ جستہ تلاش کر کے ’نعت رنگ‘ کی فضا میں پروان چڑھایا اور اب یہ چنگاریاں ایسا لاؤ بن چکی ہیں جس نے نعت کے گرد لپٹی ہوئی اندھی عقیدت کے خار و خس کو خاکستر بنا دیا ہے۔ آج صفحہ نعت ’نعت رنگ‘ کی بھٹی میں تپ کر ایسا کندن بن کر سامنے آرہی ہے جو تحقیق و تنقید کے بازار میں اپنی مضبوط ساکھ بھی قائم کر چکی ہے اور اعتبار کے معتبر حوالے بھی۔ یہ مدیر ’نعت رنگ‘ کے اُس خواب کی تعبیر بھی ہے جسے انھوں نے اس مجلے کو جاری کرنے سے پہلے دیکھا تھا۔

’نعت رنگ‘ میں کئی طرح کے خطوط شائع ہوئے۔ ان میں کچھ محض رسمی اور رسیدی نوعیت کے ہیں، کچھ شکوہ آمیز اور کچھ تعارفی نوعیت کے حامل اور کچھ مکتوب نگار کی شخصیت کی گرہ

کشائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کثیر تعداد ان خطوط کی ہے جو علمی، ادبی، مذہبی، تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے حامل ہیں۔ یہی خطوط ’نعت رنگ‘ کا حاصل کہے جاسکتے ہیں۔ ان خطوط میں علم و دانش اور تحقیق و تنقید کے بے شمار خزانے بکھرے پڑے ہیں۔ جن میں سے بعض تو علمی، تنقیدی اور تحقیقی حوالے سے خاصے کی چیز ہیں۔ یہ خزانے ریزے بعض اوقات تو موضوع کے کسی پہلو کے ضمن میں آگئے ہیں اور اکثر ’نعت رنگ‘ میں شائع شدہ مقالات کی تصحیح، توسیع یا ترمیم کی غرض سے تحریر کیے گئے ہیں۔ ان خطوط میں تنقید، نعت، تخلیق نعت اور متعلقات نعت کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ افکار و نظریات کا ایک بہاؤ ہے جو مکتوب نگاروں کے ذہنی سرچشموں سے پھوٹتا ہوا ’نعت رنگ‘ کو سیراب کر رہا ہے۔ تحقیقات کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے جو قارئین پر لٹایا جا رہا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ زبان و بیان اور اظہار کے خوبصورت پیرایے قارئین کے ذوق جمال کی آبیاری بھی کر رہے ہیں اور اس طرح تحقیق و تنقید کا ذخیرہ اپنے تخلیقی آب و رنگ کے ساتھ ’نعت رنگ‘ کے صفحات میں جلوہ گر ہوا ہے۔ ان خطوط میں نظری مباحث بھی ہیں اور تحقیق و تنقید نعت کی عملی مثالیں بھی، ذاتی مشاہدات کا بیان بھی ہے اور باطنی واردات کا اظہار بھی، علمی نکات بھی زیر بحث آئے ہیں اور تحقیقی تسامحات کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ نعت گو شعرا کے احوال و آثار بھی موجود ہیں اور تخلیقی رویوں پر نچھی تلی آراء بھی۔ شخصیات کی آب و ہوا کے نقوش بھی موجود ہیں اور جلے کٹے خیالات بھی۔ غرض یہ کہ خطوط کے مختلف موضوعات اور پہلوؤں کی یہ کہکشاں اپنے اندر ایک الگ کائنات رکھتی ہے۔ ان خطوط کی مطالعاتی/انتقادی افادیت سے کسی بھی طور انکار ممکن نہیں۔ ان خطوط میں ایک طرف زندگی کے مختلف نقوش اور مظاہر اپنے جلوے دکھا رہے ہیں تو دوسری طرف علم، ادب، تاریخ، تہذیب، تحقیق اور تنقید کے سرمائے بھی لٹائے جا رہے ہیں۔

’نعت رنگ‘ میں جن شخصیات کے خطوط شائع کیے گئے ہیں، ان کا تعلق کسی مخصوص خطے، علاقے یا جغرافیے سے نہیں اور خوش آئند بات یہ ہے کہ اس میں کسی ایک مسلک، برادری، نسل یا گروہ کو اپنے خطوط چھپوانے کی اجارہ داری حاصل نہیں بلکہ یہ مجملہ ہر زبان، ہر علاقے اور ہر مکتبہ فکر کے دانشوروں کو فراخ دل اور کھلے ہاتھوں خوش آمدید کہہ کر اظہار خیال کا یکساں موقع فراہم کرتا ہے۔ اس حوالے سے مدیر نعت رنگ کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

”نعت رنگ‘ کے اجراء کے وقت سے لے کر آج تک میں نے نعت رنگ‘ کو کسی

مخصوص نقطہ نظر کے نمائندہ رسالے کے مروجہ اصول و ضوابط کا پابند نہیں رکھا۔ اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ اس انداز اور مزاج کے حامل نعت پر کئی جریدے شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ ’نعت رنگ‘ کو ایک ایسی محفل بنانے کی کوشش کی ہے جہاں مختلف الخیال احباب اپنے اپنے مکتب فکر و انداز نظر کے ساتھ شریک ہو کر ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فکری، مذہبی، ادبی اور فنی پہلوؤں پر گفتگو کر سکیں، یہی نہیں بلکہ ادب کا عام مگر باشعور قاری بھی اس گفتگو میں اسی اہمیت کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکے جس کا حق ہم صرف لکھنے والوں کو دیتے رہے ہیں۔ ایک ایسے فورم پر جہاں اظہار رائے کی آزادی ہو وہاں مباحث کا دائرہ صرف فکری، ادبی اور فنی نہیں رہتا بلکہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی مسلکی اور فقہی بھی ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں ایسا ہونا کوئی بری بات نہیں ہے کہ یہ چیزیں بھی ہمارے لیے معنی رکھتی ہیں اور ہم اپنے نظریات کو اسی روشنی میں واضح کرتے ہیں۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اختلاف رائے بری چیز نہیں مگر شناسائی ضروری ہے۔ ہمارے بیشتر لکھنے والے اس کا خیال رکھتے ہیں مگر کچھ احباب اپنی تحریروں پر اٹھنے والے سوالات سے خاصی حد تک آزرہ نظر آتے ہیں۔ میری ان سے درخواست ہے کہ ’نعت رنگ‘ کے معماروں میں ان عظیم ناموں کو دیکھیں جو ادب و مذہب کے اہم نام ہیں لیکن انھوں نے نعت پر بے لاگ گفتگو کے دروا کرنے کے لیے اپنی تحریروں پر اعتراضات اور سوالات کشادہ دلی سے برداشت کیے اور مسلسل ’نعت رنگ‘ میں لکھتے رہے کہ ہم سب نعت پر ایسی تنقیدی گفتگو فروغ دینا چاہتے تھے جس پر کسی قسم کی مصلحت اور فرقہ بندی کا سایہ نہ ہو۔“ (۲۶)

’نعت رنگ‘ کسی منجمد ذہن کی پیداوار نہیں۔ اس کی تشکیل اور آبیاری میں ہر رنگ، ہر نسل، ہر علاقے، ہر برادری اور ہر مسلک سے تعلق رکھنے والے روشن خیال دانشوروں نے حصہ لیا ہے گویا اس کی رگوں میں ایک زندہ اور توانا خون دوڑ رہا ہے۔ اگر یہ مجملہ کسی خاص مسلک یا نقطہ نظر کا ترجمان بن کر ابھرتا تو اس کے فکری اور تخلیقی سوتے کبھی کے خشک اور منجمد ہو چکے ہوتے اور یہ مجملہ دیگر نعتیہ رسائل کی طرح وقت سے پہلے پردہ غیب میں چھپ جاتا یا محض ریختے ہوئے اپنے وجود

کا یقین دلاتا۔ چونکہ اس کی رگوں میں نئے اور متنوع خیالات کا خون دوڑ رہا ہے اس لیے یہ مجلہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ (۲۷)

اس کتابی سلسلے میں اشاعت کی غرض سے آنے والے ہر خط کو بغیر کسی قطع برید کے شائع کر دیا جاتا ہے گویا یہ مدیر کی اپنے حق ادارت سے دستبرداری کا بھی واضح اعلان ہے۔ مدیر نعت رنگ کے اس طریقہ عمل کو بعض احباب نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور بعض نے سخت تنقید کا نشانہ بنایا اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس عمل کو پسند تو کیا لیکن بعض تحفظات کے ساتھ۔ مخالفت کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے اس نہج تک پہنچ گیا کہ انھیں ہمسایہ ملک کا ایجنٹ کہنے میں بھی کوئی خفت محسوس نہ کی گئی۔ (۲۸) دلچسپ بات یہ ہے کہ مخالفین کے الزامات اور اعتراضات، مدیر کے ارادوں میں رکاوٹ بننے کی بجائے ہمیز کا کام دینے لگے۔ مخالفین کے منفی طرز عمل کے باعث تنقید نعت کا یہ سلسلہ سست روی کا شکار ہو سکتا تھا لیکن خلاف توقع اس کی رفتار تیز تر ہوتی چلی گئی اور یہ مجلہ آئے دن نئے نئے خیالات کی پرورش کی آماج گاہ بن گیا۔ دنیا بھر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار نعت کے حوالے سے جو کچھ سوچ رہے تھے، ان کے خیالات، جذبات، افکار، نظریات اور نقطہ ہائے نظر ان خطوط کے ذریعے قارئین تک پہنچنے لگے۔

نعت کے حوالے سے سوچنے والے اذہان کے خلوص کی سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ (۲۹) ہر شخص کا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے اور اس کے اظہار میں وہ آزاد بھی ہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو آزادی رائے کے سب سے بڑے علم بردار بن کر سامنے آئے ہیں چنانچہ نعت رنگ نے ہر صاحب علم کو نعت کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی آزادی دے کر سرد گرم مباحث کا دروازہ کھول دیا۔ نعت رنگ کی کھڑکیوں سے کبھی خنک اور تنگ بستہ ہوائیں اور کبھی گرم اور جھلسا دینے والی لہریں ابھرتی رہیں۔ انھی ہواؤں کے ملاپ سے تنقید نعت کا ایسا متوازن ماحول تشکیل پایا جس میں نعت پر سوچنا اور لکھنا معیوب اور ناپسندیدہ نہ رہا۔ اختلافی اور نزاعی موضوعات پر کھل کر مباحث کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتدا میں ادبی موضوعات پر پیش کیے جانے والے اختلافی خیالات تو قارئین کے لیے قابل قبول تھے لیکن نزاعی مباحث تخریبی رخ اختیار کر سکتے تھے لیکن مدیر نعت رنگ کی دانشمندی سے ان مباحث کا رخ تعمیری ہی رہا۔ چونکہ مدیر نعت رنگ کا بنیادی مقصد فقط کیسوئے نعت کی آرائش اور تخلیق نعت کا فروغ رہا، اس لیے دنیا بھر سے نعت کے حوالے سے علمی مباحث، دلائل و براہین اور نکات سے مملو خطوط اتنی کثیر تعداد میں

مدیر نعت رنگ کو موصول ہوئے جو کچھ چلی دو صدیوں پر محیط صحافتی اور ادبی تاریخ میں کسی رسالے یا جریدے کو شاید ہی موصول ہوئے ہوں۔ نعت رنگ کو موصول ہونے والے خطوط میں جن موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور نعت کے حوالے سے جو نکات اٹھائے گئے ہیں، ان سے معلومات کے صدا دار ہی وانہیں ہوئے، تحقیق کے نئے نئے جزیروں کی دریافت اور تنقید کی نئی شاہراؤں کی نشان دہی بھی ہوئی ہے۔

اگرچہ نعت رنگ سے پہلے جاری ہونے والے رسائل میں بھی مضامین شائع ہوتے تھے لیکن ان کی نوعیت تنقیدی و تحقیقی سے زیادہ تقریظی، تعارفی اور تاثراتی دائروں میں گھوم رہی تھی نیز یہ کہ رسائل کا غالب رجحان تخلیق نعت کی اشاعت اور فروغ تک محدود ہوتا تھا۔ (۳۰) مدیر نعت رنگ نے اس مجلے کو صرف تخلیق نعت کے فروغ تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں تحقیق و تنقید کو زیادہ جگہ دے کر اس امر کا بالواسطہ اعلان بھی کر دیا کہ اب تخلیق نعت کی سمت کا تعین اور رہنمائی کا کردار نقاد اور محقق ادا کریں گے۔ چنانچہ نعت رنگ کے لیے دنیا بھر سے معروف اور غیر معروف محققین اور ناقدین سے نعت کے مختلف پہلوؤں پر مقالات تحریر کروائے گئے اور اس کے ساتھ ہی ان مقالات کے موضوعات اور تخلیق نعت پر اہل قلم سے خطوط کے ذریعے آراء بھی طلب کی گئیں۔ نعت رنگ کو موصول ہونے والے خطوط کومن و عن شائع کر دیا جاتا تھا اور ساتھ ہی قارئین سے التماس بھی کی جاتی تھی کہ وہ ان خطوط کو دل جوئیوں کے موسم میں تحریر کرنے کی بجائے تحقیق و تنقید کی گرم اور مرطوب آب و ہوا میں بار آور کریں۔ نعت رنگ کے ابتدائی شماروں میں شائع ہونے والے تعریفی، تقریظی، رسمی اور رسیدی نوعیت کے خطوط رفتہ رفتہ خالص علمی، تحقیقی اور تنقیدی حیثیت اختیار کر گئے۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ نعت رنگ میں شائع ہونے والے خطوط میں تحقیقی و تنقیدی مباحث کا سلسلہ قدیم نظریات سے قدم آگے بڑھ کر جدید نظریات کا احاطہ بھی کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ اردو تنقید جن راہوں سے آج آشنا ہو رہی ہے، وہی راہیں اب نعت سے بھی ہم کلام ہونے لگی ہیں۔ یہ کام آسان نہ تھا، اس خواب کو تعبیر دینے کے لیے جو جذبہ، محنت اور لگن درکار تھا اب وہ نعت رنگ کو میسر آ گیا۔

مدیر نعت رنگ کے ذہن میں نعت کے مستقبل کا جو منظر نامہ تشکیل پا رہا تھا اس کو بروئے کار لانے کے لیے انھوں نے نعت رنگ کے اداروں کا انتخاب کیا۔ ان اداروں میں انھوں نے نعت کے نئے نئے موضوعات کی نشان دہی کی، نعت کے متنوع امکانات کی طرف

اشارے کیے، تنقید نعت کے حوالے سے نئے اور قدیم نظریات کو برتنے کا مشورہ دیا اور تنقید کے جملہ دبستانوں سے اکتساب شعور کی طرف توجہ دلائی۔ نعت کو محض تقلید کے دائرے سے باہر نکال کر بطور ایک ادبی صنف کے پرکھنے اور برتنے کا مشورہ دیا اور نعت کو رسمی، تاشرائی اور تعارفی تنقید کی صف سے نکال کر سائنٹفک، جدید اصولوں سے آراستہ اور ٹھوس بنیادوں پر پرکھنے اور برتنے کا مشورہ دیا۔ اس حوالے سے مدیر نعت رنگ کے ادارے سے ماخوذ ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”۔۔۔ دنیا کی مختلف زندہ زبانوں میں تخلیق کیے جانے والے شاعری کے شہ پاروں اور ان پر تنقید کا تقابلی مطالعہ ہی اس بات کے جواب کا تعین کر سکتا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب ہم نعتیہ شاعری اور اس سے متعلق تنقیدی مواد کو بین الاقوامی سطح پر رائج تخلیقی اقدار اور معیاروں کے تناظر میں متعارف کروائیں۔ عالم گیریت (Globalization) کے موجودہ رجحان کے پھیلاؤ کے پیش نظر یہ بات بھی قابل توجہ اور ضروری محسوس ہوتی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس اور آپ کی نبوت و رسالت کی ہمہ گیریت، جامعیت اور عالم گیریت کو عالمی سطح پر ان کی حقیقی جہتوں کے عین مطابق متعارف کرواتے؟ فروغ دیا جائے۔ یہ ہمارا دینی فریضہ بھی اور ادبی منصب بھی۔۔۔ نعت رنگ کے انیسویں شمارے کی اشاعت پر میں یہ احساس ذمہ داری آپ تک منتقل کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے نعت کے ادبی فروغ کا جو سفر شروع کیا ہے وہ ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے۔ ابھی ہمیں نعتیہ ادب کو اس کی تمام تر جہتوں کے تناظر میں تنقید کے اعلیٰ ترین معیاروں کے مطابق متعارف کروانا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ دور حاضر میں مذہبی انتہا پسندی کے رجحان کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس کو حقیقی تنوع کے ساتھ۔۔۔ مسلمانوں کی عقیدت، محبت اور وابستگی کے حوالے سے عالمی ادب کی شعری اصناف مثلاً Epic اور Ode وغیرہ کی وساطت سے روشناس کرانے کی منزل بھی سر کرنی ہے اور منزل کو سر کرنے کے لیے ہمیں ضرورت ہے ایک ایسے ادارے اور پلیٹ فارم کی جو عالمی سطح پر اپنی شناخت اور دائرہ عمل رکھتا ہو۔“ (۳۱)

مدیر نعت رنگ کے ان خیالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ نعت جو دو دہائیوں قبل تک نقدیسی دائرے اور عقیدت کے سائے میں پروان چڑھ رہی تھی اور محض سننے سنانے کی چیز بن کر محافل میلاد تک محدود ہو کر رہ گئی تھی اب وہ اس مخصوص دائرے سے نکل کر علم و ادب اور تحقیق و تنقید کی انجمن میں آ بیٹھی۔

ادب کی تفہیم کی سینکڑوں سالہ روایت پر ایک اچھٹی سی نظر ڈالیے، ہر عہد اور ہر دور میں ادب کو پرکھنے کا ایک علیحدہ اور مخصوص معیار ہی رائج رہا۔ جیسے ہی زمانے نے کروٹیں بدلیں، ادب کو پرکھنے کے معیار نے بھی نیا رخ اختیار کر لیا۔ ادب کو پرکھنے کا ہر طریقہ ادب کی کسی ایک جہت کی تفہیم یا ایک نکتے کی عقدہ کشائی میں مددگار کے طور پر سامنے آیا۔ ان طریقوں کو دبستان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان دبستانوں میں جمالیاتی دبستان تنقید، تاشرائی دبستان تنقید، عمرانی دبستان تنقید، مارکسی دبستان تنقید، ساختیاتی دبستان تنقید، وغیرہ وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تمام دبستان تنقید ادب کی تفہیم کے لیے کوئی ایک ہی مخصوص طریقہ یا انداز استعمال کرتے رہے ہیں۔ ان تمام دبستانوں کے تفہیمی طریق کار سے ادب کی یک رخ تصویر ہی سامنے آتی ہے۔ ادب کثیر الجہت اور کثیر المعنویت کا حامل ہوتا ہے۔ متذکرہ دبستانوں میں سے کوئی دبستان بھی، ادب کی تمام جہات اور امکانات کا سراغ لگانے یا سامنے لانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لیے نعتیہ ادب کی تنقید کے لیے کسی ایک دبستان تنقید کا استعمال کلی طور پر سودمند نہیں ہو سکتا۔ نعت کے تجزیہ و تفہیم میں کسی ایک ہی دبستان تنقید کا استعمال ایسا ہی ہوگا جیسے مختلف النوع اشیا کو ایک ہی میزان پر تولاجائے۔ ایسا طرز عمل کسی بے شعور یا کم شعور سے تو کیا جاسکتا ہے لیکن سنجیدہ نقاد سے اس طرح کے طرز عمل کی توقع ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ ہر سنجیدہ نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ نعت کی تفہیم، تعبیر اور تشریح کسی متعینہ فارمولے کے تحت نہ کرے بلکہ نعت کے موضوع، ہیئت، تکنیک اور اسلوب کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا الگ تنقیدی پیٹرن وضع کرے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نعت کی تفہیم و تنقید کسی لگے بندھے اصولوں کے تحت کرنے کی بجائے قدیم و جدید اصول و ضوابط اور افکار و نظریات سے کشید کیے ہوئے معیارات کی روشنی میں کی جائے۔ یہی نقطہ نظر مدیر نعت رنگ کا بھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نعت کی تنقید کو جملہ دبستانوں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اس کے لیے انھوں نے انتخابی تنقید کی اصطلاح وضع کی ہے جس میں وزیر آغا کی امتزاجی تنقید کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔ انتخابی تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے مدیر نعت رنگ لکھتے ہیں:

”میرا موقف یہ ہے کہ نعت کا مطالعہ انتخابی تنقید کے ذریعے ہی کیا جاسکتا ہے۔ انتخابی تنقید سے میری مراد یہ ہے کہ تنقید کے تمام دبستانوں کے اصولوں کی روشنی میں نعت کا مطالعہ کیا جائے۔ تاریخی دبستان تنقید سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کن حالات اور کن ادوار میں لوگ نعت کی طرف متوجہ ہوئے یا ہوتے ہیں۔ نفسیاتی دبستان تنقید کے ذریعے ان رموز کی عقدہ کشائی ہو سکتی ہے کہ شاعروں کی روحانی، ذہنی اور نفسیاتی کشادگی میں نعت نے کتنا اور کس طرح حصہ لیا۔ نعت سے کس طرح شاعروں کا کیتھارسس ہوا ہے اور کس طرح نعت نے معاشرے کو پاکیزہ بنانے میں اپنا کردار ادا کیا، کیوں کہ اعلیٰ درجے کی نعت بلند تر اقدار حیات کے بغیر نہیں لکھی جاسکتی اور اقدار ہی کی بنیاد پر انسانی معاشرے کی سمت نمائی ہوتی ہے۔ نعت کے مطالعے کے لیے اسلام کا مطالعہ بھی لازمی ہے تاکہ منصب رسالت سے آگاہی حاصل ہو سکے اور نعت محض رسی عقائد تک محدود نہ رہے کیوں کہ سرکاری سیرت کا ذکر نظم میں ہو یا نثر میں انسان کی تعمیر کرتا ہے۔“ (۳۲)

اہل علم کا ایک خاص طبقہ ایسا بھی ہے جو مقالے کے معیار اور اسناد کو تحقیقی مقالے کی تسوید میں بروئے کار لائے گئے حوالوں اور مآخذ سے پہچانتے ہیں لہذا وہ تحقیقی مقالے یا کتاب کو پڑھنے کا آغاز اس کے آخر (الٹی طرف) سے کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ مقالہ یا کتاب کی تسوید میں برتے گئے مآخذ معیاری بھی ہیں یا نہیں۔ اسی طرح ادبی مجلے کے معیار کو پرکھنے کا ایک طریقہ اس میں شائع ہونے والے خطوط کے مواد، آراء اور مکتوب نگاروں کے مراتب سے لگایا جاتا ہے کیونکہ اس طرح اس ادبی مجلے کے تحقیقی و تنقیدی معیار کا پتا چلتا ہے۔ معاصر عہد کے ادبی رجحانات سے پردہ اٹھتا ہے اور اس مجلے کے قارئین کی ادبی قد و قامت کا بھی اندازہ لگانے میں آسانی رہتی ہے۔ قارئین کے لیے شاید یہ بات حیران کن ہو کہ ’نعت رنگ‘ کا سب سے دلچسپ اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا حصہ اہل قلم کے مکاتیب کا ہے۔ ’نعت رنگ‘ کے قارئین ان مکاتیب کا شدت سے انتظار کرتے ہیں اور ’نعت رنگ‘ کے حصول کے بعد پہلی فرصت میں ان کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ یہ مکاتیب ’نعت رنگ‘ کے مشمولات کا معیار متعین کرتے ہیں۔ ’نعت رنگ‘ میں راہ پا جانے والی خامیوں کی نشان دہی کرتے ہیں، قارئین کے رجحانات اور رویوں کو

سامنے لاتے ہیں اور قارئین کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ صبیح رحمانی نے ’نعت رنگ‘ کی عمارت کی بنیاد اٹھائی تو اس کی پہلی اینٹ ہی تنقید نعت کی رکھی۔ (۳۳) ان کا یہ اجتہادی اقدام اس زمانے میں سامنے آیا جب تنقید نعت، عقیدت کے سائے میں پرورش پا رہی تھی اور سبحان اللہ، ماشاء اللہ سے قدم آگے بڑھنا نہیں پارہی تھی۔ نعت کو درپیش اس بحرانی دور میں انھوں نے تنقید نعت کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا اور پہلے شمارے ہی میں تنقید نعت کی نظری اور عملی مثالیں (مضامین کی صورت میں) پیش کر کے نعتیہ صحافت اور تنقید کو حیران کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب نعت کو رسمی اور روایتی حصار سے نکال کر ادبی، فکری اور فنی تنقید کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور نعتیہ ادب میں توانا رجحانات کے فروغ، صحت مند روایات کی ترویج، اور موضوع کی نقدی لکھنے کے خدوخال اجاگر کرنے میں تنقید نعت کو ناگزیر قرار دیا گیا تھا۔ (۳۴) ان کا یہ انقلابی اقدام گویا اس عہد کے مروجہ اسالیب تنقید نعت سے بغاوت کے مترادف تھا۔ نتیجتاً کم علم تو ایک طرف اہل علم کا بھی ایک بڑا طبقہ ان کی مخالفت پر اتر آیا اور اپنے خطوط اور مضامین کے ذریعے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا رہا اور ناامید ہو کر اپنے جلے دل کے پھپھوے پھوٹا رہا۔ مدیر کو موصول ہونے والے خطوط کے مندرجات اور ان کے اسلوب کی نوعیت سرسید کو ’تہذیب الاخلاق‘ کے اجرا کے بعد موصول ہونے والے خطوط سے قدرے مختلف نہ تھی۔ جس طرح سرسید کو ’تہذیب الاخلاق‘ کی اشاعت کے بعد مخالفوں کے طوفان کا سامنا کرنا پڑا اور معاصرین کے تیز و تند حملوں کو برداشت کرنا پڑا بعینہ ’نعت رنگ‘ اور مدیر ’نعت رنگ‘ کو رد عمل کا سامنا رہا۔

سرسید اور صبیح رحمانی دونوں نے ایسے معاملات اور موضوعات کا انتخاب کیا تھا جو ہمارے معاشرے میں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ موضوعات سرسید کے عہد میں بھی حساس نوعیت کے حامل تھے اور پونے دو صدیاں گزرنے کے بعد بھی ان کی حساسیت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ سرسید اور صبیح رحمانی دونوں کے نزدیک یہ موضوعات اہم بھی تھے اور وقت کی ضرورت بھی۔ سرسید احمد خان کا رویہ چونکہ جارحانہ تھا اس لیے ان کے خلاف مخالفت کا زور بڑھتا گیا اور آخر کار انھیں ’تہذیب الاخلاق‘ کی بساط کو لپیٹنا ہی پڑا۔ (۳۵) صبیح رحمانی نے نعت جیسے حساس موضوع کی اصلاح کے عمل کو بہ انداز دیگر لیا۔ اس لیے انھیں سرسید کی طرح شدید مخالفت کا سامنا کرنا تو نہیں پڑا لیکن مشکلات سے نبرد آزما ہونا ضرور پڑا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سرسید چونکہ حساس نوعیت کے موضوعات میں فریق کا کردار ادا کرتے تھے اس لیے مخالفت کے تمام وار انھوں نے

اپنے سینے پر سہمے جب کہ صبیحِ رحمانی نے ممنوعہ موضوعات کا دھارا اہل علم و دانش کی جانب موڑ دیا۔ دوطرفہ مباحث اور معرکوں کا میدان کارزارِ نعتِ رنگ کے صفحات پر رونما ہوا۔ یہ معرکے کبھی شعبہء مراسلات میں اور کبھی تحقیقی و تنقیدی مضامین کے حصے میں ظہور میں آئے۔ لہذا مخالفت کا جو طوفان ان کے خلاف اٹھنا تھا وہ طوفان اٹھا تو ضرور لیکن ان کے خلاف نہیں بلکہ مقالہ نگاروں اور مکتوب نگاروں کے درمیان قلمی اور ادبی معرکوں کی صورت میں ظہور میں آیا۔ جس کا سامنا بالواسطہ طور پر مدیرِ نعتِ رنگ کو بھی کرنا پڑا۔ طوفان کی منہ زور لہریں وقتاً فوقتاً ان سے ٹکراتی تو رہیں لیکن ان کے پائے استحکام کو متزلزل نہ کر سکیں۔ وہ ایک مضبوط اور مستحکم مینار کی طرح ساحلِ سمندر پر تھکے کھڑے رہے اور اس میں اٹھنے والی لہروں کے نشیب و فراز کا بغور مشاہدہ کرتے رہے لیکن جب انھیں طوفان کے تھمنے یا لہروں کے زور ٹوٹنے کا اندازہ ہونے لگتا تو سوال کا کوئی پتھر پھینک کر پھر اس میں ارتعاش پیدا کر دیتے۔ اس طرح نعت کے حساس موضوع پر گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا اور آج یہ سلسلہ تحریک کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

صبیحِ رحمانی نعت کے موضوعات پر گفتگو کرنے کے لیے 'نعتِ رنگ' کے اداروں کا سہارا لیتے اور اس میں فیصلہ سنانے کی بجائے سوال اٹھاتے اور سوال کا رخ قارئین کی جانب موڑ دیتے۔ اس طرح اس سوال کے حق اور مخالفت میں مضامین اور خطوط موصول ہونے کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ وہ قارئین کے ان موصولہ دوطرفہ نقطہ ہائے نظر کے حامل مضامین اور خطوط کو 'نعتِ رنگ' میں شائع کر دیتے۔ اس طرح بات آگے بڑھتی اور بحث کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا لیکن اس سارے عمل میں ان کا کردار ایک عمل انگیز (Catalyst) کی طرح رہتا جو خود تو عمل میں حصہ نہیں لیتا لیکن اس کی موجودگی عمل اور رد عمل کو تیز کرنے کا باعث ضرور بنتی ہے۔ (۳۶) بعینہ 'نعتِ رنگ' کا پلیٹ فارم تنقیدِ نعت کے دوطرفہ مباحث کو آگے بڑھانے میں مدد و معاون رہا۔ صبیحِ رحمانی نے کبھی بھی کسی موقف کے پلڑے میں اپنے نقطہء نظر کا وزن ڈال کر اسے جھکانے کی کوشش نہیں کی۔ (۳۷) کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کا جانبدار اندر رویہ مکالماتی فضا اور ماحول کو مسموم کرنے کا باعث بنتا۔ نتیجتاً بحث ایک طرفہ ہو کر رک جاتی اور مکالمہ آگے نہ بڑھ پاتا۔

صبیحِ رحمانی نے 'نعتِ رنگ' کا آغاز کیا اور نعت کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھنے کا مشورہ دیا تو نعت سے دلچسپی رکھنے والا طبقہ کافی سیخ پا ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ نعت کا موضوع حساس نوعیت کا حامل ہے۔ اس لیے اس پر تحقیق و تنقید کا بے رحم نشر چلانا مناسب نہیں۔ اس ماحول میں نعت کو تنقید

کی کسوٹی پر پرکھنے یا نہ پرکھنے کے حوالے سے تین طرح کے نقطہ ہائے نظر سامنے آئے۔ پہلا گروہ تو نعت کو سرے سے ہی تحقیقی و تنقیدی کسوٹی پر پرکھنے کا مخالف تھا۔ ان کے نزدیک نعت کا تعلق چونکہ عقیدے سے ہے اور عقیدے کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاتا۔ اس لیے نعت کی تنقید غیر ضروری اور نامناسب ہے۔ اس گروہ کا خیال تھا کہ نعت پر تنقید کا باب کھولنے سے صنفِ نعت کو ہی نقصان پہنچے گا اندیشہ نہیں بلکہ اس کے پردے میں صاحبِ نعت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اقدس میں گستاخی کا پہلو بھی مضمر ہے۔ (۳۸) جب کہ دوسرے گروہ کا نقطہء نظر تھا کہ تنقیدِ نعت ضروری تو ہے لیکن ایک حساس موضوع ہونے کی بنا پر تنقیدِ نعت بہت احتیاط کی متقاضی بھی ہے چنانچہ موجودہ حالات کے پیش نظر احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سازگار ماحول کے تشکیل پانے تک کا انتظار کیا جائے اور اس پر کھلے عام بحث و تحیث سے گریز کیا جائے۔ (۳۹) جب کہ تیسرا گروہ نعت پر تنقید و تحقیق کا قائل تو تھا لیکن اس کو پرکھنے کے لیے جدید تنقیدی نظریات یا مغربی افکار کی روشنی کو جائز خیال نہیں کرتا تھا۔ ان کے خیال میں نعت ایک خاص تہذیب کی پروردہ ہے اس لیے نعت کو اسی خاص تہذیبی اور معاشرتی سیاق میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس گروہ کا موقف تھا کہ اگر نعت کو اس کے تہذیبی سیاق میں سمجھنے کی بجائے کسی اور سیاق یا افکارِ نقد کی روشنی میں دیکھا جائے گا تو اس کے ساتھ سخت ادبی اور مذہبی بددیانتی ہوگی۔ (۴۰)

اول الذکر دونوں گروہ کے حامل افراد کے خیالات (بلکہ کسی حد تک تیسرے گروہ کے خیالات میں بھی) میں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے وہ ہے خوف کا عنصر۔ یہ وہی عنصر ہے جس کی طرف ڈاکٹر منظور احمد نے فکرِ اسلامی کی تشکیل نو کے حوالے سے اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد کا خیال ہے کہ اسلامی فکر میں جمود کا ایک سبب تو تصوف ہے جس کی نشان دہی اقبال نے اپنی شاعری اور نثر میں جا بجا کی ہے اور دوسرا عنصر خاص نفسیاتی ہے اور وہ ہے خوف۔ یہ عنصر ہمارے ذہنوں میں شعوری اور غیر شعوری طور پر جا گزیں ہو گیا ہے۔ یعنی اپنے تشخص کو کھودینے، اپنی سیادت اور بالادستی کے ختم ہو جانے اور اپنے کھرب جانے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خوف۔ (۴۱) اسی طرح کا خوف ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکا تھا کہ اگر نعت کی تنقید کے دروا کیے گئے تو اسلام اور پیغمبر اسلام کے مرتبہ کو نقصان پہنچے گا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے۔ (۴۲) صبیحِ رحمانی کا خیال تھا کہ نعت کو تنقید سے بالاتر سمجھنے اور اسے مرزا پھویا بنا کر رکھنے سے فائدے کی بجائے الٹا نقصان پہنچے گا اور نقصان پہنچ بھی رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ تنقیدِ نعت میں حزم و احتیاط ضروری ہے لیکن حد

سے بڑھا ہوا محتاط رویہ اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا عمل غیر ضروری ہے۔ حزم و احتیاط کے تقاضوں کے زیر اثر نعت کی تنقید کے دروازے بند کر دینا کہاں کی انصاف پسندی ہے۔ ان کے خیال میں نعت کا ادبی فروغ اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب اس صنف کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھا جائے گا اور اس کے فکری اور علمی پہلوؤں پر گفتگو کا ایسا ادبی ماحول فراہم کیا جائے گا جو خوف و ہراس اور اندیشوں کی فضا سے معمور نہ ہو۔ (۴۳) مزید یہ کہ نعت کی تنقید نہ رسمی ہو نہ تعارفی اور نہ ہی تاثراتی بلکہ علمی اور سائنٹفک ہونی چاہیے۔ جس کے پس منظر میں مشرقی علوم بھی کارفرما ہوں اور جدید مغربی زاویہ نظر بھی۔ مشرقی اور مغربی نظریات اور اصولوں کے تال میل سے ہی تنقید کا خمیر اٹھنا چاہیے اور اسی خمیر سے نعت کا تنقیدی مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ (۴۴)

یہی نہیں بلکہ ان کا خیال تھا کہ نعت کے معروف اور قدآور شعرا کے کلام کا بھی تنقیدی محاکمہ ہونا چاہیے۔ اس طرح ایک طرف ان کا ادبی مقام و مرتبہ سامنے لانے اور متعین کرنے میں مدد ملے گی بلکہ نعت کی تنقیدی تاریخ پر تاثراتی اور معتقداتی تنقید کے گرد و غبار کو دور کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ یہ وقت کی ضرورت بھی ہے اور تنقید نعت کی ضرورت بھی۔ اس حوالے سے مئی ۲۰۰۵ء میں 'جام نور' (نئی دہلی) کو دیے گئے ایک انٹرویو کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

”مولانا احمد رضا خان صاحب پر کام کرنے والوں پر ایک خوف کا سایہ ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری کو اگر ہم تنقیدی رویوں سے گزاریں گے تو ہمارے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن جائے گا جب کہ میرا خیال یہ ہے کہ اس تاثر کو ختم کرنا چاہیے۔ دیکھیے! غالب اردو کا ایک عظیم شاعر ہے اگر اس کے حق میں دو سو کتابیں وجود میں آئی ہیں تو اس کے فن کے خلاف بھی دو سو کتابیں وجود میں آئی ہیں مگر شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کے قد پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ تنقیدی کسوٹی سے گزر کر اس کی شاعری دن بدن فن کے نئے پہلوؤں سے ہمیں آشنا کر رہی ہے۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کی شاعری اتنی بڑی، اتنی وقیع اور مقبول ہے کہ ان کے سر سے کلام کی مقبولیت اور عظمت کا تاج اب کوئی چھین نہیں سکتا۔ لیکن مولانا کی شاعری پر کھل کر گفتگو نہ کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ اب تک ان کا کوئی ادبی مقام متعین نہ ہو سکا۔“ (۴۵)

سر سید احمد خان نے قرآن کی تفسیر لکھتے ہوئے اور اسلام کی حقانیت کو جدید دور کے

مطابق پیش کرتے ہوئے اپنے جدید عہد کے سائنسی نظریات اور عقلی معیارات کو بنیاد بنایا۔ ان کے اس اقدام سے علما کا ایک طبقہ ان کا سخت مخالف ہو گیا اور انھیں نیچری، ملحد، کافر، کرستان، زندیق، لامذہب، دہریہ، غدار اور انگریزوں کا ایجنٹ کہنے لگا۔ (۴۶) یہ درست ہے کہ اصلاح عقائد و افکار اور تفسیری کوششوں میں سرسید نے سخت ٹھوکریں کھائیں۔ انھوں نے جمہور علما سے اپنی راہ الگ نکال کر اور مسلمہ عقائد و افکار سے بھی اختلاف کر کے ہندوستانی مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو بدظن کر دیا تھا لیکن ان کی نیت نیک تھی اور نیک نیتی کے ساتھ اٹھنے والا قدم خواہ غلط کیوں نہ پڑ جائے اسے لائق تعزیر شمار نہیں کیا جاتا بعینہ جب صلیح رحمانی نے 'نعت رنگ' کا اجرا کیا اور اس میں تنقید نعت کے مباحث کو جگہ دی تو ان کے خلاف بھی سخت واویلا ہوا۔ ان کی نیت پر شک کیا گیا۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے انھیں ہمسایہ ملک کا ایجنٹ بھی قرار دے ڈالا لیکن چونکہ ان کی نیت نیک تھی اس لیے بدظنی کی مسموم ہوائیں زیادہ دور تک ان کا تعاقب نہ کر سکیں اور تھک ہار کر راستے ہی میں دم توڑ گئیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مکتوبی تنقید و تحقیق کی ایک صدی سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی روایت کے باوجود اردو تحقیق و تنقید میں مکتوبی تنقید کو درخور اعتنا کیوں نہیں سمجھا گیا؟ اس کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک کیوں روا رکھا گیا؟ اور اسے ادب میں خاطر خواہ مقام کیوں نہ مل سکا؟ دوسرا سوال یہ کہ مکتوباتی تنقید و تحقیق کے مباحث رسائل و جرائد میں زیادہ دیر تک اور زیادہ دور تک کیوں نہ چل سکے؟ اور یہ مباحث مروجہ تحقیق و تنقید کو راستہ کیوں فراہم نہ کر سکے؟ تیسرا سوال یہ کہ اردو کے اکثر ادبی رسائل و جرائد خطوط کی اشاعت سے کیوں کتراتے رہے؟ اور جن رسائل و جرائد (چند استثنائی مثالیں چھوڑ کر) میں خطوط کی اشاعت ہوتی رہی ان میں سے اکثر کی نوعیت محض رسمی یا رسیدی ہی کیوں رہی؟ چوتھا سوال یہ کہ کسی بھی رسالے کی ترقی کا راز کن باتوں میں مضمر ہوتا ہے؟ یہ تمام سوالات توجہ طلب بھی ہیں اور اہل ادب کو دعوت فکر بھی دیتے ہیں کہ وہ ان سوالات کا جواب تلاش کریں اور خطوط کی ادبی اور تحقیقی و تنقیدی کم مائی کا سد باب بھی کریں۔ ذیل میں ان سوالات کے ممکنہ جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ خطوط کو بالعموم ذاتی نوعیت کی چیز سمجھا جاتا رہا ہے اور اس میں موجود مباحث کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اسی وجہ سے خطوط کو وہ ادبی اور تحقیقی و تنقیدی مقام نہیں مل سکا جو دیگر اصناف ادب کو حاصل رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ خطوط

کو بالعموم غیر ادبی سرگرمیوں سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔ اسی لیے مروجہ تحقیق و تنقید میں ان کی جگہ نہیں بن پائی۔ تیسری وجہ شاید یہ بھی رہی ہے کہ ہمارے ہاں تنقید اور تحقیق خاص مزاج کی حامل بن کر ایک مخصوص ڈھرے پر چلتے رہے ہیں اور اس میں (دو چار استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر) تبدیلی کا نہ کوئی بڑا موڑ آیا اور نہ حسب ضرورت اس نے ترقی کے قدم ہی آگے بڑھائے۔ اس کے باوجود کہ خطوط میں تحقیق و تنقید کا ایسا خزانہ موجود ہوتا ہے جسے کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ادبی رسائل و جرائد میں متعدد خطوط شائع ہوئے۔ آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں علم و ادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی نکات اور مباحث بھی پیش کیے جاتے رہے ہیں اور ادبی مسائل بھی زیر بحث آتے رہے ہیں۔ اظہار خیال بھی نت نئے رنگوں میں سامنے آتا رہا ہے۔ پھر بھی خطوط کو دوسرے درجے کی چیز ہی سمجھا گیا۔ چوتھی وجہ یہ کہ چونکہ خطوط اس خاص فارمیٹ میں نہیں لکھے جاتے جن میں ہماری تحقیق و تنقید اظہار پاتی رہی ہے اور نہ ان میں، موجودہ تحقیق و تنقید میں مروج حوالہ جاتی انداز موجود ہوتا ہے اور نہ اکثر خطوط میں کسی موضوع کے تحت بیان کیے گئے خیالات کا وہ مربوط انداز دیکھنے میں آتا ہے جو تحقیق و تنقید کا وصف خاص شمار کیا جاتا ہے۔ پانچواں یہ کہ علماء و ادبا اور محققین و ناقدین کے خطوط کو عام خطوط سے بالعموم ممتاز بھی نہیں کیا جاتا رہا۔ شاید اسی لیے ان کے خطوط کو بھی محض خطوط سمجھ کر تحقیق و تنقید کے دائرے سے باہر کیا جاتا رہا ہے۔

اب ہم دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ جن رسائل و جرائد نے مکتوبی مباحث کو اپنے رسائل کا حصہ بنایا ان کی نوعیت مخصوص موضوعات تک محدود رہی اور مباحث کا سلسلہ بھی مخصوص افراد اور مخصوص موضوعات کے گرد ہی گھومتا رہا۔ معاصر عہد کے دو بڑے اور معروف ادبی رسائل خاص نقطہ نظر کی حامل شخصیات کی نگرانی اور رہنمائی میں شائع ہوتے رہے ہیں اور مزید یہ کہ ان رسائل کے موضوعات اور افکار بھی مخصوص دائروں کا طواف کرتے رہے ہیں۔ لہذا ان میں شائع ہونے والے خطوط اور مباحث بھی انہی دائروں سے کشید کردہ اثرات کا منطقی نتیجہ ہوتے تھے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی لیکن ان رسائل کے مباحث کا محور مخصوص ہونے کی وجہ سے نہ مباحث کا دائرہ ہی معاصر تمام مباحث تک بڑھایا گیا اور نہ اس سلسلے کو تمام قارئین تک پھیلا یا گیا اور نہ رسالے میں اپنے نظریات کے مخالف نقطہ نظر کے حامل خطوط کو آزادانہ جگہ دی گئی۔ (۴۷) لہذا مباحث کا سلسلہ اپنے امکانات کو برت لینے کے بعد رک گیا اور آگے بڑھ نہ پایا۔

تیسرے سوال کا جواب پہلے جواب کو مد نظر رکھتے ہوئے دیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ خطوط کو غیر ضروری سمجھا جاتا رہا اور رسائل کے صفحات میں خطوط کی شمولیت خفایت کا باعث بن کر مالی بوجھ میں اضافے کا باعث تصور کی جاتی رہی۔ زیادہ تر مکتوب نگاروں کے خطوط کا تعلق رسیدی، رسمی، تعارفی یا شکوہ آمیز نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس لیے ان خطوط کی رسالے میں اشاعت غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود رسائل میں تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے خطوط بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان خطوط میں معاصر عہد کے ادبی نظریات، رجحانات اور مباحث پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ مزید یہ کہ خطوط کی اشاعت سے رسالے کی خفایت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے مالی مسائل کا بوجھ بھی بڑھ جاتا ہے۔ وہ رسالہ جو پہلے ہی مالی مشکلات میں گھرا ہوا ہو وہ خطوط کو شامل رسالہ کر کے اپنی مشکلات میں اضافے کا خود ہی باعث بننے کا محرک قرار پائے گا۔ چنانچہ مدیر کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ خطوط جیسی غیر اہم صنف کو رسالے سے باہر ہی رکھے۔ اس میں مدیر کا فائدہ بھی ہے اور رسالے کا فائدہ بھی۔

چوتھا سوال سب سے اہم ہے اور اس کا جواب مدیر کی شخصیت میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کسی بھی ادبی مجلے کو قارئین کی منازل طے کروانا مدیر کا فرض منصبی ہوتا ہے۔ مدیر ایک سربراہ کی طرح سب کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اچھے کو بھی اور برے کو بھی، خام کو بھی اور پختہ کو بھی۔ اقبال نے میر کا رواں کی جو خصوصیات ”نگاہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز“ بتائی ہیں، مدیر کو بھی انہی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے۔ اسے اندھے کی طرح اپنیوں کو ریوڑیاں بانٹ کر خوش اور مطمئن نہیں ہونا چاہیے اور اگر وہ اپنے مخصوص ادبی معتقدات یا ذہنی رویوں کے زیر اثر کچھ ایسا کرتا ہے اور نتیجے میں وہ مجلہ بے توقیر ہو کر قارئین کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے تو پھر مدیر کو قارئین سے شکوہ کتنا ہونے کا بھی حق حاصل نہیں۔ مجلے کو کامیاب بنانے اور قارئین کی دلچسپی کی چیز بنانے کے لیے مدیر کو چاہیے کہ وہ مجلے کی ایسی فضا تشکیل دے جس میں مختلف الجھال افراد کھل کر سانس لے سکیں۔ اسے ایک کنویں کا مینڈک بننے کی بجائے وسیع اور فراخ حوصلہ کا مالک ہونا چاہیے تاکہ وہ مجلے کے لیے موصول ہونے والے ہر خیال اور نقطہ نظر کو کشادہ دل اور کھلے بازوؤں کے ساتھ خوش آمدید کہہ سکے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ایسے مدیر کو نہ ادبی کساد بازاری کا رونا رونا پڑے گا، اور نہ ہی ادب کی موت کا اعلان کرنا پڑے گا۔

دوسرا یہ کہ مجلے کے ارتقا اور ترقی کا دار مدار مجلے کی پالیسیوں پر ہوتا ہے۔ اگر مجلہ زندگی آمیز ہو، معاشرتی رویوں اور ادب کو ہم آہنگ کر کے قدم آگے بڑھا رہا ہو تو وہ عوام کے دلوں اور ذہنوں سے قریب ہونے کی وجہ سے شہرت کے پروں سے اڑنا شروع کر دیتا ہے اور جو مجلہ زندگی کے رشتوں اور ادبی رجحانات کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ کر دیکھنے کا عادی ہو، وہ ادب کی زندگی میں زیادہ دیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ زمین سے ٹوٹا ہوا تعلق خواہ وہ ادب کا ہو یا زندگی کا زیادہ دیر پائ نہیں ہوا کرتا۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نعت رنگ کی پالیسیاں کیا رہی ہیں؟ اور نعت رنگ دوسرے مجلات و رسائل سے کس طرح مختلف ہے؟ ذیل میں ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ نعت رنگ نے اپنی تشکیل کے بعد پہلا قدم ہی تنقید کا اٹھایا اور مدیر نعت رنگ نے اپنے ہر ادارے میں سوال کرنے اور اظہار خیال کی بلاروک ٹوک آزادی دے کر تنقید کے موسموں کو عام کر دیا تھا۔ اس مجلے میں دیگر رسائل کے برخلاف خطوط کی اشاعت میں خاص دلچسپی لی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ مدیر نعت رنگ کے اداروں میں سوالات اٹھانے کے ساتھ ساتھ ذاتی طور پر بھی اہل علم کو ترغیب دلاتے رہے کہ نعت رنگ ان کے روشن خیال افکار کو خوش دلی سے قبول کرنے کا منتظر ہے۔ لہذا وہ آئیں اور خطوط کے ذریعے اپنے خیالات، افکار اور نقطہ نظر کو بے خوفی سے پیش کریں۔ (۴۸) مدیر کے اس طرز عمل کی وجہ سے مجلے کا دائرہ حیرت انگیز طور پر وسیع ہو گیا۔ چنانچہ نعت رنگ میں مذہب، تہذیب، تاریخ، ادب، تحقیق اور تنقید کے مباحث نظر آنے لگے۔ مدیر کی روشن خیالی اور فراخ دلی کے باعث اس مجلے پر کسی مخصوص عقیدے، فرقے یا نظریے کی چھاپ لگی اور نہ یہ مجلہ کسی مخصوص علاقے، رنگ اور نسل کا ترجمان بنا۔

نعت رنگ اور دیگر زوال شدہ یا زوال آمادہ ادبی رسائل میں ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ نعت رنگ نے ادب اور زندگی کو باہم آمیز کر دیا۔ مختلف الخیال افراد کو نعت رنگ کے رشتے میں ایک لڑی کی طرح پرو دیا۔ توڑنے کی بجائے جوڑنے کا فریضہ ادا کیا۔ کیونکہ اگر یہ مجلہ بھی دیگر مجلات کی طرح اجنبیت کی فضا قائم کرتا یا مدیرانہ فرعونیت کے زیر اثر اپنے اوراق رکن کے درمیان فاصلوں کی خلیج حائل کر بیٹھتا یا خود کو کسی اور زمین کی مخلوق ثابت کرنے کی کوشش کرتا یا ادب اور مذہب کو خانوں میں بانٹ کر دیکھنے یا تفریق کرنے کی غیر ادبی اور غیر دانشورانہ کوشش کرتا تو اس محفل میں کوکب نورانی اوکاڑوی، عبدالحکیم شرف قادری، عبدالنعیم عزیزی، حافظ عبدالغفار، خوشتر

نورانی، حافظ محمد عطا الرحمن قادری رضوی، جیسے مذہبی علما نعت رنگ کا حصہ بن پاتے اور نہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، شان الحق حقی، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر سہیل احمد صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر نجم الاسلام، وقار احمد رضوی، ڈاکٹر یحییٰ فیض، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، ڈاکٹر رؤف پارکھی، مبین مرزا، ڈاکٹر یونس اکاسکر، ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی، ڈاکٹر شبیر احمد قادری جیسی معروف ادبی شخصیات نظر آتیں۔ مختلف مکاتب فکر اور نظریات کے حامل افراد کی نعت رنگ کے فروغ اور ارتقا میں عملی کاوشوں کا نتیجہ ہی تھا کہ یہ رسالہ مذہب اور ادب سے تعلق رکھنے والے اہل علم اور اہل قلم دونوں کے لیے قابل قبول بن گیا اور مخصوص موضوعاتی جریدہ ہونے کے باوجود اردو کی دیگر شعری اصناف میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ذیل میں نعت رنگ سے متعلق مزید چند سوالات کے جواب تلاش کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ ان سوالات کی بنا پر نعت رنگ کا معاصر نعتیہ رسائل و جرائد میں ادبی کردار سامنے لانے میں مدد ملے گی۔

(۱) پہلا سوال یہ کہ کیا نعت رنگ کا مطالعہ نعت پڑھنے کے لیے کیا جا رہا تھا؟

(۲) دوسرا یہ کہ کیا نعت رنگ کے تحقیقی و تنقیدی مضامین نعت رنگ کو پڑھوار ہے تھے؟

(۳) تیسرا یہ ہے کہ کیا نعت رنگ میں شائع ہونے والے خطوط نعت رنگ کے مطالعے کا باعث بن رہے تھے؟

(۴) اور چوتھا سوال یہ کہ کیا نعت رنگ کے ادارے نعت رنگ کی دلچسپی کا سامان فراہم کر رہے تھے؟

ان سب سوالوں کے جواب نعت رنگ ہی میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ ذیل میں ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اگر نعت رنگ کی مقبولیت کا سبب اس میں شائع ہونے والی نعتوں میں تلاش کیا جائے تو پھر اس سے پہلے اس سوال کا جواب تلاش کیا جانا چاہیے کہ نعت رنگ کے معاصر اور ماقبل رسائل میں بھی تو نعت شائع ہوتی رہی ہے۔ پھر وہ رسائل مقبولیت کی وہ منزل حاصل کیوں نہ کر پائے جو نعت رنگ کے حصے میں آئی۔ یہاں یہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ نعت رنگ میں شائع ہونے والی نعتیں اسالیب اور موضوعات کے لحاظ سے معاصر نعتیہ رسائل میں شائع

ہونے والی نعتوں سے مختلف اور نسبتاً معیاری شائع ہو رہی تھیں اور نعت کہنے والے مختلف اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ایسا بھی ہرگز نہیں۔ 'نعت رنگ' میں بھی انھی (ماسود و چار نعت گو شعرا کے) تخلیق کاروں کی نعتیں شائع ہو رہی تھیں جو معاصر اور ماضی کے نعتیہ رسائل کے لیے نعتیں بھیج رہے تھے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ 'نعت رنگ' کو پڑھوانے اور مقبولیت سے ہم کنار کرنے میں محض نعتیں اہم کردار ادا نہیں کر رہی تھیں۔

اب دوسرے سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ 'نعت رنگ' میں شائع ہونے والے مضامین اور معاصر نعتیہ رسائل میں شائع ہونے والے مضامین میں کیا فرق نظر آتا ہے؟ 'نعت رنگ' کے معاصر اور ماقبل نعتیہ رسائل میں بھی نعت پر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں لیکن ان کا غالب رجحان تعریفی، توصیفی اور وضاحتی رہا گو یا کہ ان رسائل میں شائع ہونے والے مضامین محض اسی عقیدت کے زیر اثر لکھے جاتے رہے جس عقیدت کے زیر اثر نعت کہی جا رہی تھی لیکن 'نعت رنگ' کو یہ اختصاص حاصل رہا کہ اس میں شائع ہونے والے مضامین کا غالب عنصر وضاحتی اور توصیفی کی بجائے تنقیدی اور تحقیقی رہا۔ 'نعت رنگ' کے اولین شمارے سے ہی اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ اس مجلے میں ایسے مضامین شائع کیے جائیں گے جن میں نعت کو تنقیدی اور تحقیقی کسوٹی پر پرکھا گیا ہوگا۔ نعت کی پرکھ کا یہ رجحان اس سے قبل کے اور اس کے معاصر رسائل میں مفقود نظر آتا ہے۔ 'نعت رنگ' نے تخلیق نعت کو پرکھنے کا معیار نہ عقیدت کو بنایا اور نہ ہی تاثرات کو بلکہ اس مجلے کی پالیسی ہی یہ رہی ہے کہ نعت کو جدید اور سائنٹیفک اصولوں کو پیش نظر رکھ کر پرکھا جانا چاہیے چنانچہ انھی اصولوں کو بنیاد بنا کر نعت پر تحقیقی اور تنقیدی مقالات لکھوائے گئے۔ اس طریق کار کے باعث مضامین میں اختلافی مباحث در آئے جس کی وجہ سے نعت کی ادبی تنقید میں نزاعی صورت حال پیدا ہوگئی اور ساتھ ہی علمی اور مذہبی حلقوں میں خاصا اضطراب بھی دیکھنے میں آیا لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ 'نعت رنگ' کو موصول ہونے والے مقالات دلچسپی اور دقت نظری کے ساتھ پڑھے جانے لگے اور ان مقالات میں اٹھائے گئے سوالات کے جواب تلاش کرنے کی طرف قدم بڑھایا جانے لگا۔ ایک فریق اپنے ادبی اور مذہبی معتقدات کا اظہار کرتا تو دوسرا ان خیالات کے رد میں مفصل تر جواب دیتا۔ اگر فریق اول ان خیالات سے متفق ہوتا تو خاموشی اختیار کر لیتا بصورت دیگر فریق ثانی کے جواب میں مزید دلائل اور شواہد سے کام لیتا۔ اس طرح جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مثلاً 'نعت رنگ' کے شمارہ ۶ میں جمال پانی پتی کا ایک مضمون 'نعت

گوئی کا تصور انسان شائع ہوا۔ اس مضمون کے جواب میں مولانا کوکب نورانی کا ایک مفصل خط 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۸ میں شائع ہوا۔ جس میں مولانا نے جمال پانی پتی کے استدلال سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ کوکب نورانی کے اس خط کے جواب میں جمال پانی پتی نے 'نعت گوئی کا تصور انسان اور مولانا کوکب نورانی' کے عنوان سے ایک پراثر معلومات مقالہ قلم بند کیا۔ جس میں کوکب نورانی کے خیالات سے اختلاف کیا۔ اس طرح کے بیسیوں مقالات اور خطوط 'نعت رنگ' میں شائع ہوئے۔ 'نعت رنگ' میں شائع ہونے والے مقالات کا یہی عنصر قارئین کو اس مجلے کی جانب متوجہ کر رہا تھا اور اسے پڑھوانے پر مجبور کر رہا تھا۔

تیسرا سوال کہ کیا 'نعت رنگ' میں شائع ہونے والے خطوط قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر رہے تھے۔ اس کا جواب بھی اثبات میں دیا جاسکتا ہے۔ 'نعت رنگ' میں شائع ہونے والے کچھ خطوط تو محض رسمی، رسیدی، تقریظی یا تعارفی نوعیت کے ہیں لیکن بیشتر خطوط علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں نعت کے موضوعات، اسالیب، محسنات، معائب، عروضی مباحث وغیرہ پر کھل کر اظہار رائے کیا جاتا رہا۔ جس کی وجہ سے ان خطوط میں علم، ادب، تاریخ، تہذیب، مذہب، اخلاقیات، تنقید اور تحقیق کا بے مثال خزانہ تحریر میں آ گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ 'نعت رنگ' کے مباحث کو آگے بڑھانے، نعت کو درست سمت میں لے جانے اور نعت کے حقیقی موضوعات کے تعین میں یہ خطوط بھی بنیادی اہمیت کے حامل رہے ہیں تو کچھ غلط بھی نہ ہوگا۔

چوتھے سوال کا جواب بھی تیسرے سوال کے جواب کی توثیق کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ 'نعت رنگ' کے خطوط میں جو مباحث سامنے آ رہے تھے ان کے پس پشت 'نعت رنگ' کے ادارے بھی کام کر رہے تھے۔ مدیر 'نعت رنگ' اپنے اداروں میں اکثر اوقات نعت سے متعلق ایسے سوالات اٹھاتے رہے ہیں جن کے جواب تلاش کیے جانے ضروری تھے۔ لہذا بیشتر خطوط اور مقالات کا محرک یہی سوالات بھی رہے ہیں اور یہ علمی رد عمل نعت اور تنقید نعت کو قیوں کی جانب لے کر جا رہا تھا۔ مذکورہ بالا بحث سے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں کہ نعت اور 'نعت رنگ' کے فروغ اور مقبولیت میں کوئی ایک عنصر یا محرک کارفرما نہیں رہا۔ کئی محرکات اس کی مقبولیت کے پس منظر میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہے تھے لیکن ان میں سب سے اہم اور غالب عنصر تنقید کا رہا۔ نعت کی تفہیم اور تعبیر میں تنقید کو بنیادی حیثیت حاصل رہی۔ 'نعت رنگ' کے اسی طرز عمل نے اسے اپنے پیشرو اور

معاصر رسائل و جرائد سے منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔

’نعت رنگ‘ کے خطوط کی کئی حیثیتیں اور کئی جہتیں ہیں۔ ان میں سے ایک جہت تدریسی بھی ہے۔ اگرچہ یہ خطوط تدریسی مقاصد کے زیر اثر یا نقطہ نظر سے تحریر نہیں کیے گئے لیکن غیر ارادی طور پر بعض خطوط تدریسی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ قارئین کو معلومات ہی فراہم نہیں کر رہے بلکہ کچھ سکھا بھی رہے ہیں۔ سکھانے کا یہ انداز تدریسی ہے جسے بالواسطہ تحریر کے ذریعے برتا جاتا ہے۔ ’نعت رنگ‘ میں یہ انداز خطوط کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔ بالخصوص نعت کافی مطالعہ کرتے ہوئے قارئین کو بتایا گیا ہے کہ نعت کیا ہوتی ہے؟ نعت کی خصوصیات کیا ہیں؟ کن کن موضوعات کو نعت میں برتا جاسکتا ہے اور کن موضوعات کو نعت میں برتنے سے گریز کرنا چاہیے۔ کون سا شعر نعت سے تعلق رکھتا ہے اور کون سا نعت کی تعریف کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ کون سا لفظ نعت کی روح کی نمائندگی کرتا ہے اور کون سا لفظ نعت کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ غرض یہ کہ ان خطوط میں شعر کی درست قرات، صحیح خواندگی، شعری تفہیم کے طریق کار، شعری مسائل، لفظی نقائص اور عروضی مسائل سے آگاہی دی گئی ہے۔ ذاتی شعری واردات اور تجربات میں قارئین کو شریک کر کے تخلیقی آداب بھی سکھائے گئے ہیں۔ شعری تفہیم کے لیے فکری اور فنی دونوں سطحوں کا مطالعہ کیا گیا اور فکری مغالطوں اور کج رویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ فنی سطح پر شعر کے لسانی اور عروضی نقائص کو سامنے لایا گیا ہے۔ تفہیم شعر کے یہ دونوں طریق، اساتذہ شعر استعمال کیا کرتے رہے ہیں اور یہی طریق شعر کا مقام متعین کرنے میں مددگار بھی ہوتے ہیں۔ یہ طریق مطالعہ، خطوط کو تدریس سے ہم آہنگ کر کے اسے قارئین کے فائدے کی چیز بنا دیتا ہے۔ اگر کوئی نواآموز قاری ذاتی دل چسپی لے کر ان خطوط کا مطالعہ کرے تو اسے شعر کی فکری اور فنی باریکیوں سے آگاہی بھی حاصل ہوگی اور وہ تحقیق و تنقید کی پر خاراہ میں انھیں اپنا رفیق بھی پائے گا اور رہنما بھی۔

مدیر ’نعت رنگ‘ نے اپنے اداروں میں جا بجا نعت کے ادبی، فکری اور فنی پہلوؤں پر غیر متعصبانہ، غیر جانبدارانہ اور با مقصد بحث و مباحث کی ضرورت پر زور دیا اور اس کے لیے ’نعت رنگ‘ کا پلیٹ فارم مہیا کیا جہاں ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والا دانشور اپنے مقالات اور خطوط کے ذریعے نعت کے ادبی، فکری اور فنی پہلوؤں پر سوالات اٹھا سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ صرف سوچتے رہنے اور ایک دوسرے سے کڑھتے رہنے کی بجائے میدانِ عمل میں قدم رکھ کر نعت کی فکری

آبیاری میں اپنا کردار ادا کریں کیونکہ اگر باہمی گفتگو اور اظہار رائے کا یہ سلسلہ چلتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب نعت اپنی پوری صنفی قوت اور تخلیقی توانائی کے ساتھ دنیائے ادب میں اپنا منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی (۴۹) اور اردو کی دیگر مقبول ادبی اصناف کے مقابل فخر کے ساتھ سینہ تان کر کھڑی ہو جائے گی اور یہ وہ وقت ہوگا جب نعت کے ناقدین کو بین الاقوامی ادب کے سامنے نعتیہ ادب کو پیش کرنے میں کسی بھی قسم کا معذرت خواہانہ رویہ اپنانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

دوسری طرف انھوں نے تخلیق کاروں کو بھی مشورہ دیا کہ وہ تنقید نعت کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں کو خلوص دل سے قبول کریں۔ اگرچہ طبیب کا شتر زخم کو کريدتا ہے تو ٹیسیں جنم لیتی ہیں لیکن طبیب کا یہی عمل زخم کو مندل کرنے کا باعث بھی بنتا ہے۔ صدیوں پر محیط عقیدت اور تقدس کے غبار نے نعت کے حقیقی چہرے کو گھنا دیا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ تنقید کے آب سے روئے نعت کو اس طرح دھو دیا جائے کہ روئے نعت ایک مرتبہ پھر نکھر کر سامنے آجائے اور نعت جو صرف مذہب کے خانے میں ہی بند ہو کر رہ گئی تھی مستقبل قریب میں وہ ادب کا حصہ بن کر سامنے آئے۔ مدیر نعت رنگ کا بیان ہے:

”میں اس نازک موڑ پر اپنے عہد کے نعت نگاروں سے مؤدبانہ التماس کروں گا کہ نعت کی ادبی اور فنی شناخت کے لیے کی جانے والی ان کاوشوں کو کھلے ذہنوں اور کشادہ دلی کے ساتھ قبول کریں۔ اگر آج نعت کے ادبی، فکری اور فنی پہلوؤں پر گفتگو کو رواج دینے میں کامیاب ہو گئے تو کل نعت اور نعت نگاروں کو ادب اور تاریخ ادب میں ان کا جائز مقام مل جائے گا۔ اس صورت حال میں فائدہ یقیناً نعت نگاروں ہی کو ہوگا۔ ہمیں تخلیق کاروں (اور بالخصوص نعت نگاروں) کی حساس طبیعت کا علم ہے۔ اپنے فن پر تنقیدی گفتگو یقیناً ان پر گراں گزرتی ہوگی۔ ہم بھی ان آئینوں کی نزاکت سے بے خبر نہیں۔ مگر تنقید کی آنچ وہ آنچ ہے جو شیشے کو توڑتی نہیں بلکہ پختہ تر کرتی ہے۔ وہ شیشہ جو بھٹی کی آگ سے مسکراتا ہوا نکلتا ہے شیشے کی آبرو بن جاتا ہے۔ جہاں تک کسی کی دل آزاری کی بات ہے تو ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ ہمارے ہاں شائع ہونے والے تبصرے کسی ذات پر نہ ہوں بلکہ بات فن تک محدود رہے کہ فن کو

پر کھنے والے تکرمین فن کار کے بھی قائل ہوتے ہیں۔“ (۵۰)

نعت کو عقیدت کی جکڑ بند یوں سے آزاد کرنے میں ایک اہم کردار ان مراسلہ جاتی مباحث کا ہے جو نعت رنگ میں شائع ہوتے رہے۔ ہر خط ایک نئی کیفیت اور نئے انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ تمام خطوط کا مرکزی موضوع تو نعت ہے لیکن ان تمام خطوط میں نعت اور نعت کے متعلقات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور فکری اور فنی دونوں حوالوں سے نعت پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان خطوط میں ارباب علم و عمل اپنے جذبات، خیالات، مشاہدات، واردات، مطالعات اور تحقیقات کے ساتھ شریک گفتگو رہے۔ کسی کا نقطہ نظر انفرادی رہا تو کسی کا اجتماعی، کسی کے ہاں نزہت کی کلی چٹختے ہوئے پھول کی صورت اختیار کر گئی تو کسی کے ہاں نفرت کی چنگاریاں بھڑک کر انگارہ بن گئیں۔ کسی کے ہاں تعصبات کی گرمیاں موجود ہیں تو کسی کے ہاں خلوص کی سردیاں، کوئی غلط فہمیوں کا بوجھ اٹھائے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے تو کوئی علمی فتوحات کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ کسی کے لفظوں میں شعلے بھڑک رہے ہیں تو کسی کی تحریر پھولوں کا گل دستہ بنی نعت رنگ کو مہرکا رہی ہے۔ ان سب کے باوجود نعت رنگ کے شعبہ مراسلات کا مقصد مکالمہ ہی رہا۔ کبھی مکالمے کا یہ انداز مناظرے یا مجادلے کی صورت اختیار کر لیتا تو مکتوبات نگاروں کے خیالات کی حدت اور چنگاریوں کو مدیر نعت رنگ اپنے اداریوں کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کر دیتے مبادا مکالمے کی یہ فضا ہر آلود ہو جائے یا مذاکرات کا یہ در بند ہو کر مدیر نعت رنگ کی ساری کاوشوں پر پانی پھیر کر ہی رکھ دے۔

مکالمہ زندہ معاشروں کی دین ہے اور روشن دماغوں میں جنم لیتا ہے۔ مہذب معاشروں نے ہمیشہ مکالمے کو آگے بڑھایا ہے۔ وہ معاشرے جن کے ذہنی سوتے خشک ہو چکے ہوں وہاں مکالمہ مباحثے کی بجائے مناظرے یا مجادلے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے معاشروں میں اختلافی اذہان کو نوک زبان سے نہیں نوک خنجر یا بندوق کی گولی سے جواب دیا جاتا ہے۔ سوال کو پیدا ہوتے ہی ذہن میں دفن کر دیا جاتا ہے بلکہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ جنم ہی نہ لے تا کہ اظہار خیال کا گلہ گھوٹنے کی نوبت ہی نہ آ سکے۔ ایسی صورت حال میں مکالمہ جنم نہیں لیتا خوف اور دہشت جنم لیتی ہے۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے ہی معاشرے میں جنم لیا لیکن آپ کی آمد سے فیصلے تلوار کی بجائے زبان سے ہونے لگے۔ اختلاف کرنے والے کا گلہ نہیں کاٹا جاتا تھا بلکہ اسے گلے لگایا جاتا تھا۔ امت کا اختلاف زحمت نہیں بلکہ رحمت بن گیا تھا۔

مکالمے کا وہ راستہ جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھولا تھا وقت کی مقتدر قوتوں (سیاسی اور مذہبی) نے اقتدار کے چھن جانے یا افتراق کے جنم لینے کے خوف سے بند کر دیا۔ اس طرح اسلام اور اسلامی روایات طاق میں بھی ہوئی مقدس مورتی کی صورت بن کر رہ گئی تھیں جسے عقیدت کی نظر سے دیکھا تو جاسکتا تھا لیکن بالائے عقیدت سوچا نہیں جاسکتا تھا۔ وقت کا سیل رواں بہتا رہا۔ کبھی کبھار مکالمے یا مباحثے کی لہر سطح آب پر جنم لیتی اور پھر اسے گہرائیوں میں اتار دیا جاتا۔ اختیار اور اختلاف کی آنکھ مچولی چلتی رہی۔ اردو کی ادبی صحافت میں ”تہذیب الاخلاق“ میں اس روایت نے ایک بار پھر آنکھ کھولی اور پھر مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی اب نعت رنگ کا حصہ بن چکی ہے۔ نعت رنگ نے اختلاف رائے کو صرف شائع ہی نہیں کیا بلکہ اسے نمایاں مقام دے کر اس کی اہمیت کا احساس بھی دلایا۔ کیونکہ مدیر کا خیال ہے کہ ”رؤ عمل اور اختلاف رائے کا اظہار ادب میں منفی نہیں، بلکہ مثبت رویہ گردانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے فکر کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور نئے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ (۵۱) ان کے اس عمل کو بعض احباب نے حیرت کی نظر سے دیکھا۔ (۵۲) لیکن مدیر نعت رنگ نے اس کی بالکل پروا نہیں کی۔ ان کا نقطہ نظر تھا کہ اختلاف کو شخصی ہونے کی بجائے فکری اور نظری ہونا چاہیے۔ اور ایسے اختلافات جو فکری یا علمی بنیادوں پر کیے جاتے ہوں وہ صحت مند معاشرے کی علامت ہوتے ہیں اور علوم و فنون کی ترویج و اشاعت میں بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مدیر نعت رنگ کا موقف ملاحظہ فرمائیے:

”یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری محسوس ہو رہا ہے۔ کوئی لکھنے والا ہو یا پڑھنے والا، ہر شخص کا ہر دوسرے شخص سے مکمل اتفاق ضروری نہیں ہے۔ مکمل یا جزوی اختلاف کسی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اختلاف کوئی بری چیز بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے، ادب فکر اور تنقید کے لیے تو یہ بڑی بابرکت شے ہے۔ اس لیے کہ اس سے خیال کے نئے درواہ ہوتے اور فکر و نظر کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ تاہم یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اختلاف کو فکری و نظری سطح پر رہنا چاہیے۔ اسے ذاتی یا شخصی ہرگز نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی اسے مخالفت کی سطح پر آنا چاہیے۔ نیا ہو یا پرانا، چھوٹا ہو یا بڑا، ہر لکھنے والے کی اپنی ایک حیثیت اور اہمیت ہے۔ البتہ پرانے اور بڑے لکھنے والوں کے لیے ہمارے رویے میں زیادہ سنجیدگی، متانت اور لحاظ نظر آنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم اپنے بڑوں کی عزت و

وقار کا خیال رکھتے ہوئے نظر آئیں گے تو یہ دراصل بعد والوں کی تربیت کا ذریعہ بھی ہوگا۔ 'نعت رنگ' نے اختلافات کو ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے۔ اس شمارے میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ تاہم آئندہ بے احتیاطی یا بے ادبی کو محسوس کرتے ہوئے ادارہ کسی بھی مضمون کی اشاعت سے انکار کا حق محفوظ رکھتا ہے۔“ (۵۳)

زندہ اور صحت مند معاشرہ ذہنی انجما د کی بجائے ذہنی کشادگی کو جنم دیتا ہے اور ایسے ہی معاشرے میں مکالمہ جنم لیتا ہے۔ آزاد فکر و خیال کی مکالماتی فضا زندہ معاشرے کا صحت مند حصہ بھی ہوا کرتی ہے اور زندہ اور فکر انگیز ادب کی نشانی بھی۔ زندہ معاشرے اور ادب کی یہی ترجمانی 'نعت رنگ' کے حصے میں آئی ہے۔ مکالماتی فضا کو تشکیل دینے اور سازگار ماحول کی تخلیق میں 'نعت رنگ' کو دودھائیوں سے زیادہ کی طویل مسافت طے کرنا پڑی اور سخت مجاہدہ کرنا پڑا تب جا کر ایسا سازگار ماحول تشکیل پایا جس میں اختلاف رائے کی گرما گرم محفلیں منعقد ہو سکیں۔ یہ کوئی برا شگون نہیں۔ اختلاف زحمت نہیں ہوا کرتا ہے۔ یہ معاشرے کے لیے بھی اور ادب کے لیے بھی نیک شگون ہے۔ مدیر نعت رنگ کا بیان ہے:

”زندہ اور فکر انگیز ادب ہمیشہ مکالماتی فضا کو قائم رکھتا ہے۔ 'نعت رنگ' ادب کی اس کشادگی کا قائل ہے اور اس پر کاربند بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے صفحات پر ابتداء ہی سے اختلاف رائے کی گرما گرم محفلیں آراستہ ہوئیں۔ ہم اب بھی ادب و فکر کے مکالماتی بیانیے کو نیک شگون سمجھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اس طرح کے مکالمے ادب و فن کی راہوں پر نئے چراغ روشن کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لیے اگر کچھ لوگ 'نعت رنگ' میں شائع ہونے والی کسی بھی تحریر کے بارے میں اپنی رائے یا اختلاف کا اظہار کرنا چاہیں تو ہم ان کو خوش آمدید کہیں گے۔ شرط صرف یہ ہے کہ بحث علمی و فکری اور ادبی نوعیت کی ہو اور اس کا لب و لہجہ بھی ادبی ہو۔“ (۵۴)

'نعت رنگ' کے اولین شماروں میں مکالمے کی نوعیت اور سطح دونوں، ابتدائی نظر آتی ہیں۔ زیادہ تر مکالمے عقائد کے اختلافات اور ذاتی نوعیت کے معلوم ہوتے ہیں۔ (۵۵) وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مکالموں کی فضا اور سطح دونوں بلند ہونے لگیں۔ اب نعت کے فکری

پہلوؤں پر بھی کھل کر بحث ہو رہی ہے اور لسانی اور فنی حوالے سے بھی۔ آغاز آغاز میں تنقید نعت میں حد سے بڑھا ہوا محتاط رویہ اور رائے کی قطعیت کا فقدان نظر آتا تھا لیکن جیسے جیسے مکالمے کی فضا روشن ہوتی گئی اور عقیدتوں اور تقدس کا غبار چھٹتا گیا ویسے ویسے ناقدین نعت کے اظہار میں اعتماد آتا گیا۔ اب نعت کو ایک ادبی صنف کے طور پر بھی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے اور نعت کے فروغ میں تنقید کی اہمیت کو بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ صبیح رحمانی نے درست لکھا ہے:

”اس تناظر میں یقیناً یہ بات خوش آئند ہے کہ حالیہ عرصے میں تنقید نعت کی طرف ادب کے کچھ معتبر، سنجیدہ اور اہم ناقدین متوجہ ہوئے ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نیا ابھرتا ہوا یہ طرز عمل دراصل ہمارے ہاں تہذیبی، فکری، ثقافتی، سماجی اور ادبی سطح پر ایک بڑی انقلابی تبدیلی کا پلغ اور خوش کن اشارہ ہے۔ وقت کا تغیر اسی طرح قوموں کی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تبدیلی جلد ہی اپنے وجود کا اثبات ہمارے تہذیبی اور ملی وجود کو نئی معنویت سے ہم کنار کرے گی۔ ہمارے گم گشتہ وقار کی بحالی کا ذریعہ ہوگی اور ہماری آئندہ نسلوں کو اپنے فکری مبدا اور روحانی ورثے سے وابستہ و پیوستہ کر کے اس کو جینے کے اصل معنی سے سرشار کرے گی۔“ (۵۶)

اردو کی ادبی روایت پر ایک جائزہ نظر ڈالتے ہی جو پہلو سب سے دلچسپ نظر آتا ہے وہ شعر ادا دہا کی باہمی چشمکیں ہیں۔ یہ چشمکیں ایک طرف شعرا کے باہمی تعلقات اور اختلافات کی عکاس ہیں تو دوسری طرف اس عہد کی ادبی صورت حال کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ شعرا کی چشمکوں کے ابتدائی نقوش شعرائے اردو کے تذکروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ سعادت خان ناصر کا تذکرہ خوش معرکہ زبیا، تو شعرا کے ادبی معرکوں سے بھرا پڑا ہے۔ (۵۷) شعرا کی معرکہ آرائیوں کو سازگار ماحول اس عہد کے مشاعروں نے فراہم کیا۔ جہاں شاعر کا ہی نہیں اس کی شاعری کا بھی کڑا محاسبہ کیا جاتا تھا۔ محمد حسین آزاد نے انیسویں صدی میں شمالی ہند کے مشاعروں کے متعلق لکھا ہے کہ اس عہد میں استاد شعرا تیغ و تنگ سے لیس ہو کر اپنے شاگردوں کے لاؤ لشکر کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلوں پر اعتراضوں کے سبب بعض اوقات تو مشاعرہ میدان جنگ کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک معرکہ کے متعلق محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

”یہ مشاعرہ ایک خطرناک معرکہ تھا۔ حریفوں نے تیغ و تفتک اور اسلحہ جنگ سنبھالے تھے۔ بھائی بند اور دوستوں کو ساتھ لیا۔ بعض کو ادھر ادھر لگا رکھا تھا اور بزرگان دین کی نیازیں مان مان کر مشاعرہ میں گئے تھے۔“ (۵۸)

یہ مشاعرے شاعر ہی نہیں شاعری کا میزان بھی تھے۔ بڑے بڑے اور مشاق شعرا مشاعروں میں جانے سے پہلے اپنی تخلیقات کو خوب جانچ پرکھ کر دیکھ لیا کرتے تھے اور احتیاطاً مشاق شعرا کو دکھا بھی لیا کرتے تھے۔ ذرا سی بے احتیاطی ہوئی اور مخالفین نے شاعر کو اعتراض کے نیزے پر اٹھا لیا۔ محمد حسین آزاد نے ایسی ہی ایک خفیف غلطی کے حوالے سے مرزا عظیم بیگ عظیم کا ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

”۔۔۔ ان میں مرزا عظیم بیگ تھے کہ سودا کے دعویٰ شاگردی اور پرانی مشق کے گھمنڈ نے ان کا دماغ بہت بلند کر دیا تھا۔ وہ فقط شد بود کا علم رکھتے تھے مگر اپنے تئیں ہندوستان کا صائب کہتے تھے اور خصوصاً ان معرکوں میں سب سے بڑھ کر قدم مارتے تھے چنانچہ وہ ایک دن میر ماسا اللہ خاں کے پاس آئے اور غزل سنائی کہ بحر جز میں تھی مگر ناواقفیت سے کچھ شعر رمل میں جا پڑے تھے۔ سید انشا بھی موجود تھے۔ تاڑ گئے۔ حد سے زیادہ تعریف کی اور اصرار سے کہا میرزا صاحب اسے آپ مشاعرہ میں ضرور پڑھیں۔ مدعی کمال کہ مغر خن سے بے خبر تھا، اس نے مشاعرہ عام میں غزل پڑھ دی۔ سید انشا نے وہیں تقطیع کی فرمایش کی۔ اس وقت اس غریب پر جو کچھ گزری سو گزری مگر سید انشا نے اس کے ساتھ سب کو لے ڈالا اور کوئی دم نہ مار سکا۔“ (۵۹)

بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ہندوستانی معاشرہ بھر پور کروٹ لے چکا تھا۔ سیاسی مرکز کے تبدیل ہوتے ہی ادبی صورت حال بھی نئے دور اور نئے تقاضوں سے آشنا ہونا شروع ہوئی۔ تذکرہ نگاری نے تاریخ نگاری کی طرف قدم بڑھایا۔ نئے نئے ادبی رسائل و جرائد نے ادب کی ترویج و اشاعت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ مشاعروں کی وہ محفلیں، جو انیسویں صدی میں نظر آتی تھیں، اب زوال کا شکار ہو گئیں۔ شعرا و ادبا کی باہمی چپقلشوں اور معاصرانہ چشمکوں نے انظہار کے لیے ان رسائل و جرائد کا رخ کرنا شروع کیا۔ غالباً بیسویں صدی کا پہلا بڑا معرکہ پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی ’گلزار نسیم‘ کے حوالے سے سامنے آیا۔ اس معرکے میں کثیر تعداد میں شعرا اور ادبا

نے حصہ لیا۔ اس معرکے کے بعد شعرا، ادبا، علما اور صوفیا کے درمیان کثیر تعداد میں معرکے سامنے آئے۔ اخبارات اور رسائل کی زینت بننے والے معرکوں کی داستان خاصی دلچسپ ہے۔ جن کی تفصیلات ادبی معرکوں سے متعلق کتابوں اور اردو کی ادبی تاریخوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ (۶۰)

ادبی مباحث یا معرکہ آرائی کی ایک داستان ’نعت رنگ‘ کے شماروں میں بھی بکھری پڑی ہے۔ یہ داستان اپنی ذات میں دلچسپ بھی ہے اور پڑھنے کے لائق بھی۔ ’نعت رنگ‘ میں کوئی مقالہ شائع ہوتا تو اس کا جواب اگلے شمارے میں مضمون کی صورت میں سامنے آتا اور کبھی خط کی صورت میں۔ کبھی کسی خط میں کوئی نقطہ نظر پیش ہوتا تو اگلے ہی شمارے میں اس کا جواب سامنے آتا۔ اس طرح جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو کبھی کبھی کئی کئی شماروں تک پھیل جاتا۔ بظاہر یہ مباحث وقت کا ضیاع محسوس ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر اثر کر دیکھا جائے تو حیرت انگشت بدندان نظر آتی ہے۔ سودا اور میر ضاحک، مصحفی اور انشا کے معرکوں کی طرح نہیں جن کے متعلق محمد حسین آزاد کو لکھنا پڑا:

”طرفین سے بجویں ہو کروہ خا کا (کذا) اڑا کہ شائستگی نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں۔“ (۶۱)

بلکہ یہاں دلائل و براہین کو باہم دست و گریباں دیکھ کر جہالت کی آنکھیں بند اور حیرت کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ’نعت رنگ‘ کے مباحث کی اہمیت اور افادیت سے کسی طور بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شمارے میں ایسے مضامین اور خطوط موجود ہیں جن میں کسی موقف کو پیش کیا گیا ہے اور اگلے ہی شمارے میں علما، شعرا اور ناقدین کی طرف سے اس کی تصحیح، تردید یا تائید پیش کی گئی ہے۔ خیالات کی تردید، تائید یا اصلاح کا یہ سلسلہ ’نعت رنگ‘ کے ہر شمارے میں نظر آتا ہے۔ اس طرح جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور فریقین دو گروہوں میں منقسم ہو جاتے۔ ایک موافقت میں دلائل دیتا تو دوسرا مخالفت میں۔ اس طرح بحث کا سلسلہ آگے بڑھتا۔ ان مباحث کے سلسلے میں ایسے ایسے گورنایاب سامنے آئے جو تنقید نعت کے حوالے سے ضخیم مقالات میں بھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ یہ خطوط طویل بھی ہیں (۶۲) اور علم و دانش سے معمور بھی۔ جن کا دامن علم و دانش کے خزانے سے معمور ہے۔ ان خطوط کے خالق علما و ادبا نے اپنے خیالات، افکار، تحقیق اور تنقید کے ذریعے تحقیق نعت اور تنقید نعت کی ایسی شمع روشن کی جس کے باعث نعت کی راہ گزر روشن بھی ہو گئی اور زر نگار بھی۔

ان مباحث میں حصہ لینے والوں میں مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی، عبدالحکیم شرف قادری، پروفیسر طلحہ برق، شہزاد مجددی، حافظ عبدالغفار، ریاض حسین چودھری، احمد صغیر صدیقی، شمیم احمد گوہر، ڈاکٹر شعیب نگرانی، راجا رشید محمود، ریاض حسین زیدی، ڈاکٹر اشفاق انجم وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے 'نعت رنگ' کے شعبہء مراسلات کو اپنے علمی اور فکری مباحث سے زرنگار بنا دیا ہے۔ ان مباحث یا معرکوں میں مکتوب نگاروں یا مقالہ نگاروں کی گرمیاں، سردیاں، طُز و تعریض، جواب الجواب، جارحانہ، مدافعانہ، محققانہ اور ناقدانہ رویے سامنے آئے ہیں۔ یہ معرکے ذاتی رنجشوں کو بڑھانے یا مسلکی مناقشوں کو جنم دینے کا باعث نہیں بنے بلکہ ان مباحث کے نتیجے میں تنقید نعت اور فروغ نعت کا وہ عہد سامنے آیا جسے نعت کا سنہری دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

'نعت رنگ' میں جس شخصیت نے علمی و ادبی اختلاف کو مباحث یا معرکہ آرائی میں منقلب کر دیا وہ کوکب نورانی اوکاڑوی کی ہے۔ انہوں نے 'نعت رنگ' میں چھپنے والے بیشتر مضامین پر اختلافی نوٹ رقم کیے۔ ان کے طریق کار سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے دلائل کو آسانی سے رد نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اکثر اوقات ان کے موقف کو علمی مآخذ تقویت پہنچاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'نعت رنگ' کے صفحات پر مولانا کوکب نورانی کی جن اہل قلم دانشوروں سے معرکہ آرائی ہوئی ان میں جمال پانی پتی، ابوالخیر کشفی، رشید وارثی، احمد صغیر صدیقی، ریاض حسین زیدی، ڈاکٹر یحییٰ شیط، ابوسلمان شاہجہاں پوری، اقبال جاوید، اکرم رضا، اور ریاض حسین کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

ان میں سب سے اہم معرکہ جمال پانی پتی اور مولانا کے درمیان رونما ہوا۔ جمال پانی پتی کا ایک مقالہ 'نعت رنگ' شمارہ ۶ میں 'نعت گوئی کا تصور انسان' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون کا موضوع تو 'تصور انسان' تھا لیکن ان کی تمام تر بحث اس نکتہ کے گرد گھومتی رہی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محض اعلیٰ قدروں کے حامل انسان تھے یا ماوراء انسان بھی کچھ تھے۔ یہ سوال حسن عسکری کے اس مضمون سے پیدا ہوا جو انہوں نے محسن کا کوروی کی نعت گوئی پر تحریر کیا تھا۔ حسن عسکری کے نزدیک حالی اور محسن دونوں ہی کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک جہت سے سروکار رہا۔ حالی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشری یا انسانی جہت کو لے لیا۔ ماورائی یا نوری کو چھوڑ دیا۔ محسن نے ماورائی یا نوری جہت کو لے لیا، بشری یا انسانی جہت کو چھوڑ دیا۔ جمال پانی پتی نے حسن عسکری کی حمایت میں حالی کی مسدس پر اعتراض کیے کہ "حالی جیسا آدمی رسول کریم کو عام

انسانوں کی سطح پر لا کر خود آپ کی زبان مبارک سے اپنی بندگی کا اعتراف کروایا ہے۔ اور حاصل کلام کے طور پر لکھا:

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم آپ جیسے بشر نہیں افضل البشر ہیں۔ عام انسانوں جیسے انسان نہیں، انسان کامل ہیں۔ اس موضوع پر لکھتے ہوئے انہوں نے رشید وارثی کے ایک مضمون سے بھی استفادہ کیا جس میں رشید وارثی نے حضرت باقی باللہ کے ایک قول کی تشریح میں حضرت مجدد الف ثانی کی عبارت نقل کی ہے کہ ”اگرچہ تنزلات ستہ یا مرتب موجود کے اعتبار سے احمد بلائیم کا کنا یہ درست ہے لیکن یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ذات محمدی ۷ اور حقیقت محمدی ۷ دو مختلف حقائق ہیں۔ ان دو حقائق کو ایک قرار دینا ممکن کو واجب اور واجب کو ممکن قرار دینے کے مترادف ہے۔ اگرچہ مضمون نگار رشید وارثی کے اس خیال سے متفق نہیں لیکن مولانا کوکب نورانی نے لکھا کہ اگر مذکورہ قول حضرت باقی باللہ سے ثابت بھی ہو جائے تب بھی اس کی تاویل اگر کی جائے گی تو لفظ 'احد' کی بنیاد پر ہوگی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخلوق ہیں اور مخلوق میں احد ہیں۔ یعنی بے مثل، بے مثال، یکتا اور یگانہ۔ انہوں نے اس کی مثال میں دلیل دی کہ چائے، پانی اور پتی سے مل کر بنتی ہے۔ پانی کی مقدار زیادہ اور پتی کی مقدار کم ہوتی ہے مگر پانی میں تھوڑی سی پتی ملا دیں تو سب سے پہلے نام بدل جاتا ہے پھر رنگ، ذائقہ، مہک اثر اور حیثیت وغیرہ۔ جس بشر میں اللہ تعالیٰ نے نبوت رکھی اسے اب بشر نہیں رسول اللہ کہیں گے۔“

کوکب نورانی کے اس موقف پر جمال پانی پتی نے ایک اور مضمون "نعت گوئی کا تصور انسان اور کوکب نورانی" تحریر کیا جو 'نعت رنگ' شمارہ نمبر ۹ میں شائع ہوا۔ اس میں مضمون نگار نے کوکب نورانی کے متذکرہ استدلال سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا ان کا بیان تھا:

”مولانا نے ذات محمدی ۷ اور حقیقت محمدی ۷ کے حوالہ سے چائے کی جو مثال دی ہے اس سے تو ان کے خلاف نتیجہ نکلتا ہے۔ ان کی اس مثال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے مثال بشریت تو درکنار خود بشریت ہی کی نفی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ پانی میں تھوڑی سی پتی ملانے سے جو چیز

ہنتی ہے اسے بے مثال پانی نہیں، چائے کہتے ہیں۔ اسی طرح لفظ ’احد‘ کے حوالے سے جمال پانی پتی نے مولانا کے بیان کردہ متذکرہ معانی کی بجائے اسے ذات خداوندی کی طرف اشارہ قرار دیا ہے۔“ (۶۳)

مولانا کا دوسرا معرکہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب سے ہوا۔ مولانا کے خطوط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کشفی صاحب کے مقالے کا بغور مطالعہ کرتے تھے اور قابل اعتراض مقامات پر کھل کر اختلاف کیا کرتے تھے۔ ’نعت رنگ‘ شمارہ نمبر ۴ میں کشفی صاحب کا فکر انگیز مقالہ ’نعت اور گنجینہ معنی کا طلسم‘ شائع ہوا۔ (۶۴) اس مقالے میں کشفی صاحب نے بہت سے فکر افروز نکات پیش کیے ہیں۔ ضمناً انھوں نے نعت پر پڑنے والے غزل کے اثرات کا جائزہ بھی لیا اور لکھا:

”اس روایتی غزل کا سایہ ہماری نعت گوئی پر پڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہجر اور وصل کو تو چھوڑیے شب اسرا کا دولہا، بھی نعت میں ملے گا اور وہ رب محمد بھی غم ہجر میں تڑپ رہا ہے۔ معاذ اللہ۔“ (۶۵)

کشفی صاحب کے اس بیان کے حوالے سے کوکب نورانی کا بیان تھا:

”جناب ابوالخیر کشفی کی تحریر میں ”شب اسرا کے دولہا“ کے الفاظ ص ۴۶ پر ہیں جو انھوں نے شاید (نعت میں) معترضہ بتائے ہیں، کیا میں ایسا سمجھا ہوں یا کشفی صاحب نے واقعی معترضہ بتائے ہیں؟ اگر ان کے نزدیک معترضہ ہیں تو کیوں ہیں؟ جاننا چاہوں گا۔“ (۶۶)

اسی کے ساتھ کوکب نورانی نے دوسرا اعتراض کشفی صاحب کی اس عبارت پر کیا ”اس لیے بہت سے صاحبان ’اللہ‘ کے لفظ پر اصرار کرتے ہیں اور خدا کے لفظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا کی جمع خداؤں استعمال ہوتی ہے۔“ کوکب نورانی کا موقف تھا کہ اگر لفظ خدا، اللہ تعالیٰ کا اصل نام نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص خدا حافظ کہے تو یہ غلط بھی نہیں مگر لفظ اللہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جو شخص اللہ کا استعمال کرتا ہے تو اسے ثواب بھی ملتا ہے۔ (۶۷) دراصل یہ اعتراض تو نہیں موافقت ہے لیکن درج اعتراض کے انداز میں ہوا ہے۔ ان کا تیسرا اعتراض اعلیٰ حضرت احمد رضا خان صاحب کے دواشعار پر کشفی کے درج ذیل بیان سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

کعبہ دلہن ہے تربتِ اطہر نئی دلہن
یہ رشک آفتاب وہ غیرتِ قمر کی ہے

دونوں بنیں سبیلی انیلی بنی مگر

جو پی کے پاس ہے وہ سہاگن کنور کی ہے

ان اشعار پر کشفی صاحب نے لکھا ”یہ شاعری ایک طرف تو غزل کی روایتی انداز کی عکاس ہے تو دوسری طرف بھگتی شاعری اور ہندی عناصر بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آدمی اپنے دفاع میں بڑی حد تک آگے جاسکتا ہے۔ وہ وصل کے سلسلہ میں نعت اور تصوف دونوں کا سہارا لے کر اسے جائز قرار دے گا۔ یہ ہمیں بھی معلوم ہے کہ وصل اور وصال تعین کے اٹھنے اور اپنی خودی کے وہم سے بے گانہ ہو جانے کو کہتے ہیں بلکہ ارباب تصوف تو یہاں تک کہہ اٹھتے ہیں کہ ”واصل حق مخلوق نہیں رہتا اور مخلوق کے اثرات اس پر سے زائل ہو جاتے ہیں۔“ لیکن جسمانی یک جائی کو شب اسری سے ملانے کو کیا کہا جائے گا اور اگر معاملہ صرف خواہش وصل کا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب ان سے حیات طیبہ کے کس لمحہ میں دور ہا۔ کاش ہمارے شاعر کو معراج کے معانی اور امکانات کا علم ہوتا۔ (۶۸)

کشفی صاحب کے اس بیان پر مولانا کا اعتراض تھا کہ:

”ص ۴۸ پر کشفی صاحب نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ کے دواشعار لکھے ہیں، ان کے بارے میں بھی نہیں سمجھ سکا کہ کشفی صاحب کا اعتراض کیا ہے؟ علاوہ ازیں جسمانی یک جائی اور شب اسرا کے حوالے سے کس نے کہا ہے؟ راجا رشید محمود کا جو شعر ہے اس میں بھی غالباً یہ بات نہیں ہے۔ (۶۹)

کشفی صاحب کا دوسرا مضمون جس پر مولانا نے اعتراضات کے پے در پے وار کیے ”نعت کے موضوعات“ ہے۔ یہ مضمون ’نعت رنگ‘ شمارہ نمبر ۶ میں شائع ہوا۔ غالباً کشفی صاحب نے یہ مقالہ غلط میں تحریر کیا تھا کیونکہ وہ ان دنوں حجاز مقدس جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس لیے اس میں کچھ مقامات ایسے رہ گئے ہیں جنہیں وہ اپنی استادانہ مہارت سے ناقابل اعتراض نہ بنا سکے۔ کشفی صاحب کے خیال میں اردو نعت کی روایت میں مدینہ کا تقابل جنت سے کرنے کا شعری رجحان عام ہے۔ وہ اس کے اسباب، اسلامی تعلیمات سے دوری، قرآن ناشناسی، سستی جذباتیہ اور جنت کے استخفاف میں تلاش کرتے ہیں اور اس رجحان کے معاملے میں احتیاط کی ضرورت پر زور

دیتے ہیں۔ ان کے اس موقف پر مولانا سخت گرفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کشفی صاحب نے ”سستی جذباتیت“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو پھبتی لگے ہیں انھیں عاشقان رسول کی مدینے سے محبت کو ایسے الفاظ سے مخاطب کرنے کی بجائے مناسب الفاظ سے مخاطب کرنا چاہیے تھا۔

کشفی صاحب نے دوسرا قابل اعتراض لفظ ”کملی“ کے حوالے سے کیا تھا۔ ان کا بیان ہے:-
”یہ مدثر اور مزمل کے مرتبہ عالی کی ہندی شکل ہے۔ وہ چادر جو وحی کے بار گراں کو پہل بنانے کے لیے تھی اس کو ٹھگتی کارنگ دے کر یہ عاشقانہ روپ دے دیا گیا ہے۔۔۔ معاذ اللہ یہ چادر رسالت ۷ کو صوفی کی گلیم یا سادھو کی کملی سمجھتے ہیں۔“

کشفی صاحب کے ان الفاظ کو مولانا نے سخت ناپسند کیا۔ ان کا اعتراض تھا:
”کشفی صاحب کو ایسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے جانے کیوں خیال نہیں آیا کہ صوفی اور سادھو میں مناسبت بیان کرنا اور سرکارِ دو عالم کی مبارک کملی کا بیان اس تناظر میں یوں کرنا بھی تو ادب و تعظیم کے منافی ہے۔ انھیں دوسروں کو ادب سکھاتے ہوئے خود بھی ادب ملحوظ رکھنا چاہیے۔“ (۷۰)

کشفی صاحب کا تیسرا قابل اعتراض نکتہ گنبد خضرا سے متعلق تھا۔ ان کا خیال تھا کہ گنبد خضرا کا ذکر شعرِ اہتِ سطحی انداز میں کرتے ہیں۔ اس میں نہ استوانوں کا تذکرہ، نہ صفہ کی علم آفرینی پر نظر، نہ مولا کی کیفیات کا ذکر۔۔۔ وہ مولا جہاں گردن جھکا کر حاضری کا تصور ہی جیسے ہمارے وجود کو بدل دیتا ہے۔ مولانا نورانی کو ان جملوں میں بھی لہجہ کا درشت ہونا ناگوار گزار انھوں نے لکھا:

”وہ اپنے اس درشت لہجے میں گنبد خضرا کا ذکر بھی کر گئے ہیں۔ کشفی صاحب وہی معنی و مفہیم ہی کیوں معتبر جانتے ہیں جو ان کے علم و مطالعے میں ہیں؟“ (اکرام مانسب بہ) کے تحت انھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت رکھنے والی ہر شے کے بیان میں احتیاط کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

کشفی صاحب کا چوتھا قابل اعتراض بیان مذکورہ ذیل شعر میں ’مالک‘ کے لفظ پر اعتراض تھا۔

روز جزا کے مالک و آقا تمھی تو ہو
میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب

کشفی صاحب کے اعتراض کو مولانا کو کب نورانی نے خطوط میں رد کر دیا۔ (۷۱)
ان کا تیسرا معرکہ ڈاکٹر سید تنکی نشیط سے ہوا۔ یہی نشیط ’نعت رنگ‘ کے مستقل قارئین اور مصنفین میں سے ہیں۔ ان کی علمی وسعت اور مطالعے کی گہرائی اور گیرائی سے انکار ممکن نہیں لیکن ایک خاص نقطہ نظر کے حامل ہونے کے باوصف ان کی تحریروں میں ایسے بیانات در آئے ہیں جن پر مولانا کو گرفت کرنا پڑی۔ کشفی صاحب اور مولانا کی معرکہ آرائی کا آغاز کشفی صاحب کے مضمون ”اردو نعت کے موضوعات“، مشمولہ ’نعت رنگ‘ شمارہ نمبر ۵ کے جواب میں شروع ہوئی جو اعتراض در اعتراض اور جواب الجواب کی صورت میں ’نعت رنگ‘ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مولانا نے تقریباً ہر مضمون کے جواب میں مولانا کا اعتراض موجود ہے۔ اس کے نقوش ’نعت رنگ‘ شمارہ نمبر ۱۶ تک دیکھے جاسکتے ہیں۔ (۷۲) ان کے علاوہ مولانا نے رشید وارثی، ابوسلمان شاہجہاں پوری، اکرم رضا، ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری، ڈاکٹر محمد حسن، عزیز احسن، پروفیسر اقبال جاوید، ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی، ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی کے مضامین پر بھی اعتراضات کیے ہیں۔ احمد صغیر صدیقی اور مولانا کی نوک جھونک کے نقوش ’نعت رنگ‘ کے کئی شماروں میں بکھرے پڑے ہیں۔

ان کے علاوہ آزاد فتح پوری اور ڈاکٹر تنکی نشیط، ریاض حسین چودھری اور ڈاکٹر اشفاق انجم، احمد صغیر صدیقی اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، رشید وارثی اور افضال احمد انور، ڈاکٹر محمد حسن اور صابر سنبھلی، ابوالخیر کشفی اور عبدالنعیم عزیزی، جیلانی کامران اور مبین مرزا ڈاکٹر رؤف پارکھ کے اختلافات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ اختلافات کہیں مباحث اور کہیں معرکوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ’نعت رنگ‘ کے مباحث اور معرکوں کا موضوع ایک دلچسپ موضوع ہے جو تفصیل سے دیکھے جانے کا متقاضی ہے۔

’نعت رنگ‘ کے خطوط میں جو ادبی مباحث سامنے آئے ہیں وہ مکتوب نگاروں کے ذاتی نہیں بلکہ وہ فکری مغالطوں، تحقیقی لغزشوں یا لسانی خامیوں کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں۔ ان مباحث میں لہجوں کی یکسانیت کی تلاش یا کسی ایسی ہی خواہش کی تمنا بھی بے سود ہے۔ مزید برآں یہ کہ اگر مباحث کا لہجہ یکساں رہتا تو بحث آگے نہ بڑھ پاتی اور نہ خطوط میں رنگارنگی ہی پیدا ہو پائی۔ ان مباحث کی رنگارنگی ہی دراصل خطوط کی دلچسپی اور خوبصورتی کا باعث ہے۔ ان مباحث میں کبھی لہجے کی رو بلند آہنگ ہو کر کثافت کی صورت اختیار کر گئی ہے تو کبھی دھیمی ہو کر لطافت کا احساس دلا گئی ہے، انھیں دونوں رنگوں کے تال میل سے مباحث کے تانے بانے تشکیل پا کر

نعت رنگ کی خوبصورتی کا باعث بنے ہیں۔ یہ خطوط ارباب دانش و فکر کے ان افکار و خیالات کا رد عمل ہیں جو تحریری صورت میں 'نعت رنگ' کے صفحات پر جلوہ گر ہوئے۔ یہ مباحث ہر دو صورت میں نعت کے فکری اور تخلیقی مزاج کو سنوارنے اور نکھارنے کا باعث بنے ہیں۔ ان مباحث کی وجہ سے تخلیق نعت اور تنقید نعت اس نئے عہد سے روشناس ہوئی جو 'نعت رنگ' کی دین ہے۔ تخلیق، تحقیق یا تنقید سے کسی بھی طور استفادہ معیوب نہیں ہوتا لیکن جب کسی کا خیال، نقطہ نظر، نظریہ، فکر، تحقیق یا تجربہ اپنی جھولی میں ڈال کر اپنا بنا لیا جائے تو اسے ادبی خیانت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاعری میں یہ اثرات بہت زیادہ دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان نقوش و اثرات کا سراغ صرف اردو شاعری میں ہی لگایا جائے تو تصانیف کی کئی جلدیں مرتب کی جاسکتی ہیں۔ مصنفوں یا تخلیق کاروں کی تحریروں میں خیال کا اشتراک دو طرح سے سامنے آتا ہے۔ ایک تو اردو کی صورت میں اور دوسرا سرقہ کی صورت میں۔ اول الذکر مستحسن اور ثانی الذکر غیر مستحسن شمار کیا جاتا ہے۔ ثانی الذکر کے حوالے سے تحقیق و تفتیش کی بساط بچھائی جائے تو کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی سطح پر ہر فرد اس کا شکار نظر آتا ہے۔ غالب جیسا جینس بھی جب پکڑا جاتا ہے تو یہ کہہ کر کہ متقدم شعرا نے اس کا خیال چرا لیا تھا، عذر رنگ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ (۷۳)

یہ تو صرف شاعری کا معاملہ ہوا۔ تحقیق و تنقید میں بھی سرقے کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ اس حوالے سے شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کراچی نے 'چہ دلاور است' کے نام سے 'جریدہ' کا شمار مرتب کیا ہے جس میں مشرق و مغرب کی سرقہ بازی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ سرقہ تو ایک طرف رہا۔ ادبی ڈاکہ زنی کی بھی ایک دلچسپ اور حیرت انگیز تاریخ موجود ہے۔ سینکڑوں سالوں سے غیروں کا مال ہتھیا کر اپنا بنایا جاتا رہا ہے۔ کبھی حیلے بہانوں سے، کبھی دھونس دھاندلی سے، کبھی جاہ و ثروت کا لالچ دے کر اور کبھی مشترکہ کاوش کا چکمہ دے کر۔ قدیم زمانے میں جب پرنٹنگ پریس ایجاد نہیں ہوا تھا یا اس تک دسترس آسان نہ تھی اور کتاب کی اشاعت خاصا دشوار معاملہ ہوا کرتا تھا، ایسے موسموں میں کتابوں کی چوری اور ڈاکہ زنی معمول بن چکی تھی۔ اہل علم کی تصانیف کو ہتھیا کر اپنے نام سے مشہور یا شائع کروادینا عام بات بن گئی تھی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب 'ید بیضا' میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے کئی سالوں کی محنت کے بعد متقدمین شعرا کے حالات پر مشتمل ایک تذکرہ ترتیب دیا اور اس کی کئی نقول احباب میں تقسیم کیں۔ اسی دوران انھیں حرمین شریفین کا سفر

درپیش ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ جب واپس آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ بنارس کے ایک شخص نے میدان خالی پا کر ان کے تذکرے کو اپنے نام سے موسوم کر لیا ہے اور اس کی کئی نقلیں کروا کر مختلف شہروں میں بھیج دی ہیں۔ (۷۴)

ایسے ہی کئی واقعات ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی تصنیف 'مثنیٰ تنقید' میں پیش کیے ہیں۔ شیخ علی ججویری معروف بہ داتا گنج بخش سے یہ واقعہ منسوب ہے کہ ان کے دیوان کی صرف ایک ہی نقل موجود تھی۔ کسی شخص نے مطالعے کے لیے یہ دیوان مستعار مانگا اور کچھ دن بعد تخلص بدل کر اس دیوان کو اپنے نام سے مشہور کر دیا۔ اسی طرح منہاج الدین نامی ایک شخص نے بھی ان پر ایسا ہی ستم کیا تھا۔ تصوف سے متعلق ان کی ایک تالیف اپنے نام سے منسوب کر لی تھی۔ (۷۵)

ڈاکہ زنی کی یہ روایت قدیم ادوار ہی کا حصہ نہیں رہی۔ موجود دور میں بھی یہ روایت اپنی پوری آب و تاب سے روشن ہے۔ موجودہ دور میں جس طرح بہت سے معائب نے محاسن کا روپ دھار لیا ہے بالکل اسی طرح متذکرہ بالا ادبی خیانت نے مہذب شکل اختیار کر لی ہے۔ مختلف شعبہ جات میں دوسروں کی اگائی ہوئی فضلوں کو اپنی حرص و آرزو کی فینچوں سے کاٹ کاٹ کر اپنی تحقیق و تنقید کا پیٹ بھرا جا رہا ہے۔ اب یہ رواج اس حد تک فروغ پا چکا ہے کہ اس میں نہ شرمندگی محسوس ہوتی ہے نہ اسے جرم خیال کیا جاتا ہے۔ ادبی رسائل، مجلات اور محفلوں میں بھی اس طرح کے بے شمار واقعات آئے دن پڑھنے اور سننے میں آتے ہیں کہ فلاں مدیر نے فلاں شخص کا مقالہ اپنے یا اپنے کسی دوست کے نام سے شائع کر لیا اور صاحب مقالہ خالی ہاتھوں منہ تکتا رہ گیا۔ یہ دست درازی مضامین اور مقالات تک ہی محدود نہیں ادیبوں کی برسوں کی کمائی پر بھی دیدہ دلیری سے ہاتھ صاف کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح کی ادبی صورت حال کا سامنا 'نعت رنگ' کے ایک معروف مقالہ نگار جناب شفتت رضوی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے موجود دور کی ادبی صورت حال پر بلیغ روشنی پڑتی ہے۔

”بعد تسلیمات یہ حقیر و کم ترین قلم بردار اپنے چاہنے والوں اور ناچاہنے والوں کی خدمت میں اس کے ذریعہ بقائمی ہوش و حواس، بلا جبر واکراہ، حالت ذہنی صحت میں برضا و رغبت تحریر کرتا ہے کہ ساٹھ سال قلم گھسنے کے بعد چند زخم اور چند داغ لیے ادبی دنیا سے رخصت ہوتا ہوں۔ میں لکھنے کے عمل سے تائب ہو چکا۔ یکم جون ۲۰۰۱ء کے بعد لائق اشاعت علمی یا ادبی تحریر سے گریز کروں گا۔ البتہ

سابق میں جس اندوختہ پر میرے ”کرم فرماؤں“ نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے اس پر میرا کوئی حق نہیں ہوگا، وہ چاہے چھاپیں نہ چاہیں نہ چھاپیں۔ چاہے میرے نام سے میری تحریریں چھاپیں یا اپنے سے کم ترجیحوں کے ناموں کو ترجیح دیں، مجھے اعتراض نہ ہوگا۔ ماقبل بھی لوگوں نے میری چھ کتابیں اپنے نام سے چھپوا لیں تو میں نے کیا بگاڑ لیا جواب بگاڑ [لوں گا]۔ ایک کتاب لاہور کے ایک ناشر کے پاس عرصہ چار سال سے ہے۔ ایک مسودہ کراچی سوپر مارکیٹ کے تہہ خانے میں عرصہ ساڑھے چار سال سے بند ہے۔ ایک مسودہ حیدرآباد سندھ کے ایک پبلشر کے پاس ہے۔ ان کے خلاف ایک ۵ سالہ بوڑھا ریٹائرڈ پروفیسر کیا اقدام کر سکتا ہے یہاں تو ان کا آٹو بولتا ہے جن کا علم ”حرف چند“ سے ماسوا اور وہ افلاطون، سقراط اور بقراط کے استاد بنے شہرت اور سونے بٹور رہے ہیں۔ جاہلوں کی قدردانی ناشروں کی بے بسی ایڈیٹر کی جہالت کو دیکھتے ہوئے شرفا اپنی عزت اسی طرح بجا سکتے ہیں کہ ”کتاب شاہی“ ریس سے خود کو دور رکھیں۔“ (۷۶)

ادبی اور معاشرتی زوال نے جس برے طریقے سے ہمارے معاشرے کو اپنی پلیٹ میں لے لیا ہے۔ اس کی مذکورہ ذیل اقتباسات میں کس خوبصورتی سے ترجمانی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے دو اقتباس اور ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) ”اب تو حد ہو گئی۔ میں نے حسرت موہانی کی نثر نگاری پر ایک مسودہ روانہ کیا تھا۔ کئی سال ہوئے وصولی کے خط کے ساتھ اس وقت کے ڈائریکٹر نے اشاعت کی یقین دہانی کرائی۔ عرصہ گزر گیا حال معلوم نہ ہوا۔ ابوسلمان صاحب انڈیا گئے تھے خدا بخش لاہری کی بھی زیارت کی۔ ڈائریکٹر صاحب نے میری کتاب اور ان کی کتابوں کی اشاعت کا یقین دلایا۔ وہ صاحب چلے گئے نئے صاحب ... کسی استفسار کا جواب نہیں دیتے اب اگر ماں بہن کو گفنے پر آمادہ نہ ہوں تو میں کیا کروں۔ یہی حرکت بار بار ہو چکی ہے ایک بار ڈاکٹر وحید قریشی نے ”صحیفہ“ کے لیے مضمون چھاپنے کی اطلاع [کند] وہ بدل گئے۔ احمد ندیم قاسمی مجلس پر مسلط ہوئے، مسودہ ہضم کر دیا۔ بزم اقبال لاہور نے ایک

مضمون چھاپنے کے لیے لکھائے ڈاکٹر کوئی... ذوالفقار آئے ابوسلمان سے کہا مسودہ بہت پرانا ہے اب کیا اہمیت! یعنی تحقیق نئی باتوں کی ہونی چاہیے پُرانی باتوں کی نہیں۔“ (۷۷)

(۲) ”یہ تبصرہ جو نوک قلم پر بے اختیار نہ آ گیا یہ میرے اور تمہارے درمیان کا معاملہ ہے۔ اسے عام کرنے کی ضرورت نہیں۔ مظفر وارثی کینہ پرورد آدمی نکلے۔ اُن سے وہ اعزاز ہضم نہیں ہوا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اُن کو بخشا تھا۔ نعت جیسی صنف کے مصنف کا ایسی پست سطح پر اترنا عجیب سا لگتا ہے۔ اخلاقیات کے موضوع پر بیسیوں اشعار کہنے والا شاعر اس قدر رکیک لہجہ اختیار کرے گا اس کا کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا۔“ (۷۸)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات ہماری ادبی صورت حال کی بے رحم عکاسی ہی نہیں کر رہے، بہت سے شرفا کے مقدس چہروں پر پڑے ہوئے پردوں کو بھی نوج رہے ہیں۔

ویسے تو ہر زبان کا ادب تعصبات سے بالاتر ہوتا ہے اور امن کی کوششوں میں اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن آج کے پرفتن دور میں دہشت گردی نے عالم اسلام کو اپنی پلیٹ میں لے لیا ہے اور اسلام کو دہشت اور خوف کی علامت بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ آزاد خیالی اور آزادی اظہار کی آڑ میں مذہب اسلام اور شعائر اسلام کی تضحیک معمول بن چکی ہے۔ ہر طرف خوف، دہشت، ظلم، زیادتی اور لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ فرقہ پرستی، رنگ، نسل، زبان کی بنیادوں پر تقسیم در تقسیم کا عمل جاری ہے۔ اقربا پروری، رشوت ستانی، چور بازاری، منافقت، جہالت، خود غرضی اور مفاد پرستی نے معاشرے کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ ایسی صورت حال میں نعت ایک ایسی ادبی صنف کے طور پر سامنے آ سکتی ہے جو تہذیبی مغائرت، متعصبانہ رویوں اور مذہبی مناقشوں کو ختم کر کے ملی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کی فضا پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ اس کے لیے نعت کو بھرپور انداز میں بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو تخلیق کا حصہ بنا کر ذریعہ ابلاغ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ نعت کو فضائل و برکات کے دائرے سے باہر نکال کر معاشرتی اصلاح کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے اور سیرت طیبہ کے ان نقوش کو نعت کا حصہ بنانا چاہیے جن سے معاشرے میں برداشت، حوصلے اور کشادہ دلی کی فضا ہموار ہوتا کہ مسلمانوں میں نفرت کی بڑھتی ہوئی خلیج کو ختم کیا جاسکے۔ اس طرح نعت سے سماجی شعور بیدار کرنے میں مدد ملے گی اور ہمارے

معاشرتی رویوں میں تبدیلیوں سے اسلام اور مسلمانوں کا وہ روپ سامنے آئے گا جو بین المسلمین بھی قابل قبول ہوگا اور بین الاقوام بھی۔ مجلہ 'نعت رنگ' یہ کردار بخوبی ادا کر رہا ہے اور مستقبل میں بھی اس سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ اس میں نہ کسی خوش گمانی کا دخل ہے نہ نری جذباتیت کا عمل بلکہ 'نعت رنگ' کی پالیسیاں، رویے اور روایت اس کے غماز ہیں۔ اس حوالے سے مدیر 'نعت رنگ' ایک ادارے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”ایک ایسے ماحول میں جہاں مذہب سے جڑی ہوئی اصناف پر گفتگو کے دروازے صرف خوفِ فسادِ خلق سے بند ہوں وہاں حمد و نعت کے ادبی پہلوؤں پر شریعت کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر جرات، بے خوفی اور استدلال سے پیش کرنا اور پھر اس بات پر مختلف نقطہ ہائے نظر کے تناظر میں ہونے والے اعتراضات و اختلافات کو حوصلے اور تحمل سے سننا اور برداشت کرنا صرف اس لیے کہ نعت پر ادبی مباحث کے درکھلے رہیں اور صدیوں سے بند اس ایوان میں تازہ ہوا کے جھونکے آتے رہیں تاکہ ہمیں نعت کی علمی، ادبی، تہذیبی، جہات کا علم ہو اور ہم اس کے آداب کا شعور حاصل کر کے نعت کی حقیقی قوت کو جان سکیں اور اسے بروئے کار لا کر ایک مثالی معاشرے کی تعمیر کر سکیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں اور نہ ہمیں اس سے پہلے اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔“ (۷۹)

دورِ حاضر میں سرکاری ادارے بھی مجلات شائع کر رہے ہیں اور ہائر ایجوکیشن کمیشن کی بھاری مالی امداد کے سہارے ریگنئے والے مجلات کی بھی کمی نہیں لیکن اس کے باوجود ان میں شائع ہونے والے مقالات کا معیار روز بروز گرتا ہی چلا جا رہا ہے۔ تحقیق کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اسے ہماری ادبی تاریخ کے ایسے سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا لیکن دوسری طرف 'نعت رنگ' کو نہ سرکاری سرپرستی حاصل ہے اور نہ ہی ہائر ایجوکیشن کی مالی بیساکھیاں۔ پھر بھی یہ مجلہ بے نیازی کی شان لیے اپنے معیار کو روز بروز بڑھانے میں مصروف عمل ہے اور قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ اس کا حجم بھی معاصر محبوں سے ضخیم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں 'نعت رنگ' کا ادبی کردار دیگر مجلات کے لیے ایک سوالِ نشان بن گیا ہے۔

ادبی مجلے شائع ہوتے رہے ہیں۔ آج بھی شائع ہو رہے ہیں۔ ان محلوں کے ادارے ملاحظہ فرمائیے۔ بیشتر اداروں میں مدیر حضرات، مقالہ نگاروں کی بے توجہی، بے اعتنائی

اور عدم دستیابی کا رونا روتے نظر آتے ہیں تو کوئی اشاعت کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے نوحہ کناں ہے۔ کوئی خریداروں کے رویوں کا شاکی ہے تو کوئی قارئین کی گم شدگی کا اعلان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ادبی مجلے تو ایک طرف رہے نعت کے فروغ میں جاری ہونے والے مجلے بھی اسی صورتِ حال سے دوچار رہے۔ ماہنامہ 'نعت' جنوری ۱۹۸۸ء میں لاہور سے جاری ہوا تو اس کے پہلے شمارے کے ادارے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”ماہنامہ 'نعت' اپنی علمی و مالی بے بضاعتی کے شدید احساس لیکن فروغِ نعت کی بھرپور خواہش کے جلو میں شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ نعت سے محبت رکھنے والوں کا بھی امتحان ہے۔ دیکھیے ہم سب اس امتحان میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔“ (۸۰)

رسالے کے مدیر کا بیان بین السطور وہ سب کچھ کہہ رہا ہے جس کا درج بالا سطور میں اظہار ہو چکا ہے۔ 'نعت رنگ' کے ادارے اس طرح کی صورتِ حال سے کوسوں دور ہیں۔ ان میں نہ شکوہ شکایت نظر آتا ہے نہ مایوسی، نہ مقالہ نگاروں کی تلاش کی فکر نہ مجلے کی ضخامت کا مسئلہ۔ (۸۱) اگر کچھ ہے تو وہ فقط نعت کے فروغ کی فکر مندی۔

'نعت رنگ' ایک ایسا ادبی مجلہ ہے جو فروغِ نعت میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ اس مجلے میں نعت کے حوالے سے مختلف موضوعات اور جہتوں پر اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ نعت گوئی کے آداب، شرائط، تقاضے، حفظ مراتب، واقعات اور روایات کی صحت و صداقت کے حوالے سے مباحث، تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے نعتیہ ادب کا ابلاغ جدید اردو نعت کی نئی جہتوں کی دریافت، نعت کے نئے نئے پیرایہ اظہار، نعت گو شعرا کے احوال و آثار، نعتیہ کتب، دواوین پر تبصرہ و تنقید، نعتیہ کلیات، گل دستوں اور انتخاب کا تعارف وغیرہ جیسے ان گنت موضوعات 'نعت رنگ' کی ادبی قدر و قیمت کو بھی بڑھا رہے ہیں اور گیسوئے نعت بھی سنوار رہے ہیں۔ 'نعت رنگ' نعت کے حوالے سے سوچ اور فکر کے نئے نئے آفاق کی تلاش و جستجو میں مصروف عمل ہے۔ نعت کی تفہیم و تنقید میں ادب کے جملہ پہلوؤں کو بروئے کار لانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ قدیم و جدید افکار اور دبستانِ تنقید کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ غرض یہ کہ تفہیمِ نعت اور تنقیدِ نعت کے حوالے سے سنجیدگی سے غور و خوض کیا جا رہا ہے۔

(۳)

مکتوب نگاری کی روایت کی ایک جہت ادبی رسائل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ تمام ادبی رسائل تو نہیں لیکن کثیر تعداد میں ایسے رسائل شائع ہوتے رہے ہیں (اور آج بھی شائع ہو رہے ہیں) جن میں اہل علم کے خطوط شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کو شمار میں لایا جائے تو ان رسائل کی تعداد بھی سو کا ہند سہ آسانی سے پورا کر سکتی ہے۔ ایسے رسائل و جرائد میں عوام اور خواص دونوں کے خطوط اشاعت کے مرحلوں سے گزرتے رہے ہیں لیکن معروف قلم کاروں کے خطوط کو ہمیشہ خصوصی توجہ حاصل رہی ہے۔ کیونکہ ان کے خطوط علم و ادب، تحقیق و تنقید اور معاشرہ و رجحانات و تحریکات کے حوالے سے دلچسپی کا باعث بھی ہوا کرتے تھے اور افادیت کے حامل بھی اور ساتھ ہی ادب کی سمت نمائی کا فریضہ بھی ادا کرتے تھے۔ کم و بیش تمام رسائل میں شائع ہونے والے خطوط کا دائرہ ادب کی کسی ایک جہت یا پہلو کو محیط نہیں ہوتا بلکہ ہر خط ادب کے کسی پہلو کو روشن کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا ادبی رسالہ موجود ہو جس میں ادب کے کسی ایک ہی پہلو پر خطوط شائع ہوئے ہوں یا کسی ایک صنف ادب سے متعلق خطوط لکھے جاتے رہے ہوں اور انھیں شائع بھی کیا جاتا رہا ہو۔

’نعت رنگ‘ غالباً وہ واحد ادبی مجلہ ہے جس میں صرف ایک ادبی صنف یعنی نعت کو مرکز بنا کر خطوط لکھے جاتے ہیں۔ ’نعت رنگ‘ کے اب تک اٹھائیس شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ان شماروں میں پانچ سو سے زائد خطوط شائع کیے جا چکے ہیں۔ ان میں چند سطرے خطوط بھی شامل ہیں اور کئی کئی صفحات پر مشتمل مقالات نما خطوط بھی۔ ان میں سب سے طویل خط مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی کا ہے جو کم و بیش سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو کا کوئی مجلہ ایسا نہیں جس میں اتنا طویل خط شائع ہوا ہو۔ یہ فراخ حوصلگی ’نعت رنگ‘ کے حصے میں ہی آئی ہے۔ ’نعت رنگ‘ میں شائع ہونے والے تمام خطوط کا موضوع صرف نعت ہے اور اسی موضوع کو پیش نظر رکھ کر مدیر نعت رنگ کو خطوط لکھے جاتے رہے۔ چنانچہ تمام خطوط کا دائرہ نعت کی تحقیق، تنقید، موضوعات، اسالیب، تاریخ، تقاضے، روایت اور مسائل کو محیط ہے۔

’نعت رنگ‘ میں شائع ہونے والے خطوط کو ڈاکٹر سہیل شفیق نے نہایت سلیقے اور محنت سے ترتیب دے کر ’نعت نامے‘ کے نام سے ایک ضخیم کتابی صورت میں شائع بھی کر دیا ہے۔ (۸۲) ۹۳۶ صفحات کی یہ کتاب مذہب، تہذیب، تاریخ، علم، ادب، تحقیق اور تنقید کا ایک

لازوال خزانہ ہے۔ اس کتاب میں ’نعت رنگ‘ کے پچیس شماروں میں شائع ہونے والے خطوط شامل ہیں۔ اس کتاب میں کوکب نورانی کے ’نعت رنگ‘ میں شائع شدہ خطوط شامل نہیں۔ وہ تمام خطوط علیحدہ ایک کتابی صورت میں ’نعت اور آداب نعت‘ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ (۸۳) ’نعت نامے‘ کی اشاعت کے بعد سے ’نعت رنگ‘ کے تین شمارے ۲۶، ۲۷، اور ۲۸، شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں مذکورہ دونوں کتابوں اور ۲۶، ۲۷، اور ۲۸ ویں شمارے میں شامل خطوط کو پیش نظر رکھ کر نعت کے حوالے سے اہل علم و دانش کے جواہرات اکٹھے کیے گئے ہیں اور اب یہ جواہرات ’نعت رنگ‘ کے بھرے ہوئے دامن سے سمیٹ کر قارئین کی جھولیوں میں ڈالے جا رہے ہیں۔

’نعت رنگ‘ میں شائع ہونے والے خطوط کا دورانیہ ۱۹۹۵ء سے ۲۰۱۸ء تک پھیلا ہوا ہے، تقریباً ۲۳ سالوں پر محیط خطوط اپنے جلو میں علم و ادب کا گنج ہائے گراں مایہ رکھتے ہیں۔ ’نعت رنگ‘ میں کم و بیش دو سو مکتوب نگاروں کے ساڑھے پانچ سو کے لگ بھگ خطوط شائع ہوئے ہیں۔ یہ صرف خطوط نہیں ہیں نہ مکتوب نگاروں کے مدیر سے روابط محض کے عکاس بلکہ یہ مکتوب نگاروں کے حالات، خیالات، احساسات، تاثرات، افکار، نظریات، تجربات، واردات، تحقیقات، تنقیدات اور علم و ادب کا ایک خزانہ بھی ہیں اور اپنے عہد کی ادبی صورت حال کے عکاس بھی۔ یہ خطوط ’نعت رنگ‘ کے ارتقا کو سمجھنے میں بھی مدد دیتے ہیں اور مدیر ’نعت رنگ‘ کی شب و روز کاوشوں کے شاہد بھی۔ یہ نعت کی ادبی تاریخ بھی پیش کرتے ہیں اور ’نعت رنگ‘ کی تاریخ بھی۔ ۲۳ سال کے مختصر عرصے میں نعت رنگ میں تخلیق اور تنقید و تحقیق کے بے شمار رنگ سامنے آئے ہیں۔ جس طرح اٹھارویں صدی کا نصف آخر شمالی ہند کے شعر و ادب کے مختلف رنگوں سے ایسی کہکشاں کی صورت تشکیل پا چکا تھا جسے میر و سودا کا زریں دور کہا جاتا ہے بالکل اسی طرح ان تین دہائیوں میں صنف نعت کی تخلیق اور تحقیق و تنقید کی پھوٹی کرنوں سے نعت کی ایسی قوس قزح وجود میں آئی جسے نعت کا زریں دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مدیر نعت رنگ کے نام لکھے گئے خطوط کا دامن خاصا وسیع ہے۔ ان میں ادبی نوعیت کے خطوط بھی ہیں اور مذہبی نوعیت کے حامل خطوط بھی، لسانی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خطوط بھی ہیں اور تجرباتی اوصاف کے حامل خطوط بھی، تحقیقات سے بھرپور خطوط بھی موجود ہیں اور رسیدی اور تعارفی نوعیت کے حامل خطوط بھی۔ ان خطوط میں شکوے شکایتیں بھی ہیں اور محبتیں اور

خلوص بھی، انسانی نفسیات کے پیچ و خم بھی ہیں اور نجی پریشانیوں کا بیان غم بھی، تجربات و احساسات کا تخلیقی اظہار بھی ہے اور ذاتی واردات و مشاہدات کا بے ساختہ بیان بھی۔ زبان و بیان کی آرائش بھی ہے اور سادگی اور سلاست کا اظہار بھی، اظہار کی بے تکلفی بھی ہے اور انداز بیان کی شگفتگی بھی، طفرے کے گہرے وار بھی ہیں اور شوخی گفتار کے نمونے بھی۔ غرض یہ کہ ان خطوط میں زندگی کے گونا گوں رنگوں کی طرح ہر رنگ موجود ہے اور ہر رنگ اپنی پوری آب و تاب سے 'نعت رنگ' کو منور کر رہا ہے۔

زندگی کے رنگوں کی طرح خطوط بھی متنوع رنگوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ان تمام رنگوں میں سب سے اہم رنگ شخصی ہوتا ہے اور یہی رنگ بعض اوقات خطوط کو خوبصورت بنا کر دلچسپی سے پڑھنے کی چیز بنا دیتا ہے۔ غالب کے خطوط کی اہم خوبی اس کا شخصی عنصر ہی ہے۔ غالب کے خطوط میں ان کی شخصیت اپنے تمام و کمال رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔ ان خطوط میں غالب کی زندگی ہنسی مسکراتی، بلوتی چالتی اور چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اسی عنصر نے ان کے خطوط کو حیات و وام سے ہم کنار کر کے شہرت اور بقائے دوام کے دربار میں مسند نشین کیا ہے۔ غالب ہی نہیں غالب کے معاصرین اور متاخرین کے جن خطوط میں زندگی کی حرارت موجود ہے وہی خطوط اہمیت کے حامل قرار پائے ہیں۔ شبلی کے خطوط ہوں یا اکبر کے، اقبال کے خطوط ہوں یا جوش کے ان تمام خطوط میں جب اور جہاں زندگی حرکت کرتی ہوئی نظر آئی ہے وہیں ان ادیبوں کے خطوط خصوصی توجہ سے پڑھنے کی چیز بن گئے ہیں۔

اردو خطوط نگاری کو غالب کی سب سے بڑی دین مراسلے کو مکالمے کی صورت میں منقلب کرنا تھا جس کے باعث خطوط جو ایک غیر شخصی چیز تھی، وہ شخصی بن گئی۔ غالب کا یہ انداز بہت کم مکتوب نگاروں نے برتا ہے۔ اسی انداز کے نقوش 'نعت رنگ' میں کہیں گہرے اور کہیں ہلکے دیکھے جاسکتے ہیں۔ 'نعت رنگ' میں شخصی عنصر اور مکالماتی عنصر دونوں موجود ہیں۔ یہ عنصر کہیں مکالمے کی صورت میں اور کہیں قلبی واردات کے بیان میں اور کہیں شخصیت کے اظہار میں سامنے آیا ہے۔ مکالمہ کہیں 'نعت رنگ' کے مدیر سے کیا گیا ہے تو کہیں مقالہ نگار سے، کہیں نعت گو شعرا مخاطب ہیں تو کہیں عام قارئین لیکن 'نعت رنگ' کے خطوط میں غالب کا سا یکساں رنگ مفقود نظر آتا ہے چونکہ یہ مختلف المزاج شخصیات کے ایسے خطوط ہیں جو مختلف مکاتب فکر، مختلف علاقوں اور مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان خطوط میں یکساں شخصی عنصر کی یکسانیت اور یکساں

لہجے کے اظہار کی بجائے متنوع پیرایہ اظہار اور مختلف اسالیب اپنا اپنا الگ، منفرد اور مخصوص رنگ دکھا رہے ہیں۔ 'نعت رنگ' کے خطوط میں متنوع اسالیب کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔ ان خطوط میں کہیں اصول و ضوابط کا تازیانہ لیے سخت گیر قفا و محوکلام ہے تو کہیں لطافت زبان کی دلکشی لیے مشفق و مہربان استاد، کہیں صداقت کی خنکی لیے خشک محقق جلوہ گر ہے تو کہیں منطق کے بوجھ تلے دبا ہوا زاہد خشک ملا، کہیں تخیل کے پروں کے سہارے محو پرواز تخلیق کار اور کہیں فلشن کا انداز لیے بے رحم حقیقت نگار۔ غرض یہ کہ 'نعت رنگ' میں مکتوبات اور مکتوب نگاروں کے متنوع اسالیب کا رنگارنگ ایک جہاں آباد ہے جو اپنی اپنی شان لیے 'نعت رنگ' کے شعبہء مراسلات کو رنگوں سے مزین کر رہا ہے۔

'نعت رنگ' کے خطوط کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ بیشتر خطوط تو مقصد کے جبر میں جکڑے ہوئے ہونے کی وجہ سے غیر شخصی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان خطوط میں شخصی عناصر تلاشنا بے سود ہے لیکن کم تر خطوط ایسے بھی ہیں جن کے نہاں خانوں سے زندگی جھانکتی اور کروٹیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان خطوط سے مکتوب نگاروں کی شخصی واردات اور نفسی کیفیات کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ خطوط ان شخصیات کے تحریر کردہ ہیں جو مدیر 'نعت رنگ' سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے گویا مکتوب نگاروں نے اپنے دل کھول کر ان خطوط کی طشتریوں میں رکھ دیے ہیں۔ خلوص کا ایک لازوال رشتہ ہے جو مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان محبت کے رشتے سے جڑا ہوا ہے۔ ان کے دلوں سے نکلنے والی آواز اگرچہ لفظوں کے قفس میں مقید ہے لیکن ہم انہیں گوش دل سے سن بھی سکتے ہیں اور محسوس بھی کر سکتے ہیں گویا احساسات اور کیفیات لفظوں کا روپ دھار کر 'نعت رنگ' کے صفحات پر بکھری زندگی کا پتہ دے رہی ہیں۔

خطوط میں شخصی رنگ اس وقت درآتا ہے جب مکتوب نگار، مکتوب الیہ سے دل کی زبان سے گفتگو کرتا ہے۔ مکتوب نگار کا مکتوب الیہ سے ذہن کا نہیں دل کا رشتہ ہو، بے تکلفی نے دل میں جگہ بنائی ہوئی ہو، حجاب کا پردہ حائل نہ ہوا ہو۔ ایسے مواقع پر مکتوب نگار اپنی شخصیت پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو ہلکا جھٹک اور بے خوف و خطر اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ ایسے عالم میں زندگی کو اس کے اصلی روپ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ خط جسے گفتگو کرنا یا باتیں کرنا کہتے ہیں، وہ حنیف اسعدی کے خطوط کی بنیادی خصوصیت ہے۔ ان مکاتیب میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان محبت اور خلوص کی ایسی داستان رقم ہو گئی ہے جو اپنے اندر بے پناہ اپنائیت بھی رکھتی ہے اور گہری اثریت بھی۔

حنیف اسعدی کے خطوط ایسے ہی خطوط ہیں جن میں دھڑکتے ہوئے دلوں کی

صدائیں سنی جاسکتی ہیں، دل پر گزرتی ہوئی واردات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ خطوط اپنائیت، محبت، خلوص اور بے تکلفی سے معمور ہیں۔ ان خطوط سے محبت اور خلوص کا ایک چشمہ پھوٹتا ہوا نظر آتا ہے جس کا مرکز ان کا اپنا دل ہے۔ جس کے نہاں خانے میں یہ صبیحِ رحمانی کو اترنے کی دعوت دیتے رہتے ہیں کہ وہ اس کھلی کتاب کو چشمِ دل سے پڑھ بھی لیں اور ان کی تنہائیوں میں شریک ہو کر ان کے دکھوں کا مداوا بھی کر سکیں۔ ان کے خطوط کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے قلم سے لفظ نہیں نکل رہے، محبت کی شیرینی ٹپک رہی ہے۔ یہ مراسلے نہیں مکالمے ہیں، یہ خط نہیں گفتگو ہے۔ اس میں سخن کا پردہ حائل ہے نہ خیالات کی ریاکاری۔ ہر لفظ اور ہر جملے سے خلوص اور محبت کا میٹھا میٹھا رسِ رستا ہوا نظر آتا ہے۔ غالب نے ایک خط میں اپنے عزیز شاگرد اور دوست مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا:

”میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے پر جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔۔۔ دن ان (خطوط) کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔“ (۸۴)

غالب کی اس تحریر پر مجھے حنیف اسعدی کی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ ڈھلتی عمر کا جو سناٹا ہمیں غالب کے اس خط میں سنائی دیتا ہے، وہی سناٹا حنیف اسعدی کے خطوط میں دیکھا جاسکتا ہے۔ حنیف اسعدی اسی سناٹے کو جذبات اور الفاظ کی گونج سے دبائے کی کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے خطوط سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

اس وقت رات کا ایک بجنے کو ہے۔ نیند تو.....

نیند کیا جانے کہاں جا سوئی

نیند آ جائے تو ہم بھی سولیں

ساری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی ہے صبح کے قریب سوتا ہوں اور پھر دس،

ساڑھے دس بجے اٹھتا ہوں۔ پھر اس کی کو دوپہر میں پورا کر لیتا ہوں (۸۵)

۵ ستمبر کو پھر دل کا دورہ پڑا۔ ہلکا تھا اس لئے بے غیرت زندگی مزید بے غیرتی

کے لیے بیچ گئی۔ علاج جاری ہے۔ فائدہ بھی ہے مگر آہستہ آہستہ بہتر ہو رہا ہوں

۔ کمزور ہو گیا ہوں اور روز بروز کمزوری بڑھ رہی ہے۔ غذا کم ہو گئی ہے مگر

معمولات زندگی میں فرق نہیں۔ چل پھر رہا ہوں۔ لکھ پڑھ رہا ہوں۔ مگر کم کم

۔ دل کی دھڑکن کبھی کم کبھی زیادہ۔ یہ کسی شاعر کی مشہور غزل کی ردیف بھی ہے مگر اب تو میرا قافیہ تنگ کیے ہوئے ہے۔ بقول کسے:

گلیوں میں آزار بہت ہیں گھر میں جی گھبراتا ہے

ہنگامے سے سناٹے تک میرا حال تماشا ہے

چاروں طرف ہنگامہ برپا ہے مگر میرے اندر ایسا سناٹا ہے جس کا اندازہ تمہیں تو تمہیں مجھے خود بھی نہیں ہے۔ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہوں۔ سحر چین گئے ہوئے ہیں۔ تم شاید شہر کے باہر ہو۔ ایک تابش بھائی ہیں ان سے کبھی کبھی فون پر بات ہو جاتی ہے ورنہ اس بیگانی دنیا میں کون اپنا ہے۔ (۸۶)

”تمہارا دوسرا کام بھی ہو رہا ہے مگر بہت سست روی سے میں دراصل اب ڈھے رہا ہوں۔ زیادہ تر لیٹا رہتا ہوں بیٹھتا صرف ضرورت کے وقت ہوں اور کھڑے رہنے کی تواب عمر بھی نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے ابھی حوصلہ نہیں ہارا۔ تھک جاتا ہوں آرام کر لیتا ہوں پھر تازہ دم ہو کر کام میں لگ جاتا ہوں۔ میرا بس چلے تو میں اپنے جنازے میں شریک ہو کر خود کو کا ندھا دوں۔ خیر یہ تو سب سخن طرازیوں ہیں۔ نہ میں ابھی مر رہا ہوں نہ تمہیں ماتم کرنے کی اجازت ہے۔“ (۸۷)

”اللہ کرے تم بخیر ہو میں الحمد للہ باوجود یکہ زار و زار ہوں مگر زندہ ہوں اور پیٹ بھر زندہ ہوں۔ تین روز سے انجانانے ستار کھا۔ پہلے ہی سے ٹانگیں چلنے سے بیزار تھیں اب دوسرے آزار نے اور بھی مفلوج کر رکھا ہے۔ چند قدم چلوں تو چند سینکڑ کے لئے ٹھہر جانا پڑتا ہے یہ انجانانے کا شاخسانہ بھی ہے اور موصوف کی پہچان بھی ہے مگر میں ایسا ضدی کہ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کو سزا سمجھتا ہوں اور دن کو میں کئی چکر پاؤں نکر کیلگا تا ہوں۔ میں ہار ماننے کو تیار نہیں جب تک پورا کھیل (game) ختم نہیں ہو جاتا۔ اب یہ کون بتائے کہ کھیل ختم ہونے میں کتنی دیر ہے۔

یہ کس سے پوچھوں کہ اس بے ثبات دنیا میں گزارنی تو ہے، کتنی گزارنی ہے مجھے

تم مناسب سمجھو تو اللہ میاں سے پوچھ کر بتادو۔ مری تو اُن سے اس موضوع پر گفتگو ہوتی نہیں۔ ڈر لگتا ہے اُن کے جلال سے ویسے اُن کی ایک صفت۔ اللہ جمیل و یحب الجمال بھی ہے۔ میرا اُن کا معاملہ اسی تناظر میں ہوتا ہے۔“ (۸۸)

شفقت رضوی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

”میں ایک خاص کیفیت میں خط لکھتا ہوں۔ یہ بھی خود کلامی کا ایک انداز ہے، اسے خط نہ سمجھو۔ میں اپنے آپ سے اسی طرح کی باتیں کرتا ہوں۔ تم سمجھو گے میں بوڑھا ہو کر سٹیا گیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ حساس آدمی کا اس دنیا میں یہی حشر ہوتا ہے۔“ (۸۹)

حنیف اسعدی نے بھی ایک خاص کیفیت میں خط لکھے ہیں۔ ان کے خطوط کے لب و لہجے کو خود کلامی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مدیر نعت رنگ کو انھوں نے اپنا ہم زاد تصور کر لیا ہے اور اسی ہم زاد سے یہ خطوط کی زبان سے ہم کلام ہو کر اپنی تنہائی کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (۹۰)

شفقت رضوی کے خطوط تکلف اور نا آشنائی سے شروع ہو کر بے تکلفی اور شناسائی پر منتج ہونے والے تعلقات کی ایک دلچسپ داستان سناتے ہیں۔ ان خطوط میں شکوے شکایتیں، ڈانٹ ڈپٹ، محبتیں، نفرتیں، مروت اور خلوص سب کچھ موجود ہے۔ یہ خطوط ایک ایسی داستان سناتے ہیں جو دلچسپ بھی ہے حیرت افزا بھی اور شفقت رضوی ایسا داستانوی کردار نظر آتا ہے جو عجیب و غریب خوبیوں کا مالک ہے۔ علم کی ایسی پیاس رکھتا ہے جو بجھائے نہیں بجھتی۔ علم کے جام پی پی کر صل من مزید کی صدائیں بلند کرتا رہتا ہے۔ عمر کی بیاسی بہاریں دیکھ کر بھی ان کی علمی تشنگی بجھنے نہیں پائی۔ اپنے ملک سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر علم کے چشموں کا متلاشی ہے اور اس آب بقا کو نوش جان بنا کر امر ہونے کا خواہش مند بھی ہے۔ ایک بے قرار روح کا مالک ہے جسے عمر کے تیزی سے گزرنے کا شدید احساس کھائے جارہا ہے اور بہت کچھ کرنے کے باوجود نہ کرنے کا احساس بھی تڑپا رہا ہے۔

رو میں ہے رخس عمر کہاں دیکھیے تھے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ان خطوط میں زندگی کی تابناکی بھی موجود ہے اور ڈھلتی عمر کی مایوسی بھی۔ زندگی کی طرف لوٹ جانے کا احساس بھی اور متاع زندگی کے نام نہاد اہل قلم کے ہاتھوں لٹنے کا سانحہ بھی۔ ”آپ نے عنایت بالائے عنایت فرمائی، میرا پتا معلوم کر کے گھر تشریف لانے کی زحمت اٹھائی۔ اپنی نعتوں کے مجموعے اور ”نعت رنگ“ کے شمارے عطا فرمائے۔ آپ ٹھہرے دولت و دین سمیٹنے والے، آپ کا نعتیہ کلام آپ کے لیے زاورِ آخرت ہے۔ میری کم علمی اور کم بصری کہ میں آپ کا ہم سفر نہیں۔ بہر حال یہ مقدس شعری سفر آپ کو مبارک! مجھے لذت نظارہ کچھ کم نہیں ہے۔“ (۹۱)

”کب تک خوابِ خرگوش میں رہو گے۔ اکتوبر میں لکھے گئے خط کا جواب آپ پر ادھار ہے۔ قرضہ بڑھتا جاتا ہے ادا کرنے کی کوئی صورت ہے؟ ”نعت رنگ“ کا قرض پچھلا اور موجودہ بھی ادا طلب ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ غیر اہم کاموں میں الجھ کر آپ نے ”نعت رنگ“ سے بے زنجی اختیار کیوں کر رکھی ہے۔ میری بات مانو ”نعت رنگ“ تمہیں زندہ رکھے گا باقی جو کچھ ہے بے کار ہے۔ اگر میرے آنے کے بعد کوئی شمارہ نہیں چھاپا ہے تو اس سے بڑھ کر آپ کی نالائقی اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ بہر حال اگر خرافات سے فرصت ہو تو جملہ کوائف سے مطلع کرو یا پھر مجھ سے بھی بے تعلقی کا اعلان کر دو۔ میں نے اتنے صدمے برداشت کیے ہیں کہ اب میرے سامنے کوئی بات صدمہ نہیں ہے۔“ (۹۲)

”ان چکروں میں پڑ کے تم نے ”نعت رنگ“ کو فراموش کر دیا گویا سانس لینا چھوڑ دیا ہے۔ جلدی سے خاص نمبر نکال لو اور اگلے نمبر کی تیاری کرو تو ایک دھماکہ خیز مضمون لکھنا شروع کروں۔ پڑھو گے تو جی خوش ہو جائے گا۔“ (۹۳)

”کوئی امید نہیں آتی، کوئی صورت نظر نہیں آتی آپ نے جھاننا تو دیا کہ دسمبر میں ”نعت رنگ“ مجھے پہنچ جائے گا دسمبر کے لئے دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ اگر جھاننا حقیقت بن جائے تو ہم قرب قیامت کا یقین کر لیں۔ ”نعت رنگ“ روانہ کرنے میں تاخیر نہ کریں۔ خیال پڑتا ہے میرے دو ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت پاکستانی آپ کے اکاؤنٹ میں جمع ہیں انھیں استعمال میں لائیں اور نعت رنگ

بھیجے کا صرف اٹھائیس۔ اگر ممکن ہو تو فضلی سبز سے کلیات میر اور کلیات اقبال بھی خرید کر 'نعت رنگ' کے ہمراہ روانہ کر دیں باقی حساب کتاب ہوتا رہے گا۔ کلیات میر تو چومنے اور آنکھوں سے لگانے کا کام آنے کا سنا ہے اس سے مردہ دل زندہ ہو جاتا ہے۔ کلیات اقبال ... عرصہ سے ہاتھ میں کھلی ہو رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ان کو بھی جوش ملیح آبادی بنا دوں کیسی رہے گی۔“ (۹۴)

”اب عمر ۸۲ سال ہو گئی ہے۔ ۷/۷ برس سے ایک گردہ پر گزارا ہے، صبح شام انسولین لیتا ہوں۔ ۲/۲ شدید ہارٹ ایک سے جانبر ہو چکا ہوں۔ پیر کے انگوٹھوں میں گاؤٹ کی تکلیف ہے۔ آنکھیں پڑھنے سے جلد تھک جاتی ہیں، معلوم ہوتا ہے اللہ میاں کو بلاوے کا نوٹس دینا یاد ہی نہیں رہا۔ اگر تاریخ طے ہو جائے اور اطلاع پہلے ہی پہل مل جائے کراچی میں آخری سانس لوں اور یا تو والد کی قبر میں جگہ پاؤں یا بیوی کی قبر میں ان کے ساتھ آرام کروں۔ یہاں دفن ہوا تو بس اکیلا ہی رہوں گا۔“ (۹۵)

ان خطوط میں ان کی شخصیت کا دوسرا رخ ایک سخت گیر نفاذ کا سامنے آتا ہے جو اپنی رائے کے اظہار میں بے باک ہے۔ جسے نہ دوستوں کے چھوٹے کا خوف ہے نہ تعلق کے ٹوٹنے کا اندیشہ۔

”آپ کے کرم فرماؤ اکثر تقی عابدی نے بڑی محبت اور عقیدت اور احترام کے ساتھ ایک دن میرے ساتھ گزارا۔ معلوم ہوا کہ ان کے پہلے ہی سے ہمارے چھوٹے داماد ڈاکٹر فضل حسین سے جان پہچان ہے۔۔۔ اب اس کو کیا کہا جائے کہ لوگ ایک جملہ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ بظاہر تو انہوں نے ناراضگی نہ دکھائی۔ میرا خیال ہے وہ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ میں نے ان کے یادگار مرثیہ کا مطالعہ کیا۔ وہ ڈاکٹر فضل کو دے گئے تھے۔ ان کو میں نے لکھا ”سنا تھا کہ آدمی کے مرنے کے بعد ڈاکٹر لوگ نعش کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں اب معلوم ہوا کہ کینیڈا کے ڈاکٹر زندہ ادب کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنے لگے ہیں۔“ یہ جامع تبصرہ بھلا ناراض ہونے کا ہے بہر حال مشغلہ تو ”چھیڑ خوباں سے چلی جائے“ والا ہے۔“ (۹۶)

”نعت رنگ“ میں ایک اور مضمون نظر سے گزرا۔ نام نہیں بتاؤں گا۔ جو

اعتراضات میں نے محبی مکرم عزیز احسن پر کیے تھے وہی ان پر وارد ہوتے ہیں۔ میاں امتحان کا پرچہ حل کرنا اور صحیح جوابات لکھنا اور ہے ادیب بننا اور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مضمون نگار کو استفراق کی بیماری ہے۔ علم مضمر نہیں ہوا جیسا کا ویسا باہر نکل آتا ہے۔ جو ہماری تاک میں رہتے کہ کہیں تو پکڑا جاؤں۔ اگر واقعی انھیں میری تلاش ہے تو ان کا تذبذب ختم کریں اور انھیں بتلا دیں میں امریکا کی ریاست ٹیکساس کے شہر ڈیلاس میں ہوں اور تاحال زندہ ہی نہیں سلامت بھی ہوں۔ میرا مطلب عزیز محترم جناب احمد صغیر صدیقی سے ہے۔ اگر وہ وصول کرنے آمادہ ہوں تو میرا سلام ضرور پہنچا دیں۔“ (۹۷)

”تمہارا اصرار ہے کہ ان کتب پر میری رائے ضبط تحریر میں آنا چاہیے۔ میری رائے سے لوگ کب خوش ہوئے ہیں جواب ہوں گے تم چاہتے ہو کہ لوگوں کی ناراضگی میں اضافہ ہوتا رہے تو یہ سر حاضر ہے۔“ (۹۸)

”میں نے خبر کو خیر کے سوا کچھ نہ سمجھا، میں بد کو خیر ثابت نہ کر سکا اور پھر ایسا کرنا چاہا۔ اس حیثیت اور Values کی پاس داری نے مجھے کہیں کا نارکھا۔“ (۹۹)

ان کی شخصیت کا تیسرا رخ اردو سے محبت کرنے والے انسان کا ہے جو ہزاروں میل دور بیٹھ کر اپنی زبان سے محبت بھی کرتا ہے اور پھر یہ کہ اپنے وطن اور مٹی سے دور جا کر اس کی خوشبو زیادہ عزیز بھی ہو جاتی ہے۔ یہی معاملہ زبان کا ہے۔ اردو سے محبت کے اظہار کا ایک انداز ملاحظہ فرمائیے:

”نعت رنگ“ شماره ۷۱ میرے لیے دولتِ باپایاں ثابت ہوا۔ عرصے سے (یہاں)۔ انگریزی سنتے سنتے کان پک گئے تھے۔ امریکی لہجے میں انگریزی بولتے بولتے زبان اور جڑے تھک گئے تھے۔ انگریزی کتابیں پڑھتے پڑھتے آنکھیں پھرانے لگی تھیں۔ ’نعت رنگ‘ نے اردو زبان کے چٹکارے لینے کا مزہ دیا۔ ایک تو سلونی زبان اس پر ذکرِ حبیب خدا V کی نورفشانی دل کے سرور اور روح کے کیف کے سامنے ہو گئے۔ خیال ہوا اردو کو مٹانے کے لیے غیروں نے اور ان سے زیادہ اپنوں نے جو جمتیں اٹھائیں وہ سب بے کار ثابت ہوئیں۔ اگر اردو جنوبی ایشیا میں مٹ بھی جائے تو امریکا، کینیڈا، لندن، اٹلی،

جاپان، وسطی ایشیا میں زندہ رہے گی اور اس کو مٹانے کا عزم رکھنے والے دوستوں کے سینے پر مونگ دیتی رہے گی۔ (۱۰۰)

ان کی شخصیت کا چوتھا رخ ایک محب وطن پاکستانی کا سامنے آتا ہے جو اپنی مٹی سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے اور اس عمر میں جلنا کڑھتا رہتا ہے جس عمر میں گرد و پیش سے بے خبر لوگ اپنی آخرت کو سنوارنے کی فکر میں منہمک نظر آتے ہیں۔

”میری خواہش تھی کہ زندگی کا آخری حصہ کراچی یا انڈیا میں گزاروں۔ میں امریکا میں مرنا اور دفن ہونا نہیں چاہتا۔ امریکا ظاہری زندگی کے لیے بہترین جگہ ہے۔ اندرونی زندگی کے لیے زہر قاتل ہے۔ اچھا ہوتا کہ میں کراچی میں والد کی قبر میں یا بیوی کی قبر میں دفن ہوتا۔ لیکن کراچی کے حالات دیکھ کر ہی اس ملک سے نفرت ہو گئی ہے۔ جہاں صرف حرام خوروں کا جینا آسان ہے دنیا میں اتنی بے وقوف قوم کوئی اور نہ ہوگی جو جان بوجھ کر کینے ترین افراد کو حکمران بناتی ہو۔ بزرگوں نے سچ کہا تھا کہ جیسی قوم ہو ویسے ہی لیڈر ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام اخبارات صدر مملکت کو بغیر اس خطاب کے یاد نہیں کرتے Formerly Known as 10% اور وہ بے غیرت ہے جو قوم کا مال خرچ کر کے دنیا بھر میں تفریح میں مبتلا ہے۔ بھیک مانگتا ہے اس کی حیثیت دیکھو ہر ملک امداد کی بھیک تو کیا قرض دینے کو بھی تیار نہیں۔ دنیا میں اس ملک کی کیا حیثیت؟ میں سناؤں۔ ایک دن میں اپنے ڈاکٹر سے ملنے ان کے آفس گیا۔ وہاں ویننگ روم میں بہت سارے لوگ بیٹھے تھے جیسے ہی میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ دروازہ کے قریب ایک بوڑھے جوڑے کو بیٹھا دیکھا۔ مجھے دیکھ کر بوڑھے نے اپنا انگوٹھا اوپر کی طرف کرتے ہوئے کہا، ”انڈین“ میں نے کہا، ”نو پاکستانی“ اس نے انگوٹھا نیچے کی طرف کر دیا۔ یہ زندگی میں سب سے بڑی گالی تھی جو میں نے سہی صرف پاکستانی ہونے کی وجہ سے۔“ (۱۰۱)

”یوں تو مسلمانان عالم کا شعوری اور تہذیبی رویہ رو بہ انحطاط ہے۔ اس کی پست ترین سطح پر پاکستانی معاشرہ ہے کتنی بد نصیب قوم ہے جو گزشتہ نصف صدی میں ایک رہ نما قوت پیدا نہیں کر سکی۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جو مسلمان

رہ نما گزرے ہیں ان کے پست قامت بھی نصف آخر کے قد آور سے بلند تھے۔ مذہبی، سیاسی، سماجی، علمی میدانوں میں ہُو کا عالم ہے۔“ (۱۰۲)

احمد صغیر صدیقی ’نعت رنگ‘ کے سنجیدہ اور باذوق قارئین میں سے تھے۔ ان کے خطوط سے شخصیت کے جو نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ کچھ حالی کی شخصیت سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ تحریر میں سنجیدگی اور سادگی کا خاص اہتمام کرتے ہیں لیکن ان کی سادگی سرسید کی سادگی کی طرح روکھی پھیک کی نہیں بلکہ حالی کی طرح سادہ مگر پُر کار ہے۔ یہ رائے دینے میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ حالی کی طرح وضع داری قائم رکھتے ہوئے طنز کرتے بھی ہیں تو سات پردوں میں چھپا کر۔ ان کی آراء سنجیدہ، علمی اور تجزیاتی نوعیت کی حامل ہیں۔ ’نعت رنگ‘ کے ناقد بھی ہیں اور رہنما بھی۔ خلوص ان کی تحریر کا بنیادی وصف ہے۔ ہر خط میں ان کی شخصیت کی سادگی زیریں لہری طرح ساتھ ساتھ چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

”عزیز احسن کے تنقیدی مضامین میں نے ادبی جریدوں میں پہلے نہیں دیکھے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک سچے اور بہترین ناقد ہیں اور یہ جو ہمارے پاس ڈھیروں دانش ور ”پروفیسر“ اور ”ڈاکٹر“ قسم کے ناقد بھرے ہوئے ہیں ان سے وہ رُتبے میں کہیں افضل نظر آئے۔ کچھ ایسا ہی میں نے رشید وارثی صاحب کے مضمون کو پایا، کیا ہی عمدہ باتیں لکھی ہیں۔ اور کیا خوبی ہی سے انھوں نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف برتا۔ اس کی داد دینا نا انصافی ہوگی۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ اس قسم کی نشان دہی شعرائے کرام کو اتنی بری لگتی ہے کہ ان کے دہانوں سے کف نکلنے لگتا ہے۔“ (۱۰۳)

”اپنے جناب سحر انصاری تو معلوم نہیں کس طرح شاید جوش تحسینی میں ”تو تراق“ والا جملہ لکھ گئے ورنہ وہ تو انتہائی دل جو آدمی ہیں اور علم کا ایک چاہ عمیق۔ دل آزاری سے ان کو دور کی بھی نسبت نہیں۔ آج تک انھوں نے اپنے تبصروں یا دیباچوں میں کسی انتہائی گئے گزرے شاعر کے بارے میں بھی کبھی یہ نہیں لکھا کہ اس کی تصنیف ایک عہد ساز تصنیف نہیں۔“ (۱۰۴)

”ان مباحث سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ نعت لکھنے سے قبل ہمیں عالم دین ہونے کی سند بھی حاصل کرنی چاہیے اور یہ بھی کہیں سے پتا کر لینا چاہیے

کہ ہم واقعی مسلمان ہیں کہ نہیں (یعنی ہر طرح سے راسخ العقیدہ) ڈاکٹر سید وحید اشرف کو اس حوالے سے پھنسا دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا ہے۔“ (۱۰۵)

”۔۔ ایک جملہ لکھنا چاہتا ہوں... جملہ تھا... ”ہم سب کو حکم ہے کہ کسی کام کو کرنے سے قبل بسم اللہ پڑھ لیا کریں۔“ اب مولانا کو کب نورانی نے اس میں کیا عیب ڈھونڈا اور کیا لکھا وہ پیش کر رہا ہوں۔ مولانا لکھتے ہیں، ”اس میں ”کسی بھی کام“ کے الفاظ محل نظر میں کیا۔ ایسا ہی حکم ہے؟ پھر آگے لکھتے ہیں کہ بسم اللہ کا حکم صرف جائز نیک اور صحیح کام کے لیے ہے۔ (یہاں میں بتا دوں کہ جملہ لکھتے وقت میرے ذہن میں صرف اچھے کاموں کا ہی تصور تھا۔ مگر مولانا نے ”کسی بھی کام“ میں جو رخنہ رہ گیا تھا اسے دیکھ لیا) افسوس وہ رائی کا پر بت بناتے ہوئے یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ دوسرے بھی نظر رکھتے ہیں۔“ (۱۰۶)

”آپ کا اس بار کا شمارہ صرف ۲۷۲ صفحات کا ہے۔ یہ اچھی بات ہے بس اس سے زیادہ ضخامت مناسب نہیں بلکہ کچھ اور کم کر دیں تو اچھی بات ہے۔ میٹرل جس قدر بہتر اور معیاری ہو اتنی اچھی بات ہے۔ پروفیسر شفقت رضوی سے مضامین لکھوائیں وہ بہت اچھا لکھتے ہیں مجھے ان کے ہاں بلا کی Read-ability ملتی ہے۔“ (۱۰۷)

”نعت گوئی کے ضمن میں، ایک بات کہنا چاہوں گا کہ نعتیں تو بہت سے شاعر لکھ رہے ہیں مگر یہاں بھی معیار کا مسئلہ رہتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ”نعت رنگ“ میں، نعت کا معیار ذرا سخت کیا جائے بھلے کم نعتیں چھاپیں مگر وہ عمدہ ہونی چاہئیں۔ شاعری کی جو صورت حال آج کل سامنے ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مشق کے سہارے یہ کام زوروں پر ہے۔ بہت سی نعتیں مشق کے سہارے کہی جا رہی ہیں یعنی ان کے اندر ادبی حسن کم کم ملتا ہے۔ ”نعت رنگ“ میں اس پہلو پر بھی توجہ دیں۔ ٹھیک ہے سارے شاعر تائب، مظفر وارثی، سلیم کوثر، نسیم سحر یا تمھاری طرح جیسے ٹیلنٹڈ (Talented) نہیں ہو سکتے مگر اس سے تو انکا کوئی نہیں کر سکتا کہ ہر ایک کے پاس ٹیلنٹ کا کچھ حصہ ضرور ہوتا ہے اور یہ کلام میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جب تک نعت میں نظر نہ آئے ”نعت رنگ“ میں

اسے جگہ نہ دی جائے۔ ضرورت quantity کی نہیں quality کی ہے۔“ (۱۰۸)

تفہیم و تحقیق نعت کے حوالے سے عزیز احسن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ نعت رنگ کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ مدیر نعت رنگ نے مجھے کی پہلی اینٹ انھی کے ہاتھوں سے رکھوائی تو بے جا نہ ہوگا۔ مدیر ”نعت رنگ“ سے دل اور گھر کی راہیں اتنی سٹی ہوئی ہیں کہ انھیں خط لکھنے کی نوبت ذرا کم ہی پڑی ہے۔ اسی وجہ سے ”نعت رنگ“ میں ان کے بہت کم خطوط جگہ پاسکے ہیں۔ بہر حال جتنے بھی خطوط موجود ہیں ان سے ان کے اور صبیح رحمانی کے مراسم پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے تمام خطوط سے ان کی نعت اور صاحب نعت V سے اٹوٹ محبت مترشح ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے نعت۔ اسی حوالے سے ان کے تعلقات استوار ہوتے ہیں اور اسی تناظر میں یہ شخصیت کو پرکھتے، جانچتے اور رائے قائم کرتے ہیں۔ یعنی ان کے تعلقات کا مرکز محور نعت ہے۔ گویا صبیح رحمانی اور عزیز احسن ایک جان دو قالب ہیں۔ ان کی شخصیت کی گرہ کشائی کرنے والے تین اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”نعت رنگ“ کتابی سلسلے کے اجزا کا تمہارا خواب ان شاء اللہ ضرور شرمندہ تعبیر ہوگا! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک تم خلوص سے اس کام میں منہمک رہو گے میں اپنا قلمی تعاون بھی جاری رکھوں گا اور بساط بھر دیگر امور میں بھی تمہاری معاونت سے روگردانی نہیں کروں گا۔ اللہ تمہیں عزم و حوصلہ عطا فرمائے اور نعتیہ شاعری کے لیے جو خلوص تمہارے دل میں پیدا ہو گیا ہے اس کی شمع ہمیشہ روشن رکھے۔“ (۱۰۹)

”کل رات تم سے skype پر رابطہ ہوا تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اب میری یہ کوشش ہوگی کہ قدما کی کچھ نعتیں تلاش کر کے ”نعت رنگ“ میں ایک ایک کر کے شائع کرواؤں تاکہ تذکروں، مثنویوں، دواوین اور دیگر علمی تحریروں میں چھپا ہوا نعتیہ ادب کا خزانہ بھی ”نعت رنگ“ میں محفوظ ہو جائے اور اس خزانے کو دیکھ کر اہل تحقیق کو مزید تحقیق کرنے کا حوصلہ اور ہمت ہو!“ (۱۱۰)

”ص ۵۵۵ پر جگہ جگہ نبی کریم V کے نام اقدس کے ساتھ ”ص“ کا لفظ دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ مکمل درود شریف لکھ کر حدیث میں بیان کردہ فضیلت حاصل

کرنی چاہیے۔ یہ حدیث پاک امام سخاوی نے ”القول البدیع“ کے ص ۴۶۰ پر نقل کی ہے، ”جس نے کتاب میں مجھ پر درود پاک لکھا تو جب تک میرا نام مبارک اُس میں رہے گا فرشتے اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے رہیں گے۔“ (۱۱۱)

کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جنہیں کارِ خیر کے لیے بارگاہِ رب العزت سے خصوصی طور پر مانگنا پڑتا ہے۔ ’نعت رنگ‘ اور تنقید نعت کے فروغ کے لیے کی جانے والی دعاؤں میں سے دو چار کا انتخاب کیا جائے تو سرِ فہرست نام ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا ہی ہوگا۔ کشفی صاحب بنیادی طور پر ایک استاد تھے اور مزاج میں بھی یہی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تحقیقی رسوخ اور تنقیدی شعور بلا کا تھا لیکن زندگی، انھوں نے کبھی ایک سمت کا تعین کر کے نہیں گزاری۔ مزاج کی رو جس طرف بہہ نکلی انھوں نے بھی اسی طرف رخ کر لیا۔ ان کا شمار ’نعت رنگ‘ کے چند معتبر ناقدین میں ہوتا ہے۔ ان کا صرف ایک ہی خط ’نعت رنگ‘ کی زینت بنا۔ اس خط کی پہلی سطر سے آخری سطر تک ہر عبارت سے محبت اور شفقت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ خط میں کئی مرتبہ عزیزم، مخدوم، میرے عزیز اور عزیز گرامی کے القابات مخاطب سے قلبی تعلق اور مشفقانہ رویہ کے غماز ہیں۔ پورا خط ایک مکالمہ ہے جو صبیحِ رحمانی سے کیا گیا ہے۔ اس مکالمے کے ذریعے انھوں نے اپنی یادوں کے نقوش کو از سر نو زندہ بھی کر دیا ہے اور معاصر شعرا کے تخلیقی رویوں پر خوبصورت انداز میں روشنی بھی ڈالی ہے۔ ان کا یہ خط، خط کیا ہے گویا ایک گفتگو ہے جس کے مخاطب بظاہر تو صبیحِ رحمانی ہیں لیکن اس کے پردے میں انھوں نے اپنے دل کے گوشوں کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ ہر شخص ان میں جھانک بھی سکتا ہے اور ان کے افکار و خیالات سے واقف بھی ہو سکتا ہے۔ خط سے چند سطر یہ بطور ثبوت پیش کی جاتی ہیں۔

”عزیزم! معلوم نہیں کہ حنیف بھائی نے کبھی تمہیں بتایا یا نہیں کہ ہم اس صدی کی پانچویں دہائی کے آغاز سے ایک دوسرے کے ساتھی اور دوست ہیں۔“

”تم کو نہ جانے کیوں یہ خیال آیا کہ میرے اور بھائی حنیف اسعدی کے درمیان کچھ معاملات ”من و تو“ ہیں۔“

”عزیزم! بات بھائی حنیف اسعدی تک محدود نہیں۔ ان سے پرانی دوستی ہے، دوستی نہیں بلکہ نیاز مندی۔“

”میں کہہ رہا تھا کہ صرف انھی شعرا کی نعت گوئی پر لکھ سکا ہوں جن کے مجموعوں پر مقدمے لکھے ہیں۔“

”حفیظ تائب صاحب سے میرے رشتے کو کچھ کچھ تم جانتے ہو۔ ان کی آنکھوں میں شبِ بیداری کے شاد بھی تم ہو۔“

”شاید تمہیں علم ہوا ہو کہ حضرت مولانا عبدالعزیز شرتی، اس سال شوال میں ہم سے رخصت ہو گئے۔“

ایک ہی خط میں اتنی بار مخاطب ایک استاد ہی کر سکتا ہے کیونکہ ساہا سال کی تدریس کے بعد مکالمہ شخصیت اور طبیعت میں رسوخ پا کر جزو لا ینفک بن جاتا ہے۔ (۱۱۲)

تحقیق و تدوین میں مشفق خواجہ کا نام آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے۔ ان کا ’نعت رنگ‘ میں ایک ہی خط شائع ہوا۔ بعض شخصیات کی زندگی اور فن ایک ہی سکے کے دو رخ ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب محقق تھے اور یہی خوبی ان کے خط کا وصف ٹھہری۔ پہلے ہی خط میں انھوں نے تنقید و تحقیق نعت سے متعلق اتنی معلومات دے ڈالیں جتنی پوری پوری کتاب پڑھنے سے بھی حاصل نہیں ہو پاتی۔ اس خط سے مشفق خواجہ کا مشفقانہ رویہ بھی سامنے آتا ہے۔ (۱۱۳)

ڈاکٹر معین الدین عقیل کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ عظمتِ رفتہ کی شائستگی، نفاست، رکھ رکھاؤ، وضع داری اور علییت ان کی شخصیت سے مخصوص ہے۔ ان کی شخصیت کا یہی پر تو ان کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ ایسے میں خطوط کو استثنائے حاصل ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب علم سے محبت ہی نہیں کرتے علم کے متلاشیوں سے بھی محبت کرتے ہیں اور ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں۔ ان کے خطوط میں ایک وضع دار انسان، شفیق استاد اور دور اندیش نقاد چلتا پھرتا نظر آتا ہے جو مدیر ’نعت رنگ‘ کی حوصلہ افزائی اور ’نعت رنگ‘ کی سمت نمائی کرنے میں کسی بجل کا مظاہرہ کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ (۱۱۴)

مظفر وارثی نعت کے معروف شاعر ہیں۔ ان کے خطوط کیا ہیں نرے واسوخت ہیں جن کا نشانہ محبوب نہیں اہل دنیا ہیں۔ چونکہ شاعر ہیں اس لیے خطوط میں نرگسیت کا اظہار یا تعلیٰ کا در آنا فطری امر ہے۔ ان کے خطوط پڑھ کر ایسا گمان گزرتا ہے کہ تمام عمر مخالفین سے لڑتے ہی گزری ہوگی۔ (۱۱۵)

’نعت رنگ‘ کی سب سے معروف شخصیت کو کب نورانی ادا کاڑوی کی ہے، جو اپنے ہر

خط میں ایک عالمانہ شان کے ساتھ موجود رہتے ہیں۔ ان کے خطوط پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ نعت رنگ کے دروازے پر کرسی بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ نعت رنگ کو موصول ہونے والی ہر تحریر کو خود وصول کرتے ہیں اور پھر اپنی اعتراض کی عینک سے تحریر کی ہر سطر، ہر عبارت اور ہر لفظ کا بغور معائنہ کرتے ہیں اور ان میں موجود قابل اعتراض مواد کو الگ کر کے اپنے کتاب خانے میں جا بیٹھتے ہیں اور ہر اعتراض کا کتابوں کے انبار سے جواب تلاش کر کے علمی دلائل و براہین کے اوزاروں سے آپریشن کر دیتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات آپریشن کرتے ہوئے لطیف اوزاروں کی بجائے کثیف آلات سے تحریروں کو ذبح کر ڈالتے ہیں۔

آج کے دور میں جب ہر شخص اپنی انا کے حصار میں مقید اور نرگسیت کے بوجھ تلے دبا خوش فہمیوں کے سراب میں مبتلا ہے، ایسے افراد جو مذہب کے کسی خاص طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، ان سے علمیت کی توقع رکھنا سراب کے پیچھے دوڑنے کے مترادف ہے۔ اس قطب الرجال کے موسم میں کوکب نورانی جیسی شخصیات غنیمت بھی ہیں اور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بھی۔ ان کے خطوط کا لب و لہجہ ایک طرف لیکن ان کے مطالعے کی وسعت سے کسی بھی طور انکا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نعت رنگ کے خطوط میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے خطوط مولانا کے ہی ہوتے تھے۔ جب ان کا خط شائع نہ ہوتا تو اس کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی تھی۔ نعت رنگ کے ایک شمارے میں ان کا خط شائع نہ ہوا تو حافظ محمد عطاء الرحمن قادری کو لکھنا پڑا:

”حضرت علامہ ڈاکٹر کوکب نورانی نے ”رضا کی زبان تمہارے لیے“ کے عنوان سے مدلل، مفصل اور مکمل مضمون تحریر فرمایا ہے اور مضمون کیا لکھا ہے تحقیق کا، تدقیق کا، علم اور حکمت کا دریا بہا دیا ہے۔ مولائے کریم انھیں مزید برکتیں عطا فرمائے۔ اس اعتراف کے ساتھ ساتھ اس محبت بھرے اعتراض کا حق ہم محفوظ رکھتے ہیں کہ اس مرتبہ انھوں نے خط تحریر نہیں فرمایا۔ ہم ان کے مکتوب کی کمی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔“ (۱۱۶)

اردو تحقیق میں قاضی عبدالودود کا نام ان کی تحقیقی نکتہ رسی اور اصابت رائے کے باوصف ایک قابل تقلید مثال بن گیا ہے۔ ان کی تحقیق نے دل جوئی اور دل گیری کی بجائے سخت گیری اور بت شکنی کی جو داغ بیل ڈالی اس سے اردو تحقیق کو اعتبار نصیب ہوا۔ صداقت اور بے باکی ان کی تحریر کا بنیادی وصف ہے۔ غالب، محمد حسین آزاد، مولوی عبدالحق اور خواجہ احمد فاروقی پر قاضی صاحب کے

تحقیقی مقالات ان کے مطالعے کی وسعت، نکتہ رسی اور اصابت رائے کا پتا دیتے ہیں۔ مولانا کوکب نورانی کے خطوط پڑھتے ہوئے قاضی عبدالودود کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس طرح قاضی صاحب کسی مسئلے کے بیان میں شواہد کا ڈھیر لگا دیتے تھے بعینہ مولانا کوکب نورانی ’نعت رنگ‘ کے مقالہ نگاروں کی لغزش قلم کا کڑا محاسبہ کرتے ہیں اور دلائل اور براہین کا انبار لگا دیتے ہیں اور معترضین سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ وہ بھی اسناد اور شواہد کی زبان میں گفتگو کریں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”میری تحریروں پر ناراض ہونے یا شکوہ کرنے والے اگر کوئی علمی، تحقیقی جواب

پیش نہیں کرتے تو ان کی ناراضی اور شکایت بے جا اور ناروا ہے۔“ (۱۱۷)

جس طرح قاضی عبدالودود کے سخت گیر مزاج، بے چلک رویے اور سخت گیر احتساب نے لوگوں کو تحقیق اور اسلوب دونوں میں محتاط رویہ اپنانے پر مجبور کر دیا تھا بالکل اسی طرح ’نعت رنگ‘ میں مولانا کی موجودگی سے مصنفین کی تحریروں میں غیر تحقیقی انداز، مبالغہ، ابہام اور جذباتی عنصر کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔

قاضی عبدالودود نے دوا کا پرشا و شعلہ کو ایک خط میں لکھا:

”میں علمی خطوط طویل لکھتا ہوں اور شوق مختصر“ (۱۱۸)

مولانا بھی طویل طویل خطوط لکھتے ہیں۔ نعت رنگ میں ان کا سب سے طویل خط سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اتنا ضخیم خط شاید ہی کسی مکتوب نگار نے تحریر کیا ہو۔ جس کو پڑھ کر اس پر خط کا نہیں بلکہ مقالے یا کتاب کا گمان گزرتا ہے۔ طول پسندی چونکہ خطیب یا مقرر کا وصف خاص ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے خطوط میں بھی اسی وصف نے اپنے اظہار کا راستہ تلاش کر لیا ہے۔ وہ ہر بات کے جواب میں طول پسندی میں لذت محسوس کرتے ہیں اور ہر واقعے کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ان کے سامنے سامعین نہیں بلکہ قارئین ہیں۔ ان کے خطوط میں طول کلام کی یہ خوبی اکثر اوقات عیب کا روپ دھار کر پڑھنے والوں کی طبیعتوں کو مکدر اور مغمض کرنے لگتی ہے۔

مذہبی معلومات اور فقہی معاملات میں ان کا مطالعہ اتنا وسیع اور ذہن اتنا راسا (حاضر) ہے کہ نعت رنگ میں ان کا کوئی حریف یا مد مقابل دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ اس حوالے سے وہ تمام مکتوب نگاروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ چونکہ ان کی پرورش ایک خاص ماحول کی پرورہ ہے اور ان کے تمام خطوط خاص مقاصد کے جبر میں جکڑے ہوئے ہیں اس لیے ان میں زندگی کی وہ

حرارت، اسلوب کی وہ لطافت اور بیان کی وہ شگفتگی جو متذکرہ بالا شخصیات کے خطوط کا وصف خاص ہیں، تلاشنا بے سود ہے۔ ہر خطِ علمیت کا ایک انبار لیے نعرہء منصور بلند کر رہا ہے۔ اگرچہ 'نعت رنگ' کے علاوہ دیگر خطوط سے میرے چشم و دل سیراب تو نہیں ہوئے لیکن ان کے 'نعت رنگ' میں شامل خطوط سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ یہ خطوط مدِ نعت رنگ کے نام لکھے گئے ہیں اور ان کے مخاطب نعت سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم و دانش ہیں جن کے مقالات اور خطوط تسامحات کے حامل اور وجہء نقطہء اعتراض ہیں، لہذا انھیں اپنے فرض منصبی کے ہاتھوں مجبور ہو کر دلائل و براہین کے ساتھ ع کون ہوتا ہے حریف۔۔۔ الخ کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔ مزید یہ کہ ان کے خطوط ایک ایسی صنف سے متعلق ہیں جس میں خفیف سی لغزش خواہ وہ خیال کی ہو یا زبان کی، قابل گرفت ہوتی ہے اس لیے ان کے خطوط میں صداقت کی خنکی اور لہجے کی کرتختگی شعوری عمل کا نتیجہ ہے۔ بوجھل منطق اور دقیق حقائق اگر مؤثر اور دل نشیں اسلوب میں جلوہ گر ہوں تو دلوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ یہی معاملہ مولانا کے خطوط میں سامنے آیا ہے۔ اگر ان کے خطوط میں سخن کا پردہ یافتن کا تماشا موجود ہوتا تو ان کے خطوط نعت رنگ کا شاہکار کہلائے جاسکتے تھے۔

خطوط میں ان کے علاوہ بھی علماء ادب، شعرا، محققین اور ناقدین کی ایسی کہکشائیں موجود ہیں جن کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں۔ ان میں ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحي، جمیل جالبی، احمد ندیم قاسمی، اسلوب احمد انصاری، انور سدید، تحسین فراقی، جگن ناتھ آزاد، حفیظ نائب، رفیع الدین اشفاق، شمس الرحمن فاروقی، شہزاد منظر، عارف نوشاہی، عبدالباری آسی، کالی داس گپتا رضا، محمد علی اثر، مختار الدین آرزو، ملک الظفر سہرامی، نجم الاسلام، وزیر آغا، تنکی خطی، اور ڈاکٹر یونس اسگر جیسی معروف شخصیات کے خطوط بھی شامل ہیں۔ ان خطوط میں بھی کہیں کہیں شخصیت کا کوئی گوشہ یا مزاج کی کوئی کرن اپنی جھلک دکھا ہی جاتی ہے۔ ان شخصیات کے خطوط کو بھی تجزیے کے حصار میں لایا جاسکتا تھا لیکن وقت کی کمی اور صفحات کی گنجائش اس ارادے کی تکمیل میں حائل ہی رہی۔

'نعت رنگ' میں کم و بیش دو سو اہل قلم کے خطوط شائع ہوئے ہیں۔ ان تمام خطوط کی زبان اور لب و لہجہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسلوب کا یہ اختلاف مکتوب نگاروں کے شخصی مزاج کی وجہ سے بھی پیدا ہوا ہے اور موضوع کی نوعیت کے حوالے سے بھی سامنے آیا ہے۔ اسلوب کا تنوع کسی سطح پر مستحسن اور کسی سطح پر غیر مستحسن ہو سکتا ہے۔ ایک ہی موضوع سے متعلق

تصنیف میں اسلوب کا تنوع مستحسن خیال نہیں کیا جاتا لیکن جب مختلف افراد کے ذہن و خیال کی کارفرمایاں ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں تو اسلوب کا تنوع پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ چونکہ 'نعت رنگ' میں شامل خطوط مختلف مزاجوں، طبقات، شعبوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے تحریر کردہ ہیں اس لیے ان خطوط میں اسلوب کی یکسانیت تلاش کرنا بے سود ہے۔ اس کے باوجود ان خطوط میں اسلوب کا تنوع بذات خود ایک خوبی بن گیا ہے۔

'نعت رنگ' میں شامل خطوط میں مقصد کے جبر میں جکڑا ہوا خشک اور روکھا پھیکا اسلوب بھی موجود ہے اور شعریت اور نغمگی میں ڈوبا ہوا لب و لہجہ بھی، سادہ، سلیس اور رواں اسلوب کی مثالیں بھی موجود ہیں اور مفرس و معرب الفاظ کے بوجھ تلے دبے ہوئے مرصع اور مقفی اسلوب کی شعوری کاوشیں بھی، بے تکلف اور بے ساختہ اسلوب کے اظہار کی صورتیں بھی جلوہ گر ہوئی ہیں اور تکلف اور تصنع کا شکار اسلوب بھی اپنا الگ رنگ دکھا رہا ہے، شگفتہ اسلوب بھی ذوقِ جمال کی آب یاری میں مصروف ہے اور طنز کے تیر و نشتر بھی اپنے اہداف پر کاری ضرب لگا رہے ہیں۔ ان مکتوبوں میں مکتوب نگار مکالمے بھی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنے برشِ قلم سے رنگ رنگ کے مرفعے بھی بنانے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ علمی، تحقیقی، تجزیاتی، جمالیاتی، جذباتی، فلسفیانہ، صحافتی، بیانیہ اور شاعرانہ اسالیب کے متنوع رنگ نئے نئے انداز اور نئے نئے طریقوں سے ان خطوط میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ کہیں گہرے اور کہیں ہلکے، کہیں تیز کہیں مدہم اور انہی رنگوں کے تال میل سے 'نعت رنگ' کی قوسِ قزح تشکیل پائی ہے۔ ذیل میں اسالیب کے ان تمام رنگوں سے کچھ رنگ کشید کر کے قارئین کے ذوقِ جمال اور حسن نظر کی نذر کیے جا رہے ہیں۔

ان رنگوں کو ملاحظہ کیجیے اور لطف اٹھائیے:

پہلا رنگ مکالمے کا ہے۔ اردو نثر میں غالب کے خطوط اپنی انفرادیت کے باعث خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں اپنے عہد کے مروجہ آداب سے الگ ایسا اسلوب وضع کیا جو ان ہی سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی وجہ سے غالب کا اسلوب ان کے معاصرین ہی نہیں متقدمین کے بھی جملہ اسالیب میں اپنی الگ اور منفرد پہچان رکھتا ہے۔ غالب نے ایک خط میں لکھا ہے:

”میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر

میں وصال کے مزے لیا کرو۔“ (۱۱۹)

’نعت رنگ‘ کے خطوط میں غالب کے انداز کی بھی کثیر جھلکیاں موجود ہیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی اور کا خط نہیں پڑھ رہے بلکہ غالب کا خط پڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے دو بطور مثال پیش کی سجاتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے اور معاصر غالب سے ملاقات کا لطف لیجیے:

(۱) ”تم نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا ہے کہ میں مرچکا ہوں تو یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں ہے۔ میں واقعی مرچکا ہوں مگر یہ بات خاصی فکر مندی کی ہے کہ تم زمانہ علالت میں آئے اور نہ بعد مرگ تعزیت کے لیے آئے۔ نہ پُر سادیا۔ نہ فاتحہ میں شریک ہوئے۔ یہ رسمیں میں نے اکیسے ہی ادا کیں۔ اب اگر کبھی جی چاہے آنے کو تو پتا وہی ہے اس لیے کہ جس گھر میں رہتا تھا وہی اب میرا مقبرہ ہے۔“ (۱۲۰)

(۲) اشتیاق طالب نے مجھ سے پوچھا کہ سنا ہے سحر روزے رکھ رہے ہیں۔ ”ہاں“ میں نے کہا۔ ”کیا نماز بھی پڑھتے ہیں“ انہوں نے پوچھا میں نے کہا ”ارے یار کیوں روزے بھی چھڑواؤ گے“ تم کہاں ہو۔ کہیں بھی ہو خوش رہو۔ شاید سحر کی طرح روزوں میں مبتلا ہو چلو یہ ابتلا اب ختم پر ہے دو تہائی سے تو فارغ ہو رہے ہو ایک تہائی اور ہے وہ بھی کٹ جائیں گے۔ میں تو اس نعمت سے محروم ہوں۔ شوگر کے مریض کو روزہ ممنوع ہے۔ معلوم نہیں کس وقت شوگر کم ہو جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔ میں روزے کا صدقہ دیتا ہوں شاید اسی طرح نجات ہو جائے۔ ویسے مجھے نجات کی زیادہ فکر نہیں ہے۔ جنت تو ملنے سے رہی۔ اعمال ایسے ہیں ہی نہیں۔ دوزخ اس لیے قریب نہیں آسکتی کہ اب ایسے بد اعمال بھی نہیں رہے۔ اس لئے برزخ پکٹی ہے۔ برزخ کے عادی بھی ہیں۔ اس لئے کہ زندگی میں رحمتیں بھی رہیں اور رحمتیں بھی اٹھانا پڑیں۔ چلو یہ تو میری کہانی ہوئی تمہارا فسانہ کیا ہے۔ تم تو جناتی ہو۔ اگر یہ میری خوش فہمی نہیں ہے تو پھر اسے میری دعا سمجھنا۔ (۱۲۱)

’نعت رنگ‘ کے خطوط اور ادارے اگرچہ خاص مقصد کے تحت زیورِ تحریر سے آراستہ ہوئے ہیں اس لیے ان میں ادبی اظہار کی مثالیں کثیر تعداد میں تلاش کرنا یا ابوالکلام آزاد کی سی

تحریر کے نمونے ڈھونڈنا بے سود ہیں لیکن اس کے باوجود ان خطوط میں آزاد، شبلی اور مہدی افادی کے اسلوب کی جلوہ گری بھی نظر آتی ہے اور حالی، نذیر احمد، سرسید کے اسلوب کی متحرک پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ’نعت رنگ‘ کے اداریوں کی اکثر عبارتیں سرسید کی طرح طویل طویل اور ایک ہی سانس میں لکھی گئی ہیں۔ صبیح رحمانی کی تحریریں پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن و دل میں بہت کچھ کہنے کی فکر ہے اور اس فکر میں خیالات کا ایک چشمہ ہے جو ان کے ذہن کے نہاں خانوں سے پھوٹ کر ’نعت رنگ‘ کے اداریوں میں طویل طویل جملوں کی صورت بہتا چلا جاتا ہے۔ صبیح رحمانی کے اداریوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ لمبے لمبے فقرے لکھتے ہوئے بھی اظہار و بیان کے پیرایوں کی طرف متوجہ رہتے ہیں لیکن جملوں یا فقروں کو بناتے ہوئے خیال کی ڈور کو ہاتھ سے ہرگز جانے نہیں دیتے۔ اس طرح ان کا اسلوب آزاد اور شبلی کے اسلوب سے گلے ملتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے اداریوں سے ایک پیرا گراف ملاحظہ کیجیے:

”ایک ایسے ماحول میں جہاں مذہب سے جڑی ہوئی اصناف پر گفتگو کے دروازے صرف خوفِ فسادِ خلق سے بند ہوں وہاں حمد و نعت کے ادبی پہلوؤں پر شریعت کے حوالے سے اپنا نقطہء نظر جرات، بے خوفی اور استدلال سے پیش کرنا اور پھر اس بات پر مختلف نقطہ ہائے نظر کے تناظر میں ہونے والے اعتراضات و اختلافات کو حوصلے اور تحمل سے سننا اور برداشت کرنا صرف اس لیے کہ نعت پر ادبی مباحث کے درکھلے رہیں اور صدیوں سے بند اس ایوان میں تازہ ہوا کے جھونکے آتے رہیں تاکہ ہمیں نعت کی علمی، ادبی، تہذیبی، جہات کا علم ہو اور ہم اس کے آداب کا شعور حاصل کر کے نعت کی حقیقی قوت کو جان سکیں اور اسے بروئے کار لا کر ایک مثالی معاشرے کی تعمیر کر سکیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں اور نہ ہمیں اس سے پہلے اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔“ (۱۲۲)

مندرجہ بالا پیرا گراف دیکھیے، مدیر ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہنے کی جلدی میں اظہارِ بیان کو مختصر کلموں میں تقسیم کرنے کی بجائے ایک ہی جملے میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کا بیان طویل تر ہو گیا ہے۔

صبیح رحمانی کی تحریر کا ایک وصف استدلال بھی ہے۔ وہ اپنی بات دلیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ سوال اٹھاتے ہیں اور اس کا جواب قارئین سے طلب کرتے ہیں

سوال کرنے کا یہ انداز دراصل قارئین کو سوچنے پر مجبور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ چونکہ ان کے مخاطب قارئین کے دل سے زیادہ ذہن ہیں اس لیے وہ اپنے ہر ادارے میں سوال چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کے اداریوں کا بنیادی مقصد نعت کے حوالے سے قارئین کی سوچ اور فکر کو بیدار کر کے سوچنے پر آمادہ کرنا ہے اس لیے ان کی تقریباً تمام تحریروں میں کسی نہ کسی انداز میں استفہام کا یہ انداز موجود ہے۔ ان کی ہر تحریر سوچنے پر مجبور کرتی ہے، سوال اٹھاتی ہے، زندگی اور ادب کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے جس طرف یا تو نظر نہیں پڑ پاتی یا ہم اس طرف دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ سوال اٹھاتے ہیں، پھر اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سوال کا ایک پہلو پھر خالی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ قارئین اس کا جواب خود تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ بعض اداریوں میں تو وہ پے در پے سوال کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا زرخیز ذہن سوالات پیدا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتا ہے۔ ان سوالوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ ان سوالوں کے پس پشت ان کا ایک مضطرب ذہن کام کر رہا ہے جو ہر لمحہ سوچ اور فکر کی نئی راہوں کی دریافت میں سرگرداں ہے۔ ایک پیرا گراف دیکھیے:

”یہ صدی نعت کی صدی ہے۔“ یہ عہد نعت کے فروغ کا عہد ہے۔ نعت پر جتنا کام اس دور میں ہو رہا ہے، گذشتہ ادوار میں نہیں ہوا۔ ان جملوں کی گونج آج کل ادبی حلقوں میں سنائی دے رہی ہے اور کسی حد تک ان میں سچائی بھی ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ کیا اس دور کو نعت کا دور کہنے والوں نے اپنے بڑے سے بڑے نعت گو کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے؟ کیا دیگر اصنافِ سخن کی طرح نعت کے فکری اور فنی پہلوؤں پر علمی مباحث کو فروغ دینے کی طرف توجہ کی گئی ہے؟ کیا تاریخ ادب کے مرتبین نعت نگاری اور نعت نگاروں کے فکرو فن اور ادبی حیثیت کو اجاگر کر رہے ہیں؟ کیا آج کسی اہم سرکاری اور غیر سرکاری ادبی کانفرنس میں کسی شاعر کو بحیثیت نعت نگار مدعو کیا جا رہا ہے؟ یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ حیرت اور دکھ تو اس بات کا ہے کہ آج نعت کو دوسرے درجہ کی صنفِ سخن سمجھ کر اس پر سرسری گفتگو ہو رہی ہے حالانکہ اس کا نعتیہ ادب اتنا ہی زندہ اور متحرک (ہے) جتنا کہ دوسری اصناف ادب۔ آج کا نعت گو مکمل عصری آگہی رکھتا ہے اور کرب ذات سے مسائل

کائنات تک غور کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسانیت کو درپیش مسائل کے حل کے لیے سیرت اطہر کو اس بے چین اور سکون کی طالب دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے کہ یہی راستہ ہے جو نسل انسانی کی بقا اور فلاح کا راستہ ہے۔ مسائل کائنات سے نبرد آزما دنیا اسلام اور رسول کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پناہ ڈھونڈ رہی ہے ایسی صورت حال میں ادبی تناظر میں نعتیہ ادب کا مطالعہ اس صنفِ سخن کے ساتھ ہی نہیں بلکہ پورے ادب کے ساتھ انصاف کے مترادف ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نقاد اس گراں مایہ نعتیہ سرمائے کو انتقاد کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے معنوی اور فنی پہلوؤں کو دیکھیں اور اس میں ہیئت کے تجربوں اور تازہ کاری کے رجحان کو نظر میں رکھ کر اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعین کریں۔“ (۱۲۳)

’نعت رنگ‘ کے خطوط میں ایک طرف لمبے لمبے فقرے اور جملہ درجہ کی مثالیں موجود ہیں تو دوسری طرف ان خطوط میں چھوٹے چھوٹے جملے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ چھوٹی چھوٹی جملوں میں کہے گئے اشعار ہیں جو شاعری سے مصافحہ کر رہے ہیں۔ اس طرح ان جملوں میں سہل ممتنع کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

۱۔ قلم کیسا ہے۔ تحریر کیسی ہے۔ مضمون کیسا ہے۔ سب کچھ گڑ بڑ ہے۔ سارا عالم گڑ بڑ ہے۔ اچھا چھوڑو سب پر مٹی پاؤ اور کبھی آجاؤ، صورت دکھا جاؤ۔ صورت دیکھ جاؤ جانے بعد میں صورت دیکھنے کے قابل بھی رہے یا نہ رہے۔ (۱۲۴)

۲۔ عزیز از جاں دوست اسید الحق قادری کی بغداد میں ناگہانی شہادت سے زندگی بے رنگ و نور ہوگئی ہے، کسی علمی کام میں بھی جی نہیں لگتا، ڈھیروں فون آتے ہیں، بیگانی آوازیں گویا سمع خراشی کرتی ہیں، اس لیے کبھی اٹھالیتا ہوں، ورنہ یوں ہی رنگ ہو کرتی ہے۔ اب نہ وہ زندہ دل ہنسی رہی، نہ وہ دیوار شکن قہقہے، نہ وہ علمی مباحثے رہے اور نہ راز و نیاز کی وہ باتیں۔ زندگی اتنی بدرنگ ہو جائے گی، کبھی سوچا نہ تھا۔ اب تو حال یہ ہے کہ

جب ترا نام لپیچے تب چشم بھر آوے
اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے

تم سے دل کو بہت رسم و راہ تھی اور اب بھی ہے، مگر تم اتنی دور ہو کہ تمہارے سینے سے لگ کر دل کا غبار بھی نہیں نکال سکتا۔ آج برطانیہ سے کچھ اہل علم ملاقات کے لیے آئے تھے، انھوں نے ایک بار پھر اسید میاں کا تفصیلی ذکر چھیڑ کر دل غم زدہ کو مضطرب کر دیا، کیوں کہ: عتاب کس کو ہے جو حال میر سنے (۱۲۵)

ادبی تحریر کو عام تحریر سے ممتاز کرنے والا وصف شاعرانہ وسائل کا ہے۔ یہ وسائل نثر میں شعریت پیدا کر کے اسے شعر سے قریب کر دیتے ہیں۔ تشبیہ، استعارہ، محاورہ، تراکیب، صنعتیں، وغیرہ جب کسی تحریر کا جزو بدن بن کر سامنے آتی ہیں تو وہ تحریر شاعری سے گلے ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، مہدی افادی، قاضی عبدالغفار، مثنیٰ سجاد حسین، ابوالکلام آزاد وغیرہ کی نثر اس کی روشن مثالیں ہیں۔ ’نعت رنگ‘ کے خطوط میں بھی اور اداریوں میں بھی انھی شخصیات کے اسالیب کی کرنیں چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ’نعت رنگ‘ کے مکتوب نگار اس چشمے سے سیراب ہوئے ہیں۔ انھی چشموں کی لہریں مختلف مکاتیب میں کروٹیں لیتی ہوئی دیکھی جاسکتی ہیں۔ انھی میں سے ایک انداز اشعار اور مصرعوں کو جزو تحریر بنا کر پیش کرنے کا ہے۔ یہ عمل مکتوب نگاروں نے اس خوبصورتی سے انجام دیا ہے کہ ان کی نثر پر شاعری کا گمان گزرتا ہے۔ مکتوب نگاروں نے بعض اشعار اور مصرعوں کو موقع و محل کی مناسبت سے اس خوبصورتی سے جزو تحریر بنایا ہے جیسے ایک صنایع کاری گریز یور میں گنیے جوڑ دیتا ہے۔ اسلوب کی اسی فن کارانہ مہارت کو دیکھ کر ذوق جمال ہاتھ اٹھا اٹھا کر داد دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

۱۔ سنا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں فون پر تصویر بھی آنے لگی ہے۔ اگر ایسا ہے تو گویا پوری ملاقات مگر ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے وہی بات ہو جائے گی گمر یہ بات ”معاملات“ کی ہے یا شعر کی زبان میں ”معاملہ بندی“ کی مگر اسکی پیروی کے لئے آدمی کا داغ ہونا ضروری ہے۔ (۱۲۶)

۲۔ عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ تم کو ایک علیحدہ سے دلچسپ خط لکھوں گا مگر بھائی کہاں کی رباعی کہاں کی غزل۔ معلوم نہیں تائش صاحب کا کیا حال ہے اور ہم میں سے کون پہل کرے۔ نمبر تو ان کا ہے مگر یہ حساب تو قضا و قدر کے پاس ہے اور کوئی نہیں جانتا۔ خط لکھ رہا ہوں اور تم نظروں کے سامنے ہو۔ ایسے اگر دھم سے جو آ جاؤ تو کیا ہو! (۱۲۷)

۳۔ حضرت سے دو روز سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ آئیں تو ان سے تمہارے یہاں آنے کے بارے میں استفسار کروں۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد۔ حالات ایسے ہیں کہ کچھ دن میں آنا جانا ناممکن ہو جائے گا اس لئے کہ دشوار تو اب بھی ہے۔ دیکھیں یہ حسرت کب پوری ہوتی ہے۔ (۱۲۸)

۴۔ میں آج کل ہاتھ سے تنگ ہوں۔ دوائیں بڑھتی جاتی ہیں اور آمدنی محدود ہے بہر نوع اللہ کا کرم ہے کہ ابھی تک کسی کے سامنے دست طلب دراز نہیں کرنا پڑا۔ (۱۲۹)

۵۔ میں آپ کے پرچے ”نعت رنگ“ کے عشاق میں سے ہوں اور اسی لیے غبار میر کی طرح دور بیٹھا ہوں۔ (۱۳۰)

ان خطوط میں کہیں کہیں ایسی عبارتیں بھی موجود ہیں جن میں پورا پورا شعر یا شعر کا ایک مصرع عبارت کا حصہ بن کر سامنے آیا ہے اور اس خوبصورتی سے آیا ہے کہ پڑھنے والوں کو تفہیم کی نئی منزل سے بھی آشنا کرتا ہے اور ان کے دلوں کو چھو کر بھی گزر گیا ہے۔ (حنیف اسعدی کی شخصیت کے بیان کے حصے میں پیش کیے گئے اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔) یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں:

۶۔ میں مولے قلم سے خط لکھ رہا ہوں کہ اس لیے کہ اب نیم ناپینا ہوں اور اپنا لکھا بھی پڑھا نہیں جاتا۔ دونوں آنکھوں میں موتیا تر آیا ہے۔ چشمہ بھی اتر گیا ہے۔ کل ایک آنکھ کا آپریشن کرانے جا رہا ہوں اور انشاء اللہ کل ہی واپس آ جاؤں گا۔ اب ٹیکنالوجی اتنی ترقی کر گئی ہے کہ چند منٹ میں کام تمام ہو جاتا ہے۔ گھر آ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ یہ ضروری نہیں کہ کل ہی تم وحشت زدہ ہو کر بھاگ لو۔ آرام سے کسی دن آ جانا۔ ویسے: عتاب تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

تم نے آنے کا وعدہ کیا تھا اس لئے یہ شکایت کر رہا ہوں ورنہ اس افراتفری کے ماحول میں کس کے پاس وقت ہے۔ ہاں مگر فون کی سہولت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے مگر اس کے لئے بھی فراغت درکار ہے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ عذر مل گئے معذرت کی ضرورت نہیں۔ مٹی پاؤ۔ (۱۳۱)

اشعار کی مثالیں گزشتہ صفحات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہاں طولی کلام اور

تکرارِ مباحث سے بچنے کے لیے اس کی مثالوں سے شعوری گریز کیا گیا ہے۔
 ’نعت رنگ‘ میں چھپنے والے خطوط علمی و ادبی حقائق کی گرہ کشائی کے ساتھ ساتھ اظہار و بیان کی لطافتوں سے بھی معمور ہیں۔ ان خطوط میں اسلوب کے طلسمی اظہار کے پیرائے قاری کے ذہن و دل پر اس طرح سحر طاری کرتے ہیں کہ قاری خوشی سے اُن دیکھی دنیاؤں میں اتر جاتا ہے اور علویت (Sublimation) کا ایک تاثر لے کر واپس لوٹتا ہے۔ ذیل کی چند مثالیں دیکھیے:

- ۱۔ آپ بجافرماتے ہیں کہ میں در ماندہ رہو کی طرح ڈیرہ غازی خان کے پس ماندہ جزیرے میں بیٹھ کر رہ گیا اور قافلہ شوق بہت آگے نکل گیا۔ (۱۳۲)
- ۲۔ ایک کائناتی سچائی اعتبار و اعتماد کی آخری سرحد بھی عبور کر جائے گی۔ کشور دیدہ و دل میں چراغ جلانے کا عمل بھی پوری آب و تاب سے جاری و ساری رہے گا۔ غزل اپنے بخت ہمایوں پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ غزل در حضور پر کاسہ بکف خیرات کی طلب گار ہے اور رہے گی۔ (۱۳۳)
- ۳۔ ’پروفیسر محمد اکرم رضا ہمارا سرمایہ افتخار ہیں، آقائے مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کے حوالے سے قلم اٹھاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کائنات کا سارا احسن ان کے قلم کے ہم رکاب بارگاہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں دست بستہ کھڑا ہو، لفظ لفظ میں موذت کے چراغ جل اُٹھتے ہیں۔ ہر چند یہ تصویر ادب بن جاتا ہے ورق ورق پر نجوم مہ و انجم اُمڈ پڑتا ہے۔ (۱۳۴)
- ۴۔ ان دنوں وطن عزیز ایسی سنگینوں سے دوچار ہے، جن کی تلخیوں میں نہ کوئی سائنسی تاویل کی کر سکتی ہے اور نہ کوئی شاعرانہ تعبیر۔ بس ایک ہی دیوار ہے جس سے دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے اور ایک ہی سایہ دیوار ہے جہاں ہر آلہ پاستا سکتا ہے۔ جانے والے مجھ سے کہیں بہتر تھے کہ انھیں اللہ تعالیٰ چند لمحوں میں، اپنے جوار رحمت میں لے گئے اور مجھے بہت کچھ سوچنے سمجھنے اور سنہلنے کے لیے مہلت دے دی کہ... عمل اور دعا کا وقت نزول بلا سے پہلے ہوتا ہے، اس کے بعد تو رضا کا مقام ہے۔ (۱۳۵)
- ۵۔ اردو کی شعری تہذیب میں عشق رسول ۷ کے موتیوں کی تلاش

اور اس ضمن میں غزل کا بھرپور حوالہ بذاتِ خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ جستجو اور تجسس کے نئے دروازوں پر دستک دینا بھی محقق کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ مبین مرزا مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے فکر و نظر کی پگڈنڈیوں پر آئے بکھیر کر ثقافت کے ان گنت رنگوں کو ایک تہذیبی اکائی میں جمع کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے اردو زبان کا خمیر بھی خاکِ مدینہ و نجف سے اٹھایا گیا ہے۔ اس کا پیش منظر ہی نہیں پس منظر بھی نور اسلام سے جگمگا رہا ہے۔ (۱۳۶)

۶۔ زندگی کے اس مرحلے پر جہاں میری تاریخ پیدائش ایک بھولا بسرِ خواب بن چکی ہے اور تاریخِ وفات ایک جیتی جاگتی حقیقت کی طرح میرے سامنے کھڑی ہے مجھے اپنی ان ادھوری چیزوں کو سمیٹنے کی فکر شدت اختیار کرتی جا رہی ہے جنہیں میں نے اپنی خواہشوں کی فہرست میں اولین جگہ دی ہوئی ہے۔ ”نعت رنگ“ اور تم سے مبارک تعلق کے حوالے سے میری زندگی میں جس طرح کی بہاریں اپنا رنگ دکھاتی رہتی ہیں اور مجھے سرخوش و سرمست کرتی رہتی ہیں اسی پر میں اپنے آپ کو اس حد تک تمھارا ممنون احسان سمجھتا ہوں کہ میں زندگی بھر تمھارا احسان اتارنے سے قاصر رہوں گا۔ البتہ اپنی بساط کے مطابق اپنی ٹوٹی پھوٹی کوششیں اپنی تسلی کے لیے ضرور کرتا رہوں گا۔ (۱۳۷)

۷۔ ”یہ ایکس ویں صدی کی پہلی دہائی ہے۔ نقد و نظر کے پیمانے بھی تبدیل ہو رہے ہیں، شہرِ ادب میں تازہ کاری کی مسلسل بارشوں سے فرسودگی اور بوسیدگی کا رنگ بھی اُتر رہا ہے۔ آج کی نعت اعلیٰ حضرت کے زمانے کی نعت سے بہت مختلف ہے۔ نعت کی کائنات بھی ہر آن پھیلتی جا رہی ہے۔ اگرچہ نعت گو کا اساسی رویہ وہی رہے گا جس سے ایوانِ نعت روزِ ازل سے گونج رہا ہے۔ لیکن سوچ اور اظہار کے ارتقائی سفر کے مختلف مراحل پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا، ہر زمانے کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں، اس کا ڈکشن بھی بڑی حد تک بدل جاتا ہے۔ آج کے نقاد کو بھی اُن گنت چیلنجوں کا سامنا ہے۔ اب ادبی منظر نامہ نئے رنگوں کی رنگ آمیزی سے بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ نعت وہ واحد صنفِ سخن ہے جس نے تمام اصنافِ سخن

میں اپنے وجود کو منوایا ہے حتیٰ کہ نثر میں بھی نعت کے خوب صورت نمونے مل جاتے ہیں۔“ (۱۳۸)

۸۔ آپ نے روشنی اور خوشبو کے جس مبارک سفر کا آغاز کیا ہے اس کی تحسین کے لیے میرے لفظ غریب لگ رہے ہیں مجھے..... ہاں! دلوں سے دلوں تک سفر کرتی محبت زاد کیفیتوں کی مہک قبول کیجیے کہ آپ ان خوش بخت خاک زادوں میں شامل ہو گئے ہیں عرش کے ستارے جن کی زندگی کوتاہی میں ڈھلتے دیکھ کر جگمگا اٹھتے ہیں نعت در حبیب ۷ پر پلوں سے دستک دینے کا عمل ہے۔ اس محبت نواز جستجو میں سچی نسبتوں کی خوشبو رنگ بھرتی ہے۔ سچائی کی توانائی کا رنگ اور محبت کی جہانگیر قوت کی ترنگ..... یہ پھولوں کی سوداگری ہے..... خوشبو جس کے سدا سنگ رہتی ہے..... آپ کا منور مجلہ ”نعت رنگ“ صادق نسبت کے جاوید رنگ سے مملو ہے اور نسبتیں بڑی لچ پال ہوتی ہیں۔ خود سے وابستہ لوگوں اور لمحوں کو مرنے نہیں امر کر دیتی ہیں..... کامرانی اور شادمانی بخش دیتی ہیں..... اس وقت شمارہ نمبر ۱۲ زیر مطالعہ ہے اور اس کی مہکار سے میرے چار سو بہار کے جاودانی رنگ بکھرنے لگے ہیں رنگ سچی امنگ سے پھوٹ رہے ہوں تو گفتگو کرنے لگتے ہیں اور اس گفتگو سے سرمدی سرور سے بھری خوش بو آنے لگتی ہے۔ آپ کا ادارہ اس معطر کیفیت سے سرشار ہے۔ (۱۳۹)

۹۔ ”نعت رنگ“ کا کتابی سلسلہ نمبر ۲ نظر نواز ہوا۔ سرورق دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ دل میں کیا کیا جذبات عقیدت بھڑکے۔ ذہن میں کیا کیا الفاظ محبت گونجے۔ روح نے کس کس طرح سرمستی میں رقص کیا۔ کالی کالی والے کے تصور میں بے ساختہ سرورق کو چوم لیا..... سرورق... انوار و تجلیات کی بارش۔ اس بارش میں ذات باری کی طرف سے اعلان کرتی ہوئی ٹھنڈی، بھینی خوشگوار و مشکبار ہوا..... ہوا کا اعلان... ذات بے نیاز کے اندازِ مخاطب کے والہانہ پن کا ترجمان ”ودفعنا لک ذکرک“ چمکتا دمکتا، ارفع و اعلیٰ، فضاؤں میں نور چھڑکتا ہوا مینار۔ خوش بوئیں لٹاتی ہوئی فصل بہار... علامتِ دلنشین... رحمت

للعالمین... درود و سلام ہوا اس رحمتوں کے تاج والے معراج والے نبی طاہر و مطہر پر اس کی آل پر، اس کے اصحاب پر اور اس کی ازواج پر ہے۔ (۱۴۰)

۱۰۔ غیر مشروط اور غیر متزلزل کو مٹ مٹ کا پہلا صلہ یہ عطا ہوتا ہے کہ تخلیقی سطح پر سوچ اور اظہار کے مقفل دروازے خود بخود کھلنے لگتے ہیں۔ تخیل کے پرندوں کو تازہ ہواؤں سے دائمی وابستگی کا ادراک ملتا ہے اور لفظ و معانی کی فضائے بسیط میں اونچی پرواز کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ ”نعت رنگ“ نے اپنے جس تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کے نقوش پا اتنے تابندہ اور روشن ہیں کہ بہت سے دوسرے ارباب و فاضل بھی سفر کے مراحل آسان ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ثنائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خنک ہواؤں کے قافلے کے رواں دواں رہنے کا چرچا خوش بوئیں ہی نہیں، دھنک کے رنگ بھی کرتے رہے ہیں۔ ”نعت رنگ“ کا شمارہ نمبر ۲۲ پھولوں کی اپنی خوش بوؤں، دھنک کے انھی رنگوں اور آفتابِ ادب کی اسی روشنی کا عکس جمیل نظر آتا ہے۔ (۱۴۱)

۱۱۔ جشن عید میلاد النبی ۷ کی آمد آمد ہے، پلوں پر ابھی سے اُن گنت ستارے جھلکانے لگے ہیں، نعتِ مسلسل کے سرمدی رنگوں کا شاداب موسم قریہ جاں میں ابھی سے خیمہ زن ہے، کشتِ دیدہ دل میں ابھی سے باؤ بہاری چل رہی ہے، شاخِ آرزو پر ابھی سے کلیاں مسکرانے لگی ہیں، صبحِ میلاد کی دل نواز ساعتوں کی پذیرائی کے لیے دل کی دھڑکنیں چشمِ محبت کی دہلیز پر ابھی سے سمٹنے لگی ہیں۔ صبا، خوش بو کے چراغ لے کر ابھی راہوں میں کھڑی ہے، تاریخ کائنات کے سب سے بڑے دن کے استقبال کے لیے عناصرِ فطرت رنگ و نور کی نئی پوشاک پہنے ابھی سے چشمِ براہ ہیں۔۔۔ ربیع الاول کے مقدس چاند کے طلوع ہونے میں ابھی چند روز باقی ہیں، خوشیوں اور مسرتوں کی دھنک سات رنگوں کا پرچم اٹھائے آسمانِ قلب و نظر پر جلوہ گر ہے۔ اے صبحِ میلاد کی نورانی ساعتو! ہم غلاموں کا سلام شوق قبول کرو۔ (۱۴۲)

مذکورہ بالا جیوگراف میں ادبی اور رومانوی اسلوب کی چند مثالیں بطور شہادت پیش کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اظہار و بیان کے خوبصورت پیرائے ”نعت رنگ“ کے خطوط کی زینت

بنے ہیں۔ جن کا بیان مزید طوالت کا باعث بن سکتا تھا لہذا انہی اقتباسات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
طنز ایک باشعور انسان کے ایسے رد عمل کو کہتے ہیں جس میں طنز نگار اپنے موضوع کے خلاف دلی بے زاری، نفرت اور اکتاہٹ کے جذبات کا شعوری اظہار کرتا ہے۔ طنز ایک ایسا احتجاج ہے جو انسانی رویوں کی کج روی کے خلاف کبھی دھیمے انداز میں اور اکثر اوقات بلند آہنگی کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ ایسا طنز جس کے پس پشت اصلاح کا عنصر کارفرما ہو، طنز نگار اسے ظرافت کی چاشنی میں ڈبو کر اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ طنز نگار کی ترشی اور تلخی ظاہر نہیں ہونے پاتی۔ طنز نگار انسانی زندگی اور معاشرے کی ناہموریوں کو اپنے طنزیہ نشتر سے جھنجھوڑنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے لیکن جب طنز نگار کے ذہنی رد عمل میں اصلاح یا ہمدردی کا عنصر کارفرما نہ ہو تو پھر اس کے طنز میں ترشی اور جھلاہٹ درآتی ہے۔ یہ تلخی اور جھلاہٹ زہر خند کا کام دیتی ہے۔ طنز نگار اپنے طنزیہ جملوں سے اپنے موضوع کو نیم بھل کر کے تڑپتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ ایک مشاق طنز نگار اپنے طنز کو اس خوبصورتی سے اظہار کی صلاحیت عطا کرتا ہے کہ اس کے طنز میں ”صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں“ کا گمان گزرنے لگتا ہے۔

’نعت رنگ‘ میں شائع ہونے والے خطوط مختلف مکاتب فکر اور نقطہ نظر کے حامل افراد کی طرف سے تحریر کیے گئے ہیں اس لیے ان میں مختلف اور متضاد خیالات کی کارفرمائی فطری امر ہے۔ اسی وجہ سے خطوط میں ترشی، تلخی اور طنز کا عنصر اظہار کی راہ پا گیا ہے۔ جب خطوط میں معرکہ آرائی، جذباتی طرز عمل یا ناقابل قبول ناہمواریاں موجود ہونے کی وجہ سے مکتوب نگاروں کے مکاتیب میں کہیں کہیں طنزیہ نشتریت بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ کہیں دھیمے سروں میں اور کہیں بلند آہنگی کے ساتھ۔ ذیل میں طنز کی چار مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ یہ بیان بتا رہا ہے کہ مضمون نگار اپنے ممدوح سے کس حد تک متاثر ہے۔

ظاہر ہے کہ اس تاثر کے تندہ بے مضمون نگار سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ معروضی انداز میں تنقید کا حق ادا کر سکے گا۔ (۱۴۳)

۲۔ اب ہم دوسرے تقریظی مضمون کی سمت رجوع کریں گے۔ یہ مضمون جناب پروفیسر منظر ایوبی کے زو قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک نعت ظاہر سلطانی کی

حمدیہ شاعری پر ان کی جانب سے نچھاور کیے ہوئے پھولوں جیسا ہے۔ اس میں بھی مضمون نگار اپنے ممدوح کے ”لب ولجہ کی پاکیزگی اور اسلوب کی طہارت“

میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اس حد تک اسے ممدوح کے کلام میں تلمیحی اشاروں کے غیر محتاط رویوں کا ذرا بھی پتا نہیں چل سکتا ہے۔ اس نے جوش عقیدت میں اپنے ممدوح کا یہ شعر بھی کوٹ کر دیا ہے۔۔۔ (۱۴۴)

۳۔ مظفر وارثی کینہ پرور آدمی نکلے۔ اُن سے وہ اعزاز ہضم نہیں ہوا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے اُن کو بخشا تھا۔ نعت جیسی صنف کے مصنف کا ایسی پست سطح پر اتارنا عجیب سا لگتا ہے۔ اخلاقیات کے موضوع پر بیسیوں اشعار کہنے والا شاعر اس قدر رکیک لہجہ اختیار کرے گا اس کا کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا۔ معلوم نہیں یہ کتاب تم نے مجھے بخش دی ہے یا محض پڑھنے کے لئے دی ہے۔ میں اس ”سند اس“ کو کہاں رکھوں۔ (۱۴۵)

۴۔ ان کے خلاف ایک ۷۵ سالہ بوڑھا ریٹائرڈ پروفیسر کیا اقدام کر سکتا ہے یہاں تو ان کا اَلو بولتا ہے جن کا علم ”حرف چند“ سے ماسوا اور وہ افلاطون، سقراط اور بقراط کے استاد بننے شہرت اور سونے بٹور رہے ہیں۔ جاہلوں کی قدر دانی ناشروں کی بے بسی ایڈیٹر کی جہالت کو دیکھتے ہوئے شرفا اپنی عزت اسی طرح بجا سکتے ہیں کہ ”کتا شاہی“ ریس سے خود کو دُور رکھیں۔ (۱۴۶)

نعت رنگ کے خطوط میں جہاں شخصی عناصر مرقعوں کی صورت جلوہ گر ہوئے ہیں وہاں منظر کشی کے کہیں دھندلے اور کہیں واضح نقوش بھی سامنے آئے ہیں۔ صرف ایک مثال دیکھیے۔ شفقت رضوی نے اس خوبصورتی سے دو مناظر کو صفحہ قرطاس پر الفاظ کے رنگوں سے منتقل کیا ہے کہ ہم اپنی چشمِ تخیل سے ان مناظر کو دیکھ بھی لیتے ہیں، ان میں اتر کر شریک بھی ہوتے ہیں اور لطف اندوز بھی۔

”میں نے کبھی کسی شاعر کے شعر پر سن کر داد نہیں دی لیکن جب کبھی اور جہاں کہیں لوک گیت سنے ہیں میں یا میرا دل رقص کنناں رہے۔ زندگی کی بھرپور کیفیت اور سچائی کی آخری حد کو دیکھنا ہو تو لوک گیت سنو۔ اس مضمون کے حوالہ سے سلیمان خطیب بہت یاد آئے۔ بہت پیارا شخص اور محبت کرنے والے دل کا مالک تھا۔ اس نے بتلایا تھا کہ وہ اور اس کی بیوی چوڑیاں، گہنے، کپڑے بطور سوغات لے کر گاؤں گاؤں گھومتے، جھونپڑے میں کسانوں کے مہمان بن

جاتے۔ ان کو روک کر لوک گیت سنتے، جو ہندی، مراٹھی، تیلگو، کوئی وغیرہ زبانوں میں ہوتے مفہوم کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے لیکن اس کے رنگ اور رس میں کھو جاتے۔ بے حال ہو کر ان کے تال و سر پر قرض کرتے۔ دو چار دن فطرت کی گود میں گزار کر لوٹتے تو سوغات ان کی امانت ان کے حوالے کر دیتے۔ سلیمان صاحب کا کئی برس دستور رہا کہ گرمی کے موسم میں میرے غریب خانہ پر سال میں ایک رات ضرور گزارتے۔ چاندنی رات میں گھر کی چھت پر فرش ہوتا قالیں اور گاؤں تک لگے ہوئے۔ چند حضرات باذوق محفل سجاتے۔ پہلے طعام ہوتا نوبت کے بعد محفل بجتی۔ حیدر آباد کے شاعر کلام پیش کرنے کے لیے بے تاب رہتے۔ میں منع کرتا اور سوائے سلیمان خطیب کے کسی کو سننا پسند نہیں کرتا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں زندگی [کا] جو رس ان کی شاعری میں تھا وہ اور کہیں نہیں ملے گا۔ ان کے تقابل میں نظیر [اکبر] آبادی آتے ہیں لیکن خطیب کی مٹھاس ان کے پاس بھی نہیں ہے۔ اردو کے تمام اساتذہ نے جوتشبیہات اور تمثیلے استعمال کیے ہیں ان کے مقابلہ میں خطیب کے تشبیہات اور قہقہے تو سب حقیر دکھائی دیں۔ محبوب کی یاد کے لیے کہتا ہے ”جیسے پکی دیوار میں کنکر دھسنے“ ہے اردو شاعری میں اس کا جواب؟ ان کی نظم پگڈنڈی بھی غضب کی چیز ہے کیا کیا نادر تشبیہات ہیں۔ میں ان کے بارے میں لکھنے کے لیے سوچتا رہا۔ میری نالائقی کہ میں لکھ نہ سکا۔ (۱۳۷)

(۴)

آخر میں ’نعت رنگ‘ کے حوالے سے چند سوالوں پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ’نعت رنگ‘ کا حاصل کیا ہے؟ اس سے پہلے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی سعی کی جاتی ہے کہ ’نعت رنگ‘ اپنی ابتدا ہی سے جو اہداف لے کر چلا تھا کیا وہ اہداف پورے ہو چکے ہیں؟ اور اگر پورے ہو چکے ہیں تو اب اس مجلے کا جواز کیا ہے؟ اور اگر وہ اہداف پورے نہیں ہو سکے تو ان کے اسباب کیا ہیں؟ ان سوالات کے جواب ذیل میں تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

’نعت رنگ‘ روز اول سے ایک ہی مقصد لے کر چلا تھا اور وہ تھا نعت کا فروغ۔ یہاں

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ’نعت رنگ‘ سے قبل جاری ہونے والے اور اس کے معاصر نعتیہ رسائل بھی تو اسی مقصد کے علم بردار رہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ’نعت رنگ‘ کے اجرا کا جواز کیا تھا؟ اس سوال کا جواب ایک اور سوال میں مضمر ہے اور وہ یہ کہ تخلیق نعت تو صدیوں سے ہو رہی تھی اور آج بھی تخلیق نعت کا یہ عمل ماضی کی نسبت کہیں زیادہ جاری و ساری ہے لیکن نعت اتنی قدیم اور طویل روایت کی حامی ہونے کے باوجود دیگر اصنافِ سخن سے پیچھے کیوں رہ گئی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کی تلاش ’نعت رنگ‘ کے اجرا کا باعث بنی۔ چنانچہ ان وجوہات کو تلاش اور اس کا تدارک کرنا ہی ’نعت رنگ‘ کا بنیادی مقصد قرار پایا۔ مدیر ’نعت رنگ‘ کا نقطہ نظر بھی یہی تھا کہ نعت کا فروغ محض تخلیق نعت سے نہیں بلکہ نعت کی ترقی اور فروغ میں حائل رکاوٹوں کے اسباب و علل تلاش کرنے اور صنف نعت میں پوشیدہ ان امکانات کو بروئے کار لانے میں مضمر ہے جسے نعت کی ایک صدی سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی تنقید تلاشنے میں ناکام رہی ہے۔ مدیر ’نعت رنگ‘ کے نزدیک یہ ذمہ داری تنقید اور تحقیق کی ہے۔ تحقیق نے وہ اسباب اور شواہد اکٹھے کرنے ہیں جو نعت کی ترقی میں حائل رہے اور تنقید نے ان تمام شواہد، اسباب اور مواد کا غیر جانبدارانہ، سائنسی اور معروضی مطالعہ کرنے اور تجزیے کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد نتائج سامنے لانا ہیں۔ لہذا ’نعت رنگ‘ میں نعت کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی مقالات کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ آغاز آغاز میں نعت کے حوالے سے لکھنے والوں کا ایک محدود طبقہ موجود تھا جو رفتہ رفتہ بڑھتا رہا اور آج صورت حال یہ ہے کہ ’نعت رنگ‘ کے لیے لکھنے والے محققین اور ناقدین کی بڑی اور نمائندہ آوازیں اس صف میں شامل ہو چکی ہیں۔ ان آوازوں نے نعت کو نئے نئے امکانات سے ہم کنار کیا اور نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ ’نعت رنگ‘ میں چھپنے والے مقالات کی وجہ سے تنقید نعت اور تحقیق نعت محدود اور مخصوص دائروں سے نکل کر وسعت اختیار کر گئی۔ آج نعت کو قدیم و جدید تمام اصولوں اور نظریات کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے۔ ہر وہ زاویہ نظر جو ادب کی تفہیم، تعبیر اور تشریح میں موجود عہد میں برتا جا رہا ہے، ان تمام زاویوں سے نعت کی قدر اور مقام متعین کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

’نعت رنگ‘ اپنے ابتدائی ادوار میں شخصیات پر تحقیق و تنقید کے گرد گھوم رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ مقالات کا رخ شخصیات سے موضوعات کی جانب مڑ گیا۔ گویا نعت کے موضوعات کا دائرہ پھیل کر مزید وسعت اختیار کر گیا۔ اگرچہ آج بھی ’نعت رنگ‘ میں شخصیات کے حوالے سے مقالات و مضامین تحریر کیے جا رہے ہیں لیکن ان کی تعداد ماضی کی نسبت نہایت کم ہے۔ اب ’نعت

رنگ کی تمام تر توجہ نعت کے موضوعات پر مرکوز ہو چکی ہے۔ آغاز آغاز میں 'نعت رنگ' کو موصول ہونے والے مضامین کی نوعیت سطحی ہوتی تھی لیکن اب بیشتر مضامین و مقالات میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہو چکی ہے۔ ان مقالات میں تحقیق و تنقید کا وزن خاصا وسیع ہو چکا ہے۔ پہلے 'نعت رنگ' کے مضامین اور مقالات میں تعارفی اور تقریبی عنصر بھی جھلکتا نظر آتا تھا لیکن اب تحریروں میں تنقیدی اور تحقیقی عنصر ہی مقالات کو محیط نظر آتا ہے۔ پہلے تنقید نعت میں خوف اور حد سے بڑھا ہوا محتاط رویہ دیکھنے میں آتا تھا لیکن اب بے خوفی، بے باکی اور غیر جانبداری کے اثرات غالب حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ پہلے فی حوالوں سے نعت کو دیکھا جا رہا تھا اب معیار ادبی اور فلسفیانہ ہو گیا ہے۔ پہلے اختلافی موضوعات پر زیادہ لکھا جا رہا تھا اور اب امکانی موضوعات پر غور و فکر کیا جا رہا ہے۔ غرض یہ کہ اب نعت کے اختلافی موضوعات، جہتوں، ممنوعات، محسنات، معائب، محاسن اور نظری اور عملی حوالوں سے لکھا جا رہا ہے۔

معاصر عہد میں نعت کی تحقیق اور تنقید مقالات سے قدم آگے بڑھا کر مربوط اور مبسوط کتابوں کو محیط ہو چکی ہے۔ اب نعت کے موضوعات پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ نعت نگاروں پر کتابیں مرتب ہو رہی ہیں۔ تذکرے لکھے جا رہے ہیں۔ تاریخوں کا ڈول ڈالا جا رہا ہے۔ نعت کی تحقیق و تنقید کا دائرہ غیر سندی تحقیق سے قدم بڑھا کر سندی تحقیق و تنقید تک پھیل گیا ہے۔ اب مختلف جامعات میں نعت سے متعلق ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح کے میسوں مقالات لکھے جا چکے ہیں اور ہنوز جاری ہیں۔ غرض یہ کہ نعت کو تحقیق و تنقید نے نعت کے موضوع کو پورے طور پر اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ ذیل میں تنقید و تحقیق نعت کی چند جہتوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

تذکروں میں مدحت نامہ مرتبہ صبیح رحمانی؛ وفیات نعت گویان پاکستان مرتبہ ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیم؛ کراچی کا دبستان نعت مرتبہ منظر عارفی؛ مناقب امام حسین اور شعرائے کراچی مرتبہ منظر عارفی؛ تذکرہ نعت گو شعراء مرتبہ ابوسلمان شاہ جہان پوری؛ نعت کے شعرائے متقدمین مرتبہ شمیم احمد گوہر؛ تذکرہ شعرائے بدایوں دربار رسول میں مرتبہ ڈاکٹر شمس بدایونی؛ بارگاہ رسالت کے نعت گو مرتبہ ڈاکٹر شہزاد احمد؛ تذکرہ نعت گویان راولپنڈی مرتبہ قمر عینی؛ نعت گویان بریلی مرتبہ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب؛ شعرائے امرتسر کی نعتیہ شاعری مرتبہ محمد سلیم چودھری؛ کاروان نعت کے حدی خواں مرتبہ پروفیسر محمد اکرم رضا؛ تذکرہ نعت گویان اردو مرتبہ پروفیسر سید یونس شاہ گیلانی، اول و دوم؛ غیر مسلموں کی نعت گوئی مرتبہ راجا رشید محمود؛ خواتین کی نعت گوئی مرتبہ

راجا رشید محمود؛ پاکستان کے نعت گو شعرا از سید محمد قاسم تذکرہ شعرائے جماعتیہ از صادق محمد قصوری؛ محمد کے غیر مسلم مداح اور ثنا خواں از عنصر صابری؛ عصر حاضر کے نعت گو، اول و دوم از گوہر ملیانی؛ تذکرہ نعت گویان اردو از سید یونس شاہ وغیرہ

نعت کی ادبی تاریخوں میں آنحضرت کے دور کی نعتیہ شاعری از بخت آور؛ عہد نبوی کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر شاہ محمود تبریزی؛ اردو میں نعت گوئی از ڈاکٹر ریاض مجید؛ اردو میں نعتیہ شاعری از ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق؛ اردو شاعری میں نعت گوئی از ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی؛ اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر طلحہ رضوی برق؛ اردو شاعری میں نعت (ابتدا سے محسن تک) از ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری؛ اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر فرمان فتح پوری؛ اردو نعت تاریخ و ارتقا از فضل فتح پوری، افضال حسین نقوی وغیرہ

علاقائی تاریخوں میں پاکستان میں نعت از راجا رشید محمود؛ اردو نعت پاکستان میں از ڈاکٹر شہزاد احمد؛ پاکستان میں اردو نعت از عزیز احسن؛ چکوال میں نعت گوئی از عابد منہاس؛ نعت حضور اور سرگودھا کے شعر از شا کرکند ان؛ کراچی کے نعت گو شعرا از شا کرکند ان؛ سندھ کے نعت گو شعرا از شا کرکند ان؛ راولپنڈی کے نعت گو شعرا از شا کرکند ان؛ اسلام آباد کے نعت گو شعرا از شا کرکند ان؛ چکوال میں نعت گوئی از عابد منہاس؛ پاکستان کے نعت گو شعرا از سید محمد قاسم؛ ہندوستان اور پاکستان کی اردو نعت کا تقابلی مطالعہ از قریشیہ بانو؛ وغیرہ۔

نعت کے موضوعات، رجحانات، اسالیب اور ہیئتوں پر بھی کئی کام سامنے آئے۔ ان میں اردو نعت کے موضوعات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ از شمیم اختر خاتون؛ اردو نعت میں غیر اسلامی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ از محمد کا کا خیل؛ اردو نعت کا موضوعاتی و تنقیدی مطالعہ، اردو نعت گوئی میں قرآن و حدیث کی تبلیغات، اردو نعت اور جدید اسالیب از ڈاکٹر عزیز احسن؛ اردو نعت کا ہیئت مطالعہ از ڈاکٹر افضال احمد انور؛ اردو نعت کا صنفی و ہیئت مطالعہ از ڈاکٹر بشکیلہ خاتون؛ نعتیہ شاعری اور ہیئت تجربے از صبا علیم نویدی؛ نعت اور جدید تنقیدی رجحانات از کاشف عرفان؛ اردو نعت کے جدید رجحانات از آنسہ شوکت چغتائی؛ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ اردو نعت کے حوالے سے سندی مقالات بھی تحریر کیے گئے۔ ان میں اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ از رشید وارثی؛ اردو کا نعتیہ ادب از ڈاکٹر شمیم احمد گوہر؛ اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایات کا اثر از ڈاکٹر عاصی کرناٹی؛ اردو نعتیہ ادب کے تنقیدی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر عزیز احسن؛ اردو نعت کا تحقیقی و

تنقیدی جائزہ از ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، وغیرہ۔

شخصیات کی نعت گوئی کے حوالے سے سندھی اور غیر سندھی تحقیقی و تنقیدی اور مرتبہ کتب کی اشاعت عمل میں آئی۔ خاص طور پر اردو شاعری کی بڑی آوازوں کو بطور نعت گو متعارف کروایا گیا۔ خاص طور پر غالب، محسن کا کوری، اقبال اور احمد رضا خان کی نعتیہ شاعری پر کتب سامنے آئیں۔ مرزا غالب کی نعتیہ شاعری از رفیع الدین اشفاق؛ غالب اور ثنائے خواجہ مرتبہ صبیح رحمانی؛ محسن کا کوری کی نعتیہ شاعری از عبدالنعم عزیزی؛ کلام محسن کا کوری۔ ادبی و فکری جہات مرتبہ صبیح رحمانی؛ اردو نعت گوئی اور فاضل بریلوی از عبدالنعم عزیزی، مولانا احمد رضا خان بریلوی کی نعتیہ شاعری از سراج احمد قادری؛ احمد رضا کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر سراج احمد بستوی؛ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان اور ان کی نعت گوئی از ڈاکٹر سید جمیل الدین راٹھوی؛ حضرت رضا بریلوی بحیثیت شاعر نعت از ڈاکٹر محمد امام الدین؛ امام احمد رضا خان۔ حیات اور کارنامے از ڈاکٹر طیب علی رضا انصاری؛ اردو نعتیہ شاعری میں مولانا احمد رضا خان کی انفرادیت و اہمیت از ڈاکٹر تنظیم الفردوس؛ امام احمد رضا خان کی نعتیہ شاعری میں عشق رسول کا عنصر از ڈاکٹر محمد آدم یوسف شیخ؛ کلام رضا۔ فکری و فنی زاویے مرتبہ صبیح رحمانی؛ اقبال کی نعت۔ فکری و اسلوبیاتی مطالعہ مرتبہ صبیح رحمانی وغیرہ۔

نعتیہ شاعری کی کم اہم آوازوں میں ادیب رائے پوری۔ تخلیقی، تحقیقی خدمات کا جائزہ از ڈاکٹر شہزاد احمد؛ عزیز الدین خاکی۔ تخلیقی، تحقیقی خدمات کا جائزہ از ڈاکٹر شہزاد احمد؛ سید ریاض حسین زیدی کی نعتیہ شاعری از نوید عاجز؛ سید ناصر چشتی کی نعتیہ شاعری از طارق عزیز بھٹنڈارا؛ حافظ مظہر الدین مظہر کی نعت گوئی از عتیق محمد عبداللہ وغیرہ پر کتب اہمیت کی حامل ہیں۔

’نعت رنگ‘ میں مختلف شخصیات کے گوشے بنائے گئے تاکہ ان شعرا کو ایک طرف خراج تحسین پیش کیا جاسکے اور دوسری طرف ان کا شاعرانہ مرتبہ بھی متعین کرنے میں مدد مل سکے۔ ان گوشوں کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ اس وقت ترتیب دیے گئے جس وقت ان شعرا کے دوابن سامنے نہیں آئے تھے۔ ان شعرا میں ڈاکٹر سید آفتاب احمد نقوی، آفتاب کریمی، ابو الخیر کشفی، ڈاکٹر اسلم فرخی، افتخار عارف، حافظ لدھیانوی، حفیظ تائب، خورشید رضوی، سحر انصاری، سلیم کوثر، شبنم رومانی، شوکت عابد، شبیا حیدری، صبا اکبر آبادی، غالب، والی آسی، یعقوب لطیف، انور شعور، جلیل عالی، سید ضیاء الدین نعیم اہمیت کے حامل ہیں۔

نعت نگاروں اور نعت کاروں کے خاکوں کو بھی نعت رنگ کی زینت بنایا تاکہ پیغمبر

اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرقع نگاروں کی زندگیوں کے نقوش کو ’نعت رنگ‘ کی زینت بنا کر انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ شعرا کے خصوصی گوشے بنوائے، خاص نمبر شائع کیے۔ اسی طرح ’نعت رنگ‘ میں مشاہیر علم و ادب سے انٹرویو کا سلسلہ بھی شروع کیا تاکہ معروف قلم کاروں کے خیالات، افکار اور تاثرات نعتیہ ادب کے حوالے سے سامنے آئیں۔ غرض یہ کہ نعت کو ہر طرح ہر جہت اور ہر پہلو سے ثروت مند بنانے کی کوششیں کی گئیں۔

صبیح رحمانی نے نعت کی ادبی شناخت کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے نعتوں کے منظوم تراجم کا سلسلہ شروع کیا۔ اردو کی بہترین نظموں کا انگریزی ترجمہ کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا تاکہ نعت کی ادبی شناخت کا دائرہ وسیع تر ہو سکے۔ اسی طرح نعت کو مخصوص ہیئت جکڑ بندیوں سے آزاد کروانے کے لیے اردو نعتوں میں ہیئت تنوع کے فروغ کی کوششیں کیں تاکہ جدید اصناف میں مدحت گری کے خدو خال کو بہتر طور پر اجاگر کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ’نعت رنگ‘ کے تیسرے ادارے میں نعتیہ سائیٹ، واکا، ہائیکو، دوہے، نعتیہ کافیوں اور نعتیہ گیت کو تخلیقی سطح پر برتنے کا مشورہ دیا۔ (۱۴۸)

مذکورہ بالا مباحث کے نتیجے میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ ’نعت رنگ‘ نے اپنے ہم عصر نعتیہ رسائل ہی میں نہیں ماضی کے نعتیہ رسائل میں بھی اپنی الگ اور منفرد شناخت قائم کر لی ہے۔ ’نعت رنگ‘ میں شائع ہونے والے تحقیقی اور تنقیدی مقالات میں جو گہرائی اور گیرانی نظر آتی ہے وہ اس کے معاصر اور ماقبل نعتیہ رسائل میں دیکھنے میں نہیں آتی۔ ’نعت رنگ‘ سے قبل نعت کا فروغ انفرادی معاملہ نظر آتا تھا لیکن اس مجلے کی کاوشوں نے اسے عوامی معاملہ بنا کر اپنے گرد اہل علم اور اہل قلم مصنفین کا کثیر حلقہ جمع کر لیا ہے۔ یہ حلقہ ہندوستان اور پاکستان میں ہی موجود نہیں بلکہ اطراف عالم میں پھیلا ہوا ہے۔ اس حلقے کے تنقیدی و تحقیقی فکرو خیال نے اس مجلے کو محدود فضا سے نکال کر فضا بے بسیت سے ہم کنار کر دیا۔ جدید ادبی منظر نامے سے کشید کردہ نظریات سے تنقید نعت کو اس طرح فیض یاب کیا ہے کہ اب تنقید نعت کسی معذرت خواہانہ رویے کی حامل نہیں رہی ہے۔ اب نعت دیگر مروجہ اصناف سخن کے مقابل اپنے فنی اور فکری حوالوں سے تخلیقی شاعری کا ایک معتبر حوالہ بن کر سامنے آگئی ہے اور دیگر مروجہ اصناف سخن کے مقابل اعتماد کے ساتھ کھڑی نظر آتی ہے۔ اور جہاں تک نعت کی تحقیق و تنقید کا تعلق ہے۔ نعت پر لکھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہو گیا ہے۔ اردو کی ادبی تحقیق و تنقید کی بڑی آوازیں اب تنقید و تحقیق نعت کے فروغ میں اپنا اپنا حصہ ڈال رہی

ہیں۔ جس کے باعث نعت اور تنقید نعت جو دودھائیوں قبل تنہائی کا شکار نظر آتی تھی اب اردو ادب کی انجمن میں آ بیٹھی ہے۔ 'نعت رنگ' نے مکتوب نگاری کو فروغ دے کر مکتوبی تنقید کو آگے بڑھایا ہے۔ 'نعت رنگ' میں چھپنے والے خطوط مکتوبی تنقید کا ایک وسیع سرمایہ ہیں۔ یہ مکتوبات مستقبل میں تنقید نعت کو راستہ بھی دکھائیں گے اور تنقید نعت کے نئے امکانات کو تلاش کرنے میں بھی مددگار ہوں گے۔ 'نعت رنگ' کو اعتبار و افتخار عطا کرنے میں جہاں اہل علم و اہل قلم قارئین کا ہاتھ رہا ہے وہاں سب سے اہم کردار مدیر نعت رنگ کا ہے جن کی مجتہدانہ کوششوں نے تنقید نعت میں روشن خیالی، رواداری، اور غیر جانبداری کو فروغ دے کر 'نعت رنگ' کو ماضی کی تاریک راہوں سے نکالا اور پھر اسے مستقبل کی روشن راہ گزر پر محو سفر کر دیا۔ جس کے باعث 'نعت رنگ' جو ماضی میں ایک جوئے کم آب تھی اب بحر بے کراں بننے جا رہی ہے۔

(۵)

یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ تمام ابواب کم و بیش دو شخصیات کے خطوط سے کشید کردہ ان علمی نکات پر مشتمل ہیں جو مدیر نعت رنگ کو تحریر کیے گئے ہیں۔ یہ تمام خطوط مطبوعہ ہیں اور موضوعی نوعیت کے حامل ہیں، جن کا محور صنف نعت اور متعلقات نعت ہے چنانچہ ان خطوط سے نعت سے متعلق کم و بیش تمام نکات قطرہ قطرہ علیحدہ کر کے مختلف موضوعات کے تحت بنائے گئے ابواب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پھر اس باب سے متعلق ضمنی نکات کو عنوانات قائم کر کے اہل علم و دانش کے فکر و ذوق کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ اس طرح 'نعت رنگ' میں شائع ہونے والے تمام خطوط میں موجود تقریباً تمام ہی نکات سامنے آ گئے ہیں۔ اس طریق کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ کسی ایک ہی موضوع کے تحت مختلف اہل دانش نے جو کچھ سوچا، سمجھا، اخذ کیا یا تحریر کیا، اس سے ایک ہی کتاب میں استفادہ ممکن ہو گیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب سے تمام نقطہ ہائے نظر سے استفادہ کے لیے مختلف تصانیف کو حاصل کرنے اور پھر اس کا مطالعہ کرنے کی لکھیر سے نجات ملے گی۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ 'نعت رنگ' میں چھپنے والے خطوط کی اہمیت بھی سامنے آئے گی۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ کم و بیش وقت میں نعت کے مختلف پہلوؤں پر اہل قلم کی آراء سے استفادے کا موقع ملے گا۔

'نعت رنگ' میں چھپنے والے خطوط چونکہ مختلف افراد کے ذہن و فکر کے زائندہ ہیں اور یہ تمام افراد کسی مخصوص دبستان تنقید یا مکتب فکر سے تعلق نہیں رکھتے اس لیے ان کے خیالات میں یکسانیت تلاش کرنا یا ان میں منضبط انداز ڈھونڈنا بے سود ہوگا۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے

کہ بعض مقامات پر ایک ہی عنوان کے تحت دو بالکل مختلف یا جزوی مختلف آراء یا نقطہ نظر سامنے آ گئے ہوں۔ اس کا مقصد قارئین کو ذہنی پریشانی میں مبتلا کرنا ہرگز نہیں بلکہ اس کا مقصد قارئین کے لیے ایک ایسی سہولت فراہم کرنا ہے جس کے ذریعے مختلف الخیال، مختلف المراج یا مختلف مکاتب فکر کے حامل افراد کے نقطہ ہائے نظر ایک ہی کتاب میں سامنے آ سکیں تاکہ قارئین ان کا آزادانہ مطالعہ کرنے کے بعد نتائج کا استخراج بھی خود ہی کر سکیں۔ تحقیق و تنقید کی دنیا میں اس طرح کی سہولت بہت کم دستیاب ہوتی ہے۔ کیونکہ تمام مختلف الخیال اہل قلم کی آراء کا کسی ایک کتاب میں فراہم ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب اس مشکل کا حل پیش کرے گی۔

ایک ہی کتاب میں کسی موضوع سے متعلق مختلف خیالات، نظریات، افکار کا جمع ہونا امر محال تو نہیں لیکن اس بات کا قوی امکان ہے کہ مرتب اپنی پسند و ناپسند، یا ذاتی نقطہ نظر کے زیر اثر کچھ خیالات کو کتاب میں شامل کرنے سے گریز کرے یا حقائق کو توڑ مروڑ کر یا جزوی صداقت کے ساتھ پیش کرے۔ ایسی صورت میں مخالف نقطہ نظر سے مکمل طور پر استفادہ ممکن نہیں رہتا۔ راقم الحروف نے اس کتاب کو ترتیب دیتے ہوئے کسی ایک نقطہ نظر کے پلڑے میں اپنی پسند و ناپسند کا وزن ڈال کر اس کو اہمیت دینے یا فوقیت دلانے کی کسی بھی کوشش سے گریز کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ تاکہ تمام آراء بغیر کسی قطع برید کے من و عن سامنے آجائیں۔ قارئین ان کا مطالعہ کریں، ان سے استفادہ کریں اور ان سے نتیجہ اخذ کریں۔

پہلے باب کا عنوان 'نعت: تعریف، تقاضے اور روایت' ہے۔ اس باب میں نعت کے نظری مباحث کو یکجا کیا گیا ہے۔ نعت کیا ہے؟ بطور صنف سخن اس کی حیثیت کیا ہے؟ نعت کی اہمیت کیا ہے؟ نعت کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں؟ اور کیا ہونی چاہئیں؟ نعت گو کے لیے کن کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے؟ اور وہ کون سی شرائط ہیں جن کو بروئے کار لا کر ایک معیاری نعت تخلیق کی جاسکتی ہے؟ نعت کا دیگر اصناف سے تعلق کیا ہے؟ تخلیق نعت اور تنقید نعت کے مضمرات اور مسائل کیا ہیں؟ اس باب میں نعت کی روایت پر بھی خیالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ غرض یہ کہ نعت سے متعلق اہل علم اور اہل قلم کے خیالات، افکار، نظریات، تاثرات، نقطہ ہائے نظر اور تحقیقات کو اس باب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

دوسرا باب 'نعتیہ ادب: تحقیق و تنقید' ہے۔ اس باب میں نعت سے متعلق ناقدین اور

محققین کی تحقیقی و تنقیدی تحریروں کو پیش کیا گیا ہے۔ نعت سے متعلق اہل قلم کی تحقیقات میں موجود فروگزاشتیں، تسامحات، غلط انتسابات، غلط فہمیاں، غلط حقائق، ٹھوکریں اور جزوی سچائیوں کا بیان بھی ہے اور ان کی اصلاحات، تصحیحات، تردیدات اور حقائق کا بیان بھی۔ تجزیے بھی ہیں اور تنقید بھی۔

تیسرا باب 'نعت گوئی: اصلاح سخن کی چند نمایاں صورتیں' ہے۔ اس باب میں نعت کی اصلاح کے حوالے سے ناقدین کی شعری اصلاحوں کو یکجا کیا گیا ہے۔ 'نعت رنگ' میں چھپنے والی نعتوں کو اہل قلم نے جس انداز میں دیکھا، سمجھا اور برتا ان تمام کا بیان اس باب میں موجود ہے۔ یہ باب اس کتاب کا حاصل بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ باب تنقید نعت کی عملی صورتیں پیش کرتا ہے۔ اس باب سے ایک طرف نعت کی فکری پرکھ کے انداز سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف نعت کے متنوع فنی اور لسانی مسائل پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ اس باب میں بعض مثالیں تکرار کے ساتھ درج ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکتوب نگار نے کسی شعر کی پرکھ کرتے ہوئے ایک ہی عبارت میں دو دو تین تین معائب کی نشان دہی کر دی ہے اس لیے ایسی مثالیں دو تین عنوانات کے تحت درج ہو گئیں ہیں۔ مزید یہ کہ ممکن ہے بعض مثالیں ایک ہی عنوان کے تحت مکرر درج ہو گئی ہوں۔ اس کا سبب وقت کی کمی ہے۔ مختلف مقامات پر جارحانہ، تاثراتی اور یک طرفہ انداز بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ تنقید کا یہ انداز اگرچہ غیر مستحسن گردانا جاتا ہے لیکن چونکہ یہ انداز تنقید نعت کی کسی ایک جہت یا پہلو کو سامنے لاتا ہے اس لیے اس کی اہمیت سے بھی کسی طور انکار ممکن نہیں۔

اگرچہ شاعری کے عروضی اور فنی مطالعے سے متعلق تو متعدد کتب تصنیف اور ترتیب دی گئی ہیں لیکن کم و بیش دو صدیوں پر محیط اردو شعری تنقید کی روایت میں ایک بھی کتاب ایسی موجود نہیں جس میں نعت کا فکری، فنی اور لسانی مطالعہ کیا گیا ہو۔ اس باب کو اس نوعیت کی واحد مثال اور سب سے پہلی کوشش کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس باب کی ترتیب سے ایک طرف تنقید نعت کی ممکنہ جہتیں اور اسالیب سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف تخلیق نعت اور تنقید نعت کو بھی رہنمائی فراہم ہوتی ہے۔

قدیم دور سے ہی استاد دی شاگردی کی روایت موجود رہی ہے۔ شاعر اپنی تخلیق کو جلا دینے اور شعری تربیت حاصل کرنے کے لیے استاد شاعر کی راہنمائی حاصل کیا کرتا تھا اور اہل طریقت کی طرح ایک طویل ریاض اور مجاہدے کے بعد معیاری شعر تخلیق کرنے پر قدرت حاصل

کرتا تھا۔ قدیم زمانے میں شاعری کے لیے استاد کی ضرورت اس قدر اہمیت کی حامل تھی کہ بے استاد ہونا بذات خود عیب تصور کیا جاتا تھا۔ اسی سبب سے غالب جیسے جینٹل کو اپنا ایک فرضی استاد گھڑنا پڑا (۱۸۹)۔ تاکہ وہ سخن کے بازار میں اپنے مال کی قدر و قیمت کو بے توقیر ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔ موجودہ دور میں دوسری روایات کی طرح یہ روایت بھی دم توڑ گئی ہے اور المیہ یہ ہوا ہے کہ شعری اوزان و بحر سے ناواقفیت، مطالعے، مشاہدے کی سطحیت، آسانیاں تلاش کرنے اور شارٹ کٹ مارنے کے مرض میں مبتلا تخلیق کاروں کے ہاں فنی پختگی عنقا ہو کر گئی ہے۔ آج کل شعر کہا تو جارہا ہے لیکن وہ شاعری کی میزان پر پورا تو درکنار ادھورا بھی اترنا نظر نہیں آ رہا اور استاد دی شاگردی کی روایت کے ختم ہونے سے شاعری کی اصلاح کی جو صورت حال قدیم دور میں میسر تھی آج یہ سہولت بھی مفقود ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری اور بالخصوص نعتیہ شاعری، فکری اور فنی معائب کے ساتھ سفر طے کر رہی ہے۔

تنقید نعت میں غیر معمولی حزم و احتیاط اور بے جا تقدس کے حامل رویوں نے نعتیہ شاعری کو بے حد نقصان پہنچایا۔ طرفہ تماشایہ ہوا ہے کہ نعتیہ رسائل و جرائد نے اپنا کردار ادا کرنا تو ایک طرف رہا، اصلاح سخن کے تمام دروازے ہی بند کر دیے ہیں۔ ایسی صورت حال میں نعت کا تخلیق کار جائے تو کہاں جائے؟ دو ماہی 'گلبن' احمد آباد کے نعت نمبر کے ادارے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

”ایک بات کی اور وضاحت کرتے چلیں کہ بعض شاعروں نے بڑی طویل نعتیں ارسال کی تھیں، ان میں سے چند اشعار حذف اس لیے کرنے پڑے کہ ایک صفحہ سے زیادہ دینے کی گنجائش نہ تھی۔ اسی طرح بعض نعتوں کے کچھ اشعار کمزور یا نامناسب تھے، انھیں بھی نکال دیا گیا ہے۔ متعلقہ حضرات نوٹ فرما لیں۔ (۱۵۰)

مذکورہ بالا بیان پڑھنے کے بعد سر پیٹنے کا دل کرتا ہے۔ ذرا سوچئے! ایسے موسموں میں تخلیق نعت کس طرح باآور ہو سکتی ہے؟ اگر فاضل مدیر حواشی میں ان اشعار کی اصلاح کر دیتے یا نقص پر روشنی ڈال دیتے تو تخلیق کار کا ہی بھلا نہ ہوتا، قارئین کا بھی فائدہ ہو جاتا۔ ایسے اشعار کو یک قلم رد کر دینے اور رسالہ باہر کرنے سے اصلاح کے تمام دروازے ہی بند ہو گئے۔ کم و بیش یہی صورت حال نعتیہ صحافت کے دیگر رسائل و جرائد کی رہی ہے۔ 'نعت رنگ' وہ واحد مجلہ ہے جس نے

تنقید نعت کی فضا ہی ہموار نہیں کی بلکہ ایسا پلیٹ فارم بھی مہیا کیا جس سے تخلیق نعت آسانی اور سہولت کے ساتھ اپنا راستہ طے کر رہی ہے اور فکری، فنی، لسانی اور ادبی پرکھ کے ایسے ایسے گنجائے گراں مایہ سامنے آئے ہیں جن سے نعتیہ صحافت کا دامن یکسر خالی رہا ہے۔

یہ درست ہے کہ تنقید نعت کے بے لاگ تبصروں، تجزیوں اور تحقیقات سے 'نعت رنگ' کا ماحول خاصا گرم رہا اور اس کا کسی حد تک نقصان بھی ہوا چنانچہ صحیح رحمانی لوکلکھنا پڑا کہ تنقید نعت کے حوالے سے انھوں نے جو کڑے فیصلے کیے اس کی وجہ سے انھوں نے اور شفقت رضوی نے 'نعت رنگ' کے بہت سے خیر خواہ کھو دیے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر 'نعت رنگ' دل جوئیوں کے موسموں میں ہی سانس لے رہا ہوتا تو تنقید نعت اس مقام پر نہ پہنچ پاتی جس مقام پر آج پہنچ پائی ہے۔

اس باب میں 'نعت رنگ' کے مکتوب نگاروں کی تنقید نعت کے عملی نمونوں کو شعری تنقید کے مختلف معیارات کے تحت جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ قاری یکسوئی کے ساتھ ان نمونوں کا مطالعہ کر سکتا ہے اور دوسرا یہ کہ ادب کے نوآموز قارئین نعت کی عروضی، لسانی اور فنی جہتوں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد تنقید نعت کی تفہیم کے مواقع بھی میسر آسکیں گے۔

قدیم دور میں شعری پرکھ کے معیار، فکری سے زیادہ فنی رہے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ فنی ہی رہے ہیں تو کچھ غلط بھی نہ ہوگا اور جہاں تک نعت کا تعلق ہے، اس کے معیارات تو تشکیل ہی نہ پاسکے۔ نہ فکری نہ فنی، نہ لسانی نہ ادبی۔ اگر نعتیہ اشعار کو پرکھا بھی گیا ہے تو دیگر اصناف کے شعری معیارات کی بنیاد پر ہی پرکھا گیا، بطور موضوع تنقید نعت کے معیارات کبھی تشکیل پائے ہی نہیں۔ ان اسباب اور وجوہات پر پچھلے صفحات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں شاعری کے فنی معائب میں سے معروف معائب کی نشان دہی کی جا رہی ہے تاکہ قارئین فنی معائب سے روشناس ہوں سکیں اور اصلاح سخن کے باب سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ قدیم عہد میں شاعری پر اس وقت گرفت کی جاتی تھی جب کوئی مصرع بے وزن یا دوخت ہو جاتا، اس میں زبان و بیان کی کوئی غلطی راہ پا گئی ہو، روزمرہ مکالمات باہر ہو گیا ہو یا خلاف محاورہ زبان کا استعمال کیا گیا ہو، تلفظ کی غلطی واقع ہو گئی ہو یا لفظ غلط معنوں میں استعمال ہو گیا ہو، غیر معیاری زبان استعمال کی گئی ہو یا کوئی خیال غلط بندھ گیا ہو یا شعر کا مفہوم غتر بود ہو گیا ہو یا شعر میں بیان و بدیع کی کوئی غلطی داخل ہو گئی ہو غرض یہ کہ شعر میں کسی بھی قسم کا عیب داخل ہونے پر شاعر کا قافیہ تنگ کر دیا جاتا تھا۔ ان میں سے کچھ عیوب ایسے ہیں جن کی عملی مثالیں اس باب میں پیش کی گئی ہیں۔ قدامتے جن عیوب کو خاص

اہمیت دی، وہ یہ ہیں: بے معنی، بے وزن، غیر مانوس، غیر فصیح، ابتذال، اتصال، انقال، ضعف تالیف، مخالف لغت، دوخت، اخلال، فکب اضافت، تعقید لفظی، تعقید معنوی، تنافر، حشو، شکست ناروا، ایٹائے جلی، ایٹائے خفی، بندش کی سستی اور شترگرہ، وغیرہ

چوتھا باب 'کتابیات' کا ہے۔ اس باب میں 'نعت رنگ' کے خطوط میں نعتیہ کتب پر تعارفی، تقریظی، تنقیدی یا تحقیقی اظہار بیان کے نمونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کسی ایک ہی کتاب پر اگر دو یا دو سے زیادہ ناقدین نے اظہار خیال کیا ہے تو ان تمام خیالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ہر کتاب کے لیے علیحدہ عنوان قائم کیا گیا ہے۔ نعتیہ کتب سے متعلق ایسے بیانات جو ایک آدھ سطری ہیں انھیں اس باب کا حصہ نہیں بنایا گیا۔

پانچواں باب 'شخصیات' کا ہے۔ اس باب میں شعرا و ادبا کے حوالے سے مکتوب نگاروں کے بیانات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس میں کسی شاعر یا ادیب کے اپنے بیانات بھی ہیں اور دوسروں کے بیانات بھی۔ اس سے نعت گو شخصیات کے حالات زندگی، کوائف، تصورات، افکار، عقائد اور ادبی نقطہ نظر سامنے آتا ہے۔ اس باب میں اعلیٰ حضرت احمد رضا خان فاضل بریلوی کے حوالے سے 'نعت رنگ' کے خطوط میں شامل تمام خیالات، تحقیقات اور تنقیدات کو اکٹھا کر دیا گیا ہے تاکہ ان کا ادبی مقام و مرتبہ سامنے لانے اور متعین کرنے میں مدد مل سکے۔

چھٹا باب 'متفرقات' کا ہے۔ اس باب میں نعت کے حوالے سے ایسے خیالات، بیانات اور مضامین پیش کیے گئے ہیں جو اس کتاب کے ابواب کے دائرہ اختیار میں تو نہیں آتے، لیکن نعت کے مزاج، جہت، پہلو، یا کسی اور سمت کو روشن کرتے تھے انھیں اس باب میں جمع کر دیا گیا ہے۔

ساتواں باب 'نعت رنگ' ایک مطالعہ ہے۔ اس باب میں 'نعت رنگ' سے متعلق مختلف مکتوب نگاروں کے بیانات، اقوال، آراء، نقطہ ہائے نظر اور خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ ان بیانات سے اہل علم کے 'نعت رنگ' سے متعلق خیالات کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور 'نعت رنگ' کا ادبی مقام و مرتبہ متعین کرنے میں مدد بھی ملتی ہے۔ آخر میں مدیر نعت رنگ سے متعلق اس باب و ادب کی آراء پیش کی گئی ہیں۔

(۶)

ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب ہمیشہ اپنی گراں قدر آراء اور قیمتی علمی و ادبی تحائف سے میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود انتہائی قلیل وقت میں اس کتاب کے نامکمل مسودے کا مطالعہ کیا اور اس کا جامع پیش لفظ تحریر کیا۔ تنقید نعت اور تحقیق نعت کے حوالے سے ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ راقم الحروف نے اس کتاب کا مقدمہ لکھتے ہوئے ان کی کتابوں سے بھی رہنمائی حاصل کی ہے۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اپنی گراں قدر رائے تحریر فرمائی۔ ڈاکٹر سہیل شفیق کی شخصیت ایک ایسے سیاح کی ہے جو تحقیق کے وسیع و عریض صحرا میں محو سیاحت رہتے ہیں۔ ان کے علمی کام مجھے ہمیشہ تحریک دیتے رہتے ہیں۔ اس کتاب کی تیاری میں بھی ان کی مرتبہ کتاب 'نعت نامے بنام صبیح رحمانی' سے بھرپور مدد ملی ہے۔ اگر ان کا کام سامنے نہ ہوتا تو مجھے اس کتاب پر کام کرتے ہوئے دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ ڈاکٹر زبیر خالد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ عروض پران کی گہری نظر اور اثابت رائے کا میں ہی نہیں معاصرین بھی قائل ہیں۔ اس کتاب کے تیسرے باب 'نعت گوئی: اصلاح سخن کی چند نمایاں صورتیں' کے خاکے کی تشکیل اور ذیلی عنوانات کی تقسیم ان کی تجاویز، مشوروں اور رہنمائی کی ہی مرہون منت ہے۔ میں ان کا بہت ممنون ہوں۔ ڈاکٹر اقبال کامران کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کے مقدمے کو بغور پڑھا اور مفید مشوروں سے نوازا۔ زبیر بھائی ہمیشہ میرے علمی اور تحقیقی کاموں میں آسانیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ اس بار بھی انھوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک فون کال پر 'نعت رنگ' کے آٹھ شمارے بھجوا کر میری 'نعت رنگ' کی فائل کو مکمل کر دیا۔ خدائے بزرگ و برتر ان کی اور میرے دیگر دوستوں کی عمر، صحت اور رزق میں برکت عطا فرمائے۔

'نعت رنگ' کے انتخاب کردہ ہر اقتباس کے بعد ماخذ کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ 'نعت رنگ' کے چوبیس شماروں میں شامل خطوط کا انتخاب ڈاکٹر سہیل شفیق کی مرتبہ 'نعت نامے بنام صبیح رحمانی' سے کیا گیا ہے اور اس میں شامل ہر اقتباس کے حوالے کا اندراج (احمد صغیر صدیقی، ص ۱۴۵) اور 'نعت رنگ' کے پچیس، چھیس، ستائیس اور اٹھائیسویں شمارے میں شامل خطوط کے حوالے (ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، ص ۲۵، ۸۷)، (ریاض حسین چودھری

ص ۲۶، ۶۲۲)، (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷، ۴۹۸)، (ڈاکٹر تحسین فراقی، ص ۲۸، ۶۴۵) کے طور پر درج کیے گئے ہیں۔ حوالے میں موجود ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸ اور ۲۸ نمبر شمارہ نمبر اور ۸۷، ۶۲۲، ۴۹۸، ۶۴۵ نمبر صفحات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جب کہ کوکب نورانی کے خطوط سے حاصل کردہ اقتباسات کے حوالے (کوکب نورانی، ص ۳۵۵) کے طور پر دیے گئے ہیں۔ کتاب کی تیاری آخری مراحل میں تھی کہ اردو کے معروف نقاد شمس الرحمن فاروقی کے دو خط موصول ہوئے۔ خطوط میں موجود علمی نکات کی اہمیت کے پیش نظر انھیں بھی اس کتاب میں غیر مطبوعہ کے عنوان سے شامل کتاب کر لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ابراہیم عبدالسلام

صدر شعبہ اُردو

گورنمنٹ کالج سول لائسنز، ملتان

Cell No. 0333-6102985

E-mail: drabrarabduhsalam@gmail.com

حواشی و حوالہ جات

- ۱۔ 'نعت رنگ' شمارہ ۲۱ ص ۹
- ۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کا بیان ہے: کسی نعت یا نعتیہ مضمون کے بارے میں حسن و قبح کے حوالے سے کسی طرح کا حکم لگانا مناسب نہیں۔ ان نقطوں کا استعمال، نعت اور نعت کے مباحث میں میرے دائرہء خیال و قلم سے خارج ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی سے جن الفاظ و خیالات کی نسبت ہو جائے وہ میرے نزدیک تنقید مروجہ سے بلند و بالا ہو جاتے ہیں۔" (۱) نعت نامے بنام صبیح رحمانی، ص ۱۵ (۲) ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعات حمد و نعت ص ۱۷) ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے بظاہر بڑی عجیب محسوس ہوتی ہے لیکن اس موضوع کی نزاکت اور معاشرتی صورت حال کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ پی۔ ٹی۔ وی کے ایک ادبی پروگرام میں جس میں اردو کے معروف ادیب بھی شریک تھے، صبیح رحمانی نے تنقید نعت کی اصطلاح استعمال کی تو پروڈیوسر کو پروگرام روکنا پڑا اور سراسیمگی کے عالم میں کہنا پڑا کہ یہ پروگرام نعت کا ہے اس میں تنقید کا لفظ استعمال نہ کیا جائے۔ (دیکھیے: ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعات حمد و نعت ص ۱۸)

۳۔ مدیر نعت رنگ کا بیان ہے: ”جہاں تک نعتیہ ادب کی بات ہے تو اس کی صورت حال اس لحاظ سے اور بھی اتر ہے اسے کسی بھی عہد میں بقاعدہ تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نتیجتاً باب نقد و نظر نے اسے ”شعر عقیدت“ کا نام دے کر عام ادبی فضا سے دور کر دیا ہے اور یہ تکلیف دہ صورت حال کسی حد تک اب بھی برقرار ہے۔“ فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۴۳۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ از ڈاکٹر عبدالعزیز خان (عزیز احسن)، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، مارچ ۲۰۱۳ء ص ۳۲۲، ۳۲۶

۴۔ نعت میں احترام رسالت کے تقاضے، ڈاکٹر محمد الحق قریشی، بحوالہ اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر عبدالعزیز خان (عزیز احسن) نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، مارچ ۲۰۱۳ء۔

۵۔ عزیز احسن لکھتے ہیں: نعتیہ ادب کی تنقیدی جہت کو اجاگر کرنے میں سب سے اہم اور نمایاں کردار کتابی سلسلے ”نعت رنگ“ کا رہا ہے۔ لیکن بعض دوسرے رسائل میں بھی جزوی طور پر کچھ تنقیدی نکات پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ نعت رنگ میں تنقیدی نوعیت کی تحریریں اس کثرت اور تواتر سے شائع ہوئیں کہ اہل علم نے نعتیہ ادب میں ”تنقید“ کے وجود کو تسلیم کر لیا۔ (اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر عبدالعزیز خان (عزیز احسن) نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، مارچ ۲۰۱۳ء ص ۲۵۳)

۶۔ اس حوالے سے مدیر ”نعت رنگ“ ایک ادارے میں رقم طراز ہیں: ”میں نے جب یہ سفر شروع کیا تو دو چار ساتھی ہی ساتھ تھے مگر الحمد للہ اب یہ قافلہ خاصا وسیع ہے جس میں لکھنے والے اور پڑھنے والے بھی شامل ہیں۔ پاکستان کے علاوہ بھارت، عرب امارات، سعودی عرب، یورپ کے ممالک اور امریکا میں بھی وابستگان اردو نعت رنگ“ کا انتظار کرتے ہیں۔“ (فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۴۰)

۷۔ اس حوالے سے صابر سنبھلی کا بیان ملاحظہ فرمائیے: ”نعت رنگ“ کے بارے میں پہلے کچھ سن چکا تھا۔ یہ پہلا شمارہ ہے جس کا دیدار ہوا۔ اس عنایت کے لیے آپ کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ اگرچہ مضامین اور مکاتیب میں اختلافات کو بہت جگہ ملی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہتر تھا، بلکہ جیسا کہ پہلے سن چکا تھا ”نعت رنگ“ میں شروع سے ہی اہل قلم حضرات [کے] اختلافات نمایاں نظر آتے ہیں۔ جبکہ دیگر ادبی جریدوں میں اختلافات اتنے زیادہ نہیں ہوتے۔ (نعت نامے بنام صبیح رحمانی، ص ۵۵۴)

۸۔ صبیح رحمانی ”نعت رنگ“ کے ایک ادارے میں لکھتے ہیں: ”تحسین تعبیر اور تفہیم شعر خالصتاً ذوقی معاملہ ہے، اس لیے شعری پسندیدگی کے زاویے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن شریعت کے معیارات کی پاسداری ہر حال میں ضروری ہے۔ زبان بھی کچھ قواعد کی پابند ہوتی ہے۔۔۔ اس ضمن میں اتفاق یا اختلاف دونوں قسم کی آراء ہمارے لیے قابل احترام ہوں گی۔“ (صفتن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۳۵)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: ”ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نقاد ہمارے اس گراں مایہ نعتیہ سرمائے کو انتقادی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے معنوی اور فنی پہلوؤں کو دیکھیں اور اس میں بیعت کے تجربوں اور تازہ کاری

کے رجحان کو نظر میں رکھ کر اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعین کریں۔ ادب پر لکھنے والے حضرات اور ہمارے قاری اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے، اس تحریک میں شامل ہو کر ادب کی اس اہم روایت کو آگے بڑھانے میں مدد کریں۔“ (فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۳۸)

۹۔ صبیح رحمانی ”نعت رنگ“ کے ادارے میں رقم طراز ہیں: ”شاعر کے اسلوب، لفظی کوتاہیوں یا خیالات پر تنقیدی رائے ضرور دیجئے لیکن سنجیدگی، متانت اور استدلال کے ساتھ۔ غلطی تو انسان کے خیر میں شامل ہے بس اس بنیادی سچائی کو سامنے رکھتے ہوئے دوسروں کی کوتاہیوں کی نشان دہی کی جائے تاکہ جس کی غلطی یا کوتاہی ہو وہ آپ کا شکریہ ادا کرے۔ یہ بات ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہے لیکن اگر نقاد کا انداز جارحانہ ہے یا اس کی تحریر میں تعجیب کا رنگ ہے تو دل بھی خراب ہوں گے اور تنقید بھی مجروح ہوگی۔“ (فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۴۲)

۱۰۔ صابر داد کا بیان ہے: ”نعت رنگ“ میں نعت کے ادبی پہلوؤں پر جس تواتر سے ادبی مباحث شائع ہوئے ہیں اس نے ہمارے قارئین میں اس صنف کے متعلق جاننے اور پڑھنے کی خواہش بیدار کر دی ہے اور یہی نہیں بلکہ اس حوالے سے ہمارے لکھنے پڑھنے والوں میں ایک مکالمے کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ ”نعت رنگ“ نے نعتیہ ادب کو جس طرح اردو دنیا میں موضوع گفتگو بنایا ہے اس کا اعتراف تو بڑے پیمانے پر ہو چکا ہے لیکن جس مکالمے کی طرف ہم نے نشان دہی کی ہے وہ نعت رنگ کے گوشہ خطوط میں سامنے آیا ہے۔ اردو کے اہم لکھنے والے ان علمی و ادبی مباحث میں شمولیت اختیار کر رہے ہیں۔

(نعت اور آداب نعت، ص ۶)

۱۱۔ غالب کے خطوط جلد اول مرتبہ خلیق انجم ص ۱۵۳۔ میر مہدی مجروح نے غالب کو خط کے مختصر ہونے کی شکایت لکھی تو غالب نے جواب میں لکھا ”یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔“ مرزا حاتم علی بیگ مہر نے ایک خط میں انھی روشوں سے کام لیا تو غالب ناراض ہوئے انھیں لکھتے ہیں: ”اگر تم مناسب جانو، تو ایک بات میری مانو، رفعت عالمگیری یا انشائے خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ جو عبارت اس میں سے پسند آیا کرے، وہ خط میں لکھ دیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمھارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔“ (ایضاً ص ۱۵۴) غالب نے اس انداز کو بھانٹوں کی زبان کہا ہے۔ مرزا گروپال تھنہ کو لکھتے ہیں: ”وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھانٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔“ (ایضاً ص ۲۳۶) غالب نے خطوط کی بنیاد مطلب نویسی پر کھی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنا یا عبارت آرائی کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔ قاضی عبدالحمیل جنون کو خط میں لکھتے ہیں: ”میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری تحریر نہ ہو تو کیا لکھوں۔“ (ایضاً ص ۱۵۱)

۱۲۔ دیکھیے: (۱) اودھ اخبار کی ادبی قدر و قیمت، پروفیسر حنیف نقوی، مشمولہ نول کشور اور ان کا عہد، مرتبین، قاضی عبید الرحمن ہاشمی و ڈاکٹر وہاب الدین علوی، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، اول، مئی ۲۰۰۴ء

۱۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: تہذیب الاخلاق ۲ محرم سنہ ۱۲۸۹ھ، جلد سوم نمبر ۳، تہذیب الاخلاق، یکم ربیع الثانی ۱۲۸۹ھ جلد سوم نمبر ۷، تہذیب الاخلاق، ۱۵ ربیع الثانی ۱۲۸۹ھ، جلد سوم نمبر ۸، تہذیب الاخلاق، یکم رجب ۱۲۸۹ھ جلد سوم نمبر ۱۳، تہذیب الاخلاق، ۲۹ شعبان ۱۲۸۹ھ، جلد سوم نمبر ۱۵، تہذیب الاخلاق، یکم ذی قعدہ ۱۲۸۹ھ، جلد سوم نمبر ۱۹)

۱۵۔ دیکھیے: نورالافاق، جلد انمبر ۷، مورخہ ۲۲ نومبر ۱۸۷۳ء، نمبر ۹ جلد و جلد ۲ نمبر ۵ بحوالہ مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا، خولہ احمد فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۵۳۰)

۱۔ دیکھیے: مباحثہ گلزارِ نسیم یعنی معرکہ چلبست و شرر مؤلفہ میرزا محمد شفیع شیرازی ثم لکھنؤی، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ، بارود ۱۹۴۲ء)

اودھ پنج مطبوعہ ۲۰ جولائی ۱۹۰۵ء تا ۶ نومبر ۱۹۰۵ء بحوالہ مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقا، خواجہ احمد فاروق قومی کونسل برائے فروغ اردو زمانہ نئی دہلی ۲۰۳۰ء ص ۵۳۳)

۱۸۔ دیکھیے: معارف، جولائی، ۱۹۵۳ء، اگست، ۱۹۵۳ء، ستمبر ۱۹۵۳ء، اکتوبر ۱۹۵۳ء، نومبر ۱۹۵۳ء، دسمبر ۱۹۵۳ء، ستمبر ۱۹۵۴ء وغیرہ۔ اسی طرح 'معارف' کی کئی اقساط میں سید سلیمان ندوی کے نام مشاہیر علما و ادبا مثلاً حبیب الرحمن شروانی، ابوالکلام آزاد، اور علامہ اقبال کے خطوط بھی شائع ہوئے۔ مزید خطوط کے لیے دیکھیے: معارف نومبر ۱۹۷۹ء، ستمبر ۱۹۷۹ء، جنوری ۱۹۸۰ء)

۱۹۔ دیکھیے: وفیات معارف مرتبہ ڈاکٹر سہیل شفیق، قمر طاس، کراچی، ۲۰۱۳ء

۲۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: نگار کھنھو، مئی ۱۹۸۳ء، ص ۳۲-۳۰: مئی ۱۹۸۴ء، ص ۵۳-۴۹: مارچ ۱۹۸۷ء

۴۵-۴۷: اپریل ۱۹۵۰ء ص ۶۲-۶۰؛ مئی ۱۹۵۰ء ص ۵۶-۵۹؛ جون ۱۹۵۰ء ص ۵۶-۵۸؛ نومبر
۱۹۵۰ء ص ۵۳-۵۲؛ مارچ ۱۹۵۱ء ص ۴۹-۴۸؛ اپریل ۱۹۵۱ء ص ۳۷-۳۵؛ مئی ۱۹۵۱ء،
۳۷-۳۶؛ جون ۱۹۵۱ء ص ۴۰؛ اگست ۱۹۵۱ء ص ۳۷-۲۸؛ ستمبر ۱۹۵۱ء ص ۴۱-۳۸؛ اکتوبر ۱۹۵۱ء،
ص ۳۵-۳۱؛ نومبر ۱۹۵۱ء ص ۴۳-۴۱؛ دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۴۳-۴۱؛ مارچ ۱۹۵۲ء؛ اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۵۰-
۴۸؛ مارچ ۱۹۵۴ء ص ۴۸-۴۷؛ دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۵۳-۵۰؛ اگست ۱۹۵۹ء ص ۴۷-۴۳؛ نومبر ۱۹۵۹ء،
ص ۴۱-۳۵؛ اپریل ۱۹۶۰ء ص ۴۰-۳۹؛ نومبر ۱۹۶۰ء ص ۴۰-۳۵؛ اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۴۳-۴۲؛

۲۱۔ دیکھیے: مکتوبات مشاہیر، خدا بخش اور نینفل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۹ء)

۲۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ۸ مئی ۱۹۶۹ء، یکم اگست ۱۹۶۷ء، ۹ ص ۸/ اگست ۱۹۶۹ء، ۱۰ ص یکم نومبر ۱۹۷۰ء، ۹ ص ۱۵/ نومبر ۱۹۷۰ء، ۵ ص ۲۲/ دسمبر ۱۹۷۰ء، یکم ستمبر ۱۹۷۰ء، ۵ ص ۶/ یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء، ۸ ص ۱۵/ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ۹ ص ۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ۹ ص ۷/ ۱۵ نومبر ۱۹۷۰ء، ۱۵ ص ۵/ مارچ ۱۹۷۱ء، ۹ ص ۷/ ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء، ۱۵ ص ۷/ جولائی ۱۹۷۱ء، ۸ ص ۷/ مئی ۱۹۷۱ء، ۶ ص ۷/ یکم فروری ۱۹۷۱ء، ۶ ص ۵/ ۸ فروری ۱۹۷۱ء، ۷ ص ۷/

۲۳۔ اس حوالے سے شان الحق حقی صاحب کا بیان ہے:۔۔۔ تاکہ اپنے کام کی بابت اہل الرائے سے استصواب بھی کما سکا جسکے اُشارہ اردو نامہ، مترجم مصباح العثمان، اردو ڈکشنری بورڈ کراچی، ۱۹۹۷ء ص ۸)

۲۴۔ دیکھیے: اشاریہ اردو نامہ، مرتبہ مصباح العثمان، اردو دشمنی بورڈ کراچی، ۱۹۹۷ء

۲۵۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجیے: پاکستان، میل، نعتیہ صحافت - ایک جائزہ از شبنم اداہر، مشمول نعت رنگ،

۲۶۔ 'نعت رنگ' ابتداء، شمارہ نمبر ۷، انومبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۱-۱۴۰

۲۔ اس حوالے سے مدیر نعت رنگ کا بیان ہے: ”نعت رنگ کے اجرا کے وقت ہم نے جن خواہشات کا اظہار

کیا تھا وہ کافی حد تک پوری ہو رہی ہیں، تنقیدی جمود خاصی حد تک ٹوٹ چکا ہے اور نعتیہ ادب پر بے لاگ تبصروں اور تنقیدی مباحث کی ایک ایسی فضا بن چکی ہے جس نے اہل علم کو نعت کے ادبی پہلوؤں کی جانب نہ صرف متوجہ کر دیا ہے بلکہ وہ اس موضوع پر تنجیدی سے غور کرنے اور لکھنے پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ ’نعت رنگ‘ میں لکھنے والے ناموں میں اہل علم کا مسلسل اضافہ اور موضوعات کا تنوع ہمارے اس دعوے کی دلیل کے طور پر سامنے ہیں۔‘ (فن ادارہ نویسی اور نعت رنگ ص ۵۶)

صبحِ رحمانی ایک اور ادارے میں لکھتے ہیں:

”میں نعت پر کام کرنے والوں کو بھی جغرافیائی حدود میں بانٹ کر یا علاقائی سطح پر تقسیم کر کے نہیں دیکھتا اور نہ ہی اس قماش کی کسی تقسیم کو درست سمجھتا ہوں۔ میرے لیے نعت کا کوئی خدمت گزار چاہے وہ کسی خطے اور کسی ملک کا رہنے والا ہو۔ چاہے اس نے نعت کے موضوع پر ستر صفحات کی کتاب لکھی ہو یا ہزار صفحات کا مقالہ لکھا ہو، چاہے اس کے پیوٹیں مجموعے شائع ہوئے ہوں یا اس نے چند نعتیں کہی ہوں یکساں احترام کے لائق سمجھتا ہوں۔ کون نہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ کس کا عارضہ یا کس کا کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

بارگاہ میں کتنا مقبول ہے؟ میں سب کی خدمات اور کام کو نہ صرف پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہوں بلکہ اس کے اعتراف اور وسیع تر پھیلاؤ میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتا، نعت رنگ کے شمارے اس بات کے گواہ ہیں۔“ (ایضاً ص ۱۳۸)

۲۸۔ دیکھیے: فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ڈاکٹر افضل احمد نور، ص ۱۳۵

۲۹۔ اس حوالے سے مدیر نعت رنگ ایک ادارے میں رقم طراز ہیں: نعت رنگ کے خدمت گزاروں، لکھنے والوں اور قارئین نے اب تک جو کچھ بھی پیش کیا ہے، نیک نیتی سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ نعت رنگ کے منتظر رہتے ہیں اور اس کی قبولیت کا دائرہ روز بروز وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔“ ص ۶۵-۶۶

۳۰۔ نعت رنگ کے معاصر نعتیہ رسائل میں بھی تعارفی، تقریظی اور کسی حد تک تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں لیکن ان تمام رسائل میں نہ تو نعت رنگ میں شامل مقالات کی طرح کثیر تعداد میں مقالات شائع ہوتے رہے اور نہ ان کا معیار نعت رنگ کے معیار کی سطح کا رہا۔ اگرچہ نعت رنگ کو یہ مقام حاصل کرنے کے لیے کافی تگ و دو کرنا پڑی لیکن نعت رنگ کے معاصر اور ماقبل نعتیہ رسائل کے ایک درجن سے زائد رسائل کی اشاعت کے بعد بھی وہ معیار نظر نہیں آتا جو نعت رنگ کے حصے میں آیا۔ اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نعت رنگ کے لیے لکھنے والے مقالہ نگاروں میں سے کئی وہ مقالہ نگار بھی ہیں جو نعت رنگ سے پہلے دوسرے نعتیہ رسائل میں لکھ رہے تھے کیا نعت رنگ میں شامل ہو کر ان کے مقالات کے معیار میں فرق آیا؟ اس کا جواب اثبات میں دیا جاسکتا ہے۔ مدیر نعت رنگ نے آغاز ہی سے مقالات کے تنقیدی اور تحقیقی معیار پر زور دیا اور زیادہ تر انھیں مقالات کو نعت رنگ کا حصہ بنایا جاتا رہا جو تنقید اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر ہی احاطہ تحریر میں آئے۔ ویسے بھی مقالہ نگار کو مدیر اور رسائل اور جرائد کی کی پالیسیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: اردو میں نعتیہ صحافت - ایک جائزہ از ڈاکٹر شہزاد احمد، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۶ء۔

۳۱۔ فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۱۵۲-۱۵۱

۳۲۔ فن اداریہ اور نعت رنگ ص ۷۷

۳۳۔ نعت رنگ کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں چند صفحات ہی تخلیق نعت کے حصے میں آئے تھے باقی تین سو سے زائد صفحات تحقیق اور تنقید کی نظری و عملی مثالوں (مقالات و مضامین) کے لیے مختص کیے گئے تھے، جو اس بات کا اعلان تھا کہ نعت رنگ، تخلیق نعت سے زیادہ تحقیق و تنقید نعت کو اہمیت دے گا کیونکہ اسی کے ذریعے معیاری تخلیق نعت کے لیے سازگار ماحول تشکیل پائے گا۔

۳۴۔ فن اداریہ و نعت رنگ ص ۹۶

۳۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: سر سید احمد خان ایک سیاسی مطالعہ، عتیق صدیقی ص ۱۵۶-۱۳۸

۳۶۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک سائنسدان ہابر نے ہائیڈروجن اور نائٹروجن کو ملا کر امونیا گیس ایجاد

کی۔ امونیا گیس اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک اس کے اندر لوہے (آئرن) کو عمل انگیز (Catalyst) کے طور پر استعمال نہ کیا جائے۔ امونیا گیس (NH₃) بنانے کے لیے نائٹروجن (N₂) اور ہائیڈروجن (H₂) کا ملاپ کروایا جاتا ہے جس میں آئرن، عمل انگیز (Catalyst) کے طور پر حصہ لیتا ہے۔ اس عمل میں آئرن (Fe) عملی طور پر تو ذرا بھی استعمال میں نہیں آتا لیکن امونیا بننے میں اس کی موجودگی ناگزیر ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح صحیح رحمانی کی شخصیت بھی نعت رنگ کے مباحث میں پلائٹیم کا کردار ادا کرتی رہی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلین نے عمل انگیزی کی مثال سلفیورس ایسڈ کی دی ہے۔ ان کا بیان ہے: آکسیجن اور سلفر ڈائی آکسائیڈ کا ملاپ پلائٹیم کی موجودگی ہی میں کارآمد ہو کر سلفیورس ایسڈ کی تخلیق کا باعث بنتا ہے یعنی پلائٹیم کی موجودگی بظاہر بے حرکت، غیر جانبدار اور غیر مبدل رہتی ہے لیکن اصل محرک پلائٹیم ہی ہوتا ہے کیونکہ اس کے بغیر دونوں گیسوں کا ملاپ کسی مثبت عمل کو پیدا نہیں کر سکتا (دیکھیے: اردو سے ایلین تک، ڈاکٹر ذہیل جالبی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع ہفتم، ۲۰۱۳ء، ص ۴۹۴)

۳۷۔ ارشد جمال نقشبندی مرتب نعت اور آداب نعت لکھتے ہیں۔ ”رطب و یابس اور غیر مختلط روپوں کے الفاظ ہی دوسروں کو بھڑکا سکتے تھے اور صحیح رحمانی دوسروں کے اعتراض کا ہدف ہو سکتے تھے۔۔۔ بحیثیت مدیر انہوں نے کسی طرح جانب دارانہ رویہ نہیں اپنایا بلکہ نعت رنگ میں مختلف مکاتب فکر سے وابستہ اہل قلم کی نگارشات شائع ہوئیں اور تحریروں کو من و عن شامل کیا گیا، یوں کسی کو ان کی نیت پر کوئی شک نہیں ہوا۔۔۔ نعت رنگ کی علمی و ادبی وقعت تسلیم کی جانے لگی، نعت کے موضوع سے نعت رنگ کا ذکر کچھ ایسا وابستہ ہو گیا کہ اب فروغ نعت یا نعت کے ارتقاء کو کوئی جائزہ نعت رنگ کے ذکر کے بغیر نامکمل ہوگا، یا یوں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس ضمن میں نعت رنگ کا ذکر لازمی ہو گیا۔ نعت رنگ اب ایک کتابی سلسلہ ہی نہیں رہا بلکہ نعت کے حوالے سے ایک ادبی تحریک بن گیا ہے۔ (ص ۱۳)

۳۸۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کا بیان بھی اسی خیال کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس حوالے سے سعید بدر کا بیان ملاحظہ فرمائیے: ”نعت رنگ کے زیر نظر شمارے میں ایک بات خاص طور پر محسوس ہوئی کہ اس کے ۵۶۰ صفحات میں سے ۵۳۴ سے ۵۴۶ تک صرف ۱۲ صفحات میں ۱۰ نعتیں شامل ہیں، باقی سب کچھ تنقید ہی تنقید ہے گویا مختلف احباب اور قابل قدر اصحاب نے نعت، پر محض تنقید فرمانے کا ہی فریضہ ادا کیا ہے خوبوں کے ساتھ زیادہ تر خامیوں اور کمزوریوں کو اجاگر کیا ہے۔ تنقید نگار کا مزاج ہمیشہ خامیوں کی تلاش کرنا ہی ہوتا ہے وہ اگر ”حسن و قبح“ کی تلاش کے اس دلچسپ شغل میں نعت نگار کی تعریف یا تحسین کے چند جملے لکھتا ہے تو وہ درحقیقت ”بزرور وزن بیت“ کے حامل ہوتے ہیں یا پھر ان چند جملوں سے اس کا مقصد خود خود کو ”غیر جانبدار“ ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایسے تنقید نگار بھی موجود ہیں جنہوں نے غالب و اقبال اور ظفر علی خاں پر بھی نثر زنی سے گریز نہیں کیا۔ یہ کہنے سے میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ان ”بزرگوں“ سے غلطیاں نہیں ہوئیں یا ان کے اشعار میں کہیں سقم موجود نہیں یا پھر وہ ”معصوم عن

الخطاء“ تھے یا ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں لیکن فارسی اور اردو زبانوں میں ہمیشہ سے یہ روایت رہی ہے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است، یعنی بڑوں اور بزرگوں کی غلطیوں یا کمزوریوں کو الم نشرح کرنا بھی خطا کے زمرے میں آتا ہے لیکن مغربی افکار سے مسحور و مرعوب ہو کر ہم لوگ اپنے اجداد اور اسلاف کے تابناک اور خوبصورت چہروں پر بھی دھبے لگانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ محترم المقام صبیح رحمانی! آپ نے جب نعت پر تنقید کا سلسلہ شروع کیا تھا تو راقم نے اس وقت بھی اُن سے اسی ”خدا شے“ کا اظہار کیا تھا لیکن آپ اپنی دُھن کے پکے ہیں۔ آپ نے اس کام کو آغاز کر کے ہی دم لیا کیا۔ ”تنقید نگار“ حضرات کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ نعت نگاروں پر ہر پہلو اور ہر گوشے سے حملے کریں اور بالخصوص اگر کوئی نعت نگار پسند نہ ہو تو اس کی شامت ہی آجاتی ہے۔ چاہیے تو یہ کہ یہ حوصلہ شکنی کے بجائے حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ اس صنف کو فروغ حاصل ہو۔ (نعت رنگ شماره ۲۵، اگست ۲۰۱۵ء، ص ۹۱۳-۹۱۲) اقتباس ذرا طویل ہے لیکن صورت حال کو سمجھنے کے لیے مفید ہے اس لیے اس خط کا کثیر حصہ نقل کرنا پڑا ہے۔ اس اقتباس کا لب و لہجہ ملاحظہ فرمائیے۔ اگر اس نظریے پر عمل کیا جائے تو ہزاروں سالوں کا ارتقا اور علوم و فنون کی ترقی سب وقت کا ضیاع محسوس ہوتی ہے۔ موصوف تنقید کو تنقیص کے معنوں میں لے رہے ہیں۔ انھیں معلوم ہی نہیں کہ تنقید کو اسلام نے کبھی ناپسند نہیں کیا اگر ایسا ہوتا تو نہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشاورت کو پسند کرتے اور نہ مسجد نبوی میں خطبے کے دوران کسی کو یہ سوال کی جرات ہوتی کہ مال غنیمت سے ہر ایک کو ایک ایک چادر حصے میں آئی ہے اور ایک ہی چادر تمہارے حصے میں آئی۔ پھر یہ لباس جو ایک چادر سے نہیں بن سکتا آپ نے کیسے زیب تن کیا ہوا ہے اور خلیفہ وقت نے اس سوال کا برا بھی نہیں مانا تھا اور اسی وقت اس چادر کا حساب بھی دینے میں کسی قسم کی عار محسوس کی تھی۔

۳۹۔ اس حوالے سے پروفیسر محمد اقبال کا بیان ملاحظہ فرمائیے: ”میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس نوع کی بحثوں کو کچھ عرصے کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔ کیونکہ آج ہر مسلک ایک ”مستقل دین“ بن چکا ہے۔ امت مسلمہ پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ ساری دنیا ہماری حالت پر ہنس رہی ہے مگر ہمیں اپنی حالت پر درنا نہیں آتا۔ وطن عزیز کے حالات اس نوع کی بحث و تمحیص کے قطعاً تحمل نہیں ہیں“

لبو پوشاک بندوں کو ملی ہے
مساجد خوں میں تر کردی گئی ہیں
جواں لاشے اٹھائے جا رہے ہیں
کہ عمریں مختصر کردی گئی ہیں

(نعت نامے ص ۱۹۲) اسی خط میں آگے چل کر مزید لکھتے ہیں: ”مدیر ”نعت رنگ“۔۔۔ کا یہ ادارتی فرض ہے کہ وہ موجودہ حالات میں نزاعی امور کا دروازہ نہ کھولیں اور انہیں اشاعت سے قبل حذف کر دیں کہ نہ ”نعت رنگ“ کا یہ مسلک ہے نہ مشن۔ یوں بات دور تک نکل جاتی ہے اور اسے سنبھالنا اور سمجھنا مشکل

ہو جاتا ہے، ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ نعت کو اپنوں اور غیروں کے درمیان وصل کا وسیلہ ہونا چاہئے۔ فصل کا نہیں۔ بالکل اُسی طرح، جس طرح ماضی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموش حرار کی سٹیج پر ہر مکتب فکر، اختلافات کے باوجود یک زبان اور یک سو ہو گیا تھا۔“ (نعت نامے ص ۱۹۳)

۴۰۔ اس حوالے سے ڈاکٹر یحییٰ ثنیط کا موقف ملاحظہ فرمائیے: ”نعت کے تقدس اور تقدیسی ادب کے تقاضوں کا لحاظ اور نعت کے فنی لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے نعتیہ شعر و ادب کو میزان نقد پر تولنا، شستہ و شائستہ تنقید کی عمدہ مثال ہے۔ نقد نعت کی بدترین مثال اسے مغربی سوٹی پر پر کھنے کی کوشش ہے۔ نعت نہ صرف یہ کہ مشرقی ادب کی نمائندگی کرتی ہے بلکہ خالصتاً ادب اسلامی کی ایک صنف کی حیثیت سے اپنا وجود منوالیتی ہے۔ اس لیے اس پر نقد و جرح کے لیے فکر نقد کا اسلامی ہونا ضروری ہے ورنہ تنقید نعت کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔“ (رشید وارثی اور نعتیہ نعت اڈا ڈاکٹر سید یحییٰ ثنیط، مشمولہ اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ مصنفہ رشید وارثی، نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، ۲۰۱۰ء ص ۷)

۴۱۔ اقبال شناسی، ڈاکٹر منظور احمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع دوم، ۲۰۱۳ء ص ۲۵۔

۴۲۔ دیکھیے: حوالہ نمبر ۳۵

۴۳۔ ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعات حمد و نعت ص ۱۶۔

۴۴۔ ”ہمیں فن شاعری اور صنائع بدائع کے بارے میں مشرقی علوم اور مغربی زاویہ نگاہ کبھی برتنے کی ضرورت ہے۔ صنائع بدائع کا خلافت استعمال نعت میں کہاں کہاں کیا گیا ہے اس کی نشان دہی کا فرض ابی ہمارے ناقدین پر قرض ہے۔ محض یہ کہہ دینے سے کیا خوب تشبیہ ہے۔ بات نہیں بنتی۔ (فن ادارہ یونیورسٹی اور نعت رنگ ص ۱۵۶)

۴۵۔ نعت رنگ کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ، پروفیسر شفقت رضوی، مہر منیر اکیڈمی، کراچی، فروری ۲۰۰۴ء، ص ۴۷۵-۴۷۴

۴۶۔ ”سر سید تہذیب الاخلاق“ میں لکھتے ہیں: ”پرانے دل بعضے تو ہم کو برا کہتے کہتے ٹھنڈے ہو گئے اور بعضے مہربان اور نئے دل اب جوش پر ہیں اور ہم برا کہنے پر تیز۔۔۔ ہم کو طحدا اور زندیق اور لامذہب نیچرلسٹ اور دہریہ کہتے ہیں۔“ ”تہذیب الاخلاق“ کے ایک اور شمارے میں لکھتے ہیں: ”ہم کو طحدا، زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں۔۔۔ مگر طرفہ یہ ہے کہ ہم کو کرستان بھی کہتے ہیں۔ ہماری قوم کے ایک اخبار نویس نے چھاپا کہ ہم عیسائی ہو گئے اور ایک گرجا میں پتسمہ یعنی اصطباغ لیا۔۔۔ اس شخص کو یہ بھی غیرت نہ ہوئی کہ میں ایک مسلمان شخص کی نسبت کس دل اور غیرت سے ایسی جھوٹی خبر چھاپ دوں۔“ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: سر سید احمد خان ایک سیاسی مطالعہ، عتیق صدیقی، سیونٹھ سکاٹی پبلی کیشنز، لاہور، جولائی ۲۰۱۲ء ص ۱۱۱، ۱۱۵، ۱۳۸-۱۳۵)

۴۷۔ دیکھیے: حاشیہ نمبر ۵

۴۸۔ قارئین کو مکاتیب کی اہمیت سے آگاہ کرنے کی خاطر ایک مرتبہ ’نعت رنگ‘ نے مقالہ نگار سے مجلے کے لیے موصول شدہ مقالے کو بھی خط کی شکل دینے کی درخواست کرنا پڑی۔

۴۹۔ ”جہاں تک نعتیہ ادب کی بات ہے تو اس کی صورت حال اس لحاظ سے اور بھی اتر ہے اسے کسی بھی عہد میں باقاعدہ تنقید کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نتیجتاً باب نقد و نظر نے اسے ’شعر عقیدت‘ کا نام دے کر عام ادبی فضا سے دور کر دیا ہے اور یہ تکلیف دہ صورت حال کسی حد تک اب بھی برقرار ہے۔ ’نعت رنگ‘ میں شائع ہونے والی تنقیدی گفتگو سے اہل فکر و نظر نے اس اہم صنفِ سخن اور اس کے فکری و فنی پہلوؤں کی طرف سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا ہے اور یہی ہماری کامیابی کی پہلی منزل ہے۔ ’نعت رنگ‘ کے جو ادبی اثرات مرتب ہو رہے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں جب نعت اپنے پورے تقدس اور پوری ادبی شان کے ساتھ دیگر اصنافِ سخن کے جھوم میں نمایاں نظر آئے گی۔“ فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۴۳

۵۰۔ ایضاً، ص ۴۴

۵۱۔ نعت رنگ ۲۶، ص ۱۱۔

۵۲۔ اس حوالے سے مدیر ’نعت رنگ‘ کا بیان ہے: ”نعت کے مسائل اور بہت سے پہلو خطوط کا موضوع بن سکتے ہیں اور ہماری تمنا ہے کہ آپ کے خطوط ’نعت رنگ‘ کی توصیف تک محدود نہ رہیں بلکہ بزم فکر و نظر بن جائیں۔ کئی احباب نے اپنے خطوط میں ان مضامین کی اشاعت پر تعجب کا اظہار کیا ہے جن کے مندرجات سے انھیں اتفاق نہیں۔ ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ مقالہ نگاروں سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں علاوہ ازیں ادب اور فن کی دنیا میں یہ اختلافات نہ ہوتے تو فکر و نظر کے بہت سے گوشے اپنے امکانات کے ساتھ ہمارے سامنے نہ آتے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ فکری اختلاف شخصی مخالفت نہ بننے پائے اور اختلاف کرتے ہوئے لہجے کی متانت اور اسلوب کی شرافت برقرار رہے۔“ (فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۸۴)

۵۳۔ دیکھیے: نعت رنگ، شمارہ نمبر ۲۷، ص ۱۱۔

۵۴۔ دیکھیے: نعت رنگ ۲۶، ص ۱۳۔

۵۵۔ ’نعت رنگ‘ میں شائع ہونے والے ایک مکتوب نگار کا بیان ملاحظہ فرمائیے: ”ایک دوست کے احساس دلانے پر ’نعت رنگ‘ کے حالیہ شمارے (۱۶) میں شائع ہونے والے مکاتیب کا بغور جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ نعت کی آڑ میں بریلوی دیوبندی عصبیت پر تول رہی ہے اور نہیں معلوم کیوں ادارہ ان نظریاتی اور مسلکی تلخیوں کو اعتدال کا حسن نہیں دے رہا یا نہیں دے سکا یا نہیں دینا چاہتا۔ میں فرقہ پرستی کی اس آگ کو نہ غذا دینا چاہتا ہوں نہ ہوا کہ بحالات موجود اُمتِ مسلمہ ان مناقشات کی متحمل نہیں ہے۔ فکر و نظر اور دست و بازو کے تصادم کی کون سی کسر باقی رہ گئی ہے جسے ’نعت رنگ‘ پورا کرنا چاہتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج ساری دنیا ہماری زبوں حالی پر ہنس رہی ہے مگر ہمیں اپنی حالت پر رونا نہیں آتا۔“ (نعت نامے

ص ۲۰۳-۲۰۴)

۵۶۔ نعت رنگ ۲۶، ص ۱۳۔ مدیر نعت رنگ ایک اور ادارے میں تحریر کرتے ہیں: اُردو تنقید کے معتبر ناموں کا اس کارواں میں شامل ہونا یقیناً ’نعت رنگ‘ کے سفر کو اعتبار عطا کر رہا ہے۔ نعتیہ ادب میں تازہ مکالمے اور نئے بیانیے کی روشنی طوع ہو رہی ہے۔ یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ دلا نا ضروری محسوس ہو رہا ہے۔ کوئی لکھنے والا ہو یا پڑھنے والا، ہر شخص کا ہر دوسرے شخص سے مکمل اتفاق ضروری نہیں ہے۔ مکمل یا جزوی اختلاف کسی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اختلاف کوئی بری چیز بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے، ادب، فکر اور تنقید کے لیے تو یہ بڑی بابرکت شے ہے۔ اس لیے کہ اس سے خیال کے نئے دروا ہوتے اور فکر و نظر کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ تاہم یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اختلاف کو فکری و فنی سطح پر رہنا چاہیے۔ اسے ذاتی یا شخصی ہرگز نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی اسے مخالفت کی سطح پر آنا چاہیے۔ نیا ہو یا پرانا، چھوٹا ہو یا بڑا، ہر لکھنے والے کی اپنی ایک حیثیت اور اہمیت ہے۔ البتہ پرانے اور بڑے لکھنے والوں کے لیے ہمارے رویے میں زیادہ سنجیدگی، متانت اور لحاظ نظر آنا چاہیے۔ اس لیے کہ ہم اپنے بڑوں کی عزت و وقار کا خیال رکھتے ہوئے نظر آئیں گے تو یہ دراصل بعد والوں کی تربیت کا ذریعہ بھی ہوگا۔ ’نعت رنگ‘ نے اختلافات کو ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے۔ اس اشارے میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ تاہم آئندہ بے احتیاطی یا بے ادبی کو محسوس کرتے ہوئے ادارہ کسی بھی مضمون کی اشاعت سے انکار کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

۵۷۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: خوش معرکہ زیبا، سعادت خان ناصر، مرتبہ مشفق خواجہ، مجلس ترقی ادب لاہور، اول اپریل ۱۹۷۰ء، دوم مارچ ۱۹۷۲ء۔

۵۸۔ آبِ حیات، محمد حسین آزاد، مرتبہ ابرار عبدالسلام، شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، مارچ ۲۰۰۶ء، حاشیہ ص ۱۷۵۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۷۶۔

۶۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (i) نقوش ادبی معرکہ نمبر حصہ اول و دوم، شمارہ ۱۲۷-۱۲۸، ادارہ فروغ اردو لاہور، ۱۹۸۱ء (ii) الزبیر ادبی معرکہ، سہ ماہی الزبیر، مدیر مسعود حسن شہاب، اردو اکیڈمی، بہاولپور، ۱۹۷۴ء (iii) اردو کے ابتدائی ادبی معرکہ، ڈاکٹر محمد یعقوب عامر، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، مارچ ۱۹۹۲ء (iv) اردو کے ادبی معرکہ حصہ دوم، ڈاکٹر محمد یعقوب عامر، بستان ادب لاہور، ۱۹۹۱ء)

۶۱۔ آبِ حیات، محمد حسین آزاد، مرتبہ ابرار عبدالسلام، ص ۲۱۲۔

۶۲۔ کوکب نورانی نے طویل طویل خطوط تحریر کیے۔ ان میں سب سے طویل خط سوغات پر مشتمل ہے۔ ان کے تمام خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ دیکھیے: نعت اور آداب نعت، کوکب نورانی، مرتبہ ارشد جمال، ناشر مصنف، دسمبر ۲۰۰۴ء

۶۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: نعت رنگ کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ، ص ۱۵۸-۱۵۴

- ۶۴۔ دیکھیے: نعت رنگ، شمارہ نمبر ۴ ص ۵۴-۱۷
- ۶۵۔ نعت رنگ، شمارہ نمبر ۴ ص ۴۶
- ۶۶۔ نعت اور آداب نعت، ص ۴۹
- ۶۷۔ ایضاً
- ۶۸۔ نعت رنگ، شمارہ نمبر ۴ ص ۴۸
- ۶۹۔ نعت اور آداب نعت ص ۵۰-۴۹
- ۷۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: نعت رنگ کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ، ص ۵۱-۴۹
- ۷۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: (۱) نعت رنگ کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ، ص ۵۳-۵۲ (۲) نعت اور آداب نعت ص ۷۵-۵۹
- ۷۲۔ دیکھیے: نعت اور آداب نعت
- ۷۳۔ اس حوالے سے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے کہ غالب نے اپنی شاعری میں توارید یا سرتے کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اگر ان کی شاعری میں کسی متقدم شاعر کا خیال پیش ہو گیا ہے تو ان (غالب) کے لیے باعث ننگ نہیں بلکہ متقدم شاعر کی خوش نصیبی ہے اور میرے اشعار پر توارید کا گمان نہ کرو بلکہ یہ یقین جانو کہ چور (متقدم شاعر) اس کا (غالب کا) مال خزانہ ازل سے چرا کر لے گیا۔ یعنی اگر متقدمین کے بعض مضامین غالب کی شاعری میں پائے جائیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ درحقیقت یہ مضامین ازل میں غالب ہی کے حصے میں آئے تھے جسے متقدمین وہیں سے چرا کر لے گئے۔ اب اگر غالب نے مضامین کو اپنے نام سے پیش کیا تو کیا گناہ کیا کیوں کہ وہ تو اصل میں غالب کا ہی مال تھے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے:
- ہزار معنی سرخوش، خاص نطق من است کز اہل ذوق دل و گوی از عسل بردہ است
ز رفتگان بہ یکی گر تو ارم رو داد بدان کہ خوبی آرایش غزل بردہ است
مراسم ننگ ولی فخر اوست کان بہ سخن بہ سعی فکر رسا جا بدان محل بردہ است
مہر گمان توارید یقین شناس کہ دزد متاع من زخاں خانہ ازل بردہ است
- (تفصیل کے لیے دیکھیے: چودلا و راست مرتبین سلمان چشتی، ربیعان چشتی، خالد جامعی، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۳۶۰-۳۵۶)
- ۷۴۔ دیکھیے: ساراق بناری۔۔۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی، از مولانا احسن مارہروی، مشمولہ جریدہ چودلا و راست، ۲۰۰۷ء، ص ۳۶۰-۳۵۶
- ۷۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: تنقید، خلیق انجم، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۹۶-۱۸۶
- ۷۶۔ نعت نامے بنام صبح رحمانی ص ۷۹-۷۸
- ۷۷۔ ایضاً، ص ۲۸۱

- ۷۸۔ ایضاً، ص ۳۰۱
- ۷۹۔ فن اداریہ اور نعت رنگ، ص ۵۷
- ۸۰۔ ماہنامہ نعت، لاہور، مدیر اچار شید محمود، جنوری ۱۹۸۸ء ص ۳
- ۸۱۔ مدیر نعت رنگ لکھتے ہیں: ”الحمد للہ کہ اب ’نعت رنگ‘ کے لکھنے والوں کا حلقہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ ہمیں ابچھ مواد کی تلاش میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دستیاب مواد کو فوراً قارئین ’نعت رنگ‘ تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ (ابتداءً شمارہ ۱۴، دسمبر ۲۰۰۲ء۔۔۔ ص ۱۲۵)
- ۸۲۔ دیکھیے: نعت نامے بنام صبح رحمانی مرتبہ ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، جولائی، ۲۰۱۴ء۔
- ۸۳۔ دیکھیے: نعت اور آداب نعت، کوکب نورانی اوکاڑوی، مرتبہ صاحب زادہ ارشد جمال نقاش بندی، ناشر مصنف، دسمبر ۲۰۰۴ء۔
- ۸۴۔ غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، جلد اول، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۸ء، بار سوم، ص ۲۵۶۔
- ۸۵۔ نعت نامے بنام صبح رحمانی ص ۲۹۲
- ۸۶۔ ایضاً، ص ۳۰۹-۳۰۸
- ۸۷۔ ایضاً، ص ۳۰۶
- ۸۸۔ ایضاً، ص ۳۰۳
- ۸۹۔ ایضاً، ص ۵۰۷
- ۹۰۔ ایضاً، ص ۳۱۳-۲۹۰
- ۹۱۔ ایضاً، ص ۷۷
- ۹۲۔ ایضاً، ص ۲۸۵-۲۸۴
- ۹۳۔ ایضاً، ص ۲۸۵
- ۹۴۔ ایضاً، ص ۲۸۹-۲۸۸
- ۹۵۔ ایضاً، ص ۲۸۲
- ۹۶۔ ایضاً، ص ۲۸۹
- ۹۷۔ ایضاً، ص ۵۰۶
- ۹۸۔ ایضاً، ص ۲۹۳
- ۹۹۔ ایضاً، ص ۵۰۷
- ۱۰۰۔ ایضاً، ص ۲۹۰
- ۱۰۱۔ ایضاً، ص ۵۰۷-۵۰۶
- ۱۰۲۔ ایضاً، ص ۲۹۳

- ۱۰۳۔ ایضاً، ص ۴۶
 ۱۰۴۔ ایضاً، ص ۴۸-۴۷
 ۱۰۵۔ ایضاً، ص ۶۶-۶۵
 ۱۰۶۔ ایضاً، ص ۷۰
 ۱۰۷۔ ایضاً، ص ۵۰
 ۱۰۸۔ ایضاً، ص ۶۴
 ۱۰۹۔ ایضاً، ص ۴۸۴
 ۱۱۰۔ ایضاً، ص ۶۸۶
 ۱۱۱۔ ایضاً، ص ۶۹۵
 ۱۱۲۔ ایضاً، ص ۳۹، ۳۷، ۳۵
 ۱۱۳۔ ایضاً، ص ۸۰۳-۸۰۲
 ۱۱۴۔ ایضاً، ص ۸۲۳-۸۲۷
 ۱۱۵۔ ایضاً، ص ۸۱۵-۸۲۲
 ۱۱۶۔ ایضاً، ص ۶۹۶
 ۱۱۷۔ نعت اور آداب نعت ص ۲۹۴
 ۱۱۸۔ مکتب قاضی عبدالودود مرتبہ محضر رضا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۹۔
 ۱۱۹۔ غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، جلد اول ص ۱۵۸-۱۵۷
 ۱۲۰۔ نعت نامے، ص ۲۹۰
 ۱۲۱۔ نعت نامے، ص ۳۱۳-۳۱۲
 ۱۲۲۔ فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۵۷
 ۱۲۳۔ نعت رنگ، ابتدائیہ- شمارہ نمبر ۲ دسمبر ۱۹۹۵ء- ص ۹۷
 ۱۲۴۔ نعت نامے بنام صبیح رحمانی، ص ۳۰۷
 ۱۲۵۔ ایضاً، ص ۳۳۱
 ۱۲۶۔ ایضاً، ص ۳۰۵
 ۱۲۷۔ ایضاً، ص ۳۰۷
 ۱۲۸۔ ایضاً، ص ۳۰۳
 ۱۲۹۔ ایضاً
 ۱۳۰۔ ایضاً، ص ۶۲۴
- ۱۳۱۔ ایضاً، ص ۳۰۹
 ۱۳۲۔ ایضاً، ص ۲۶۲
 ۱۳۳۔ ایضاً، ص ۶۲۳/۲۶
 ۱۳۴۔ ایضاً، ص ۳۸۲
 ۱۳۵۔ ایضاً، ص ۲۰۵-۲۰۴
 ۱۳۶۔ ایضاً
 ۱۳۷۔ نعت نامے، ص ۵۲۶
 ۱۳۸۔ ایضاً، ص ۳۸۳
 ۱۳۹۔ ایضاً، ص ۷۲۲
 ۱۴۰۔ ایضاً، ص ۸۷۸
 ۱۴۱۔ ایضاً، ص ۳۸۵
 ۱۴۲۔ فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۵۰-۴۹
 ۱۴۳۔ نعت نامے بنام صبیح رحمانی، ص ۸۵
 ۱۴۴۔ ایضاً، ص ۸۷
 ۱۴۵۔ ایضاً، ص ۳۰۱
 ۱۴۶۔ ایضاً، ص ۴۷۹-۴۷۸
 ۱۴۷۔ ایضاً، ص ۵۰۵
 ۱۴۸۔ دیکھیے: فن اداریہ نویسی اور نعت رنگ، ص ۱۰۴۔
 ۱۴۹۔ دیکھیے: (i) غالب کا ایک فرضی استاد، عبدالصمد، قاضی عبدالودود، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء (ii)
 غالب بحیثیت محقق، قاضی عبدالودود، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
 (iii) عبدالصمد- استاد غالب، مالک رام مشمولہ فسانہء غالب، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اول جنوری ۱۹۷۷ء۔
 ۱۵۰۔ اداریہ از سید ظفر ہاشمی مدیر دو ماہی گلشن، احمد آباد، جنوری تا اپریل ۱۹۹۹ء، ص ۷۔

نعت: تعریف، تقاضے اور روایت

نعت:

نعت ہمارے ادب کی ایک مستقل صنفِ سخن ہے۔ قریباً ہر شاعر نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور کمال کمال کیا ہے، صرف کلمہ گویاں ہی نہیں، دیگر مذاہب کے شعرا نے بھی بقول شخصے، کچھ یوں اپنی عاقبت کا سامان کر لیا ہے۔ نعت بڑی نازک صنف ہے۔ شاعری کی تمام اصناف میں شاید سب سے زیادہ نازک۔ (تخلیل عادل زادہ ص ۵۰۹)

محمد ۷ شناسی کی طرح خدا شناسی کا اذاع بھی نوع بشر کے حیطہ اختیار سے باہر ہے۔ بجز محمدؐ کون ہے، جو خدا کو اس طرح جاننے کا دعویٰ کر سکے، جس طرح جاننے کا حق ہے۔ بقول راف:۔

آشنائے مصطفیٰ ہے ذات رب

اور قیصر مصطفیٰ رب آشنا

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حمد گوئی یا نعت نگاری کے حوالے سے کوئی بھی سعادت زور بازو کا حاصل نہیں ہے، بلکہ خدائے بخشنده کی بخشش ہے، جو بحمد للہ! ”نعت رنگ“ اس کے مرتب اور ادا رتی عمل کو بہر صورت نصیب ہے۔ یہ ایک معلوم بات ہے کہ نعت ہمیشہ حضور ۷ سے محبت اور وابستگی کے والہانہ اظہار کا ایک ذریعہ متصور ہوتی ہے۔ کئی عاشقان باصفا تو ایسے بھی ہیں، جو اپنے آپ کو فروتر ظاہر کرنے کے لیے ثنائے رسول ۷ کو ایک جسارت بلکہ سوء ادب خیال کرتے ہیں:

کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا

گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں

بائیں ہمہ عقیدے کی حد تک نعت شعرا اور غیر شعرا کا ہمیشہ مرکز نگاہ رہی ہے، البتہ فکری

وفی نقطہ نظر سے نعت کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا ہے۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ تاحال یہ فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ نعت ایک باقاعدہ صنفِ سخن ہے یا نہیں۔ نقد و نظر کے حوالے سے بھی خوش اعتقادی آڑے آئی ہے اور جو کچھ نعت میں کہا جاتا رہا ہے، اس پر نہ صرف صا د کیا گیا ہے بلکہ تنقیدی زاویہ نگاہ سے نعت کو پڑھنا یا سننا سوء ادب تصور ہوا ہے۔ اس صورت حال نے تاریخی، علمی، فکری اور اعتقادی اعتبار سے (خصوصاً قرآن و حدیث کی ارشادات کے تعلق سے) ایک لمحہ فکریہ کی جو صورت پیدا کر دی ہے، اس کا ”نعت رنگ“ نے بخوبی ادراک کیا ہے۔ یہ اسی کا کارنامہ ہے کہ آج نعت کے ضمن میں علمی، ادبی، انتقادی، تاریخی اور مذہبی جانچ اور پرکھ کے دروازے وا ہو چکے ہیں اور سرگزشتہ خمار رسوم و قیود نعت گو شعرا کے در فکر و خیال پر دلیل و برہان دستک دینے لگے ہیں۔ اس قلمی جہاد میں ”نعت رنگ“ کے جن قلم کاروں نے اہم کردار ادا کیا ہے، ان میں ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی سرفہرست ہیں۔ ڈاکٹر کشفی اردو ادب کی تدریس، تنقید، تحقیق اور تخلیق ہر لحاظ سے ممتاز و ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ نقد و نظر کے حوالے سے تو ان کی عظمت مسلم ہے۔ آج کل وہ نعتیہ ادب میں جو اضافے کر رہے ہیں، وہ علمی، ادبی اور تاریخی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ (قیصر خفجی ص ۷۴۵-۷۴۴)

نعت کہنے سے پہلے آداب نعت سے واقفیت ضرور حاصل کرے کیوں کہ یہ صرف شعر کہنے والی بات نہیں، یہ تو محبوب رب جلیل کی بارگاہ میں باریابی پانے کی جستجو کا مرحلہ ہے۔ محبت رسول کے میزان پر ایمان تولنے کا معاملہ ہے۔ ایمان و عقیدت کے قبلہ و کعبہ کی طرف جان و دل کرنے کا سلسلہ ہے۔ قطرے کو گہر کرنے، ذرے کو رشک آفتاب کرنے کا ول ولہ ہے اور کیوں نہ ہو، نعت گوئی میرے معبودِ کریم کی سنت ہے، یہ وہ وصف و سعادت ہے جو مشیتِ خاک کو قرب ایزدی عطا کرتی ہے۔ روایت ہے کہ سجدے میں بندہ اپنے رب کریم کے بہت قریب ہوتا ہے، اسے بہت پیارا لگتا ہے، شاید یہ وجہ بھی ہو کہ سجدے میں بندے کا جسم رب کریم کے محبوب کریم کے مبارک نام ”محمد“ ۷ کی مکتوبی ساخت کا نقش جمیل بن جاتا ہے۔ (کوکب نورانی ص ۱۱۱۳)

نعت کا موضوع کبھی پرانا نہیں ہوتا، آفتاب کی کرنوں پر بھی کبھی بڑھاپا نہیں طاری ہوا، تارے کبھی پرانے نہیں ہوئے، حضور اقدس ۷ کے احسانات کو یاد کرنے کی خو کو رجعت پسندی سمجھنے والوں کی عقلیں محروم بینائی ہو سکتی ہیں، ان پر عجز و پیری کا دور آ سکتا ہے مگر وہ ذات سرکار رسالت پناہ کی ذات اقدس کو انسانی آبادی نے یہ کہہ کر پکارا ہے اور اسی طرح تا قیامت فریاد کرتی

رہے گی: (عبداللہ عباس ندوی ص، ۶۶)

دو عالم بہ کاکل گرفتار داری بہر مو ہزاراں سیہ کار داری
تو سر تا بہ پا رحمتی یا محمدؐ نظر جانب ہر گنہ گار داری

نعت، صنفِ سخن کی حیثیت سے:

جناب انور خلیل نے کہا ہے:

میرے خیال میں نعت کو علاحدہ صنفِ سخن کہنا صائب نہیں... ہیئت کے لحاظ سے اصنافِ سخن شمار ہوتی ہیں جب کہ نعت کسی بھی صنفِ سخن میں کی جاسکتی ہے۔ اسی لیے میں نعتیہ ادب کی اصطلاح کو صنفِ سخن پر ترجیح دیتا ہوں۔

عارف منصور ص ۴۰۸ پر لکھتے ہیں:

اصنافِ سخن کی دو بڑی اقسام ہیں۔ ایک ہیئت کے حوالے سے جیسے نظم، مسدس، ہائیکو وغیرہ اور دوسرے موضوعات کے حوالے سے جیسے حمد، نعت، نوحہ مرثیہ۔

عارف منصور کی اس توضیح سے ص ۵۲۲ پر لکھے گئے جناب کوکب نورانی کے اس اعتراض کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ جناب کوکب نورانی لکھتے ہیں:

لوگوں نے کتنی غلطی پھیلا رکھی ہے کہ حمد کے معنی ہیں خدا کی تعریف اور نعت کے معنی ہیں رسول کی تعریف۔ (احمد صغیر صدیقی ص، ۷۹)

بائیں ہمہ عقیدے کی حد تک نعت شعر اور غیر شعر کا ہمیشہ مرکز نگاہ رہی ہے، البتہ فکری و فنی نقطہ نظر سے نعت کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا ہے۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ تاحال یہ فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ نعت ایک باقاعدہ صنفِ سخن ہے یا نہیں۔ (قیصر نجفی ص، ۷۵)

تجربہ ہے کہ ارباب نقد و نظر نے صنفِ نعت کو اپنی تحریروں میں وہ مقام اور درجہ نہیں دیا جو دوسری اصنافِ سخن کو دیا ہے آخر کیوں؟ غالباً اس کی وجہ مذہب سے کم تعلق اور رسول ﷺ کی تعریف و توصیف کے حوالے سے اس کو (نعوذ باللہ) یک رخہ سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا، صنفِ نعت پر جستہ جستہ کام ہوا جو نہ ہونے کے برابر ہے، نعتوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں اور

ایک آدھ کتاب تاریخِ نعت کے حوالے سے منظر عام پر آئی ہے جس سے سیری نہیں ہوتی۔ آپ کا کام ٹھوس ہے اور آپ نے نعت کو ادبیات کی اعلیٰ اصناف میں شامل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ (تالش دہلوی ص، ۲۴۲)

اردو میں جب سے شعر و ادب لکھا جا رہا ہے اس وقت سے حمد و نعت بھی کہی جا رہی ہے لیکن برکت و تبرک کے لیے..... اس جذبے سے بلند ہو کر جن شعرائے کرام نے نعت کو ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے اپنایا۔ ان میں حضراتِ محسن کا کوروی، امیر بینائی، احمد رضا خان بریلوی کے نام خصوصیت سے لیے جاسکتے ہیں۔ اب رہی بات علامہ اقبال کی..... انھوں نے واقعی حمد اور نعت کو ایک نیا رخ دیا ہے اور کشفی صاحب کے مطالبہ پر پوری اترتی ہے..... یعنی اقبال کے یہاں قرآن و حدیث کا مطالعہ اور کائنات کا مشاہدہ نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑوں سے نسبت ہی بڑا بناتی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری اسی وجہ سے بلند تر ہے کہ وہ قرآن و حدیث سے اکتسابِ نور کرتے ہیں۔ اب رہی مولانا الطاف حسین حالی کی نظم ”مد و جزر اسلام“ تو اس کے ادبی محاسن اپنی جگہ لیکن برادرِ محترم جمال پانی پتی صاحب نے نہایت پتے کی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں: ”انھوں نے (مولانا حالی نے) اس بات پر غور نہیں کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ کی بے مثل بشریت اور عبدیت کا ملکہ کو ہم جیسے عام انسانوں کی سطح کے برابر لانے سے نعت گوئی کا حق تو رہا درکنار، خود ایمان کی سلامتی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“ (سلطان جمیل نسیم ص، ۴۳۲-۴۳۱)

جناب سید حسین احمد نے اصنافِ سخن کی تعریف و تقسیم کرنے والوں کے حوالے سے (شاید) یہ لکھا ہے، مجھ سا کم علم و کم فہم یہ جاننا چاہتا ہے کہ ”صنفِ سخن“ کی تعریف کی بنیاد کیا ہے؟ ”نعت کو“ مضامینِ سخن“ اور ادب تو خود انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے یعنی نعت بلاشبہ سخن تو ہے صرف ”صنف“ کا سابقہ اس کے ساتھ لگانے کے لئے فنی طور پر جو اعتراض انہیں مانع ہے وہ فارم اور اجزائے ترکیبی کے تعین و تقرر کا ہے۔ اس بارے میں مروجہ فنی اور تکنیکی قواعد و ضوابط سے واقف نہ ہونے کے باوجود یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو معاشرے میں اصنافِ سخن کی تعریف و تقسیم وغیرہ سے پہلے بھی نعت تھی بلکہ اردو نہیں تھی اور نعت تھی، شاعری میں غزل، نظم، رباعی، مرثیہ وغیرہ کی تقسیم سے پہلے نعت تھی اور اسے نعت ہی کہا اور شمار کیا گیا۔ نعتیہ غزل یا نعتیہ رباعی کے نام تو بہت بعد کے دور میں لکھے پکارے گئے ہیں۔ اس پہلے سے موجود نعت کو کیا کہا جائے گا؟ اردو دان طبقے کا اپنے معاشرے میں حمد و نعت کی اصطلاحی تقسیم طے کر لینے کا یہ مطلب نہیں کہ عربی دان طبقے اور

عرب معاشرے میں بھی یہی استعمال بلفظ منوایا جائے۔ لفظ ”ثناء“ کی مثال سامنے ہے، اُردو دان طبقہ اس کی معنوی حد بندی پر کوئی اصرار نہیں کرتا۔ متعدد لفظوں کی ایک فہرست یہ فقیر ہی فراہم کر سکتا ہے جن کے اصل لغوی اور ہمارے ہاں اصطلاحی معنوں کا استعمال مختلف ہے، اس کے باوجود ان الفاظ کے وسیع استعمال پر اختلاف نہیں کیا جاتا۔ شعر کہنے والے کو صرف شاعر کہا جاتا ہے خواہ وہ کسی ایک مروجہ صنف ہی میں کلام کہے، ہر صنف کے حوالے سے اس کا نام نہیں پکارا جاتا، یعنی نظم کہنے والے کو صرف ناظم نہیں کہا جاتا بلکہ نظم کا لفظ بھی لغت میں وسعت رکھتا ہے اور کئی معنی دیتا ہے اور کیا باقی اصنافِ سخن میں ”نظم“ نہیں؟ کیا بے نظمی اور بد نظمی پائی جاتی ہے ان میں؟ ”غزل“ کے لفظ کے لئے ذرا لغت کھولنے اور دیکھنے کیا کیا معانی درج ہیں۔ غزل نگار کو غزل کیوں نہیں پکارا جاتا؟ کیا غزل ”سیاسی“ نہیں ہوتی؟ کیا مضامین اور موضوعات کا سابقہ دیگر مروجہ اصنافِ سخن کے ساتھ نہیں پکارا جاتا؟ جب معاشرے میں ”نعت“ کے اصطلاحی طور پر ایک معنی و مفہوم پر اتفاق کیا جاسکتا ہے تو اس کے ”صنفِ سخن“ مانے جانے میں کیا حقیقی عذر مانع ہے؟ میری یہ عرض اگر شاعری کے متفقہ اصول و قواعد کے مطابق فضول ہے تو معذرت خواہ ہوں۔

(کوکب نورانی ص ۳، ۱۹۳-۱۹۲)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کا مضمون ”نعت، بحیثیت صنفِ سخن“ اہم مضمون ہے۔ ہمارے بعض ناقدین صرف مخصوص موضوع اور کوئی مخصوص ہیئت نہ ہونے کی بنا پر نعت کو ”صنفِ سخن“ تسلیم نہیں کرتے جبکہ یہی ناقدین ”مرثیے“ کو صنفِ سخن کا درجہ دیتے ہیں جبکہ یہ بھی موضوعی صنف ہے اور جو لوگ ”مسدس“ کو اسکی ”ہیئت“ قرار دیتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اس کی مسدس ہیئت تو انیس و دہیر کی وجہ سے مقبول ہو گئی ورنہ ان سے قبل اور آج بھی مسدس کو مرثیے کی حتی ہیئت تسلیم نہیں کیا گیا ہے جس طرح رباعی کی ہیئت تسلیم شدہ ہے، آج بھی دیگر شعری ہیئتوں میں مرثیے کہے جا رہے ہیں اس لیے جس طرح مرثیے کو موضوع کے اعتبار سے صنفِ سخن کا درجہ دیا گیا ہے اسی طرح نعت کو بھی ”صنفِ سخن“ تسلیم کر لینا چاہئے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۲۷، ۱۹۸)

مرثیہ اور نعت: مماثلت کی چند جہتیں:

سید حسین احمد کا مضمون ”کیا نعت ایک صنفِ سخن ہے“ ایک مختصر سی تحریر ہے، جسے نعت اور مرثیے کا ایک تقابلی جائزہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ درست ہے کہ عہدِ سودا سے قبل

مرثیے کا کوئی فارم مقرر نہیں تھا اور نہ ہی اجزائے ترکیبی متعین تھے۔ سودا نے فارم اور میر ضمیر نے اجزائے ترکیبی مقرر کر کے مرثیے کو ایک باقاعدہ صنفِ سخن بنا دیا۔ ہمارے خیال میں ہیئت کے اختصاں اور فنی صورت گری کے باوصف مرثیہ ایک طویل عرصے تک ایک صنفِ سخن کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا اور مرثیہ گو شاعر کو ”بگڑا ہوا شاعر“ کہا جاتا رہا۔ تا آں کہ علامہ شبلی نعمانی نے ”موازنہ انیس و دہیر“ لکھ کر مرثیے کی فنی اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہ شبلی ہی تھے، جنہوں نے مرثیے کے سر پر ایک باقاعدہ صنفِ سخن کا تاج رکھا۔ مقام حیرت ہے کہ نعت بھی صدیوں سے ویسے حالات سے دوچار ہے، جیسے حالات مرثیے کو اپنے ارتقائی سفر میں درپیش تھے، مگر افسوس کہ اب تک نعت کو نہ تو کوئی سودا ملا ہے، نہ میر ضمیر اور نہ ہی کوئی شبلی نعمانی یہ ایک لمحہ فکر یہ ہے، جس پر اہل فکر و نظر اور صاحبانِ علم و دانش کو توجہ دینا چاہیے۔ (قصرِ نجفی ص ۷۴)

اُردو میں نعتیہ ادب: تخلیقی اظہار کی چند صورتیں:

نعتیہ ادب کے سلسلے میں کسی دقیق مطالعہ کا میں دعویٰ نہیں کرتا لیکن جو کچھ پڑھا اور دوسروں کی رائے سے متاثر ہوئے بغیر جو رائے قائم کی ہے ممکن ہے درست نہ ہو۔ لیکن یہ میری رائے ہے اور اسی طور قبول کرنا میرے حق کو تسلیم کرنا ہے۔ میرا مطالعہ یہ نظریہ قائم کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اردو میں نعت گوئی چار نوع کی ہے۔

- ۱۔ وہ نعت جو جذبہ صادق اور خلوص بے پایاں کے ساتھ لکھی گئی ہو اس کی پہچان یہ ہے کہ قاری اور نعت خواں پر پڑھنے کے دوران ایک خاصی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔
- ۲۔ کمال فن کے اظہار کے لیے لکھی گئی نعت، اس کا اثر دل پر کم ہوتا ہے۔ البتہ دماغ غور و فکر پر مائل ہوتا ہے۔ اس کی داد دی جاتی ہے اس سے کیف طاری نہیں ہوتا۔
- ۳۔ روایت کی پاسداری میں کہی جانے والی نعت۔
- ۴۔ بس یوں ہی کہی ہوئی نعت! جب سب کہتے ہیں تو ہم کیوں نہ کہیں کے جذبے سے وجود میں آنے والی نعت۔

ذرا سی توجہ سے ہر نعت کو ان میں سے کسی قسم میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں (۱) اور (۲) کے امتزاج سے جو نعت وجود میں آتی ہے وہ ہر اعتبار سے کامیاب ہوتی ہے۔ (شفقت رضوی ص ۷۷، ۱۹۷)

تخلیق نعت کی خصوصیات:

بات درحقیقت یہ ہے کہ ہر شعر کہنے والا نعت نہیں کہہ سکتا ہے۔ اس کے لیے شعری سلیقہ، رسول اللہ ﷺ سے عشق، رسالت کے تقدس سے آگہی، مقام رسالت کا شعور اور لفظوں کو موتیوں کی طرح شعری مالا کاروپ دینا آنا ضروری ہے کہ کوئی لفظ مقام رسالت کے منافی نہ ہو اور کوئی شعر تقدس رسالت کے خلاف نہ ہو اور یہ سب اُس وقت آتا ہے جب وہ ایک تہذیبی روایت، ماحول فضا، ربانی سے گزر رہا ہو جس کی برتر مثال حضور ﷺ کے دور کی مدنی زندگی ہے کہ حضور ﷺ کا ہر صحابی حضور ﷺ کے عشق سے سرشار نظر آتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ بنی نجاری لڑکیوں کے ان استقبالیہ اشعار سے بھی ہوتا ہے کہ اُن کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات کیا تھی اور وہ اُس ہستی میں کس کل کا منظر دیکھ رہی تھیں یا اُن کو دکھایا جا رہا تھا:

طلع البدر علینا من ثنیا ت الوداع
وجب الشکر علینا ما دعیٰ للہ داع
ایہا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

اب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کیا ماحول تھا کہ بنی نجاری چھوٹی چھوٹی بچیاں بلند پایہ روایت کی بنا ڈال رہی تھیں۔ حضور ﷺ کے مدینہ شریف میں ظہور فرمانے سے پہلے ہی اہل ایمان کے گھروں میں سرشاری کی کیفیت تھی۔ حضور ﷺ سے محبت کا ذکر بلند تھا اور یہ نعتیہ اشعار اُس ذکر و شوق کا نتیجہ تھے۔ یہ لفظ ہمیشہ کے لیے زندگی پا گئے، امر ہو گئے۔ اب میں اُس فضا، اُس تقدس، اُس ماحول کی طرف آتا ہوں جو ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کی یادوں میں محفوظ ہے اور جس کا سفر آج بھی جاری ہے، لیکن وقت نے اسے نئی جہتیں دے دی ہیں۔ اور اب یہ گھروں کے آنگنوں، راہ داریوں اور حویلیوں سے نکل کر عوامی سطح پر ایمان افروز محافل کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اب یہ ایک ایسی Poetic sensibility (شعری حسیت) ہے جو تقدس کی زرمالاؤں کا روپ دھار چکی ہے، نعتیہ شاعری نے عربی ادب میں عشق نبی ﷺ سے اظہار کی ایک Dynamic (متحرک) اور پُر اثر شکل اختیار کر لی جب کہ Devotional (جاں نثاران) شاعری کی اصناف میں کوئی دوسری شکل رائج نہ ہو سکی اس میں ایک تو یہ کہ نبی پاک ﷺ سے محبت کرنے اور اُس کے اظہار کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ فعل سمجھا گیا۔ دوسرے یہ کہ صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ سے

محبت کا وہ معیار قائم کیا جو روح زمانہ کے ساتھ سفر کر رہا ہے، ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی نے یادوں کے دریچوں سے پردے اٹھا کر وہ کہکشاں دکھائی ہے جو شہر نبی ﷺ کی فضاؤں کو چھو رہی ہے۔ (سلیم یزدانی ص ۴۴۲-۴۴۱)

نعت گوئی کی خصوصیات:

نعت، نہایت مقدس و محترم صنف سخن ہے لہذا اس کی تقدیس و طہارت کا تقاضا ہے کہ مضامین و افکار بھی ایسی ہی صفات کے حامل ہوں، ان کے اظہار کا ذریعہ زبان ہے تو اس کا بھی صحیح اور پاکیزہ و شستہ ہونا لازمی ہے۔ اس لیے الفاظ کا انتخاب انتہائی غور و فکر اور احتیاط کا طالب ہے۔ اگر ایک بھی نامناسب لفظ در آیا تو وہ ساری شعری فضا کو مکدر کر دیتا ہے۔ زبان کے ساتھ فنی شاعری اور عروض کا علم بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ یہی شاعری کی اساس ہیں۔ مضمون کتنا ہی اعلیٰ ہو، زبان کتنی ہی عمدہ ہو، بیان لاکھ خوب صورت سہی لیکن اگر شعر میں فنی عیب یا عروض کی خامی موجود ہو تو وہ ایک زنگ آلود آئینے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۱۳۳)

نعت گوئی کے لیے ان خصوصیات کے علاوہ حقیقت و صداقت کیساتھ سنت و شریعت، سیرت پاک، قرآن و حدیث کا قابلِ قدر علم اور اس کی پاسداری بھی لازم ہے۔ ہمارے اکثر شعرا کا تو یہ حال ہے کہ وہ مدینہ منورہ کی تعریف و توصیف میں کہے گئے اشعار کو بھی نعت کہتے ہیں۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ دیوبندی، بریلوی، سلفی، نجدی جیسے تنازعات بھی نعت میں شامل ہو گئے ہیں جب کہ ان کے لیے اردو میں ایک بہترین صنف سخن ”ہجو“ موجود ہے، شعرا ہجو یہ نظمیں نہ کہتے ہوئے اس قبیل کے اشعار نعت میں کہتے ہیں جو مجھے تو مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۱۳۴)

نعت گو / نعت گوئی کے لیے شرائط:

”نمائے رسول ﷺ“ کے ضمن میں میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ شہر غزل، نعت گو کی تربیت گاہ ہے۔ رموزِ شعر سے آشنائی ضروری ہے۔ نعت گو کو شعر کی باریکیوں، نزاکتوں اور لطافتوں سے آگاہ ہونا چاہیے جمالیاتی قدروں کی پاسداری کا اہل ہو تو اسے اقلیم نعت میں داخلے کی اجازت ملنی چاہیے، آنسوؤں سے وضو کرنے کا سلیقہ جانتا ہو تو قلم اٹھائے۔ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں ہدیہ نعت پیش کیا جائے تو نعت فنی حوالے سے بھی اعتبار و اعتماد کے معیارات پر

پورا اُترتی ہو۔

ادب گاہست زیر آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

یہاں تو ذرا سی بھی لغزش یا شونٰی سوئے ادب میں شمار ہوگی اس لیے احتیاط اور ادب پہلی شرط ہے لیکن مجھے ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات سے اختلاف کرنے کی اجازت دیجیے کہ

”زبان کے ساتھ فن شاعری اور عروض کا علم بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ یہی

شاعری کی اساس ہے۔“

یقیناً زبان کے ساتھ فن شاعری اور عروض کا علم بھی شاعر کے لیے ضروری ہے لیکن یہ شاعری کی اساس نہیں۔ شاعری تو دل کے آئینوں کے رقص میں آنے کا نام ہے، شاعری کی اساس تخیل ہے، شاعرانہ اپروچ ہے۔ اظہار کا کھرا پن ہے۔ ندرت فکر اور سوچ کی بلند پروازی ہے۔ جذبے کی سچائی اور اثر پذیری کے اوصاف زندہ شعر کی بولتی علامتیں ہیں، شاعری جمالیاتی شعور کے ابلاغ کا نام ہے، گزارش ہے کہ پہلے شاعری وجود میں آئی۔ فن شاعری کے ضابطے اور اصول اساتذہ کی شاعری سے اخذ کیے گئے کون کا فر علم عروض کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہے لیکن ہر شاعر کے لیے علم عروض کا ”ماہر“ ہونا بھی تو ضروری نہیں۔ اگر مذکورہ کلیے کو حرف آخر سمجھ لیا جائے تو علم عروض کے ماہرین ہی کو شعر لکھنے کا حق حاصل ہوگا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک اچھا عروضی ایک اچھا شاعر نہیں ہو سکتا وہ ہر وقت جمع تفریق کے چکر میں رہتا ہے۔ شاعری تو ایک خداداد صلاحیت کا نام ہے، شعوری کوششوں سے محض ان صلاحیتوں میں نکھار پیدا کیا جاسکتا ہے، شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ عروض کی کتابیں پڑھ کر شاعر نہیں بنا جاسکتا، علم عروض شاعری کی اساس نہیں بلکہ شاعری علم عروض کی بنیاد ہے، کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ آج لاشعوری طور پر زبان و بیان کا نیا ضابطہ تحریر مرتب ہو رہا ہے۔ (ریاض حسین چودھری ص ۳۹۲)

ہمارے بزرگ جو کچھ لکھ گئے ہیں ہم اس سے ہدایت بھی حاصل کر سکتے ہیں اور عبرت بھی بشرطیکہ دیدہ بینا رکھتے ہوں..... آپ شاید میرے اس مشورے پر ہنس دیں لیکن میں اپنے نوجوان اور جدید شعرا کو یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ جس طرح دنیا کا کوئی بھی فن..... گانے بجانے سے لے کر..... کرکٹ، فٹبال اور شاعری تک بغیر سیکھے نہیں آتا..... اس لیے وہ جس شعبے سے بھی متعلق ہوں اس کے بارے میں پرانی سے پرانی اور نئی سے نئی ہر اہم بات ضرور سیکھیں اور

معلوم کریں..... خاص طور سے نئے شاعروں کو یہ چاہیے کہ وہ مطالعہ اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ جو آئمہ فن آج موجود ہیں ان سے بھی رہنمائی حاصل کریں۔ اس لیے کہ شاعری میں مشکل ترین صنف نعت ہے..... ذرا سے ڈمگائے اور گئے۔ (سلطان جمیل نسیم ص ۴۳۲)

نعت لکھنا بقول عرفی تلوار کی دھار پر چلنے کا عمل ہے۔ تہذیب و ادب کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ شاعری جمالیات کا التزام آسان کام نہیں ہے۔ نعت نگاری کے لیے محض سرکارِ دو عالم کی محبت و عقیدت ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے اُس ذاتِ عظیم کی حتی الامکان تفہیم بھی چاہیے۔ یوں تو حقیقت محمدیؐ کو خالق کائنات کے سوا کون جانتا ہے۔ مگر ایک امتی ہونے کی حیثیت سے ہمارے ذہنوں میں ختمی مرتبت کا کیا تصور ہے، یہ بات نعت نگاری میں بہت اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ رسول کریمؐ کے مقام بشریت اور مقام نبوت کے متوازن تصور ہی سے ایک مودب اور اثر انگیز نعت تخلیق کی جاسکتی ہے۔ یہاں غزل کے عام محبوب اور محبت والی کیفیت زیبا نہیں ہے۔ نعت آقا و غلام کے رشتے پر استوار ہوتی ہے۔ یہاں برابری گستاخی ہے۔ یہ حفظ مراتب کی دنیا ہے یہاں تعظیم کی کڑی شرطیں ہیں۔ اور انہی پابندیوں اور شرائط میں رہتے ہوئے ایک نعت نگار کو اپنے جمالِ فن اور تخلیقی شعور کے نگ دکھانے پڑتے ہیں۔ آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آپ نے نعت پر تنقید کا باقاعدہ آغاز کیا اور قدیم اور جدید نعتوں کے مضامین اور اسالیب پر معروف اہل قلم سے انتقادی مقالات لکھوائے۔ جس کی وجہ سے ادب کے عام قاری کو نعت کا ایک نیا شعور ملا۔ (فراست رضوی ص ۹۰۲/۲۵)

قرآن کا ترجمہ کرنے کے لئے صرف عربی داں ہونا کافی نہیں، اسی طرح نعت کہنے کے لئے صرف شاعر ہونا کافی نہیں ورنہ خود ظہیر صاحب وہ اوصاف کیوں لکھ رہے ہیں جن کے بعد ان کے نزدیک مشکل نہیں ہو سکتی؟ نعت نگاری میں ان اوصاف کے باوجود بھی کوئی لغزش بعید از امکان نہیں۔ (کوکب نورانی ص ۱۵۶/۳)

اس بارے میں عرض ہے کہ نعت نگار ہو یا سیرت نگار، انہیں ”شرک“ کی صحیح تعریف اور اس کی بنیادی باتوں سے آگہی ہونی چاہیے اور یہ آگہی حقائق اور ادلہ شرعیہ کے مطابق ہو۔ علمائے حق اہل سنت و جماعت نے عقائد و نظریات پر جو کتابیں یادگار بنائی ہیں ان کا مطالعہ ضرور کیا جائے۔ (کوکب نورانی ص ۲۳۸/۳)

ان باتوں کے حوالے سے یہ کہوں گا کہ نعت گوئی کے لیے نعت گو کا سیرت رسول

کریم ۷ سے پوری طرح واقف ہونا، بلاشبہ بہت اچھی اور اہم شرط ہے لیکن ”پوری طرح واقفیت“ تو کیا، بنیادی ضروری واقفیت میں بھی ”کچھ“ ہی شمار ہوں گے۔

نظم و نثر میں نعت کہنے والوں کو ضرور چاہیے کہ وہ سیرت رسول کریم ۷ پر لکھی گئی مستند کتابوں کا توجہ سے مطالعہ ضرور کریں اور خود اپنی فہم کی تائید و تصدیق بھی جب تک حقائق و براہین سے نہ پائیں، اسے بیان نہ کریں۔ (کوکب نورانی ص، ۳/۲۴۷)

میری عرض صرف اتنی ہے کہ کوئی شعر کہے یا تنگ بندی کرے مگر نعت شریف صرف وہی کہے جو نعت شریف کہنے کو غایت درجہ سعادت جانے اور خود کو بخوبی یہ باور کرا لے کہ اس کی ہر قابلیت و صلاحیت کی نہایت کے باوجود اس سے ذاتِ ممدوح (۷) کی مدح و ثنا کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور ذاتِ ممدوح (۷) کی محبت و تعظیم کے ہر ہر تقاضے کا ہر مرحلے اور ہر لمحے پاس و لحاظ رہے۔ (کوکب نورانی ص، ۳/۳۳۱)

نعتیہ ادب اور احتیاط کے تقاضے:

حافظ (افضل فقیر) صاحب کو اللہ نے جو غیر معمولی بصیرت اور بیان کا جو حیران کن سلیقہ عطا کیا تھا وہ اس دیا چے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے شعر و شاعر کے ضمن میں جن چار مقامات کا ذکر کرنے کے بعد کمال و وسعت نظر کے ساتھ ان کی جو توضیح کی ہے اس سے خود میرے بعض اشکالات رفع ہوئے۔ البتہ مضمون کے آخر میں عرفی شیرازی کے نعتیہ قصیدے کے جو دو شعر انھوں نے درج فرمائے ان میں سے پہلے میں عرفی وہ احتیاط ملحوظ نہ رکھ سکا جس کی اس جیسے عالی دماغ شاعر سے توقع تھی۔ عرفی بعض اور مقامات پر بھی ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتا ہے مثلاً اس کے ایک اور نعتیہ قصیدے کا ایک شعر ہے:

عیسیٰ مکسِ تکلم تو حلوائے دکانِ آفرینش

اب آپ غور فرمائیے کہ کیا اس شعر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تحفیف کا پہلو صاف نمایاں نہیں؟ بہر حال کہنا یہ ہے کہ متقدمین خواہ وہ فارسی ادب سے متعلق ہوں خواہ اردو سے، ان امور پر وہ توجہ نہیں دے سکے جس کا تقاضا نعت گوئی کرتی ہے۔ اس تمام تر کے باوجود اردو اور فارسی کا کلاسیکی نعتیہ ادب اس کا مستحق ہے کہ اس کے قابل لحاظ حصے کو ادب عالیہ میں شمار کیا جائے۔ (ڈاکٹر حسین فراقی ص، ۲۴۵)

نعت میں محتاط رویوں کی ضرورت کو ہمیشہ محسوس کیا گیا، لیکن دورِ موجود میں یہ ضرورت کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے کہ پہلے عام طور پر وہ لوگ نعت کہتے تھے جن کا فطری رجحان اس موضوع کی طرف ہوتا تھا اور وہ دینی تعلیم رکھتے تھے لیکن پاکستان میں ہر شاعر نعت کہنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے اور نعت کے موضوعات میں بہت وسعت آ رہی ہے۔ اس لیے نعت میں احتیاط کے تقاضوں کو سامنے لانے کی ضرورت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ غالباً یہی محسوس کرتے ہوئے رشید وارثی اور عزیز احسن نے اس کام کے لیے بڑے بھرپور انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ دونوں حضرات قرآن پاک اور حدیث مبارکہ پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور ان کا ادبیات کا مطالعہ بھی وافر ہے، پھر انھوں نے پہلے ہونے والے احتساب سے بہتر انداز اختیار کیا ہے... رشید وارثی نے ذم کے پہلو رکھنے والے اشعار کی نشان دہی کی، لیکن شعرا کرام کے نام نہیں دیے۔ یہ روش اس اعتبار سے بہتر ہے کہ مقصود نعت نگاروں کی تحقیر نہیں، بلکہ ذم کے پہلوؤں کو سامنے لانا ہے، تاکہ نعت، معیاری بن سکے۔ عزیز احسن نے البتہ پورے اعتماد اور جرأت سے شعرا کرام کے نام لے کر بے احتیاطیوں کی نشان دہی کی ہے، لیکن انھوں نے اپنا زاویہ نظر یہ بتایا ہے:

محبتیں بھی رہیں دل کو تھیں بھی نہ لگے

کسی کے سامنے اس طرح آئینہ رکھیے

اشتہارات سے پتا چلا ہے کہ یہ دونوں حضرات اور ادیب رائے پوری ان موضوعات پر کتنا تیار کر لیتے ہیں۔ اللہ انھیں مزید فکری بالیدگی اور توازن سے نوازے۔ (حفیظ تائب ص، ۲۸۱)

افسوس یہ ہے کہ اس زمانے میں بہت سے لوگوں نے نعت کو فیشن کے طور پر یا رواج عام کی پابندی کی مجبوری کی بنا پر اختیار کر لیا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اکثر شعرا نے کرام کو زبان پر پوری طرح قدرت نہیں، لہذا ان سے عجب عجب طرح کی بے تمیزیاں اور بھونڈے پن سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ ایک عام طریقہ یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ یا پیغمبر اسلام سے یوں مخاطب ہوتے ہیں گویا نعوذ باللہ ان کو کچھ دے رہے ہوں، یعنی اظہارِ محبت اس طرح ہوتا ہے کہ اپنی محبت کا ذکر زیادہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ۷ کو گویا اپنی ثنا اور توصیف کا مستفیدہ قرار دیے جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ کی زیر نظر کتاب میں کچھ مختصر تحریریں ایسی ہیں جن میں نعت گوئی کے آداب سے بحث کی گئی ہے، لیکن تشنگی محسوس ہوتی ہے کیوں کہ بنیادی باتیں پوری طرح زیر بحث نہیں آئیں۔ دیگر مضامین میں جناب حسن محمود جعفری کا مضمون بہت خوب ہے لیکن مغربی حوالوں کی کثرت کے باوجود

کوئی بنیادی نتیجہ پوری طرح واضح ہو کر نہیں ملا۔ (شمس الرحمن فاروقی ص ۵۱۲-۵۱۱)

نعت گوئی کے بارے میں میرا خیال ہے کہ اگر یہ صدق جذبے سے کی جائے تو اس میں بڑا اثر ہوتا ہے، لیکن اگر اسے فیشن اور تقلید کے طور پر اختیار کیا گیا تو اس میں وہ تاثر اور والہانہ پن پیدا نہیں ہوتا جس کے بغیر نعت، نعت نہیں ہوتی۔ پاکستان میں ان دنوں نعت گوئی نے ایک فیشن کی صورت اختیار کر لی ہے جسے ٹیلی وژن، ریڈیو اور نعتیہ مشاعروں نے مزید فروغ دیا ہے۔ دل کی گہرائیوں اور رسول اکرم ﷺ سے گہری محبت اور عقیدت کے تحت نعت کہنا اور محض قادر الکلامی کے زور پر شعر موزوں کرنا ایک بات نہیں ہے۔ اس لیے نعت گو تو بے شمار ہیں لیکن بہزاد لکھنوی جیسے نعت گو معدودے۔ بہر حال آپ کی کوشش قابل تعریف ہے۔ شکریہ (شہزاد منظر ص ۵۵۲)

جناب رضوی صاحب کے تحقیقی مضمون کے علاوہ نعت سے متعلق کچھ تنقیدی مضامین بھی زیر نظر تالیف میں شامل ہیں۔ ان مضامین میں جناب عاصی کرنالی، جناب رشید وارثی اور جناب عزیز احسن کے مضامین خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ ان مضامین میں ایسی تراکیب، استعارے اور مضامین کی نشان دہی کی گئی ہے جو ہماری نعتیہ شاعری میں اکثر استعمال ہوتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو ان مروجہ مضامین میں شان رسالت میں گستاخی کے پہلو نکلتے ہیں جن سے اجتناب برتنا چاہیے۔ نعتیہ شاعری دراصل پل صراط پر چلنے سے بھی مشکل کام ہے کیوں کہ یہاں معمولی سی بے احتیاطی بھی دین و دنیا میں خسارہ کا سبب بن سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے میدان نعت گوئی کو ایک ایسی ”ادب گاہ“ سے تعبیر کیا ہے جو عرش سے بھی ”نازک تر“ ہے اور جہاں ”جنید و بایزید“ جیسے صاحبان بصیرت بزرگوں کے بھی ہوش گم ہو جاتے ہیں مذکورہ تیوں مقالے نعت گو شعرا کے لیے ہدایت و رہنمائی کے نکات سے پوری طرح آراستہ ہیں جن کا مطالعہ عام قارئین کے علاوہ بہت سے نعت گو شعراء کے لیے بھی خاطر خواہ افادیت کا حامل ثابت ہوگا۔ (حکیم محمد سعید ص ۴۳۰)

(۱) ”نعت رنگ“ کے مضامین سے یہ خوش آئند حقیقت بڑی واضح طور پر میرے سامنے آئی ہے کہ حمد و نعت غزل کی زمین سے گزرتے ہوئے اپنی ادبی حیثیت کا لوہا منوار ہی ہیں۔ اس پیش بہا تبدیلی کے پیش نظر آپ اتفاق کریں گے کہ نعت خواں حضرات کو بھی اپنے لب و لہجے کو زیادہ سے زیادہ غزل سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے جو اب تک کم نظر آتا ہے۔ عوامی سطح پر بھی سامعین کی توجہ اور تربیت کا اہتمام کرنا ہوگا تاکہ ماحول بنانے میں

آسانی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غزلیہ حمد و نعت کا سنتا سنا کسی خاص طبقہ تک محدود ہو کر رہ جائے یا پھر اس کے قبول عام ہونے کیلئے لمبا عرصہ درکار ہو۔

(۲) اکثر ایسی نعتیں بھی سننے میں آتی ہیں جن کی طرز فہمی گانوں پر بنائی جاتی ہیں اور کئی بڑے بڑے نعت خواں بھی اس روش پر چل نکلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا کسی مجبوری سے ہوتا ہو یا کچھ سامعین اسے پسند بھی کرتے ہوں لیکن مجھے ذاتی طور پر اس سے نعت کا تقدس مجروح ہوتا دکھائی دیتا ہے اور میرے نزدیک اس رجحان کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔ تھوڑی سی کوشش اور ریاضت سے کوئی منفرد طرز موزوں کرنا چنداں مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی کہوں گا کہ اگر کوئی لکھاری جان بوجھ کر کسی فلمی گانے کی تضمین لکھنے کی کوشش کرے تو میرے نزدیک یہ بھی نامناسب ہے۔

(۳) میرے خیال میں روایتی صنف حمد و نعت کے لیے موسیقی کے استعمال سے بھی چنداں گریز کرنا چاہیے۔ ادب اور روحانیت کا تقاضہ ہے کہ خاموشی سے الفاظ میں ڈوب کر کلام کو سنا اور سمجھا جائے جیسے کے صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ ہمارے ہاں اس بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں اسی لیے میں نے روایتی صنف کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ موسیقی کا اس طرح کا استعمال روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے اور میرے خیال میں یہ جدت طرازی بھی پیشہ ورانہ سوچ کی آئینہ دار ہے۔

(۴) اگلی بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ محافل میں نوٹوں کو عامیانا انداز میں اُچھال اُچھال کر نچھاور کرنا یا مغرب کی تقلید میں ہاتھ کھڑے کر کے دائیں بائیں لہرانا حمد و نعت کے شانِ شایاں ہرگز نہیں لگتا۔ میرے لیے ایسے مظاہرے ایک غیر ضروری آزمائش سے کم نہیں ہوتے۔ دم سادھ لیتا ہوں اور سر جھک جاتا ہے۔ ساری توجہ ملیا میٹ ہو جاتی ہے۔ ثنا خواں حضرات کی خدمت بے شک دل کھول کے کریں لیکن دکھاوے کا شائبہ نہ ہو۔ اس سے عزت نفس کے مجروح ہونے کا خدشہ بھی رہتا ہے۔ دوسری طرف لطف و سرور کی کیفیت میں روح کے ساتھ جسم کا وجد ایک قدرتی امر ہے البتہ وقار کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔

(۵) یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہمارے ہاں سامعین کی ایک بڑی تعداد اشعار میں استعمال شدہ بیش تر الفاظ، تراکیب یا تشبیہات کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے۔ گویا عرف عام میں یہ

اُن کے سر سے گزر جاتی ہیں۔ اگرچہ اس کے باوجود اُن کا شوق و وجدان دیدنی ہوتا ہے۔ غزلیہ نعت و حمد میں تو مشکل گوئم کا غالب ہونا ویسے بھی قرین قیاس ہے ایسے میں اگر ثنا خواں مشینی انداز میں بولتے چلے جانے کی بجائے اندازِ بیاں میں لچک پیدا کرے، تلفظ پر زور دے اور کہیں کہیں رُک کر ضروری وضاحتیں کرنے کا فن اپنائے تو مجھے یقین ہے کہ نہ صرف سننے والوں کی دلچسپی بڑھے گی بلکہ نعت خواں کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوگا۔ صرف ایک دو مرتبہ اتنا کہہ دینا ہی کافی نہیں کہ ”میرے ساتھ مل کر پڑھیں“ بلکہ چاہیے یہ کہ دیگر پہلوؤں سے بھی سامعین کو ساتھ لے کر چلا جائے تاکہ اس کا رُخیر کے جملہ مقاصد کے حصول کا بہتر موجب ہو۔

(۶) جب سے ٹی وی نے ثنا خوانی کی بڑھ چڑھ کر سرپرستی شروع کی ہے جہاں اس صنف کو کئی اعتبار سے تقویت ملی ہے وہیں تجارتی مفاد کے درآنے سے معیار میں اکھاڑ بچھاڑ کا سماں بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ اکثر غیر ضروری شو، شاورنت نئی اختراعات کے استعمال سے کافی حد تک مقصود سامع کے دل کو نہیں بلکہ جیب کو ٹوٹنا لگتا ہے۔ ہر چھوٹا بڑا اپنا لوہا منوانے کے درپے ہے۔ معیار سے زیادہ مقدار پر زور ہے۔ انوار کی بجائے سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز کی بارش ہو رہی ہے۔ اکثر سُر پر اتنا زور دیا جاتا ہے یا یہ ایسی بے ربط ہوتی ہے کہ شعریت سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اس روش کی اصلاح کی ضرورت ہے کیونکہ مجھے تو نعت و حمد کے حوالے سے یہ حرف و صوت کی خدمت نہیں لگتی۔ (خضر حیات ص، ۳۲۷-۳۲۵)

(۷) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ جو القاب مستعمل ہیں مثلاً ”مولائے کل“، ”آقائے دو جہاں“، ”سرکارِ دو عالم“ وغیرہ میں ان پر اکثر غور کرتا ہوں یہ تمام القاب مجھے رب رحمان و رحیم کے محسوس ہوتے رہے ہیں مثلاً آقا و مولا تک تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ”مولائے کل“ کہا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کے لیے کیا کہیں گے؟ ہمارے سامنے ”رحمت للعالمین“، ”رسول مقبول“، ”نبی کریم“، ”حبیب خدا“ وغیرہ جیسے القاب بھی تو ہیں بہر حال میری خواہش ہے کہ اس طرف بھی کوئی صاحب علم مضمون نگار توجہ دے تو کیا ہی اچھی بات ہوگی اگر علامہ اقبال اور مولانا حضرات کچھ کہتے ہیں تو اسے سند بنا کر سب کو قائل کرنے کی ضرورت نہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ بذریعہ تحقیق غلط اور درست کا فیصلہ کیا جائے۔ (احمد صغیر صدیقی ص، ۴۵)

(۸) نہ جانے کیوں اس خیال کے شعر نعت میں مجھے اچھے نہیں لگتے۔ جن میں آنحضور کی ذات گرامی کو فاسق و فاجروں کے طرف دار، عاصیوں کے دل کی راحت وغیرہ کہا جاتا ہے بہر حال اپنی اپنی سوچ ہے بے شک کہنے والا جن معنوں میں یہ کہتا ہے وہ میں جانتا ہوں مگر سطح پر یہ باتیں مجھے پسند آتیں۔ (احمد صغیر صدیقی ص، ۵۷)

(۹) نعت میں اس قسم کا خیال پیش کرنا جس سے روضہ رسول ۷ کے مقابلے میں کعبے کا احترام مجروح ہو یا سرزمینِ مدینہ کے مقابلے میں ”مکہ“ کا احترام کم ہو جائے مناسب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں دو جگہ کے اشعار ضرور دیکھیے۔ صفحہ نمبر 79 پر منظور حسین منظور کا شعر: (امیر الاسلام صدیقی ص، ۲۲۹)

یہ ارض مقدس ہے زیارت گہہ عالم
کعبہ سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

(۱۰) اس ضمن میں ایک بات عرض کرنا چاہوں گا کہ بہت سی نعتوں میں شعرا مدح رسولؐ سے زیادہ ”گنبد خضرا“ یا ”طیبہ“ وغیرہ کی شان میں ”نعت“ کہتے نظر آتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے بات بنتی ہے۔ کوثر علی صاحب کی نعت کا قافیہ ردیف ہی ”بہارِ طیبہ“، ”کنارِ طیبہ“ ہے۔ اس میں تمام تر مدح طیبہ کی ہے۔ الفاظ اور بیان کے لحاظ سے یہ نعت بہت عمدہ ہے مگر سارا زور طیبہ پر ہے۔

جیسے معراج کی شب راہ فلک روشن تھی

یوں چمکتی ہے ہر اک راہ گزارِ طیبہ

ایک شعر جناب ولی اللہ ولی کا دیکھیں:

ہائے گستاخِ خاکہ ہے ان کا لیے

جن کی صورت پر نازاں ہیں لوح و قلم

پتا نہیں کیا کہا ہے انھوں نے... (احمد صغیر صدیقی ص، ۸۱-۸۰)

نعت گوئی اور تربیت کے تقاضے:

مولانا الطاف حسین حالی نے شاعروں، خصوصاً غزل گو شاعروں کے لیے جو پند نامہ لکھا ہے یعنی مقدمہ شعر و شاعری... اس میں غزل اور مضامین غزل کے بارے میں جو اندازِ نقد اختیار کیا گیا ہے اس معیار پر خود مولانا حالی کی غزل پوری نہیں اُترتی۔ مقدمہ شعر و شاعری کی

اہمیت اور قدر و قیمت اپنی جگہ لیکن جذبات و خیالات کا بہاؤ اور تخلیقی جذبہ... تنقید کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لیکن اس کے باوجود تنقید ہی تربیت کا باعث ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب نے نعت کے موضوعات پر ایک بصیرت افروز مضمون تحریر فرمایا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے تو میں بالکل ہی متفق ہوں کہ دوسروں سے الگ اپنی راہ تراشنے کے شوق میں، جدت کے گرداب میں بہت سے شاعر پھنس جاتے ہیں۔ یوں وہ زبان سے غفلت برتتے ہیں اور نئے موضوعات تک رسائی حاصل کرنے کی جگہ اپنے اسلوب کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ صرف نعت گو شاعروں کا حال نہیں ہے بلکہ آج کل جو بھی قلم سنبھال کے ادب کے میدان میں اُترتا ہے وہ ان ہی مذکورہ سامانِ حرب سے لیس ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی جائے تو جواب ملتا ہے، بات سمجھ آ رہی ہے نا... گویا اصل مقصد بات سمجھ آنا ہی رہ گیا ہے۔

پھر ایسے شاعروں کو جو اپنی راہ تراشنے کے شوق میں جدت کے گرداب میں پھنس جاتے ہوں..... زبان سے غفلت برتتے ہوں اور اپنے اسلوب کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہوں، ہمارے کشفی صاحب کا مشورہ یہ ہے کہ وہ مطالعہ حدیث اور مشاہدہ کائنات کے ذریعہ ہی رسول اکرم ﷺ کی حقیقی عظمت کی بارگاہ میں بار پا سکتے ہیں..... بھائی! ہمارا شاعر تو رسالے کا بھی وہی صفحہ پڑھتا ہے جس پر اس کا کلام بلاغت نظام شائع ہوا ہو..... اور جو شاعر ”پڑھے لکھے“ ہونے کے دعویدار ہیں وہ مشاہدہ کائنات اور مطالعہ قرآن و حدیث کے بجائے دیگر فلسفیوں کی کتاب پڑھتے ہیں۔ نعت صرف ضرورتاً کہتے ہیں یعنی ریڈیو، ٹی وی کے مشاعروں کے لیے۔ (سلطان جمیل نسیم ص ۴۳۱)

نعت گوئی: چند تجاویز:

سلیم شہزاد نے اپنے مضمون میں آزاد نظم میں نعت کی جلوہ گری پر بات کی ہے اور اچھا لکھا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صابر سنبھلی کے مضمون میں دی گئی کئی باتوں کی عملی تعبیر ملتی ہے۔ یعنی وہ چاہتے ہیں کہ نعت میں ہیئت کے تجربے زیادہ ہونے چاہئیں۔ اسے غزل کے انداز تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ نعت صرف غزل کے انداز ہی میں نہیں متعدد دوسری ہیئتوں میں کہی جا رہی ہے۔ جناب سلیم شہزاد کا یہ مضمون بہت محنت اور عہدگی سے لکھا ہوا ہے۔ (احمد صغیر صدیقی ص ۷۹-۷۸)

نعتیہ شاعری پس منظر اور روایت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات سے کچھ معجزات ان کی حیات میں ظہور میں آئے ہوں یا نہ آئے ہوں، ان کی وفات کے بعد جو درود و سلام، لا تعدوا ولا تحصى، ان کی ذات گرامی پر بھیجے گئے وہ اپنی جگہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ یہ میرے نزدیک سب سے بڑا اور سچا معجزہ ہے، جس کا جواب محال ہے۔ نعتوں کا سلسلہ الگ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی اور برگزیدہ شخصیت کے لیے، اتنے منظومات، سلام، گیت، بھجن یا مدحیں لکھی گئی ہوں گی۔ حضرت عیسیٰ کی شان میں بہت سے odes, hymns, songs لکھے گئے ہیں، جیسے پنسر کا Ode to the Nativity of Christ (بر میلاد مسیح) (۴۶۹) مگر ان کی تعداد اس کا عشرِ عشر بھی نہ ہوگی۔ حیرت بالائے حیرت یہ کہ خود غیر مسلموں نے اس میدان میں دل کھول کر طبع آزمائی کی اور بہت کچھ دادِ سخن آرائی دی، جس کا اعتراف واجب ہے۔ یہ سلسلہ قرونِ اولیٰ سے جاری ہے، اس کا آغاز جناب رسالت مآب ﷺ کے حینِ حیات میں ہو گیا تھا، اور برابر فروغ پذیر رہا۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی میں گزشتہ سب زمانوں سے بڑھ گیا۔ ہمارے ہاں تحریک پاکستان سے بھی اس کو تقویت ملی، جس میں ایک نئے اسلامی معاشرے کی تشکیل اور دین کی عظمت مد نظر تھی، جو جناب رسالت مآب کی ذاتِ مکرم سے عبارت ہے، بقول اقبال:

”بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست“

اس صدی کے آغاز میں بعض خلاف مذہب تحریکات کے رد عمل کے طور پر بھی دنیا بھر کے مذہبی حلقوں میں ایک ہلچل پیدا ہوئی، جس میں سوویت یونین کے خلاف کچھ شعوری تحریک کا بھی دخل تھا۔ جس کی روحانیت سے عاری نظامِ فکر اور محض مادی تصور حیات نے دنیا بھر میں بہت سے انسانوں کے ایمان کو متزلزل کر دیا تھا۔ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں ایک طرف روس کے خلاف سرد جنگ زوروں پر تھی اور یہ اس مہم کا آخری مرحلہ تھا جو ستر بہتر برس خصوصاً امریکہ کی طرف سے بہ شدت و بہر حیلہ جاری رہی۔ دوسری طرف جنرل صاحب نے اسلامی نظام رائج کرنے کا سبز باغ دکھایا، جس سے مومنین کے دل میں ایک نئی امنگ پیدا ہوئی اور اس سے اہل تخلیق بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ انیس سو اسی (۱۹۸۰ء) کی دہائی میں سب سے زیادہ نعتیں لکھی گئیں اور جو نعتیہ مجموعے جب سے اب تک شائع ہوئے ان کی تعداد تمام ہند اسلامی

تاریخ کے نعتیہ مجموعوں سے بڑھ گئی۔

حب رسول مسلمان کا جزو ایمان ہے، اور اس کا اظہار بصورت نعت ایک فطری اور اندرونی تقاضا ہے۔ چنانچہ کوئی بیرونی تحریک یا تقریب بھی تخلیقی ذہن کو اس طرف باسانی مائل کر سکتی ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اب وہ جوش و جذبہ جسے بڑی طاقتیں اپنے مفید مطلب سمجھتی تھیں اور اسے ہوا دینے پر مائل تھیں، انھیں کھلنے لگا ہے۔ اب وہ اسے تقویت دینے کی جگہ اسے دبانے پر مائل ہیں۔ مگر بقول مولانا ظفر علی خاں:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
مذکورہ تاریخی پس منظر سے قطع نظر، ثنائے رسول بھی صلوٰۃ و سلام کی طرح، ہمارا محبوب مشغلہ، بلکہ فریضہ اور ایک مبارک ادبی روایت ہے۔ یہ ہمیشہ سے جاری تھا اور جاری رہے گا۔ ”نعت رنگ“ کے کتابی سلسلے نے اس مقدس روایت کو منظم institutionalized صورت میں جاری رکھا ہے، اور بڑے دل پذیر، رنگارنگ، روح پرور، ایمان افروز مجموعے شائع کیے ہیں۔ میں آپ کے ذوق اور لگن کا معترف و مداح ہوں۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء۔

(شان الحق حق ص، ۴۷۱، ۴۷۰)

جس عرق ریزی سے آپ نے اس شمارے کو ترتیب دیا ہے اُس کا اظہار اس میں شامل نشر و نظم کے شہ پاروں سے ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی تہذیب ہو اُس میں اعلیٰ ترین مقام اُس کے مذہبی شہ پاروں کو ہوتا ہے۔ یونان کے دیو مالائی ادب کو اور دیوی دیوتاؤں کے شان میں کہے گئے گیتوں اور زمزموں کو جو مقام یونانی ادب میں حاصل ہے، وہ بعد میں معرض وجود میں آنے والے ادب کو نہیں ہے، یہی صورت حال بھارت کے کلاسیکل ادب کی ہے۔ سنسکرت میں جو ادب عالیہ نظر آتا ہے، اُس میں اظہار، وجدان کی سرحدوں کو چھوٹا نظر آتا ہے، اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایسا ادب تخلیق کیف و مستی کی فضا میں ہوتا ہے۔ اور یہ خاص و عام سب کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔

’رگ وید‘ میں بھارت میں آئے ہوئے آریوں کی عظیم شاعری اور مناجاتیں اُس دور کی بے مثال شاعری تصور کی جاتی ہے، اس لیے یہ وجدانی ذوق شوق کی مظہر ہیں۔ یہی حال کتاب متی، مرقس کی انجیل اور اُس سے پہلے تورات، زبور اور کتب انبیا کی حمدیہ شاعری کا ہے جو تخلیقی اعتبار سے بلند پایہ کلام ہے۔

نعتیہ شاعری کی روایت عربی ادب سے فارسی ادب اور پھر اردو کے دامن کو گل رنگ

کرتی ہے۔ عربی کے چار بڑے عربی شعرا جنھوں نے عربی شاعری کو شعری محاسن سے مالا مال کیا، وہ کعب بن مالک الانصاری، حضرت حسان بن ثابت، حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت کعب بن زہیر تھے۔ یہ چاروں حضرت محمد ۷ کے صحابی تھے۔ ان میں سے حضرت حسان بن ثابت کو حضور ۷ نے خاص طور سے یہود و مشرکین کے شعرا کی مخالفانہ شاعری کے جواب میں شعر کہنے کی اجازت دی تھی، انھوں نے نعت گوئی کے فن کو بلندیوں تک پہنچایا اور پھر یہ ایک مستقل صنف شاعری کے طور پر عربی ادب کی شناخت بن گئی۔ آج عربی کا شعری ادب نعتیہ شاعری سے مالا مال ہے۔ (سلیم یزدانی ص، ۴۴۱-۴۴۰)

اُردو زبان اور نعت:

گواردو زبان اور اس میں نعت گوئی کی تاریخ اتنی قدیم نہیں لیکن چوں کہ اردو زبان شروع ہی سے مومنہ ہے لہذا اردو زبان کا دامن نعت سے بھرا ہوا ہے لیکن نعت پر نقد و تبصرہ کے حوالے سے اتنا کام نہیں ہوا جتنی اردو نعت کی وسعت ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی جامعات میں شاید کان پوری یونیورسٹی (بھارت) کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اردو نعت پر پہلا تحقیقی مقالہ سید رفیع الدین اشفاق کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد اور ڈاکٹر ریاض مجید پاک و ہند کی دواہی شخصیات ہیں، جنھوں نے رفیع الدین اشفاق صاحب کے بعد نعت پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد شخصیات اور رسائل و جرائد نے نعت پر بہت کچھ لکھا اور مختلف رسائل و جرائد کے نعت پر خاص نمبر شائع کیے۔ میں طوالت سے بچنے کی خاطر شخصیات اور رسائل کے نام لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن پاکستان میں ڈاکٹر ریاض مجید کا مقالہ اور نقوش، ’نعت کائنات‘، ’الرشید نعت نمبر‘ اور ’اوج نعت‘ (مرتبہ آفتاب نقوی) وہ کام ہے جو نعت کے حوالے سے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

پاک و ہند میں نعت کی تعریف، تاریخ، مختلف زبانوں میں نعت کی ہیئت و کیفیت نعت کے لوازمات، مضامین و مواد، ادب اور تقاضے، ماخذ و مصادر الغرض گونا گوں گوشوں اور پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے اور میرا خیال تھا کہ اس کام کے بعد اردو نعت پر کوئی کیا لکھ سکے گا؟ لیکن ”نعت رنگ“ کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ اردو نعت کے حوالے سے ابھی بہت کچھ کہنا اور لکھنا باقی ہے۔ اسی بہت کچھ، کہنے اور لکھنے میں ”نعت رنگ“ وہ کردار ادا کر رہا ہے کہ بہت جلد اسے خود ایک حوالے کا

مقام حاصل ہو جائے گا۔ ”نعت رنگ“ کی تہذیب و تدوین جس عقیدت، محبت، خلوص اور علمی پیاس و لگن کے ساتھ ہو رہی ہے وہ قابل قدر و تعریف ہے اور مستقبل میں اردو نعت پر تحقیق و تدقیق کرنے والوں کے لیے حوالہ ناگزیر ہے۔ (ڈاکٹر قبلدیا زس، ۷۳۷)

کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ حصول پاکستان کی جنگ اسی اردو زبان میں لڑی گئی تھی۔ اردو زبان قصراً خوت کا بنیادی پتھر ہے۔ تراجم قرآن، تفاسیر سیرت النبی کی کتب، میلاد نامے تمام ترا اسلامی ادب حتیٰ کہ ممتاز علما و مشائخ کی تقاریر اردو زبان کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔

معیار اور مقدار کے حوالے سے بھی حمد و نعت کے لیے اردو زبان ہی کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔ اردو زبان و ادب سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ امر باعث صداقت و افتخار ہے کہ آج بھی زیادہ تر نعت غزل کی ہیئت میں کہی جا رہی ہے۔ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی نعت کائنات میں غزل کی ہیئت بھی مقبول ترین ہیئت ہوگی۔ (اگرچہ نئی نئی اضافہ سخن میں بھی مدحت نگاری کا عمل دلپذیر جاری رہے گا) (ریاض حسین چودھری ص ۲۶، ۲۷)

عصری صورت حال اور نعت کی ضرورت اور اہمیت:

ڈاکٹر شعیب نگرامی کا ”مقالہ“ الا ماشاء اللہ تنقید نگاری کی ایک خوب صورت مثال ہے جس پر بے ساختہ انھیں داد دینے کو جی چاہتا ہے افسوس وہ اپنے مخصوص مسلکی فریم سے باہر ہی نہیں نکل سکے۔ مفروضوں پر مبنی بہتان تراشیوں کے پہاڑ تحقیق (تخلیق؟) کر لینا کہاں کی دانشوری ہے۔ موضوع نعت ہے لیکن مدرسوں کے نصاب تعلیم میں قرآن و حدیث کو تبرکاً شامل کرنے کی کبھی بھی کسی جا رہی ہے۔ گویا مقصود تنقید نعت نہیں اپنے مخصوص مسلک کی تنکناؤں کی رونمائی ہے ارشاد فرماتے ہیں:

عربی کی نعت کو تو حید خالص کی ڈگر سے ہٹا کر شرک کے غار میں دھکیلنے کے گناہ گار ساتویں صدی کے اندلسی الاصل شاعر ابن ہانی اور اسکندریہ کے نعت گو شاعر محمد بن سعید البوصری تھے۔ جن کے بارے میں ایک دوسرے استاد محمد البخار کہا کرتے تھے کہ مذکورہ دونوں شعرا نے شریک نعت گوئی کا شجر خبیثہ لگایا تھا جو آج بھی پھل پھول رہا ہے۔

موصوف نے حسان بن ثابت، زہیر بن کعب اور عبداللہ بن رواحہ رضوان اللہ علیہم

اجمعین کا بھی ذکر کیا ہے، یقیناً وہ جانتے ہوں گے کہ ان شعرائے دربار رسالت مآب ﷺ نے نعت سے دفاع رسول ﷺ کا کام لیا تھا اور کفار و مشرکین کی ہرزہ سرائیوں کا جواب دیا تھا۔ ڈاکٹر شعیب نگرامی کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نعت آج بھی دفاع رسول ﷺ کے منصب جلیلہ پر رونق افروز ہے۔ طائف کے اوباش لڑکوں کے قہقہے آج بھی فضاؤں میں زہر گھول رہے ہیں، آج بھی سفاک لمحے ابوجہل اور ابولہب کی چیرہ دستیوں کی یاد دلا رہے ہیں۔ حق و باطل کا معرکہ آج بھی جاری ہے، حق، باطل کے ساتھ سمجھوتے کا روادار نہ کل تھا اور نہ آج ہے۔

آج دشمنان اسلام اور منکرین رسول کا دائرہ مزید وسیع ہو چکا ہے۔ گستاخانہ خاکوں سے لے کر نعوذ باللہ قرآن پاک کو جلانے تک کے روح فرسا واقعات اسی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں بعض اوقات ذہن مسلک کے گرد و غبار میں اس قدر الجھ جاتا ہے کہ نہ زبان قابو میں رہتی ہے اور نہ قلم ہی گرفت میں آتا ہے۔ زبان ہندیان بکنے لگتی ہے اور قلم گالیاں تخلیق کرنے لگتا ہے انتہاء پسندی و ہشت گردی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کسی تحریر یا کسی شعر کا من مانا مفہوم اخذ کر کے بہتان تراشی کی بوچھاڑ کردی جاتی ہے۔ کفر و شرک کا الزام لگانے کے بعد خود ہی فتویٰ صادر فرما کر قلم فروشوں کی پرانی عادت ہے۔ موصوف نے ایک ہی سانس میں نعتیہ شاعری کے ۸۰ فیصد حصہ کو شریک شاعری قرار دے ڈالا ہے اور تو اور انھوں نے اقبال کو بھی نہیں بخشا۔

ع نگاہ عشق و مستی میں رہی اوّل وہی آخر

کیا تاجدار کائنات ﷺ، نبی آخر الزماں ﷺ، حضور رحمت عالم ﷺ رسولِ اوّل و آخر نہیں؟ وہ صاحب علم جو رباعی اور دو اشعار کے مابین فنی فرق سے بھی آگاہ نہیں، اس کے لکھے کو اعتبار اور اعتماد کی سند دی جاسکتی ہے؟ ارباب نقد و نظر اس زہر فشانی کا تریاق دریافت کریں ورنہ یہ زہر سارے جسم میں سرایت کر جائے گا۔

گزارش یہ ہے کہ توحید تو ہمیشہ خالص ہی ہوتی ہے۔ اس میں ملاوٹ کا تصور بھی بندے کو کفر و شرک کے الاؤ کا ایندھن بنا دیتا ہے۔ اللہ ایک ہے اور وہ ہر قسم کے عیب سے پاک ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ سے ہے اور اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔ وہ وحدہ لا شریک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ کوئی ثانی نہیں، کوئی ہمسر نہیں وہ یکتا اور تنہا ہے۔ لائق بندگی صرف اور صرف خدا کی ذات ہے سجدہ صرف اُسی کو روا ہے ہم اُسی کی عبادت کرتے ہیں اور اُسی سے مدد مانگتے ہیں۔ وہ پتھر میں کیڑے کو رزق دیتا ہے۔ وہ اپنی تمام مخلوقات کا روزی رسا ہے، وہی بیماروں کو شفا دیتا

ہے۔ وہی زمین کے سینے سے خوشہ گندم اگاتا ہے۔ ہماری ایک ایک سانس اُسی کے قبضہ قدرت میں ہے، وہی طاقت کا سرچشمہ ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، وہی کائنات رنگ و بو کا مالک و مختار ہے۔ آقائے مختشم ۷ اُس کے بندے اور رسول ہیں، وہ بندے اور رسول جن کے سرِ اقدس پر قادرِ مطلق نے ختمِ نبوت کا تاج سجایا۔ انھیں کل جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ تاجدارِ مدینہ اللہ کے وہ بندے اور رسول ہیں جن کی قدم بوسی کے لیے یہ جہان رنگ و بو تخلیق کیا گیا۔ جس رسول اوّل و آخر پر اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اور ربّ کائنات ایمان والوں کو حکم دیتا ہے کہ تم بھی رسولِ رحمت پر خوب درود و سلام بھیجا کرو، حضور ۷ اللہ کے وہ بندے اور رسول ہیں جن پر ہدایت آسمانی کی آخری دستاویز نازل کی گئی۔ قرآن عظیم میں جن کے محاصر و محاسن کی دھنک سجائی گئی ہے، جنھیں مہمانِ عرش ہونے کا اعزاز بخشا گیا ہے جن کے وسیلے سے ہمیں ایمان نصیب ہوا۔ جنھیں زمین کے سارے خزانوں کی کنجیاں عطا کی گئیں، قیامت کا دن شافعِ محشر ۷ کی عظمتوں اور رفعتوں کے ظہور کا دن ہے۔ ربّ کائنات آپ کو مقامِ محمود پر فائز کرے گا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور رسول اپنی امتوں سمیت حضور ۷ کے خیمہِ مصافحت کی تلاش میں نکلیں گے، سورج سوانیرے پر آگ برسا رہا ہوگا۔ نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ ساقی کوثر حوضِ کوثر پر پیاسوں کو پانی پلا رہے ہوں گے، سب سے پہلے آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ سب سے پہلے آپ جنت الفردوس میں داخل ہوں گے، رہی علمِ غیب اور تصرفاتِ رسول کی بات تو گزارش ہے کہ اللہ ربّ العزت کا علم لامحدود ہے اور یہ علم اس کا ذاتی علم ہے۔ اللہ خالق ہے اور حضور ۷ اس کی مخلوق ہیں، حضور ۷ کا علم ذاتی نہیں عطائی ہے، اللہ ربّ العزت کا عطا کردہ ہے۔ حضور ۷ کو اُن کے ربّ عظیم نے کتنا علم اور کیا کیا عطا کیا ہے، میں اور آپ اس کا تعین کرنے والے کون ہوتے ہیں، کیا قاسم آقا حضور ۷ کی کنیت نہیں؟ ہر عہد میں ہر نعت گو کا یہی عقیدہ رہا ہے سوویت روس کے ٹکھرنے کے بعد یہود، ہنود اور نصاریٰ نے اپنی توپوں کا رخ اُمتِ مسلمہ کی طرف کر دیا تھا۔ اسلامیانِ عالم کو ہر محاذ پر پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، نعتیہ شاعری پر شریک شاعری کا لیل لگا کر آپ اپنے کن آقاؤں کو خوش کر رہے ہیں، کیا آپ ان عالمی فزاقوں کے ہاتھ مضبوط نہیں کر رہے؟

فکری مغالطوں کی چلیں لاکھ آندھیاں

پرچم اڑے گا اور بھی اونچا حضور کا

بدقسمتی ہے کچھ لوگ حضور ۷ کی دکھی امت کو مزید خانوں میں تقسیم کرنے کی گھناؤنی سازش میں مصروف ہیں۔ مکین گنبد خضرا سے غلامی کا رشتہ از سر نو استوار کرنے کے بجائے یہ غلامی رسول کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔ اس وقت امتِ مسلمہ کو جدید علوم میں مہارت حاصل کر کے اپنے کھوئے ہوئے مقام کو اغیار کے ہاتھوں سے چھیننا ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ علم و حکمت کی ہر روشنی تاجدارِ کائنات، حضور رحمتِ عالم ۷ کے قدموں کی خیرات ہے، نعت درود و سلام کے پیکر شاعری کا نام ہے۔ آقا ۷ کی سیرت مقدسہ سے اکتسابِ شعور کرنے کی سعی ہے۔ نعت کے خلاف ہر سازش پیغمبر اسلام ۷ کے خلاف ایک کھلی سازش ہے۔ پیغمبر اسلام ۷ کے خلاف سازش دین اسلام کو لاکارنا ہے۔ اس کی توقع دشمنانِ اسلام سے تو کی جاسکتی ہے کسی کلمہ گو سے نہیں۔ لمحہ فکر یہ ہے کہ یہ لوگ دشمنانِ اسلام کے ہاتھ مضبوط کر کے کون سا مذہبی فریضہ سرانجام دے رہے ہیں، چلیے بات مختصر کرتے ہیں۔ کیا آپ اپنی محافل اور مجالسوں میں (بقول آپ کے) یہ ۲۰ فی صد غیر شریک شاعری پڑھتے ہیں، یقیناً نہیں پڑھتے، تو پھر یہ تنقید برائے تنقید ہی ہوئی نا؟ (ریاض حسین چودھری ص، ۳۸۹-۳۸۷)

واقعہ یہ ہے کہ اردو نعت عصری آگئی، ملی شعور اور اجتماعی درد کا مرقع ہے۔ خصوصاً عصر حاضر میں ملتِ اسلامیہ پر مصائب و آزمائش کا طوفان ٹوٹ پڑا ہے، اس کی بھرپور عکاسی نعتیہ شاعری میں بھی ہوتی ہے۔ (شاہ رشاد عثمانی ص، ۳۴۶)

جدید اردو نعت:

یہ ایکس ویں صدی کی پہلی دہائی ہے۔ نقد و نظر کے پیمانے بھی تبدیل ہو رہے ہیں، شہرِ ادب میں تازہ کاری کی مسلسل بارشوں سے فرسودگی اور بوسیدگی کا رنگ بھی اُتر رہا ہے۔ آج کی نعت اعلیٰ حضرت کے زمانے کی نعت سے بہت مختلف ہے۔ نعت کی کائنات بھی ہر آن پھیلتی جا رہی ہے۔ اگرچہ نعت گو کا اساسی رویہ وہی رہے گا جس سے ایوانِ نعت روزِ ازل سے گونج رہا ہے۔ لیکن سوچ اور اظہار کے ارتقائی سفر کے مختلف مراحل پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا، ہر زمانے کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں، اس کا ڈکشن بھی بڑی حد تک بدل جاتا ہے۔ آج کے نقاد کو بھی اُن گنت چیلنجوں کا سامنا ہے۔ اب ادبی منظر نامہ نئے رنگوں کی رنگ آمیزی سے بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ نعت وہ واحد صنفِ سخن ہے جس نے تمام اصنافِ سخن

میں اپنے وجود کو منوایا ہے حتیٰ کہ نثر میں بھی نعت کے خوب صورت نمونے مل جاتے ہیں، ہدایتِ آسمانی کی آخری دستاویز قرآن حکیم اس کی روشن تر مثال ہے۔ جدید اردو نعت میں موضوعات کے تنوع کو بھی پیش نظر ہونا چاہیے۔ آپ کا فکر انگیز ادارہ اس حوالے سے نئی ستوں کی نشان دہی کر رہا ہے اور مستقبل کے نعت گو اور نقاد کی درست رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ جمود کو توڑنا اور افقِ شعر پر نئے آفاق کی تسخیر بذاتِ خود ایک اجتہادی اور جہادی عمل ہے اور ”نعت رنگ“ اس اجتہادی اور جہادی عمل میں پہلے دن سے شریک ہے، نعت کائنات ہے اور ہم اس کائناتِ نعت میں سانس لے رہے ہیں۔ نقد و نظر کے نئے حوالوں کے ظہور اور نئے پیمانوں کی تشکیل کے بغیر اب آگے بڑھنا تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ انتخابی تنقید کا نظریہ بڑا توانا اور جان دار ہے۔ عملی سطح پر یقیناً اس کی پزیرائی ہوگی۔ انتخابی تنقید کا نظریہ ایک دبستانِ تنقید کے طور پر جلد ہی اپنے تخلیقی اور تنقیدی وجود کو منوالے گا۔ آپ کے اس نقطہ نظر میں کافی وزن ہے کہ تنقید کے تمام دبستانوں سے اکتساب شعور کیا جائے، ابتدائی خاکہ آپ نے دے دیا ہے اب اس ابتدائی خاکے میں رنگ آمیزی کا فریضہ بھی اربابِ علم و فن کو دینا چاہیے، پاک و ہند کے ممتاز نقاد حضرات کا آپ کو تعاون اور اعتماد حاصل ہے۔ ڈاکٹر سید محمد یحییٰ شیط، ڈاکٹر محمد اسحق قریشی، پروفیسر محمد اقبال جاوید، ڈاکٹر ریاض مجید، حسن محمود جعفری، پروفیسر محمد اکرم رضا، پروفیسر افضال احمد انور، عزیز احسن، ڈاکٹر غفور شاہ قاسم اور دیگر اربابِ فکر و نظر کے دروازوں پر دستک دیجیے کہ وہ شہرِ قلم کے دروازے وا کریں۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی زندہ ہوتے تو آپ کو خوب خوب شاباش دیتے۔ (ریاض حسین چودھری ص ۳۸۴)

پاکستان میں نعت گوئی:

پاکستان میں ۱۹۸۰ء کے بعد نعت گوئی کا چلن عام ہوا۔ ریڈیو اور ٹی وی پر نعتیہ مشاعروں کی کثرت دیکھ کر بڑے بڑوں کو، راتوں رات مشہور ہو جانے کا راستہ نظر آیا۔ پھر اردو کے ادبی رسائل نے بھی شعرائے قدیم کے دواوین کی طرح اپنے وقیع رسائل کی ابتداء حمد اور نعت سے کرنے کی بنیاد رکھی۔ یوں رفتہ رفتہ نعت ادب کا حصہ بنتی چلی گئی۔ گزشتہ بیس سال میں جتنے نعتیہ مجموعے شائع ہوئے ہیں بیس برس پہلے شاید اتنی نعتیں بھی شائع نہیں ہوئی ہوں گی۔ نعت گوئی کے سلسلے میں ٹھوس علمی اور ادبی کام کی طرف صاحبانِ علم کو متوجہ کرنا..... پھر ان کے کام کو سامنے لانا۔ یہ بڑا وقت طلب کام تھا..... جو آپ بڑی عمدگی سے انجام دے رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں

”بگڑا شاعر مرثیہ گو“ کا مفروضہ قائم کر لیا گیا تھا اسی طرح نعت اور نعت خوانی کو بھی محفلِ میلاد کی ضرورت سمجھا جانے لگا تھا۔ (سلطان جمیل نسیم ص ۴۳۲)

نثری نظم اور نعت:

پروفیسر ڈاکٹر افضال احمد انور کا مقالہ ”نثری نظم اور نعت“ دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی جن قدیم اور جدید نثر پاروں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ نثری نظم کے عنوان سے نہیں لکھے گئے۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں کہ غیر ارادی طور پر نثری نظمیں اور نثری نعتیں تخلیق ہوتی رہیں۔ آج اپنے آبا کے اپنے انہی نقوشِ قلم کو بنیاد بنا کر نثری نظم ایک باقاعدہ صنفِ سخن کے طور پر سامنے آرہی ہے تو اس پر منفی رد عمل کیوں؟ یوں لگتا ہے جیسے عبارت آرائی کو نثری نظم کا نام دیا جا رہا ہے۔ لوگ عبارت آرائی کو منفی معنوں میں لیتے ہیں۔ کسی اہل قلم کو تنحیک کا نشانہ بنانا ہو تو اس پر عبارت آرائی کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ میں اس بات کا زبردست حامی ہوں کہ قاری کو تخلیق کار کے نقطہ نظر سے اختلاف کرنے کا جمہوری حق ملنا چاہیے، البتہ تنقید برائے تنقیص کا دروازہ بند ہونا چاہیے۔ عبارت آرائی بھی تخلیقی عمل کا حصہ ہے۔ یہ کسی نثر پارے کی اضافی خوبی ہے جسے بجا طور پر اب نثری نظم کا نام دیا جا رہا ہے۔ نثر پر شاعری کا گمان ہونا ہی نثری نظم یا نثری نعت کا دستاویزی جواز ہے، ہمارے بعض مقررین کی تقاریر کے بعض حصوں کو بھی نثری نعت میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ عطا اللہ شاہ بخاری، صاحبزادہ فیض الحسن، شورش کاشمیری، پیر کرم شاہ الازہری اور شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی بعض مکمل تقاریر یا ان کے متعدد حصے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ نثری نظم اور نثری نعت کو ایک نئے تجربے کے طور پر اپنے قدم جمانے کا موقع تو دیں۔ اگر اس نئی صنفِ سخن میں تخلیقی توانائی ہوگی تو یہ زندہ رہے گی۔ ورنہ وقت سب سے بڑا اور ظالم نقاد ہے، نئی نئی اصنافِ سخن متعارف ہو رہی ہیں۔ یہ سب تخلیقی عمل کی ارتقائی صورتیں ہیں۔ تخلیقی عمل بغیر کسی رکاوٹ کے جاری و ساری رہتا ہے۔ جمود کا لفظ موت کے مترادفات میں شامل ہے، تخیل کا پرندہ پرواز مانگتا ہے۔ اظہار کی تنگناؤں میں اڑنا اس کی جبلت کے خلاف ہے۔ یہ مسلسل پرواز کا تمنا کی ہے۔ سانیٹ اور ہائیکو اب اجنبی اصنافِ سخن نہیں، تلاشی، کوثریہ... اور اب ”اکائی“ نئی اصنافِ سخن کے طور پر متعارف ہو رہی ہیں۔ ”اکائی“ (حمد و نعت) کے تعارفی کلمات میں میں نے لکھا ہے:

”ہمارے ہاں، یک مصرعی نظموں کی روایت پہلے سے موجود ہے میں نے

اس میں ہیئت کی معمولی سی تبدیلی کی ہے اور اس نئی صنفِ سخن کو ”اکائی“ کا نام دیا ہے۔ اکائی میں شامل تمام یک مصرعی نظمیں ایک ہی بحر میں ہوں گی، ان ہم وزن مصرعوں کی تعداد پر پابندی نہیں ہوگی۔ اسے شاعری صوابدید پر چھوڑ دیا جائے گا۔ قافیے اور ردیف کا اہتمام بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اس پابندی سے نئے تخلیقی آفاق کی تسخیر کے امکانات محدود ہو سکتے ہیں۔ ”اکائی“ کی وسعت پزیری شاید اس کی متحمل نہ ہو سکے، یوں اس کی انفرادیت بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اکائی میں شامل ہر مصرعی نظم کا آغاز ایک ہی یا ایک سے زیادہ الفاظ سے ہوگا۔ اور یہ لفظ یا الفاظ ہر یک مصرعی نظم میں دہرائے جائیں گے۔ اس تکرار سے ایک دل نواز آہنگ پیدا ہوگا۔ اس کا انداز عموماً خطابیہ ہوگا ہر یک مصرعی نظم الگ خیال کی حامل ہوگی، لیکن بہت سی یک مصرعی نظموں کو جب ایک مربوط نظم کی شکل دی جائے گی تو یقیناً اس کا ایک مجموعی تاثر بھی مرتب ہوگا۔ اکائی کا مرکزی خیال حمد و نعت کے مضامین سے ابلاغ پائے گا۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس نئی صنفِ سخن کو صرف اور صرف حمد و نعت کے لیے مختص رکھا جائے، زیادہ سے زیادہ اس کا دامن منقبت اور سلام تک پھیلایا جاسکتا ہے۔ یہ اس کے مزاج کا تقاضا بھی ہے۔ اکائی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اسے محافل میں ترنم سے پڑھا جاسکتا ہے۔ ”اکائی“ کی تازگی ہوائے خوش گوار کا ایک جھونکا ثابت ہوگی۔ اس نئی صنفِ سخن کی پزیرائی کے بارے میں پُر امید ہوں۔“ (ریاض حسین چودھری ص ۳۹۵-۳۹۴)

پروفیسر ڈاکٹر افضال احمد انور (فیصل آباد) نے اپنے مضمون ”نثری نظم..... اور نعت“ میں نثری نظم کی حتی المقدور وکالت کی ہے۔ لیکن وہ اپنے مقدمے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ نثری نظم کی حمایت میں انکے پیش کردہ دلائل اگر تسلیم کر لئے جائیں تو صحیح و مقبلی نثر، انشائیہ، خاکہ نگاری سبھی طرز و اصناف معدوم ہو جائیں گی۔ حتیٰ کہ ابن صفی کے ناولوں تک کو نثری نظم کے شاہکاروں میں شامل کرنا پڑے گا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۱۲۱)

ہندوستانی اور پاکستانی نعت گو شعرا میں فرق:

دوسری بات جو خاص طور پر آپ سے اور اپنی برادری یعنی شعرائے کرام سے عرض کروں گا کہ جب قرآن پاک میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ان کے جانثار صحابہ کرام کا بھی ذکر ہے، پروردگار عالم نے صحابہ کرام کے بارے میں فرمایا کہ میں ان سے راضی ہوں اور یہ مجھ سے راضی ہوئے۔ اسی مضمون کو میں نے اپنے دو شعروں میں عرض کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

یہاں کیا مدح اصحاب حبیب کبریا ہوگی صحابہ کی حقیقت روزِ محشر آئینہ ہوگی
خدا سے وہ ہوئے راضی خدا ان سے ہوا راضی صحابہ کی فضیلت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی
ہندوستانی اور پاکستانی شعرا میں یہی فرق ہے کہ ہم لوگ اپنی نعتوں میں صحابہ کرام کا بھی ذکر کرتے ہیں اور خصوصیت سے لکھنؤ کے سنی شعرا تو نعت پاک میں ترتیب کا بھی خاص اہتمام کرتے ہیں جو آپ کے وہاں نہیں ملتا۔ میں نے آپ کے بھیجے ہوئے نمبر اور آپ کا خود مجموعہ کئی بار پڑھا لیکن کہیں بھی اصحابِ رسول ﷺ کا تذکرہ نہیں ہے۔ کیا آپ حضرات صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ اور دوسرے جلیل القدر صحابہ کو نہیں مانتے جس کے واسطے سے اسلام ہم تک پہنچا۔ حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنینؓ کا تو ذکر ملتا ہے اور حضرت خدیجہؓ کا۔ لیکن حضور کی سب سے زیادہ چہیتی بیوی جن کے حجرہ پاک میں آج بھی حضور آرام فرما رہے ہیں اور حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت فاروق اعظمؓ۔ پروردگار ہم سب کو نعت پاک کے ساتھ فضائل صحابہ بھی نظم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (ساجد صدیقی لکھنؤی ص ۴۰۱)

سندھی ادب اور نعت:

مدحت رسول ﷺ کی سعادت تقریباً ہر زبان کو حاصل ہے۔ لیکن سندھی زبان نے آپ ﷺ کی ثناء اور تعریف کو ایک منفرد مقام دیا ہے مگر جغرافیائی قیود اور میڈیائی ذرائع کم ہونے کے باعث منظر عام پر نہیں آسکا۔ انشاء اللہ میں اس سلسلے میں تحقیقی مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سندھی ادب میں نعتیہ شاعری پر تنقیدی پہلو کو یکسر فراموش کر دیا گیا ہے یا ناکافی ہے۔ البتہ اصناف کے لحاظ سے جس قدر صنفوں کو نعت کا سنگھار بنایا گیا ہے، اردو ادب میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ مثلاً سہ حرفی، صنف واسع الشفتین، صنعت عکس و تراد، صنعت تحت القاد، صنعت فوق القاد، صنعت حروف متصل، صنعت عمودی عکس اور بغیر الف کے وغیرہ اس سلسلے میں ”نعت رنگ“

کے مؤثر مضمون نگاروں کو دعوت فکر و تحقیق ہے۔ (حبیب الرحمن سیال ص ۲۷۳)

فروغِ نعت کے نئے امکانات:

ارضِ پاک میں فروغِ نعت کے لیے کی جانے والی مساعی اپنا رنگ لاپچی ہے اور اس کے لیے چھٹی سا توئیں دہائی میں چھیڑی گئی مبارک تحریک کامیابی کی منزل سے کافی حد تک قریب ہے۔ آج نعت کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو ہی میں موجود ہے اور تقسیم ملک کے بعد اس میں اضافہ کرنے کا سہرا ارضِ پاک ہی کے سر ہے۔ نعت نگارانِ پاک، انگریزی، جاپانی، پنجابی وغیرہ شاعری کے اصناف اور ہیئتوں میں جو تجربات کر رہے ہیں وہ بھی خوش آئند ہے۔ بھارت میں بھی ہائیکو اور سانیٹ وغیرہ میں نعتیں لکھی جا رہی ہیں۔ مگر پاک کی بہ نسبت کم تیزی اور کم جوش سے، بیکل اور نظمیں مار ہوی جیسے شعراء ہندی بخور و اوزان اور اصناف میں نعت کہنے کا تجربہ کر رہے ہیں اور کافی حد تک کامیاب ہیں۔

نظمی صاحب نے تو سنسکرت زبان میں کئی نعتیں کہی ہیں۔ سید آل رسول حسنین نظمی مارہروی امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کے مرکز عقیدت اور مرشد خانہ خانوادہ برکاتیہ مارہرہ مطہرہ کے چشم و چراغ ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم اے اور مرکزی حکومت کے محکمہ سنسری میں بمبئی میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ عالم بھی ہیں۔ اردو، فارسی زبان و ادب کے باوصف عربی اور انگریزی میں بھی مہارت حاصل ہے ہندی اور سنسکرت سے بھی خاصی واقفیت ہے۔ (عبدالنعیم عزیزی ص ۶۸۱)

تنقیدِ نعت اور احتیاط کے تقاضے:

نعتیہ شاعری پر تنقید ضرور کی جائے مگر علم و فہم میں توازن ضروری ہے اور واضح رہے کہ نبی پاک ﷺ کی ذات و صفات، محامد و محاسن اور ان کے جمال و کمال کے بیان میں قلم و زبان کو حد درجہ احتیاط لازم ہے بلکہ فکر و خیال کو بھی۔ کوشش کی جائے کہ جو بات ہو وہ محض خامہ فرسائی کے شوق کی تکمیل نہ ہو۔ اللہ کریم ہمیں علم نافع اور ادب کی توفیق عطا فرمائے۔ عزیز احسن صاحب اس بارے میں تفصیل جانا چاہیں تو میرے والد گرامی علیہ الرحمہ کی تصنیف لطیف ”ذکر جمیل“ ملاحظہ فرمائیں۔ (کوکب نورانی ص ۷۱۳)

نعت شریف ایسا موضوع نہیں کہ ہر کوئی محض خامہ فرسائی کے شوق میں کوئی مضمون لکھ

دے، جس طرح شاعر کو نعت کہنے کے لئے عقیدت و محبت کے ساتھ ساتھ عقائد اور حقائق سے آگہی ہونا ضروری ہے اسی طرح نعت شریف پر تحقیق و تنقید میں کچھ لکھنے سے پہلے بہت جان کاری کی ضرورت ہے اور لکھتے ہوئے احتیاط اس سے زیادہ ضروری ہے۔ اس تمام تر احتیاط کے باوجود یہ حوصلہ بھی رہنا چاہیے کہ فی الواقع غلطی پر صرف اس کا اعتراف ہی نہ کیا جائے بلکہ اس تصحیح و اصلاح کو مفید اور قابلِ قدر سمجھا جائے۔ (کوکب نورانی ص ۱۲۴/۳)

محترم احمد صغیر صدیقی نے ڈاکٹر شعیب نگرانی کے مقالے پر میرے ردِ عمل کا اُدا منایا ہے اور غصے کے عالم میں میرے اس شعر کو ہدف تنقید بنایا ہے۔

بعد مرنے کے چلے جائیں گے سب سے چھپ کر

ایک گھر ہم نے مدینے میں بنا رکھا ہے

فرماتے ہیں: ”اس شعر سے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے مدینے میں جو گھر بنایا گیا ہے وہ کوئی چرچ ہے اس میں شاعر چھپ کر جانے کی بات کر رہا ہے عجیب سا شعر ہے ایسے شعر بظاہر اچھے لگتے ہیں لیکن جب ان میں اتر اجاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ شعر کیسا ہے اور یہ کام ہما شاکا نہیں۔“

(ریاض حسین چودھری ص ۶۲۴/۲۶)

بات صرف اتنی ہے کہ شاعر نے تصور میں شہر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جو گھر بنا رکھا ہے، مرنے کے بعد وہ اس گھر منتقل ہونے کا آرزو مند ہے۔ تنقید ضرور کیجئے لیکن یہ بتاد دیجئے کہ بات شہر حضور کی ہو رہی ہے یہ چرچ کہاں سے آگیا۔ (ریاض حسین چودھری ص ۶۲۵/۲۶)

نعت رنگ کے اس شمارے میں ص ۵۹ پر ڈاکٹر صاحب نے نہایت شدت سے یہ

جسارت بھی کی، ان کے الفاظ ہیں:

”ہمارے نعت گو شعراء نے اس تصور کو بڑی حد تک قبول کیا ہے، اور اسی کے

مطابق عقائد اسلام کو بالائے طاق رکھ کر نعت نبی ﷺ کو جزو ایمان سمجھ

لیا ہے، فسوس کہ علماء و فضلاء بھی اس بدعتِ قبیحہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔“

اس کے جواب میں عرض ہے کہ نعت جزو ایمان نہیں بلکہ جانِ ایمان ہے اور عقائدِ اسلامیہ کو بالائے طاق رکھنے والا مومن نہیں رہتا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی صفحے پر تین اشعار لکھے ہیں، انہوں نے ان اشعار کے بارے میں علماء و فضلاء کے بیان اور فتاویٰ ملاحظہ نہیں فرمائے، کیا یہ سب اشعار کسی صحیح العقیدہ و قابلِ شخص کے ہیں؟ جب علمائے حق کی طرف سے ایسے اشعار کی سخت مذمت

کی گئی، اس کے بعد، ڈاکٹر بخٹی کا صرف انہی اشعار کو پیش کرتے ہوئے یوں غیر تحقیقی انداز میں تمام علماء و فضلاء اور اہل علم پر زبان اعتراض دراز کرنا ہرگز درست نہیں۔ (کوکب نورانی ص ۵۵/۳)

نعت کے عظیم الشان سرمائے کو نظر انداز کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ 'شان محشر' اور 'مرتبہ شفاعت' کو اوین میں لکھ کر تضحیک کا نشانہ بنایا جا رہا ہے؟ مدینہ منورہ کے ذکر جمیل کو نعت سے خارج کرنے کی منصوبہ بندی کیا رنگ لائے گی؟ کل گنبد خضرا، موجب اقدس، روضہ رسول، درحبيب، وادی بطناء، اور خلد طیبہ کی معطر گلیوں کے ذکر کو بھی شجر ممنوعہ قرار دیا جائے گا۔ تمام علامتوں، استعاروں اور تلمیحات پر بھی پابندی کا مطالبہ کیا جائے گا۔ معجزات کے ذکر کو بھی نعت کے دائرے سے خارج کرنے پر اصرار کیا جائے گا ڈاکٹر اشفاق انجم صاحب! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دکھی امت پہلے ہی ان گنت خانوں میں تقسیم ہو کر اپنی اجتماعی قوت سے محروم ہو چکی ہے۔ اسے ایک پلیٹ فارم پر لانے کی سعی کیجیے۔ بکھری ہوئی ملت اسلامیہ کو اتحاد کا درس دیجیے۔ (ریاض حسین چودھری ص ۲۶/۲۴)

نعت نبوی اور ترجمے کے مسائل:

حضرت مولانا جامیؒ کی مشہور و معروف نعت ”وصل اللہ علی نور کر و شد نورھا پیدا“ کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ آپ کو بھجوانے میں تامل کیا کہ بعض مسائل ان کی یادگار نعت کے ترجمے میں بڑی بڑی رکاوٹوں کی شکل بن گئے تھے مثلاً پہلے ہی شعر (مطلع) کے دوسرے مصرعے میں جب وہ زمیں کو ساکن کہتے ہیں تو اکیسویں صدی میں بیٹھا ہوا آدمی کیسے ترجمہ میں زمیں کو ساکن باندھ دے پھر ایسا نہ کرے تو نہ ترجمہ ہوا نہ ترجمانی۔

یونہی چوتھے شعر کے دوسرے مصرعہ میں مولانا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خال کو خال ہندی سے تشبیہ دیتے ہیں تو میں ہندی خال کو مشبہ بہ کا درجہ دیتے ہوئے لرز گیا اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زلف مبارک کا مشبہ بہ (یا مستعار منہ) شب تاریک کو نہیں بناسکا۔ تیسرا الجھن کا مقام یہ بنا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لقب مَرْمَل قرآن پاک میں بیان ہوا مگر وزن کی ضرورت کے تحت حضرت مولانا نے اسے مَرْمَل ہی باندھ دیا تھا میں نے اسے بھی قرآنی تشدید مکرر کے ساتھ باندھا۔ (احسان اکبر ص ۲۶/۶۵)

اسلامی ادب اور نعت:

میری دانست میں یہ ہے کہ شاعری تو ادب میں لامحالہ شامل ہے بلکہ نمایاں ہے لیکن دینی موضوعات کے حوالے سے نظم و نثر کو زبان کے تحت نہیں رکھا گیا بلکہ اسے عام لوگوں کی تنقید سے بچانے کے لئے یا ایک ہی صف میں کھڑا کرنے کی بجائے الگ شمار کیا گیا۔ واضح رہے کہ اس بارے میں، میں کوئی تحقیق بیان نہیں کر رہا ہوں۔

ادب میں شعبے ہیں، جیسے فنکا ہی ادب الگ شمار ہوتا ہے۔ ادب العالیہ درجہ بندی میں ہے۔ کلاسیکی ادب الگ شمار ہوا، اسی طرح اسلامی ادب بھی الگ شمار کیا گیا۔ یہ ضرور ہوا کہ مرثیے اور قصیدے کو شعری اصناف ہی کے طور پر ادب بلکہ تعلیمی نصاب تک میں شامل رکھا گیا البتہ نعت کو اسلامی ادب میں رکھا گیا ہے۔

شاعری کو ادب سے خارج نہیں کیا جاسکتا تو منظوم نعت کیسے ادب سے الگ کی جاسکتی ہے؟ آپ اسے اسلامی ادب کی بجائے محض ادب کی الگ صنف شمار کروانے کی بات کر رہے ہیں تو پھر اردو ادب اور اسلامی ادب کی تفریق و تقسیم ختم کرنے کی بات کیجئے؟ مجھے رشید وارثی صاحب کے الفاظ نہایت موزوں لگے کہ ”اردو کے اسلامی ادب“..... اور ہر زبان کے اسلامی ادب میں نعت شریف کا مقام کوئی ہلکا یا کم نہیں کر سکتا اور اس کے مضامین پر ہر کس و ناکس کو کلام کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ نعت شریف کی عزت و توقیر ”ادب“ سے نہیں، البتہ ”ادب“ ضرور نعت شریف کی برکت سے مزید سرفراز ہوگا۔ (کوکب نورانی ص ۱۲۹/۱۲۸)

نعت نبوی اور سراپا نگاری:

جناب عاصی کرناٹی نے لکھا ہے کہ نعت گوئی میں سراپا نگاری کا عنصر نہ کم ہوتا جا رہا ہے اور سیرت نگاری کے اجزاء و عوامل میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس بارے میں یہ فقیر کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ جناب سید محمد ابوالخیر کشتفی کی تحریر میں اللہ کریم جلّ شأنہ کا ذکر کرتے ہوئے تعظیمی کلمات نہ کہنے کا بیان گزر چکا ہے۔ مجھے وہ حدیث شریف بھی یاد آ رہی ہے کہ ایک صحابی نے دعا سے قبل اللہ کریم جلّ شأنہ کی تعریف نہیں کی تو میرے نبی کریم ﷺ نے اسے آداب دعا تلقین فرمائے کہ پہلے اللہ تعالیٰ عزّ وجلّ کی تعریف کرو پھر اپنی حاجت بیان کرو۔ یوں ہمیں آداب بندگی ملحوظ رکھنے کی واضح ہدایت دی گئی ہے۔ ہم قرآن کریم کو پڑھیں تو ہمارے معبود کریم جلّ

شانہ نے اپنے حبیب کریم ۷ کا ذکر جس انداز سے فرمایا ہے وہ ہمیں تعلیم کرتا ہے کہ ہم ذکر رسول ۷ بھی ان کی بہت تعریف و توصیف کے ساتھ کریں اور ان کے اسم مبارک ہی سے واضح ہے کہ ان کی مبارک و مکرم ہستی کی تخلیق ہی تعریف و توصیف کے لیے ہوئی ہے۔ لایمکن الشاء کما کان حقہ کہنے سے پہلے ان کے حسن و جمال اور محامد و محاسن کا بیان حتی المقدور حتی الامکان حتی الوسع بہت عمدگی سے کرنا ضروری ہے۔ میرے آقا کریم ۷ کے حسن و جمال کا تذکرہ بھی دنیا کے کفر و شرک کو گراں گزرتا ہے اور غیر مسلم نہیں چاہتے کہ کوئی بھی بات ایسی کی جائے جو میرے رسول کریم ۷ کی تعظیم و توقیر اور ان سے محبت و عقیدت میں اضافہ کا سبب اور ذریعہ بنے۔ خالق کائنات میرے رب کریم جل شانہ نے اپنے حبیب کریم ۷ میں ہر حُسن، ہر جمال، ہر کمال بھی اس کمال پر رکھا کہ چودہ صدیاں، لکھنے والوں، کہنے والوں نے بساط بھر لکھا اور کہا مگر کوئی بھی پوری طرح بیان نہ کر سکا نہ ہی کر سکتا ہے۔ قرآن کریم ہی میں دیکھیے کہ متاع دنیا کو ”ذلیل“ اور رسول کریم ۷ کے خُلق کو ”عظیم“ فرمایا گیا ہے۔ جب شمار نہ ہونے والا قلیل ہے تو ”عظیم“ کی شان مخلوق میں پوری طرح کون جان سکتا ہے! یہ بھی عرض کروں کہ دنیا کی چند عشقیہ داستانیں جو مشہور ہیں، ان داستانوں کی شہرت محبوبان مجازی کے حُسن و جمال کی وجہ سے نہیں بلکہ ان میں مجنوں و فرہاد، راں جھا و مہیں وال وغیرہ کے جوشِ عشق ہی کی بات ہوتی ہے، یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ غزل کے پیرائے میں محبوبان مجازی کے لیے حسن و جمال کی بابت بھی جو کچھ کہا جاتا ہے وہ مبالغہ و لفاظی بلکہ زیادہ تر خلاف واقعہ ہی ہوتا ہے۔ (کوکب نورانی ص ۳۱۷/۳)

نعت نبوی اور شعری مبالغہ:

میرے نزدیک ہمارا ایمانی تشخص بہت اہم اور عظیم ہے۔ غیر مسلم، میرے محبوب کریم ۷ کی مدح میں کیسا اور کتنا ہی رطب اللسان کیوں نہ ہو، وہ کسی مومن کے برابر نہیں ہو سکتا، بڑایا بہت بڑا ہونا تو دور کی بات ہے۔۔۔ پروفیسر محمد اقبال جاوید کی دو تحریریں اس شمارے میں ہیں۔ فرماتے ہیں: ”حقیقت یہ ہے کہ جس نے حضور ۷ کے بارے میں مبالغے سے کام لیا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔“ (ص ۱۷۹) پروفیسر صاحب نے اپنے جملے کو واضح نہیں کیا، انہیں یہ فرمانا چاہیے کہ ایسا مبالغہ جو غلط ہو (یعنی شرعی حدود سے باہر ہو) ورنہ شانِ مصطفیٰ علیہ الخیۃ والثناء کی کوئی حد ہی نہیں۔ امام بوصری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

فان فضل رسول اللہ لیس له حد فیعرب عنه ناطق بفہم
پروفیسر صاحب نے ۱۸۲ پر لکھا ہے کہ: ”خیال رہے کہ نعت ذرا سی بے احتیاطی (بزعم خویش عقیدت) سے حمد بن جاتی ہے۔۔۔۔۔“ عرض کرنا چاہوں گا کہ حمد کا لفظ رسول پاک ۷ کے لئے منع تو نہیں ہے ان کا تو اسم گرامی ہی ”محمد“ (۷) ہے جس کا مادہ ہی حمد ہے۔ وہ شاید مردِ ج اصطلاح میں مراد لیتے ہوئے فرما رہے ہیں البتہ انھوں نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ”حقیقت یہ ہے کہ حضور (۷) کو ان کے مرتبے سے گرا دینا، اپنے ایمان کو ختم کر لینا ہے اور مرتبے سے بڑھادینا شرک ہے، (مرتبے سے بڑھادینا، یعنی خدا کا شریک یا اس کے مثل یا ہمسر قرار دینا)۔ (کوکب نورانی ص ۵۰۳)

صفحہ ۵۹ پر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ”ثنائے محمدی ۷ کو ”حمد“ کی شکل میں پیش کرنے کا فن کس قدر مذموم اور ناروا ہے لیکن اردو کی نعتیہ شاعری کی بڑی مقدار میں یہی اصنامی تصور چھایا ہوا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب سے عرض ہے کہ ثنائے نبی (۷) کو حمد کی شکل میں نہیں تو کیا ”ذم“ کی شکل میں پیش کیا جانا چاہیے؟ اور ”اصنامی تصور“ کے الفاظ تو دریدہ دہنی شمار ہوں گے، وہ بتائیں کہ بڑی مقدار میں کیا وہ ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟ بلاشبہ نعت، حمد رسول ۷ ہے اور نعت و مدح کہنا آسان نہیں لیکن ”بڑی مقدار“ کے الفاظ، ڈاکٹر صاحب کا مبالغہ ہی نہیں مغالطہ بھی ہیں۔ اگر توصیف رسول ۷ کو ”اصنامی تصور“ کہا گیا ہے تو یہ شقاوت اور گستاخی ہے جس پر توبہ واجب ہے۔ ڈاکٹر کی صاحب ملاحظہ فرمائیں کہ ڈاکٹر ابوالخیر کشتی صاحب ص ۲۲ پر لکھتے ہیں: ”یہ شاعرانہ تخیل کا اعجاز ہے۔۔۔۔۔“ لفظ اعجاز کا استعمال انہوں نے شاعرانہ تخیل کے ساتھ کیا ہے، وہ شاعر کو کیا درجہ دیتے ہیں، ان کی تحریر اسے واضح کرتی ہے۔ شاعری اور ایک شاعر کے کرشمہ و کمال کے لئے تو تعریف و توصیف کی حد نہ ہو لیکن وصف رسالت ۷ اور توصیف رسول ۷ کے بیان میں نامناسب لفظ استعمال کئے جائیں!!! وہ ہستی جس کی شان کی حد ہی نہیں، جس کی مدح میں پورا قرآن ہے، خالق کائنات خود جس کی تعریف فرماتا ہے، جس کی جان، جس کی خاک پا، جس کے زمانے کی قسمیں یاد فرماتا ہے، جس کی تعظیم و توقیر کا حکم دیتا ہے، اس ہستی کے بیان میں کون انسان دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ اس کی شان بیان کر سکا ہے؟ حضرت مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”لیس کلامی یفی بنعت کمالہ۔۔۔۔۔“ اور مرزا غالب بھی لکھ گئے:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است (۷)

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

تو فرمودی رہ بٹھا گرفتیم وگرنہ جز تو مارا منزلے نیست

مزید ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں: (کوکب نورانی، ص ۵۸/۳-۵۷)

معنی حرم کئی تحقیق اگر بنگری بادیدہ صدیق اگر

قوتِ قلب و جگر گردد نبی از خدا محبوب تر گردد نبی (۷)

ہم غور کریں کہ نعت شریف میں محبوب و ممدوح تو وہ ذات بابرکات ہے جو صادق و مصدوق ہے اور ہر حُسن، ہر جمال اور ہر کمال کی بے مثال و با کمال جامع ہے، سچ کہوں کہ حُسن و جمال اور کمال وہی ہے جو ذاتِ مصطفیٰ کریم ۷ میں ہے، ان کے حُسن و جمال کے بیان میں کسی مبالغے کا گمان تو تب ہو کہ کوئی کا محققہ انھیں اور ان کی حقیقت کو جانتا ہو یا جان سکتا ہو۔ نعت شریف کے محبوب کریم ۷ کو دیکھیے، ان کا ہر سچا چاہنے والا ان کے بے مثال حسن و جمال، فضل و کمال اور عظمت و شان کا والہ و شیدائے، ان پر فدا ہے اور یہ محبت بھی کیا پیاری اور انوکھی ہے کہ یہاں چاہنے والوں میں رقابت نہیں بلکہ مثالی قرابت ہے، جو کوئی میرے محبوب کریم رسول پاک ۷ کی جس قدر زیادہ محبت و تعظیم رکھتا ہے، ان کے چاہنے والوں میں بھی وہ زیادہ محبوب و محترم ہو جاتا ہے۔ اہل علم سے یہ بھی مخفی نہیں کہ بغیر تخصیص کے مدح ممکن ہی نہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وصف بغیر موصوف کے نہیں اور کون نہیں جانتا کہ حقیقی تعریف اللہ کریم جلّ شأنہ ہی کے لیے ہے۔ میرے محبوب کریم رسول پاک ۷ کی تعریف و توصیف درحقیقت اللہ کریم جلّ شأنہ ہی کی تعریف ہے اور میرے مقدس و مطہر رسول کریم ۷ کی ذات و صفات میرے رب تعالیٰ جل مجدہ الکریم کی ذات و صفات پر دلیل و برہان ہیں۔ ہر سچے مومن کو اللہ کریم جلّ شأنہ کے اجمل و احسن حبیب کریم ۷ کا ہر سچا و سچا تذکرہ، خواہ وہ ان کے مبارک اور بے مثال حسن و جمال کا ہو یا ان کی با کمال مقدس سیرت کا ہو، محبوب و مطلوب اور مرغوب ہے اور دنیا و آخرت میں یہی تذکرہ اور انہی کا چرچا رہے گا۔ (کوکب نورانی، ص ۳۱۸/۳)

نعت اور عربی الفاظ: صحت تلفظ اور درست استعمال کے مسائل:

(۱) جناب تنویر پھول نے حمد و نعت میں الفاظ کے مناسب استعمال پر مقالہ لکھا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے شعرا ”خیر الامم“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے لیے لکھتے ہیں جو

درست نہیں کیونکہ خیر الامم سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے یعنی اُمت مسلمہ۔ میرے خیال میں یہ بات درست نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جس طرح خیر البشر درست ہے اسی طرح خیر الامم بھی درست ہے اور اُمت جمع ہے اُمت کی۔ اُمت کے معنی ہیں۔ گروہ جماعت وغیرہ اس سے صرف اُمت مسلمہ مراد لینا درست نہیں۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۸۹۱/۲۵)

(۲) حزیں صدیقی صاحب تو اس دنیا میں نہیں ہیں مگر انھوں نے اپنے متعدد شعروں میں ”کبریا“ کا لفظ ”خدا تعالیٰ“ کے لیے استعمال کیا ہے جو درست نہیں یہ لفظ ”بڑائی“ کے معنی میں ہے معنی صفت ہے۔ اسم نہیں۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۸۹۲/۲۵)

(۳) صفحہ نمبر ۶۵۷ پر احسان اکبر صاحب نے ”مرّتل“ کے درست تلفظ (زاوَرَم پر تشدید کے ساتھ) کی بات کی ہے۔ ایک نجی گفتگو میں حضرت راغب مراد آبادی مرحوم نے راقم الحروف سے کہا تھا کہ لوگ اکثر ”مرّتل“ اور ”حرّین“ کا تلفظ غلط کرتے ہیں، منزل میں حرف ز اور میم نمبر ۲ پر تشدید ہے اور حرّین جمع ہے حرم کی اس لیے ح اور ردو نوں پر زبر ہے یعنی درست تلفظ ہے ح ر م ی ن۔ اس بات کی تصدیق درود تاج سے بھی ہوتی ہے۔ صفحہ نمبر ۶۶۱، سطر نمبر ۴ میں ”السلامُ علیک ایہا النبی ۷!“ میں ہائے ہوز کی جگہ حائے حطی درست نہیں۔

(تنویر پھول، ص ۵۲۵/۲۷)

(۴) صفحہ نمبر ۱۳۲ پر تحریر ہے ”کبریا کا لفظ ہمارے ہاں بڑے بڑوں نے اللہ کے صفاتی نام کے طور پر استعمال کیا ہے“۔ یہ حقیقت ہے کہ اُردو میں ایسا ہی ہے، اسی سے لفظ ”کبریائی“ بھی بنا ہے جس طرح رحمن سے رحمانی اور رحیم و کریم سے رحیمی و کریمی۔ علامہ اقبال کے اس شعر میں بھی یہی صورت ہے:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اُس کو بتلاتا، مقام کبریا کیا ہے

بات دراصل یہ ہے کہ ہر زبان کا الگ الگ انداز ہے۔ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں آجائے تو ضروری نہیں کہ معانی و اعراب و قواعد ہو بہو ایک ہی ہوں، مثال کے طور پر عربی میں ”رَقِیب“ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے لیکن فارسی اور اُردو میں یہ لفظ جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے اسے سب ہی جانتے ہیں۔ عربی لفظ ”صَدَقَہ“ اُردو میں حرف دال کے سکون کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، ”کلمہ“ عربی میں مونث ہے جبکہ اُردو میں مذکر، علیٰ ہذا القیاس لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس میں کھلی چھوٹ ہو۔ صفحہ نمبر ۲۶۶ پر عزیز لدھیانوی کے اس شعر میں لفظ ”عرب“ کے درمیانی حرف کو

مفتوح کی جگہ ساکن باندھنا غلط ہے:

حق کی مدد سے بالیقین حامی شہِ عرب و عجم
”امی شہ ارض و سما“ والا مصرع درست ہے لیکن مذکورہ بالا مصرع درست نہیں۔

(تنویر پھول ص ۲۶/۶۶۰)

(۵) جناب منظر عارفی (کراچی) نے نعت گوئی میں لفظ ”ارم“ کے استعمال کی مذمت کی ہے کیونکہ اُن کے نزدیک یہ ”شدا“ کے بنائے ہوئے باغ کا نام تھا اور بقول اُن کے ”ارم“ جنت کا نام بھی نہیں ہے بعض لوگ اس لفظ کو مجازاً جنت کے لیے استعمال کرتے ہیں راقم کے خیال میں اگر زبان سے الفاظ کو ترک کرنے کے لیے یہ روش اور رویہ اختیار کیا گیا تو پھر اردو زبان میں بلکہ پنجابی میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ”خدا“ کا لفظ بکثرت استعمال کرتے ہیں جو فارسی میں ”نمبر داریا“ چوہدری کے معانی میں استعمال ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کٹر توحید پرست لوگ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ عشق پر بھی اعتراض کرتے ہیں حکیم الامت نے محبت کے لیے عشق کے لفظ کو خوب استعمال کیا ہے اور اسے خاص معنی عطا کر دیے ہیں جس سے عشق الہی اور عشق رسول تراکیب عام استعمال ہو رہی ہیں۔ اس روش کے تحت ہمیں بہت سارے الفاظ ترک کرنا ہوں گے جو فارسی یا ہندی زبان سے اردو میں در آتے ہیں یہ تو وہی رویہ ہوگا جو فارسی کے مشہور شاعر فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں اختیار کیا تھا اور اس نے بزمِ خویش عربی الفاظ کا استعمال نہ کر کے خالص فارسی الفاظ استعمال کر کے ”عجم“ زندہ کرنے کی کوشش کی یہ رویہ آج بھی جاری ہے اس نے کہا:

عجم زندہ کردم بایں فارس

بہر حال یہ منظر عارفی کا نکتہ نظر ہے۔ (سعید بدر ص ۲۵/۹۱۵) صفحہ نمبر ۲۲۵ پر لفظ ”ارم“ کے استعمال پر بحث کی گئی ہے جو معلوماتی ہے اور صفحہ نمبر ۲۱ پر ایک دوسرے مقالہ نگار نے تحریر کیا ہے ”قرآن وحدیث اور دیگر مذہبی کتابوں میں جن آٹھ جنتوں کا ذکر ہے ”ارم“ ان میں شامل نہیں ہے، اس حقیقت سے جاہل و کم علم شعرا بے خبر ہو سکتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہر زبان کا الگ الگ انداز ہے۔ اردو زبان میں لفظ ”ارم“ کا حوالہ کسی مخصوص جنت یا جنت کے کسی حصے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس سے مجازاً جنت یا بہشت مراد ہے، فیروز اللغات، نسیم اللغات اور جواہر اللغات سب اسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔ جو لوگ لفظ ”عشق“ کی طرح اسے استعمال نہ کرنا چاہیں وہ نہ کریں لیکن استعمال کرنے والوں کو ”جاہل و کم علم شعرا“ کہنا مناسب نہیں۔ غالب

جیسا بڑا شاعر بھی لفظ ”ارم“ کو اسی مفہوم میں استعمال کرتا ہے: ”خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں“۔ عربی میں تو لفظ ”بہشت“ بھی نہیں ہے، کیا اسے بھی استعمال کرنا قابلِ اعتراض ہوگا؟ عربی میں ”رقیب“ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے لیکن ہماری غزلوں میں اس کے دوسرے معنی ہیں۔

اردو میں لفظ ”مولیٰ“ سے مراد ”آقا“ ہے لیکن عربی میں اس سے مراد ”آزاد کیا ہوا غلام“ بھی ہے۔ دیکھنا یہ پڑتا ہے کہ کوئی لفظ کس مفہوم میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں کچھ لوگوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ گوشت اور دالوں کے آمیزے کو ”حلیم“ کہنا گناہ ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے اسے ”حلیم“ نہیں بلکہ ”دلیم“ کہا جائے۔ یہ سب لالچنی باتیں ہیں اور زبان کو محدود کرنے کا سبب بن سکتی ہیں۔ اگر ”حلیم“ پر اعتراض ہے تو ”رقیب“ اور ”حکیم“ کا کیا ہوگا؟ ”رقیب رُوسیاہ“ اور ”حکیم صاحب“، ”حکیم جی“ ان سب کو زبان سے خارج کرنا پڑے گا۔ (تنویر پھول ص ۲۵/۹۲۱-۹۲۰)

مجھے راجہ رشید محمود صاحب کی اس بات سے قطعی اتفاق ہے کہ ”اگر کوئی شخص اصل عربی تلفظ کو استعمال کرے تو اس پر اعتراض کرنا... کہاں تک جائز ہے کسی لفظ کے بولنے یا لکھنے میں مقامی طور پر یا کسی دوسرے ملک میں کوئی تبدیلی در آئے تو اس لفظ کو درست استعمال کرنے والا تو غلط نہیں ہو سکتا اور اصل لفظ لغو قرار نہیں پاتا۔“ (”نعت رنگ“ شمارہ نمبر ۱۶، ۱۴۱-۱۴۲)

اگر کوئی لفظ، تلفظ یا معنی کے اعتبار سے غلط استعمال کیا جا رہا ہے تو اس کے درست استعمال کو غلط اور ناروا قرار دے کر کسی صاحبِ فکر کا تو ثبوت فراہم نہیں ہوتا۔ آج عام طور پر ”قرآن“، ”غلطی“، ”عربی“ وغیرہ الفاظ کا غلط تلفظ عوام میں رائج ہے۔ عربی الفاظ کی نزاکتوں سے ناواقف شعرائے کرام بھی اس قسم کے الفاظ شعر میں غلط موزوں کر دیتے ہیں۔ ”نعت رنگ“ میں شائع ہونے والی نعتوں میں بھی اس قسم کا عیب راہ پا جاتا ہے۔ چنانچہ اربابِ بصیرت اس کی فنی گرفت فرما کر اصلاح کی ذمہ داری ادا فرماتے ہیں۔ قرآن، منزل، مدثر وغیرہ الفاظ کو اشعار میں غلط تلفظ کے ساتھ موزوں کرنے پر شعرائے کرام کی فنی گرفت کی مثالیں ”نعت رنگ“ کے صفحات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ الفاظ کا غلط تلفظ یا غلط املا رائج الوقت ہے تو کیا اس کے خلاف الفاظ کا صحیح استعمال اور درست تلفظ نہیں کیا جائے گا؟ کیا جائے گا اور ضرور کیا جائے گا:

ع ہے یہی رسم تو یہ رسم مٹادی جائے (ملک الظفر سہرامی ص ۸۴)

نعتیہ ادب کے فروغ کی کاوشیں:

حقیقت یہ ہے کہ مدتِ دراز تک ”نعت“ کو ہمارے ہاں دوسرے درجے کی صنفِ سخن سمجھا جاتا رہا ہے۔ نعت کہنے والوں کا ایک الگ ہی گروہ تھا جس کو دانش ورانِ ادب قابلِ توجہ نہیں سمجھتے تھے۔ خدا بھلا کرے اقبال صفی پوری کا کہ انھوں نے کل پاکستان نعت مشاعرے کی روایت قائم کی اور ملک کے تمام بڑے اور اہم شاعروں کو باقاعدہ نعت کہنے کی طرف راغب کیا۔ نعتیہ شاعروں سے میرا شغف انھیں مشاعروں کے سبب پیدا ہوا۔ اس کا اظہار ضروری تھا کہ یہ بات ریکارڈ پر آ جائے۔ حق دار کو اس کا حق ملنا ہی چاہیے۔ دوسرا سنجیدہ کام تم نے شروع کیا ہے بلکہ دوسرا نہیں، یہ پہلا سنجیدہ کام ہے جو اس جہت میں کیا گیا ہے۔ ”نعت“ کے سیاق و سباق پر گفتگو، نعت کے سفر کی نشان دہی، اس کی صنفی اہمیت پر تنقیدی مضامین اور نعت گو شعرا کی بے احتیاطیوں پر گرفت۔ یہ سب کچھ ”نعت رنگ“ میں یک جا ہے اور یہ کام یہاں ختم نہیں ہو گیا، تم نے اس کو جاری رکھنے کے جس عزم کا اظہار کیا ہے وہ نئی نسل کی تمام کج رویوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر دے گا۔ میری دلی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ (شبنم رومانی، ص ۷۲-۷۱)

نعت اور خود پسندی:

مولانا کو کب نورانی اوکاڑوی کا طویل مراسلہ حرفِ حرف پڑھنے کے قابل ہے۔ ان کی یہ بات بھی گرہ میں باندھ لینے کی ہے کہ ہم میں سے اکثر خود پسندی اور خود رائی کے شکار ہیں اور دورِ خاپن بھی ہم میں کچھ کم نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ علمی مباحث کے علاوہ خودِ حمد و نعت کی شاعری پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ ان کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ لفظ ”حمد“ اور ”محمّد“ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی آتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ صنفِ سخن کے طور پر جب ”حمد“ کا لفظ لایا جائے گا تو اس کے معنی اللہ کی تعریف ہی ٹھہریں گے۔ مولانا نے اپنے معترضین کا جواب خوب لکھا ہے، خاص کر احمد صغیر صدیقی اور ظہیر غازی پوری صاحبان کے لیے ان کے مراسلے میں بہت سی اچھی باتیں ہیں۔

مجموعی طور پر آپ کا یہ شمارہ بہت خوب ہے۔ بعض شاعر اور شاعروں کے بارے میں بعض مضامین البتہ اس بلند معیار کے نہیں ہیں جس کی آپ سے توقع ہمیشہ رہتی ہے۔ (شمس الرحمن فاروقی، ص ۵۱۳)

نعتیہ ادب: تحقیق و تنقید

(۱) تحقیق

حقائق کی بازیافت:

(۱) میں مولانا احمد رضا خاں کی نعت پر کچھ لکھنا چاہوں گا۔ میرا اندازہ ہے یہ اعلیٰ حضرت کی نعت نہیں کہ مجھے اس میں کئی سقم ایسے نظر آئے جو کسی طور نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ آج کل شعرا کے ملتے جلتے نام خاصی گڑ بڑ پیدا کر رہے ہیں۔ مولانا صاحب کی نعت کا مطلع ہے:

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفیٰ کہ یوں
کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں

معلوم نہیں ”کیف“ کا لفظ انھوں نے کس نسبت سے لکھا۔ ”پر جبریل“ تو اس میں فٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ سوچ کے پر لکھ دیتے تب بھی بات نہیں بنتی۔ اسی طرح دوسرے شعر میں انھوں نے لکھا ہے۔

(روحِ قدس سے پوچھیے) اس میں ”قدس“ کو انھوں نے جس تلفظ کے ساتھ باندھا ہے وہ غور طلب ہے۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرعے میں ”کھوجانے“ کے معنی میں ”گیں“ لکھا ہے۔ جو واقعی ایک دلچسپ ترکیب ہے۔ پانچواں شعر سنئے:

دل کو دے خود و داغ عشق پھر میں فدا دو نیم کر

مانا ہے سن کے شق ماہ آنکھوں سے اب دکھا کہ یوں

میں کچھ نہیں لکھوں گا۔ اسی نعت کے چھٹے شعر کا آخری مصرع سنیں:

ع اے میں فدا لگا کر ایک ٹھوکر اسے بتا کہ یوں

اس میں ”میٹر“ پر جو زری ہے وہ ضرور دیکھیے۔ اس کا ساتواں شعر بھی شعری حسن کے لحاظ سے ”واطلب“ ہے:

باغ میں شکر وصل تھا ہجر میں ہائے ہائے گل

کام ہے ان کے ذکر سے خیر وہ یوں ہوا کہ یوں

اس میں ”ان“ کا ذکر کہاں ہے؟ (”ہائے ہائے گل“) خیر جو کچھ ہے کچھ پسندیدہ نہیں۔ اسی قبیل کی نعت رفیع بدایونی کی بھی ہے۔ جس میں شاعری خود کشی کرتی نظر آرہی ہے:

(ہے اگر ظرف تو اس خاک سے بھی جو ہر کھینچ)

اس میں ”ظرف“ کا استعمال خوب ہے۔

(لمس غروب کبھی چاہیے تو مہر خاور کھینچ) ”مہر خاور“ پر توجہ دیں۔

(نفس تو ہجر میں ان کی تڑپ تڑپ کر کھینچے) ہجر میں ان کی (ان کے نہیں)۔

اشفاق انجم اور تنویر پھول صاحب بھی انہی نعتوں کو اگر کچھ بہتر کر کے چھپواتے تو یہ دنیا اور آخرت دونوں میں مفید بات ہوتی..... غالب کی زمینوں میں جتنی نعتیں شائع ہوئی ہیں بہت کم زور لگیں۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۵۸)

(۲) پروفیسر اکرم رضا صاحب کا ۷۹ صفحات پر پھیلا ہوا مضمون انتہائی پُر مغز اور چشم کشا ہے۔ اس مضمون کے غائر مطالعہ کے بعد جہاں طبیعت خوش ہوئی، وہیں منتخب اشعار میں بے شمار اسقام اور اغلاط دیکھ کر طبیعت منغص ہو گئی۔ اب یہ نامعلوم صاحب قلم کا سہو ہے یا کاتب کے قلم کا۔

مصنف سے تو اس کا امکان کم ہے

یقیناً یہ کاتب کا سہو قلم ہے

کہیں مصرعے وزن سے خارج، بحر سے خارج، کہیں کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں اور کہیں الفاظ کی صحت کا خیال کیے بغیر اٹکل پچھلے الفاظ لکھ دیے ہیں۔ جس کی وجہ غالباً موزونی طبع، ذوق شعری اور فن عروض سے ناواقفیت ہے۔ آج کل کی کتابوں میں یہ بات زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ کاش چھپنے سے قبل کسی موزوں طبع سے کم از کم اشعار کی درستی کروالی جائے۔ خاص طور سے نعتیہ اشعار کی۔ صفحہ نمبر 22 پر اقبال کی مدحیہ اشعار کے الفاظ آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ مصرع اس طرح ہے:

ع وہی قرآن، وہی فرقاں، وہی یسین، وہی طہ

پہلا شعر ”وہ دانائے سبل“ سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا شعر ”نگاہ عشق و مستی“ سے

شروع ہوتا ہے۔ ان اشعار کی ترتیب الٹ دی ہے۔ یہ اشعار بال جبریل میں ہیں۔

صفحہ نمبر 24 پر قرآن حکیم کی ایک آیت ”یا ایہا الذین... و انتم لاتشعرون“ کا ترجمہ نامکمل ہے۔ خاص طور سے یہ حصہ کہ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو“ چھوڑ دیا ہے۔ یہی حصہ تو اہم ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کے سامنے اونچی آواز سے بولنے والوں سے سخت اظہار ناراضی کیا ہے۔

صفحہ نمبر 26 پر ایک اور آیت کا حوالہ ہے جس کا ترجمہ ہے ”اے ایمان والو! تم ’راعنا‘ نہ کہو اور ’انظرنا‘ کہو اور بغور سنو کافروں کے یہ دردناک عذاب ہے۔“

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف ”راعنا“ کے دو متضاد معانی لکھے ہیں۔ ایک (ہماری طرف توجہ فرمائیے) اور دوسرے (شریر) فرماتے ہیں عبرانی زبان میں ”راعنا“ کے معنی شریر کے ہیں۔ عبرانی زبان کی لغت دستیاب نہیں۔

عربی میں ”راعنا“ کے معنی ہیں (ہمارے ساتھ رعایت کیجیے)۔ ”راع“ کے معنی ”رعایت“ اور ”نا“ کے معنی (ہمارے ساتھ)۔ یہود تضحیک کا پہلو پیدا کرنے کے لیے ”راعنا“ کہہ کر ادا کرتے تھے گویا وہ یہ کہتے تھے کہ ”اے ہمارے چرواہے، اور اس کی غرض رسول اکرم ﷺ کی توہین تھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ ”راعنا“ کی جگہ ”انظرنا“ کہیں اور یہ پابندی مسلمانوں پر بھی عائد کر دی گئی۔

منتخب اشعار میں اتنی اغلاط ہیں کہ ان کی نشاندہی اس خط میں ممکن نہیں لہذا میں ان اغلاط کی تصحیح شدہ فہرست کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ گزارش ہے کہ اس تصحیح کے ساتھ اشعار کو پڑھیے اور دیکھیے کہ وہ اب بحر اور وزن میں ہیں یا نہیں۔

ایک بڑی غلطی صفحہ نمبر 51 پر سید محمد تقی یزدانی میرٹھی کے اشعار کے تیسرے مصرعے میں ہے۔ مصرع یوں لکھا ہے:

ع سلاطین کا شرف ہے اُس کے آگے طرفو کہنا

”طرفو“ کوئی لفظ نہیں۔ اصل لفظ ہے ”طرقو“، ”ط“ پر زبر، ”ر“ پر زبر اور تشدید، ق پر پیش اور ”الف“ غیر ملفوظ ہے یعنی وہ بولی نہیں جائے گی۔ عرب کے قاعدے کے مطابق نقیب، سلاطین کے آگے ”طرقو“، ”طرقو“ کہتے ہیں یعنی ”ایک طرف ہو جاؤ“ یہ اصل میں سلاطین کے استقبال کا اہتمام تھا۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا نقیب بننا سلاطین کا شرف ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ نعت میں اس قسم کا خیال پیش کرنا جس سے روضہ رسول ۷ کے مقابلے میں کعبہ کا احترام مجروح ہو یا سرزمین مدینہ کے مقابلے میں ”مکہ“ کا احترام کم ہو جائے مناسب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں دو جگہ کے اشعار ضرور دیکھیے۔ صفحہ نمبر 79 پر منظور حسین منظور کا شعر: (امیر الاسلام صدیقی، ص ۲۲۹-۲۲۸)

یہ ارض مقدس ہے زیارت گہہ عالم

کعبہ سے کشش اس کی ہر اک دل میں سوا ہے

(۳) ”خطوط“ میں علامہ کوکب نورانی صاحب کا مفصل خط واقعی لائق مطالعہ

اور معلومات افزا ہے۔ البتہ ایک مقام ص ۵۵۲ پر میں رک گیا، جہاں انھوں نے فیروز شاہ

(میانوالی) کے مبلغ اور مغالطے کا تذکرہ یوں فرمایا ہے، ”وہ لکھتے ہیں، سرکار دو جہاں کا فرمان

ہے، فضیلت اس گواہی کی ہے جو دشمن بھی دے۔“ اس پر علامہ کوکب نورانی فرماتے ہیں:

”فی الواقع اگر یہ فرمان رسول کریم ۷ ہی کا ہے تو اصل عربی مجھے یوں

یاد ہے۔ الفضل ماشہدت به الأعداء... الخ“

میرے نزدیک صحیح ترجمہ یوں ہوگا کہ ”فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں۔“

بجائے فرمایا ترجمہ تو یہی درست ہے، البتہ یہ فرمان رسول کریم ۷ نہیں ہے بلکہ مشہور عربی مصرع

ہے جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ امام ثعالبی علیہ الرحمہ نے ”التمثیل والمجازہ“

ص ۲۲ میں اسے معروف عرب شاعر السری الموصلی الرفاء کے حوالے سے نقل کیا ہے: النوری نے

”نہایۃ الادب فی فنون الادب“ میں اس طرح لکھا ہے:

(محمد شہزاد مجددی، ص ۵۳۴)

و فضائل شہد العدو بفضلها الفضل ماشہدت به الاعداء

ابن ہشام انصاری کی شرح ”قصیدہ بانس سعاد“ ص ۶ پر یہ شعر اس طرح لکھا ہے:

و ملیحۃ شہدت لها ضراتها والفضل ماشہدت به الاعداء

نعتیہ گل دستے:

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ فقیر نے ردِ قادیانیت کے حوالہ سے ایک نیا رخ یعنی

”سُنی صحافت“ کو متعارف کروایا اور بحمد اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کی ایک ضخیم جلد فروری ۲۰۱۵ء میں

مکتبہ اعلیٰ حضرت دربار مارکیٹ لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ اب اس کی دوسری جلد اخبار اہل فقہ (امرت سر) کی فائلوں سے تیار کی جا رہی ہے۔ یہ اخبار مولانا غلام احمد انکسر امرت سری نے ۱۹۰۶ء میں جاری کیا اور تقریباً ۱۹۱۴ء تک جاری رہا۔ مولانا غلام احمد انکسر نے نعتیہ ادب کے فروغ کے لیے ایک ماہ وار رسالہ بھی جاری کیا تھا جس کا نام ”گلستانِ رحمت“ تھا۔ فقیر قادری کو اگرچہ اس کا کوئی شمارہ نہ مل سکا تاہم اخبار اہل فقہ کے متعدد شماروں میں اس کے اشتہار ضرور نظر سے گزرتے رہے چنانچہ انہی اشتہارات کی بنیاد پر فقیر نے رسائلِ حسن کے مقدمہ میں درج ذیل تحریر لکھ دی:

”مولانا غلام احمد انکسر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے ہندوستان کی تاریخ کا سب سے پہلا نعتیہ رسالہ بنام ”گلستانِ رحمت“ جاری کیا۔“

مولانا انکسر لکھتے ہیں:

”یہ نعتیہ رسالہ جو ہندوستان بھر میں اکیلا ہے ۲۷ رمضان المبارک

۱۳۲۵ ہجری المبارک (۴ نومبر ۱۹۰۷ء) کو پہلا پرچہ نکلا۔ عاشقانِ رسول

کریم کے نور ایمانی کو جلا دینے والا اور قلبِ محزون کو تسکین بخشنے والا ہے۔

کون مسلمان ہے جو رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نعت پڑھنے سننے

کا عاشق نہ ہو۔“ (اہل فقہ، ۶ دسمبر ۱۹۰۷ء)

اس کے ہر شمارے کے لیے کوئی خاص مصرع طرح رکھا جاتا اور تمام شعر حضرات اسی پر نعتیہ کلام تحریر فرماتے۔ شہنشاہِ سخن، استاذِ زمن مولانا حسن رضا خان حسن فاضل بریلوی سے ایک ملاقات میں مولانا انکسر نے جب اس رسالے کے اجرا کا ارادہ ظاہر کیا تو مولانا حسن رضانی اس کی تحسین فرمائی اور تاریخی قطعہ بھی تحریر فرمایا جو کہ حسب ذیل ہے:

انکسر نے کیا نعت میں گلدستہ وہ جاری بلبلی کی طرح غنچہ و گل جس پہ ہوں شیدا

اللہ یہ گلزار پھیلے پھولے جہاں میں ہر پھول سے ہو رنگ ترقی کا ہویدا

نکلے گی تاریخ حسن شاخِ قلم سے اندازِ گلستاں کے ہیں گلدستہ سے پیدا

(کلیات حسن: ۴۸۷-۴۸۸ مطبوعہ اکبریک سیلرز، لاہور) ۱۳۲۵ھ

کچھ روز قبل تحقیقی کام کی غرض سے پنجاب پبلک لائبریری (لاہور) جانا ہوا۔ جناب امداد صابری صاحب کی کتاب ”تاریخ صحافت اردو“ کی ورق گردانی کرتے ہوئے فقیر کی نظر ایک رسالہ پر پڑھ گئی جو کہ نعتیہ ادب کے فروغ میں ۱۸۹۵ء میں جاری ہوا تھا۔ چونکہ اس دریافت سے

فقیر کی گذشتہ تحریر یعنی ”گلستانِ رحمت“ کو پہلا نعتیہ رسالہ قرار دینے کی تردید ہوتی ہے۔ اب آپ کی خدمت میں ان دونوں رسائل کا تعارف پیش کر رہا ہوں، کیونکہ نعتیہ ادب کے حوالہ سے آپ کا تحقیقی کام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے چنانچہ عرض یہ ہے کہ اس موضوع پر تحقیقی بنیادوں پر کام کیا جائے تاکہ سنی صحافت کا ایک اور رخ یعنی نعتیہ صحافت سے عوام و خواص متعارف ہوں۔ آپ کی سہولت کے لیے امدادِ صابری کی کتاب ”تاریخ صحافت اردو“ جلد سوم سے اس رسالہ کا تعارف نقل کر رہا ہوں، ملاحظہ فرمائیں:

”گلدستہ مداحِ النبی“۔ یہ نعتیہ کلام کا ماہ نامہ گلدستہ جھجر ضلع ریتک سے ۱۸۹۵ء کو شائع ہوا۔ پہلے سولہ (۱۶) صفحات پر، بعد میں بیس (۲۰) صفحات پر نکلنے لگا تھا۔ مہتمم مولوی غلام احمد خاں بریاں تھے۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔ نمونہ کا پرچہ ڈیڑھ آنے میں ملتا تھا۔ مسلم پریس جھجر میں طباعت ہوتی تھی۔ اس گلدستہ میں نعتیہ کلام کے ساتھ اپریل ۱۸۹۷ء کے بعد سے ایک ناول بالاقساط چھپنے لگا تھا، اس وقت سے بیس صفحات ہو گئے تھے اور اس کی ابتدا مولانا بریاں نے اپنے ناول ”الحسانت“ سے کی تھی۔ مولانا نے کتب تصوف بھی تالیف فرمائی تھیں۔“

(تاریخ صحافت اردو، جلد سوم، ص ۲۵۵)

اپریل ۱۸۹۷ء کے شمارہ سے منتخب نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اس لیے سیر چمن کرتا ہوں گا ہے گل سے مجھے شاہ کی بو آتی ہے
خاک ہم کیوں نہ رہ عشقِ نبی میں چھانیں جب وفا کی ہمیں ہر ذرے سے بو آتی ہے
مست ہو جائیں نہ کیوں سونگھ کے خوشبو گل کی یاد جب ختم رسل کی ہمیں بو آتی ہے
جناب محمد عبدالحی اختر صاحب (طالب علم از امرتسر)

کیا صبا گلشنِ یثرب سے تو آتی ہے تجھ سے اللہ کے محبوب کی بو آتی ہے
وصف کیسوئے محمد کا اثر نطق میں ہے مشک سے بڑھ کے مرے شعر میں بو آتی ہے
جناب سید مظہر حسین صاحب کے کلام سے کچھ اشعار:

میں مدینہ کو گیا اور نہ کعبہ پہنچا وجہ کیا ہے ابھی اے موت کہ تو آتی ہے
میں تو حضرت کا فدائی ہوں بتا دے اے حور کیا سبب ہے کہ مرے سامنے تو آتی ہے
جناب ڈاکٹر محمد اسماعیل خان صاحب ذبیح دہلوی:

جتنی بڑھتی ہے ترے لطف و کرم کی امید اتنی عصیاں میں مرے نشوونما آتی ہے

جادہ طیبہ گر اے شیخ بنے جائے نماز نہر کوثر سے ابھی بہر وضو آتی ہے
جناب قمر الدین صاحب قمر دہلوی شاگرد و حید الدین بیجو دہلوی:

عشق احمد میں یہاں حشر کا بھی خوف نہیں کیا ڈرانے کو شبِ غم مجھے تو آتی ہے
مر مٹا خاک ہوا عشقِ محمد میں قمر سونگھ لو خاک سے بھی عشق کی بو آتی ہے
جناب حاجی قتل حسین صاحب قتل جلال پوری مقیم بمبئی:

تیری کیا بات ہے اے شفقتِ سلطانِ عرب کامِ مظلوم کے ہر حال میں تو آتی ہے
صفِ مستانِ نبی کا جو گذر ہوتا ہے توڑ کر ساغر و مینا و سیو آتی ہے
گنبدِ روضہ انور کو نظر زائر کی کبھی چوم آتی ہے جا کر کبھی چھو آتی ہے
نزع کا وقت ہے محبوب خدا آتے ہیں اے اجل کس نے بلایا ہے جو تو آتی ہے
مرے اشعار نہ کیوں کر ہوں قتل مقبول عشق احمد کی ہر اک لفظ سے بو آتی ہے
اللہ کرے کہ کوئی صاحب اس موضوع پر تحقیقی بنیادوں پر کام کرتے ہوئے نعتیہ ادب کے فروغ

میں سنی صحافت کے کردار کی تاریخ مرتب فرمادیں۔ (محمد ثاقب رضا قادری، ص ۲۵/۹۳۱-۹۲۸)
محمد ثاقب رضا قادری صاحب کا خط پسند آیا کہ انھوں نے اپنی فروگزاشت (وہ بھی عدم معلومات کی بنا پر) کا اقرار کر لیا کہ ”فقیر نے رسائلِ حسن کے مقدمے میں درج ذیل تحریر لکھ دی:

”مولانا غلام احمد انگلو کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے ہندوستان کی

تاریخ کا سب سے پہلا نعتیہ رسالہ بنام ”گلستانِ رحمت“ جاری کیا جس کا

پہلا پرچہ رمضان المبارک ۱۳۲۵ھ (۴ نومبر ۱۹۰۷ء) کو نکلا۔“

جناب امداد صابری صاحب کی کتاب ”تاریخ صحافت اردو“ کی ورق گردانی کرتے ہوئے فقیر کی نظر ایک رسالہ پر پڑھ گئی جو کہ نعتیہ ادب کے فروغ ۱۸۹۰ء میں جاری ہوا تھا چوں کہ اس دریافت سے فقیر کی گذشتہ تحریر یعنی ”گلستانِ رحمت“ کو پہلا نعتیہ رسالہ قرار دینے کی تردید ہوتی ہے۔ امداد صابری لکھتے ہیں:

”مداحِ النبی“ یہ نعتیہ کلام کا ماہنامہ گلدستہ جھجر ضلع ریتک سے ۱۸۹۰ء کو شائع ہوا۔“

محمد ثاقب رضا قادری صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ:

”مداحِ النبی“ سے قبل بھی ایک نعتیہ گلدستہ ”منشور شفاعت“، بمبئی سے

فقیر محمد فدا چشتی کی ادارت میں ۱۸۸۹ء مطابق ۱۳۰۹ھ میں جاری ہوا تھا

اس کے علاوہ ایک اور نعتیہ گلدستہ بمبئی ہی سے بلقیس جہاں بیگم (مالک اور فاطمہ بیگم کی ادارت میں ”چراغِ کعبہ“ کے نام سے ۱۸۸۵ء مطابق ۱۳۰۳ھ میں جاری ہوا تھا۔“

(دیکھئے: ”بمبئی میں اردو“ میمونہ دلوئی، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۳۲۵-۳۲۷)

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۵۲-۶۵۱)

رحمت للعالملین نمبر ز:

شہر کراچی کے ڈاکٹر شہزاد احمد مایہ ناز محقق اور ممتاز دانش ور ہیں انہوں نے ”پاکستان میں نعتیہ صحافت..... ایک جائزہ“ کے عنوان کے تحت طویل اور مبسوط مضمون تحریر کیا ہے اور پاکستان و ہند میں شائع ہونے والے ”نعت نمبروں“ کا مختلف حوالوں سے جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی یہ تحقیق قابل قدر اور قابل صد ستائش ہے لیکن معذرت کے ساتھ عرض کننا ہو کہ غالباً کمپوزر کی غلطی سے ”گا ہے بگا ہے“ کا لفظ چھپ گیا ہے جو اہل علم و ادب کے نزدیک غلط ہے یہ لفظ فارسی زبان سے متعلق لفظ ہے جو دراصل ”گا ہ بگا ہ“ ہے (جسے گا ہ بگا ہ بھی لکھا جاتا ہے) یا پھر اسے ”گا ہے گا ہے“ لکھتے یا بولتے ہیں بصد معذرت عرض ہے کہ اس گرانقدر مضمون میں روزنامہ امروز کے ۱۹۸۶ء کے ”رحمت للعالملین“ نمبر کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو نعت ہی کے حوالے سے راقم نے شائع کیا تھا آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی اخبارات کے ہفت روزہ ایڈیشن جنھیں ’سندے ایڈیشن‘ کہا جاتا تھا صرف بیس یا چوبیس صفحات پر مشتمل ہوا کرتے تھے لیکن راقم نے یہ نمبر ۲۸ صفحات پر شائع کیا تھا اس سے قبل ۱۹۸۵ء کے ہفت روزہ میں بھی ۲۴ صفحات میں بیشتر صفحات نعتیہ ادب پر مشتمل تھے یا در ہے کہ جزل ضیاء الحق کا دور تھا اور چھٹی اتوار کے بجائے جمعہ کو ہوا کرتی تھی اس لیے اسے سندے ایڈیشن کے بجائے جمعہ ایڈیشن ہی کہتے تھے۔

مزید براں راقم کو یاد ہے کہ ممتاز صحافی شورش کاشمیری نے بھی اپنی زندگی میں ہفت روزہ چٹان“ کا رحمت للعالملین“ نمبر شائع کیا تھا جسے بہت پسند کیا گیا اسی شمارے سے متاثر ہو کر راقم نے ”رحمت للعالملین“ ایڈیشن شائع کیا۔ (سعید بدر، ص ۲۵/۹۱۶-۹۱۵)

قصیدہ بردہ:

رہی بات امام شرف الدین محمد بن سعید البوصیری علیہ الرحمۃ کی تو ”آفتاب آمد دلیل

آفتاب“ والی بات ہے۔ ان کے علم و فن، عقائد و نظریات اور بارگاہِ خدا و مصطفیٰ ۷ میں مقبولیت کا ایک زمانہ شاہد و معترف ہے۔ آپ کی ولادت مصر کے علاقہ ”دلاص“ میں ۶۰۸ھ بمطابق ۱۲۱۲ء میں ہوئی۔ حفظِ قرآن اور مروجہ علوم دینیہ کی تحصیل و تعلیم کے بعد آپ نے عربی ادب و شعر میں اپنے کمال فن کا لوہا منوایا اور حکام وقت کے درباروں تک رسائی حاصل کی، لیکن مدح حبیب ۷ ان کی آخری منزل ٹھہری جس کی معراج ان کا ”قصیدہ بردہ“ شریف ہے۔ امام بوصیری علیہ الرحمۃ زہد و تصوف کی راہوں کے مسافر تھے اور سلسلہ شاذلیہ کے بانی حضرت سیدنا ابوالحسن شاذلی کے خلیفہ اعظم حضرت شیخ ابوالعباس المرصی علیہ الرحمۃ اللہ تعالیٰ کے مرید تھے۔ انھوں نے اپنے مشائخ کی مدح میں منفبت کے شعر بھی کہے ہیں۔

أمت کے جلیل القدر ائمہ حدیث و تفسیر اور مشائخ طریقت نے ان کے مدحیہ قصائد کو حُرِ جاں بنایا اور اس کے شروحات و حواشی لکھ کر اپنے لیے سامانِ سعادت فراہم کیا۔ اگر کسی مزید تفصیل میں جائے بغیر صرف ان شروح و حواشی کی فہرست اور شارحین کے اسما ہی درج کر دیے جائیں تو ہر صاحب ایمان جان جائے گا کہ حضرت بوصیری علیہ الرحمۃ توحید کی جملہ اقسام سے کتنا واقف تھے اور عشقِ رسالت مآب ۷ کے کس مرتبہ پر فائز تھے۔

امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمۃ نے ”حسن المحاضرہ“ میں ان کے تعارف میں لکھا ہے کہ علامہ بوصیری تفسیر و حدیث کے تبحر عالم تھے۔ جب کہ ان کے تلامذہ میں امام ابوہیان، امام ابوالفتح ابن سید الناس اور محقق عصر امام عزرا بن جماعۃ رحمہم اللہ جیسے اکابر علما بھی شامل ہیں۔ اُردو دائرۃ معارف اسلامیہ (۵۳/۵) میں لکھا ہے۔

اس شہرہ آفاق قصیدے کا اُردو انگریزی، لاطینی، ایمانی، فارسی، ترکی اور بربری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور ایک سو کے قریب عربی، فارسی، ترکی اور بربری زبانوں میں شرحیں لکھی ہیں۔ عبداللہ (۵۴۱) یعقوب انصاری، ابن ہشام النحوی، خالد بن عبداللہ الازہری اور شہاب الدین القسطلانی (شارح بخاری) کی شروح خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یاد رہے کہ اس قصیدہ میمونہ مبارکہ کی شروحات و حواشی کی فہرست نقل کرتے ہوئے کسی بھی محقق، ادیب اور فہرست نگار نے تمام و تکمیل اور ان کے احصا کا دعویٰ نہیں کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر خالق داد ملک شیخ جمال بن نصیر الجناہی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تقدیم میں قصیدہ بردہ کی ۳۶ شرح قصیدہ شروح کی فہرست کا اندراج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس قصیدہ بردہ کو عالم اسلام کے اطراف و اکناف میں بزرگوں نے حفظ کیا اور دینی حلقوں میں اس کی قرأت کو معمول بنایا، جب کہ ناشرین نے مشرق و غرب میں اسے شائع کیا اور آٹھویں صدی ہجری سے آج تک شارحین نے مسلسل اس کی شرحیں لکھیں، جن میں سے چند کی فہرست اور شارحین کے اسما ہم یہاں بطور نمونہ نقل کرتے ہیں کہ بطور اتمام فہرست ملاحظہ فرمائیے:

- ۱۔ ابوشامہ عبدالرحمن بن اسماعیل المقدسی الشافعی (۶۹۵ھ)
 - ۲۔ علی بن جابر موسیٰ البیہقی الشافعی المتوفی سۃ (۷۲۵ھ)
 - ۳۔ جمال الدین عبداللہ بن یوسف المعروف بابن ہشام الشافعی (۷۶۱ھ)
 - ۴۔ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن الزمردی الشافعی (۷۷۶ھ)
 - ۵۔ مسعود بن عمر المعروف بسعد الایوبی تفتازانی (۷۹۸ھ)
 - ۶۔ ابو عبداللہ محمد بن احمد بن مرزوق التلمسانی (۷۹۱ھ)
- شرح کا عنوان: ”الاستیعاب لما فیہا سحر البیان والاعراب“ ان کی ایک اور شرح کا عنوان ”انہار صدق العودۃ فی شرح قصیدۃ البردۃ“ ہے۔
- ۷۔ جلال بن قوام بن الحکم، تکمیل شرح کی تاریخ ۷۹۲ھ ہے۔
 - ۸۔ بدر الدین محمد بن بہادر الزرکشی المتوفی ۷۹۴ھ
 - ۹۔ محمد البساطی الساہرودی المعروف بمصنف المتوفی سۃ ۸۷۵ھ
 - ۱۰۔ شرف الدین علی البزدوی المتوفی سۃ ۸۲۸ھ
 - ۱۱۔ کمال الدین حسین الخوارزمی المتوفی سۃ ۸۴۰ھ
 - ۱۲۔ جلال الدین محمد بن احمد الحلی الشافعی المتوفی ۸۴۶ھ و سۃ الانوار المفضیہ فی مدح خیر البریۃ
 - ۱۳۔ جلال الدین احمد بن محمد بن محمد الخبندی المتوفی سۃ ۸۰۳ھ و سۃ ”طیب الحبيب ھدیۃ الی کل حُبّ لبیب“
 - ۱۴۔ زین الدین ابو العزطاہر بن حسن المعروف بابن حبیب الحلی۔ المتوفی سۃ ۸۰۸ھ
 - ۱۵۔ القاضي شہاب الدین الدولۃ آبادی المتوفی سۃ ۸۴۹ھ
 - ۱۶۔ زین الدین خالد بن عبداللہ الازہری المتوفی سۃ ۹۰۵ھ و سۃ ”الزبدۃ فی شرح قصیدۃ البردۃ“
 - ۱۷۔ شہاب الدین احمد بن محمد القسطلانی المتوفی سۃ ۹۲۳ھ و سۃ۔

شارق الانوار المعنیۃ فی شرح الکواکب الدرّیۃ

- ۱۸۔ القاضي زکریا بن محمد الانصاری المتوفی سۃ ۹۲۶ھ و سۃ ”الزبدۃ الرائقۃ فی شرح قصیدۃ البردۃ الفائقۃ“
 - ۱۹۔ عبید اللہ محمد بن یعقوب المولیٰ الفناری المتوفی سۃ ۹۳۶ھ۔
 - ۲۰۔ محی الدین محمد بن مصطفیٰ المعروف بشیخ زادہ المتوفی سۃ ۹۵۱ھ
 - ۲۱۔ بدر الدین محمد بن الفزی المتوفی سۃ ۹۸۴ھ و سۃ ”زبدۃ“
 - ۲۲۔ خیر الدین خضر بن عمر العطوفی المتوفی سۃ ۹۸۴ھ
 - ۲۳۔ حسام الدین حسن بن محمد العباسی
 - ۲۴۔ احمد بن مصطفیٰ الشہید بلالی
 - ۲۵۔ یحییٰ بن منصور بن یحییٰ الحسنی و سۃ نتائج الافکار
 - ۲۶۔ الامام فخر الدین احمد بن محمد بن ابی بکر الشیرازی و سۃ ”نزهۃ الطالبین و تحفۃ الراغبین“
 - ۲۷۔ الفضل الحسن بن محمد بن الحسن الحنفی النخعی
 - ۲۸۔ یحییٰ بن زکریا المفتی و سۃ ”صدق المورۃ“
 - ۲۹۔ ابو العباس احمد الازوی المعروف بالقصار
 - ۳۰۔ حسن بن حسین التاشی
 - ۳۱۔ شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن حسن القدسی البرمونی
 - ۳۲۔ علی بن سلطان المعروف بملا علی قاری المتوفی سۃ ۱۰۱۴ھ
 - ۳۳۔ عبد الواحد بن احمد الانصاری المتوفی سۃ ۱۰۴۰ھ و سۃ ”شفاء القلب الجرح“
 - ۳۴۔ محمد بن منلا ابی بکر بن محمد بن منلا سلیمان الکردی الحنفی ائمہ شرح فی سۃ ۱۰۴۸ھ و سۃ الدرۃ فی شرح الکواکب الدرّیۃ المعنیۃ
 - ۳۵۔ ابراہیم بن محمد الباجوری المتوفی سۃ ۱۲۷۶ھ
 - ۳۶۔ القاضي عمر بن احمد الخربوٹی و سۃ ”عصیدۃ الشہدۃ“
- پروفیسر علی حسن صدیقی لکھتے ہیں:
- ابن ادریس مراکش نے جن کا انتقال ۶۶۰ھ میں ہوا ”خواص البردۃ فی رء الذرء“ کے نام سے قصیدہ بردہ کی شرح لکھی۔ انھوں نے مندرجہ بالا

فہرست میں ابوالعباس احمد التلمسانی (۷۷۶ھ) کا اضافہ بھی کیا ہے اور کچھ فارسی، ترکی اور اردو شروح و تراجم کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ (مقدمات تاریخی ص ۱۸۳) یوں پروفیسر صاحب نے یہ فہرست ۴۱ کے عدد تک پہنچائی ہے جو بہر حال نامکمل ہے۔

”المدائح النبویہ فی الادب العربی“ میں ڈاکٹر ذکی مبارک نے مزید کچھ اسماء کا اضافہ کیا ہے:

علاء الدین البسطامی المتوفی سنہ ۸۷۵ھ

یوسف بن ابی اللطف القدسی المتوفی بعد الالف للھجرۃ

یوسف البسطامی من علماء القرن التاسع

لامحمد من علماء القرن الحادی عشر

محمد بن مصطفیٰ المدرنی من علماء القرن الثانی عشر

محمد عثمان المیرغنی من علماء القرن الثالث عشر

اس کے علاوہ دارالکتب مصر میں اور بھی شروح موجود ہیں جن کے مؤلفین کے اسماء

نامعلوم ہیں:

۱۔ الرقم علی البردة

۲۔ الجوہرۃ الفردۃ فی شرح البردة

۳۔ راحة الارواح

۴۔ الذبذبة الرقنۃ فی شرح البردة الفائقۃ

۵۔ قصیدۃ الشہدۃ فی شرح البردة

۶۔ وردۃ الخلیفۃ فی شرح بردة المدح (بحوالہ المدائح النبویہ (ص ۱۷۱-۲۰۷) ذکی مبارک)۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ قصیدہ بردہ کی بکثرت شروح علماء ائمہ ملت نے تہرکا و تمنا ہی (۵۴۴) لکھی ہیں اور سبھی نے گویا ان شروح و حواشی اور سیکڑوں تضمینات و مستنبعات و تجمیسات کے ذریعے امام بوصیری علیہ الرحمۃ کی تائید و تصویق کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ توفیق ہوئی تو شروحات قصیدہ بردہ شریف کے حوالے سے مستقل مضمون لکھ کر پیش کروں گا۔ (محمد شہزاد مجددی، ص ۵۴۵-۵۴۱)

ڈاکٹر صاحب اسی صفحے پر مزید لکھتے ہیں: ”اس قصیدے کو شہرت ”قصیدہ بردہ“ کے نام

سے ملی، جہاں اس کی ادبیت کو تسلیم کیا گیا وہاں تعویذ، گنڈے میں اس کے اشعار استعمال کر کے اس کی فضیلت کو بھی منوالیا گیا ہے.....“

جناب ڈاکٹر یحییٰ ثقیط کے یہ جملے یہی واضح کرتے ہیں کہ وہ اپنے قلب و ذہن میں کوئی گرہ رکھتے ہیں ورنہ اس مبارک قصیدہ شریفہ کی فضیلت کا بیان اس طرح نہ کرتے۔ قریب ترین حوالے کے لئے وہ جناب اشرف علی تھانوی کی نشر الطیب ہی ملاحظہ فرمائیں کہ اس قصیدہ بردہ کی فضیلت کی وجہ کیا ہے اور اس کی فضیلت کس قدر ہے؟ وہ عطر الوردہ سے بھی شاید واقف نہیں، قصیدہ بردہ سیکڑوں برس سے اکابر اولیاء و علماء کا وظیفہ ہے کیوں کہ یہ بارگاہ رسالت V میں نہایت مقبول ہے اور تعویذ گنڈے کی تحقیر و تضحیک کیوں کر روا ہو سکتی ہے، کلام الہی اور پاک و مبارک دعائیں و الفاظ ہی تعویذات میں درج کیے جاتے ہیں، (کوکب نورانی ص ۸۱/۳)

’قصیدہ ذوقا فیتین‘:

’نعت رنگ‘ کے اس شمارے میں ایک دو قابل اعتراض باتیں بھی آگئی ہیں، اس کو مجبوراً آخر میں عرض کر رہا ہوں کہ: خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

(۱) اس شمارے کی ابتدا ’قصیدہ ذوقا فیتین‘ کے منظوم ترجمے سے کی گئی ہے اور ادارہ نے تعارف میں لکھا ہے کہ ”مشہور محقق ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی نے اپنے مقالے میں اسے امام شرف الدین بوصیری سے منسوب کیا ہے، جو بجا طور پر درست معلوم ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیوں کر بجا طور پر درست معلوم ہو گیا، جو بالکل خلاف واقعہ ہے بوصیری کا پورا دیوان ’مجموعۃ النہایۃ‘ میں موجود ہے اس میں کہیں اس قصیدے کا نام و نشان نہیں ملتا۔ راقم نے اس قصیدے کو کتب خانہ حرم (قدیم) کے ایک مجموعہ نعت مرتبہ جارا اللہ السہودی سے نقل کیا ہے۔ علامہ محمد حسین مخلوف نے اس کو کسی نامعلوم شاعر کا کلام قرار دیا ہے۔

(۲) ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحي صاحب نے شوقی کے دو قصیدوں کا ذکر کیا ہے، شوقی کے تین قصیدے ہیں جن کا موضوع نعت ہے اور نینوں قصاید شوقیات کی پہلی جلد میں بارہا طبع ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں، بات کو طول دینا نہیں چاہتا اور نہ شوقی کے کلام پر تبصرہ اس وقت مقصود ہے، البتہ ایک شعر کا ترجمہ حیرت ناک حد تک قابل نظر ہے!! وہ شعر ہے:

ابا الزہراء قد جاوزت قدری بمدحک بیدان لی انتسابا

شاعر حضور اکرم ﷺ کو عہد رسالت کے اسلوب میں کنیت کے ذریعے خطاب کرتا ہے، کنیت کے ذریعے خطاب کرنا ایک بڑا اعزاز تھا جیسے کوئی آج کل کی زبان میں کسی کو حضرت والا یا حضرت اقدس لکھے، شاعر کہتا ہے:

اے پدرِ زہرا (یعنی اے سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے والد بزرگوار)
آپ کی مدح کر کے میں اپنی حیثیت سے تجاوز کر گیا، (یعنی ہماری حیثیت اتنی نہیں تھی کہ ہم آپ کی مدح کر سکیں۔ ”بیدانِ لیا انتساب“ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجھے ایک نسبت حاصل ہے۔ ”بید“ کا ترجمہ۔ لیکن، ہاں، مگر۔ حسب موقع کیا جاسکتا ہے۔

کون سی نسبت؟ یہ الفاظ میں نہیں کہا گیا بلکہ بین السطور سے مضمون عیاں ہے کہ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ مجھے غلامی کی نسبت حاصل ہے اور یہی جرأت مدح کا سبب ہے۔ اس شعر کا ترجمہ موصوف نے کیا ہے ”اے ابو ہریرہؓ آپ ﷺ کی ثنا خوانی کی وجہ سے میں اپنے مقام سے بلند ہو گیا، جب کہ اس سے قبل میرا ایک انتساب تھا، اس ترجمہ سے نہ تو مفہوم واضح ہوتا ہے اور نہ معنی کا سراغ ملتا ہے اور نہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ یہاں بیچ میں کہاں سے آگئے اور کہاں سے یہ معنی نکالے گئے کہ عقل کام نہیں کرتی، بلاشبہ حسن ظن اپنی جگہ پر اچھی چیز ہے مگر حسن ظن کو اس درجہ مایوس کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔

دوسری بات قابلِ بوجہ یہ ہے کہ مقالہ نگار صاحب نے ”بیچ البردہ“ کا ذکر کیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ حضرت بصری کے قصیدہ بردہ کی زمین میں اور اسی قافیہ پر یہ قصیدہ شوقی نے لکھا ہے ”بیچ البردہ“ کا مطلب ہوا قصیدہ بردہ کے طرز پر یا قصیدہ بردہ کی زمین پر قافیہ پر ایک قصیدہ جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ شاعروں میں ایک مصرع طرح پر لوگ غزلیں کہتے ہیں، قافیہ اور عروض کی پابندی ہوتی ہے اس طرح شوقی نے حضرت بصری کے قصیدہ پر قصیدہ لکھا ہے، بصری کے قصیدہ کا پہلا شعر ہے:

امن تذکر جیران بڈی سلم مزجت دمعاً جری من مقلۃ بدم

تیری آنکھوں سے یہ خون آلود آنسو کیوں رواں ہیں، کیا ذوسلم کے پڑوسی یاد آ رہے ہیں؟

شوقی کا پورا قصیدہ اسی وزن اور قافیہ پر ہے ان کا مطلع ہے:

ریم علی القاع بین البان والعلم احل سفک دمی فی الاشهر الحرم

وہ ہرنیاں جو بان کے درختوں اور ٹیلوں کے درمیان ہیں انھوں نے حرمت والے مہینوں میں میرا خون بہانا جائز کر لیا (غزل کے شعر سے تشبیہ ہے) (عبداللہ عباس ندوی، ص ۲۶۹-۲۷۰)

منسوبات اور ان کی حقیقت / اشعار کا انتساب اور ان کی حقیقت:

(۱) ”نعت رنگ“ ۸ میں ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی نے جو مقالہ ”شعر کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کی رائے“ عنوان سے قلم بند کیا ہے، وہ کافی ژرف نگاہی سے لکھا گیا ہے۔ یہ مقالہ قرآن کریم اور احادیث نبی کریم ﷺ پر ان کی ژرف نگاہی کا غماز ہے۔ لیکن اس مقالہ میں ایک بات کھٹکتی ہے موصوف نے اپنے اسی مقالہ میں حضرت حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ کے مندرجہ ذیل شعر کا انتساب سبغہ معلقہ کے مشہور و معروف شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ کی جانب کر دیا ہے۔ موصوف نے ثانوی حوالہ میں العقد الفرید کا نام لکھا ہے:

وان احسن بیت انت قائلہ بیت تقال اذا انشدته صدقا

واضح ہو کہ درحقیقت مولانا الطاف حسین حالی نے اس شعر کو تسامحاً زہیر ابن ابی سلمیٰ کا اپنی معرکہ آرا تحقیق مقدمہ شعر و شاعری کے صفحہ ۹۴ پر لکھ دیا ہے۔ راقم نے ۱۹۷۷ء میں ”اردو شاعری میں نعت“ کے تحقیقی سفر کے دوران اس شعر کو زہیر ابن ابی سلمیٰ کے دیوان میں نہیں پایا اور تلاش بسیار کے بعد اس کو یہ شعر علامہ ابن رشیق کی کتاب العمدہ کے صفحہ ۷۳ پر ملا اور تب اس کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ اس شعر کے تخلیق کار شاعر رسول ﷺ حضرت حسان بن ثابتؓ ہیں۔ راقم نے اس واقفیت کا اظہار اپنی کتاب ”نعتیہ شاعری کا ارتقاء“ مطبوعہ ۱۹۸۸ء کے صفحہ ۱۱۴ پر کر دیا ہے۔ (محمد اسماعیل آزاد، ص ۱۰۴)

(۲) ص ۳۱۷ پر ”التفات سید سادات ﷺ“ کے عنوان سے پروفیسر محمد اقبال

جاوید صاحب کی تحریر ہے۔ فرماتے ہیں، مندرجہ بالا عنوان، حافظ لدھیانوی مرحوم کے مندرجہ ذیل شعر سے ماخوذ ہے:

التفات سید سادات کب محدود ہے وسعت دامن بھی دیتے ہیں عطا کرتے ہوئے

جہاں تک مجھے یاد ہے یہ شعر حضرت حفیظ تائب مرحوم کا ہے۔ (محمد شہزاد مجددی، ص ۵۳۳)

(۳) رشید وارثی صاحب کا مضمون بھی بحیثیت مجموعی فکر افروز ہے اور نعت گوئی کے

باب میں ایک عمدہ منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ البتہ ص ۵۲ پر انھوں نے جس شعر کا انتساب حافظ شیرازی سے کیا ہے وہ سعدی شیرازی کا ہے۔ شعر یہ ہے:

دفر تمام گشت و بیایار رسید عمر

ماہچنہاں دراؤل وصفِ تو مانده ایم (ڈاکٹر تحسین فراقی، ص ۲۴۵)

(۴) ص ۳۶۵ پر مذکورہ کی روداد میں مشہور قطعہ یا صاحب الجہال و یاسید البشر

کو انور شاہ کا شمیری سے منسوب کیا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ یہ قطعہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ (حافظ عبدالغفار حافظ، ص ۶۴۶)

تخلیقات، تصانیف کا انتساب اور ان کی حقیقت

(۱) قصیدہ: الصبح بدا من طلعة: کا خالق کون؟

’نعت رنگ‘ کے سترھویں شمارہ میں ص ۸ پر مشہور و مقبول قصیدہ: الصبح بدا من طلعة۔ الخ کو امام شرف الدین بوسیری رحمۃ اللہ علیہ کی جانب منسوب کیا گیا ہے حالانکہ حقیقت کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ہمارے یہاں رائج الوقت درس نظامی کے ادب عربی کی معروف ترین کتاب ’المدح النبوی‘ جدید کے ص ۶۴ اور نسخہ قدیمہ کے ص ۱۷ پر اس قصیدہ کا انتساب قاضی محمد اکھفی المعصومی کی طرف ہے۔ اور مرتب کتاب مولانا یلین اختر مصباحی، ایڈیٹر: ماہ نامہ ’کنز الایمان‘ دہلی نے اس قصیدہ کو محمد جار اللہ سمودی کی کتاب ’المجموعۃ الکبریٰ فی القصائد الفخری‘ سے اخذ و نقل کیا ہے۔

اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ دیوان بوسیری میں بھی اس کا کہیں کچھ پتا نہیں... جو لوگ امام بوسیری کے سلاست آمیز اور فصاحت خیز قصاید کے مقام و مرتبہ اور شان طہر اقیات سے واقف ہیں وہ تو بدستور اجالوں کے راہی رہیں گے البتہ بیش تر حضرات کے اس مغالطہ کے دام ہم رنگ زمیں کے اسیر ہو جانے کا خطرہ تھا اس لیے یہ چند معروضی سطر میں انھیں حضرات کی خدمت میں پیش کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب کا مضمون بھی مجموعی طور پر معلوماتی اور عمدہ ہے۔ مگر کشفی

صاحب نے ص ۱۸ پر قصیدہ مشہورہ: ان نلت یاریح الصبا یوما الی ارض الحرم کا انتساب حضرت زین العابدینؓ کی طرف کیا ہے اور یہی زبانِ زدِ خاص و عام اور مشہور نام بھی ہے

شاید اسی شہرت نے کشفی صاحب جیسے محقق کو بھی تحقیق کی زحمت اٹھانے سے باز رکھا ورنہ اس سلسلہ میں اہل علم و ادب کی معمولی توجہ رخ حقیقت سے نقاب کشائی کے لیے کافی ہوتی۔ تحقیقین عصر کے نشتر تحقیق نے واضح کر دیا ہے اور خود قصیدہ کا زیرو بم کھلے بندوں اعلان کر رہا ہے کہ مذکورہ قصیدہ حضرت سید سجاد کا نتیجہ فکر اور ساحتِ عشق نہیں ہے۔ کشفی صاحب کی کشفی کے لیے صرف اتنا عرض کر دیں کہ صدر اسلام میں مقطوعوں کا کوئی وجود نہ تھا اور اہل عرب کے قصاید عموماً مقاطع و تخلصات سے خالی ہوا کرتے تھے مگر یہاں دیکھیے مقطع میں تخلص کس شان سے جڑا ہوا ہے۔ نیز یہ کہ مطلع کے مصرع دوم میں روضۃ کا لفظ وارد ہوا ہے۔ جس سے قصیدہ کی عجیت پر بھرپور روشنی پڑ رہی ہے کیوں کہ عربی میں روضۃ کا استعمال باغ وغیرہ کے معنی میں ہوا ہے۔ میری نظر سے عربی کی کسی کتاب یا عربی کی کسی لغت میں ’روضۃ‘ روضۃ نبوی کے معنی میں کہیں نہیں گزرا ہے۔ خدا بھلا کرے استاذ الاساتذہ محقق دوراں علامہ محمد احمد مصباحی کا جنھوں نے اس سلسلے میں تحقیق تمام فرما کر یہ فیصلہ دو ٹوک سنا دیا ہے کہ: ممانسب الی زین العابدین علی بن الحسین المتوفی سنہ ۹۵ھ، والظاہرانہ شاعر عجمی علیٰ اسلوب شعر العجم (المدح النبوی، جدید، ص ۱۰۲ مطبوعہ مجلس برکات مبارک پور) یعنی گویہ قصیدہ امام زین العابدینؓ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ عجمی اسالیب شعری کا حامل یہ کسی عجمی النسل شاعر کا کلام ہے۔ (محمد افروز قادری چریا کوٹی، ص ۱۵۳-۱۵۲)

(۲) خواجہ معین الدین چشتی کی شاعری:

کچھ دن قبل ایک کتاب ’لمعات خواجہ‘ دیکھنے کا اتفاق ہوا جو معین الدین احمد اور شمس بریلوی کی مشترکہ تالیف ہے۔ ان حضرات نے بہت قوی شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ فارسی دیوان خواجہ معین الدین چشتیؒ ہی کا ہے معین الدین ہروی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کتاب کافی ضخیم ہے اور ان کے دلائل کے وزن کا اندازہ اس کو پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کی نظر سے وہ کتاب شاید نہیں گزری۔ وجہ ظاہر ہے کہ اتنی کتابیں طبع ہوتی رہتی ہیں۔ کسی فرد واحد سے یہ توقع کرنا کہ ہر کتاب کا اس نے مطالبہ کیا ہوگا غیر فطری ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب اس کتاب پر نظر ڈال لیں تو ان کی رائے بھی میری طرح تبدیل ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب سے میں معذرت خواہ ہوں۔ کسی قسم کی گستاخی میرے پیش نظر نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ حافظ محمود شیرانی صاحب اس برصغیر ہندوپاک میں پہلے ادیب ہیں جنہوں نے کلام معین پر اس قدر تصریح کے ساتھ لکھا ہے ورنہ عموماً خواجہ غریب نواز کے سوانح نگار حضرات نے شیرانی صاحب کے مقالہ کا حاصل یہ ایک جملہ لکھنے ہی پر اکتفا کیا ہے کہ ”یہ دیوان خواجہ معین الدین سنجریشی کا نہیں بلکہ معین الدین ہروی صاحب معارج النبوة کا ہے۔“

حضرت شمس بریلوی اور معین الدین صاحب رقم طراز ہیں کہ ”ان سوانح نگاروں نے اس امر کی ذرا بھی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ وہ اس کی صحت کو نقد و تبصرہ کی روشنی میں دیکھتے اور غور کرتے کہ اس قول میں کہاں تک صداقت ہے اور یہ معیار درایت پر پورا اترتے ہیں یا نہیں۔ انھوں نے اپنی جگہ یہ سمجھ لیا کہ چونکہ حافظ محمود شیرانی صاحب نے یہ لکھ دیا ہے اور فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ کلام خواجہ غریب نواز کا کلام نہیں ہے اس لیے یہی درست ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہم کو صاحب آب کوثر جناب ڈاکٹر شیخ اکرام صاحب اور یوسف سلیم چشتی صاحب پر تعجب ہے کہ ان دونوں حضرات نے بایں دیدہ وری تحقیق کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ ”لمعات خواجہ“ کے مولفین شمس بریلوی اور معین الدین احمد نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ”ہم نے اپنی اس تصنیف میں اس مسئلہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔ یعنی ایک تحقیقی مقالہ کی شکل میں داخلی اور خارجی ہر پہلو سے اس کلام کو کسوٹی پر کسا ہے اور الحمد للہ کہ دلائل نے اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ یہ کلام معرفت نظام صرف خواجہ غریب نواز ہی کا کلام ہے۔ یہ صفحات ناقدانہ بحث کے ہر پہلو کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ تحقیق کی جہاں تک رسائی ہو سکی ہے ہم وہاں تک پہنچے ہیں اور الحمد للہ کہ تائید الہی کی رہنمائی کی بدولت ایسے اسباب تک رسائی ہو گئی جن کی موجودگی میں خواجہ غریب نواز کے کلام سے انکار ممکن نہیں۔“ (ڈاکٹر میرزا اختیار حسین کیف، ص ۹۵-۹۴)

(۳) امیر خسرو، قدسی اور سعدی سے منسوب بات غزلیات اور تصنیف کی حقیقت:

حضرت کتبی کے مضمون میں جامی کی مذکورہ نعت خاکسارم یا رسول اللہ خسرو کی غزل ’شب جائے من بودم‘ اور قدسی کی مشہور نعت ’مرحبا سید کی مدنی العربی‘ سے متعلق اہل نظر محققین خوب خوب بحثیں کر چکے ہیں مگر کوئی بھی ان نعتوں کو ان مشہور شاعروں کے علاوہ کسی دوسرے کی ثابت نہ کر سکا۔ قدسی مشہدی کی نعت کو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے پروفیسر سمیع الدین احمد نے بہت دور کی کوڑیاں لاکے کسی قدسی ہندی (غیر معروف) سے منسوب کر دی اور لکھ دیا:

”نعت قدسی کے مصنف اصلی کا سراغ اور تعین کے وقت اس اہم نکتے کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ غزل مذکور کا سبک ہندوستانی شاعر کا ہے۔ لہذا جب تک ایسی کوئی مستند دستاویز بطور ثبوت نہیں حاصل ہو جاتی، یہ دعویٰ کہ نعت متذکرہ (مرحبا سید کی مدنی العربی) قدسی مشہدی ہی کی تصنیف ہے، از روئے تحقیق صحیح نہیں ہوگا۔“ (ماہ نامہ معارف، اعظم گڑھ، اپریل ۱۹۷۸ء) مگر اے عامہ ان کے ادعا کے خلاف ہی رہی۔

بھائی! اس طرح تو شیخ سعدی شیرازی کا پند نامہ بہ عنوان کریم بھی سعدی کے متداول نسخے یا کلیات مستند مطبوعہ ایران میں شامل نہیں، تو کیا کریم سعدی بھی کسی اور کی قرار دے دی جائے گی۔ اس فقیر نے ’کریم سعدی‘ کے عنوان سے اپنے مضمون مطبوعہ ماہ نامہ معارف، اعظم گڑھ، اکتوبر ۱۹۷۸ء میں اسے سعدی کی ہی تصنیف ہونے کے مضبوط قرائن سے بحث کی ہے۔

ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ (بھارت) کے ایک کل ہند امیر خسرو سیمینار منعقدہ ۲۱ نومبر ۱۹۸۳ء میں اسی خاکسار نے اپنے مقالے بہ عنوان ’خسرو کی مشہور غزل‘ میں اس غزل (شب جائے من بودم) کو روشن حقائق اور قوی قرائن کی روشنی میں خسرو ہی کی غزل ثابت کیا۔ مقالہ چھپا اور اکیس سال گزر چکے اب تک کسی سے اس کا جواب بن نہ پڑا۔ صدیاں گزر گئیں ان غزلوں پر صوفیہ و مشائخ کو وجد و حال کرتے۔ تحقیق کی دنیا میں کچی یا پکی روشنائی ہی واحد معیار نہیں ورنہ صحیح بخاری شریف کی تدوین پر اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کی سند نہ دی جاتی۔ (طلحہ رضوی برق، ص ۵۶۳-۵۶۲)

تحقیقی تسامحات:

- ۱۔ شمارہ ہفتم میں پیارے لال شاکر میرٹھی کا ذکر ہندو شعرا کے تحت (ص ۲۲) آیا ہے میرا خیال ہے وہ پکے عیسائی تھے، ہندو نہ تھے۔ تحقیق کر لیں۔ (۸۷۲)
- ۲۔ یوں ہی شاہ صاحب نے اپنے ایک دوسرے مضمون کے ص ۱۹۳ پر ”الفضل ما شہدت به الاعداء“ کو حدیث رسول بتانے کی ناپاک جسارت کی ہے حالانکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ حدیث نہیں بلکہ عربی کے ایک مشہور شعر کا مصرع دوم ہے جواب بطور مقولہ بھی مستعمل ہے۔ شعریوں ہے:

و ملیحتہ شہدت لها ضراتہ و الفضل ما شہدت به الاعداء
(الرد الوافر: ۲۷)

بلا تحقیق اتنے دھڑلے سے کسی بات کا انتساب آقائے عرش پناہ کی طرف کر دینا شاہ صاحب جیسے اہل ادب کو زیب نہیں دیتا۔ شاید موصوف کی نظر سے یہ حدیث پاک نہیں گزری۔ ورنہ اس جرأت و جسارت کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

من کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعده من النار (محمد افرزقادی چریا کوٹی، ص ۱۵۲)

۳۔ ”ظہور رحمت“ (شاد عظیم آبادی) مسدس کی ہیئت میں ہے نہ کہ مثنوی کی۔ مثنوی میں تو ہر شعر کا اپنا الگ قافیہ ہوتا ہے۔ اگلے مضمون میں کنیر فاطمہ زہرا کے کلام کو، بجا طور پر مسدس کہا گیا ہے۔ (شاہ حسین نہری، ص ۲۷۵)

۴۔ ص ۳۱۷ پر پروفیسر محمد اقبال جاوید نے اپنے مضمون کا آغاز کرتے ہوئے حضرت حفیظ تائب مرحوم کا مشہور شعر حافظ لدھیانوی مرحوم کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔

(محمد شہزاد مجددی، ص ۵۳۵)

۵۔ حضرت علامہ کوکب نورانی کے مفصل مکتوب میں ص ۵۵۲ پر ایک عربی محاورے کے حوالے سے (جسے صاحب مضمون نے سرکار وجہاں V کا فرمان لکھا ہے) بایں الفاظ تصحیح فرمائی گئی ہے۔ فی الواقع اگر یہ فرمان رسول کریم V ہی ہے تو اصل عربی مجھے یوں یاد ہے:

الفضل ما شهدت به الاعداء۔

ہماری دانست میں یہ عربی کا مشہور مقولہ حدیث نبوی نہیں ہے، عرب شعرا کے کلام میں یہ مقولہ بہ کثرت منظوم شکل میں ملتا ہے۔

امام الثعالبی نے ”التمثیل والحاضرة“ (ص ۲۷) میں السری الموصلی الرقاء کے حوالے سے اسے درج کیا ہے۔

علامہ شہاب الدین توییدی نے ایک شعریوں لکھا ہے:

و فضائل شهد العدو بفضلها والفضل ما شهدت به الاعداء

(نہایۃ الادب فی فنون الادب، ص ۱۷۱/۸)

اسی طرح کا ایک خوب صورت شعر اور دیکھیے:

و ملیحة شهدت لها ضررتها والفضل ما شهدت به الاعداء

(شرح قصیدہ بانٹ سعادت ص ۶) (محمد شہزاد مجددی، ص ۵۳۶)

۶۔ ص ۵۶۱ پر ڈاکٹر یحییٰ خلیف نے حضرت کعبؓ کی ولدیت کو ان کا نام بنادیا ہے۔ لکھنا چاہیے

حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ۔

۷۔ صفحہ نمبر ۲۳۴ پر نمرود کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے کہ اُس نے بلند ترین مینار یا محل بنوایا تاکہ وہ ابراہیم (علیہ السلام) کے معبود کو تلاش کرے لیکن قرآن پاک میں یہ بات نمرود نہیں بلکہ فرعون اور ہامان کے حوالے سے ہے (سورۃ المؤمن آیات ۳۶ و ۳۷، نیز سورۃ القصص آیت نمبر ۳۸)۔ (تنویر پھول، ص ۲۵/۹۲۱)

۸۔ محترم مبین مرزا صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ”تیری معراج“ والا شعر پنڈت نور بہار لکھنوی کا نہیں ”کرشن بہاری تو لکھنوی“ کا ہے اور نور صاحب ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن میں آج تک کوئی پنڈت نہیں ہوا اور نہ آگے اس کا کوئی امکان ہی ہے۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۲۸)

محسن کا کوروی اور محسن کا کوروی حسان الہند: تحقیقی مطالعہ:

پروفیسر موصوف نے حسان الہند کے لقب سے ملقب محسن کا کوروی کا تذکرہ اپنی معرکہ آرا کتاب ”اردو کی نعتیہ شاعری“ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۴ء میں کیا ہے۔ اس میں حسان الہند کی نعتیہ شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ صفحہ ۵۶ سے صفحہ ۶۸ تک لیا گیا ہے۔ اس جائزے کے بعد پیرا گراف میں منجملہ دیگر باتوں کے یہ فرمایا گیا ہے کہ (حسان الہند) محسن کا کوروی نے مروجہ شاعری کی ہر صنف میں نعت کے فن کو برتا ہے۔ ”ہر صنف“ پر غور فرمائیں خصوصاً بمقابلہ نعتیہ قصیدہ نگاری (نیز یہ کہ انھوں نے ”نعت گوئی کو سنجیدگی سے ایک مستقل فن کی حیثیت سے اپنایا اور اس بلند سطح تک لے گئے جس سے آگے بڑھنا دوسروں کے لیے آسان نہ رہا۔ محسن نے دوسرے شعرا کی طرح نعت گوئی کو جزوی اور رسمی طور پر نہیں اپنایا بلکہ اسے پوری توجہ اور پورے شعور کے ساتھ اپنے فکر و فن کی جولان گاہ بنایا ہے۔ پروفیسر موصوف نے محسن کا کوروی (حسان الہند) سے متعلق اپنے اس معروضہ کے افتتاحی جملے میں ان (محسن کا کوروی) کو متوفی ۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۲ھ لکھا ہے۔

پروفیسر موصوف کے مندرجہ بالا فرمودات سے صاف عیاں ہے کہ دونوں محسن کا کوروی (محسن کا کوروی خلیفہ مولانا عبدالسلام ہسوی اور محسن کا کوروی حسان الہند) ایک نہیں ہیں بلکہ دو الگ الگ ہستیاں ہیں، جن میں سے ایک یک صنفی ہیں اور دوسرے یعنی حسان الہند نعت کے لیے ہمہ صنفی اور ”اردو کے پہلے شاعر... جنھوں نے نعت گوئی کو سنجیدگی سے ایک مستقل فن کی حیثیت سے اپنایا“ سعدی نے درست فرمایا ہے:

گر نمیند بروز شپہ چشم چشمہ آفتاب را چہ گناہ
ان محسن کا کوروی کا سن وفات جن کا تذکرہ ”نیا ز اور فتح پور“ میں ہے ۱۳۳۹ھ ہے۔
اردو ادب کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ حسان الہند کا مزار عید گاہ مین پوری میں ہے، جب کہ محسن
کا کوروی ثم فتح پوری کا مزار محلہ پنی میں ہے۔ واضح ہو کہ پروفیسر فرمان فتح پوری کا مولد فتح پور کا
ایک گاؤں بہت پور ہے اور انھوں نے اپنی زندگی کا خاصا حصہ فتح پور ہی میں، پہلے ایک ہونہار
طالب علم کی حیثیت سے اور بعد میں ایک لائق و فائق استاد کی حیثیت سے، مسلم کالج میں گزارا جو
محسن کا کوروی فتح پوری کے مزار سے بہت قریب ہے۔ دونوں کے درمیان کا فاصلہ با آسانی پانچ
منٹ میں (پیدل) طے کیا جاسکتا ہے۔

گوہر مسعود صاحب نے خود غلط طور پر سمجھ لیا کہ پروفیسر فرمان فتح پوری صاحب نے
اپنا تذکرہ بالا جملہ حسان الہند محسن کا کوروی کی بابت لکھا ہے اور اپنے اس مفروضہ کو مسلمہ مان کر
اس کی تغلیط میں اپنا سارا زور قلم صرف کر ڈالا۔ انھوں نے اس سلسلے کی عصری شہادتوں سے صرف
نظر کر کے محسن کا کوروی ثم فتح پوری کا نام محمد محسن کی بجائے محسن علی شاہ ایک کتبے کی بنیاد پر لکھ ڈالا،
جس میں نہ کا تب کا نام کندہ ہے اور نہ اس کے نصب کنندہ کا۔ واضح ہو کہ راقم نے اس کتبہ کو اور اس
سے ملحق محسن کا کوروی فتح پوری صاحب کے خلیفہ عبدالشکور صاحب کے کتبہ کا بغور مطالعہ کیا ہے۔
ان میں سے کسی میں نہ کتبہ کی تاریخ درج ہے اور نہ کتبہ کو نصب کیے جانے کی تاریخ مندرج ہے،
جس کی بنا پر یہ کتبات ساقط المیعاد ہو جاتے ہیں۔ (محمد اسماعیل آزاد، ص ۱۱۰-۱۰۹)

نعت گو شعرا کے اشعار: تفہیم و تعبیر کی غلط فہمیاں:

(۱) شمارہ (۱۰) میں جناب رشید وارثی صاحب نے اپنے طویل اور فاضلانہ مضمون
”اردو نعت میں ادب رسالت کے منافی اظہار کی مثالیں“ میں صفحہ ۲۱ اور ۲۲ پر اس خاکسار کے
دو شعر بھی سوئے ادب کے ضمن میں نقل کیے ہیں:

یہ قلب سلیم اس کا پڑھتا ہے کلمہ جس البیلہ افعی نے اس کو ڈسا ہے

طبیعت میں وہ قدرتی شرم جیسے کہ پردہ نشیں کوئی ناکتھا ہے

پہلے شعر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: ”شعر میں بیان کیا گیا ہے کہ شاعر کا قلب سلیم
اس انوکھے یا خوب صورت ناگ کا کلمہ پڑھتا ہے جس نے اسے ڈسا ہے۔ یہاں معاذ اللہ

آپ ۷ کی ذات اقدس کے لیے ایک خوب صورت ناگ کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے اور
آپ ۷ کے عشق مبارک کی تاثیر کو ڈسنے سے تعبیر کیا گیا ہے... الخ!

گزارش ہے کہ وارثی صاحب کو اس شعر کا محل و محل سمجھنے میں سخت مغالطہ ہوا ہے۔ اس
شعر کا متکلم نہ تو شاعر ہے اور نہ اس کے ضمیر ”اس“ کا مرجع آپ کی ۷ ذات اقدس۔ یہ تو
”فارقلیط“ کے ابتدائی حصے میں ایک پیت کی ماری، برجگ ٹیار لیلیٰ کی پکار ہے۔ جو رفیقہ، قتیلہ
اور فاطمہ بنت مر کے ساتھ ان ”بتان سیہ چشم و شمشاد قد“ میں شامل ہے جو حضور والا کے جواں میر،
جوان رعنا والد حضرت عبداللہ سے شادی کی خواہاں تھیں۔ غم فراق کی شدت میں ناامید، اس
امیدوار حسینہ کی زبان سے یہ کرب و کیف کے الفاظ نکلتے ہیں۔

”سلیم“ کے معنی یہاں ”لدلیغ“ سانپ کا کاٹ کھایا ہوا، ڈسا ہوا اور وہ شدید زخمی جو
ہلاکت کے قریب ہو، کے ہیں۔ اس کے معروف معنی ”صحیح و سالم، تندرست، چنگا، درست،
کامل، صاف دل اور حلیم“ وغیرہ کے ہیں۔ مارگزیدہ اور جاں بہ لب کے لیے یہ تفاؤلاً، نیک شگون
کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

دوسرے شعر کے بارے میں وہ رقم طراز ہیں: ”شعر میں آپ کی طبع مبارک میں شرم
وحیا کے عنصر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ لیکن اس بے احتیاطی کے ساتھ کہ شرم و حیا کے ضمن میں
آپ ۷ کو پردے میں بیٹھی ہوئی کنواری لڑکی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو آپ ۷ کے ادب
و تعظیم اور جلالت شان کے پیش نظر بڑی روح فرسا جسارت ہے۔ واضح رہے کہ حضرت
ابوسعید خدریؓ کا یہ قول کتب احادیث میں آتا ہے کہ آپ ۷ میں کسی پردہ نشین عورت سے زیادہ
حیا تھی۔ اس قول پر شارحین نے نکتہ چینی فرمائی ہے جیسے ”مدارج النبوت“ میں شیخ عبدالحق محدث
دہلوی نے اس تشبیہ کو آپ کے ادب و تعظیم کے حوالے سے پسندیدہ نہیں سمجھا۔“

محدث دہلوی کی کتاب میری نظر سے نہیں گزری اور نہ ہی ان شارحین کی نکتہ چینی جن کا
انھوں نے نام نہیں لیا۔

ہے اپنی اپنی نظر، اپنا اپنا ذوق نظر جدا جدا ہے مذاق جمال ہر انسانا

لیکن:

نہ تنہا من دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار ہم مست

جناب خدریؒ کی روایت کے الفاظ ہیں:

كان النبي، رسول V اشد حيا من العذراء في خدرها!

میرے سامنے اس روایت کے قابل استناد و استشہاد ہونے کے لیے درج ذیل

مآخذ تھے اور ہیں۔

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الحیا (۷۷) حدیث ۱۲۳

۲۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب کثرة حياءه (۱۹۸) حدیث ۱۳۳۲

۳۔ سنن ابن ماجہ، کتاب زهد، باب الحیا (۱۷) حدیث ۴۱۸۰

۴۔ مسند احمد بن حنبل، ج ۳

۵۔ الشفاء قاضی عیاض اندلسی، فصل الحیا

۶۔ ریاض الصالحین، کتاب الادب، باب الحیا (۸۴)

از، ابو زکریا نووی دمشقی، نمبر ۶۸۴/۴۔ آخر میں لکھا ہے: متفق علیہ

۷۔ جواہر البحار فی فضائل النبی المختار از امام یوسف اسماعیل نبہانی باب حیا و چشم پوشی میں الشفاء کے حوالے سے

۸۔ شمائل رسول از امام ینتہانی، شرم و حیا اور مزاج میں یہ روایت درج ہے

۹۔ شمائل ترمذی، باب ماجاء فی حیا رسول اللہ، میں

۱۰۔ شمائل کبریٰ از مولانا شتر جالندھری و مولانا غلام رسول مہر

باب شرم و حیا میں ان الفاظ کے ساتھ (بقول بخاری صحابہؓ سے مروی ہے)

۱۱۔ حمۃ للعالمین از، قاضی سلیمان منصور پوری، جلد ۳،

شرم و حیا کے ذیل میں صحیح بخاری کے حوالے سے

۱۲۔ سیرۃ النبی از سید سلیمان ندوی، جلد ۶،

باب فضائل اخلاق میں شرم و حیا کے تحت بخاری کے حوالے سے

۱۳۔ سیرۃ نبویؐ پر ایک، باب حیا میں یہ روایت درج ہے محققانہ نظر، از۔ خلیفہ محمد سعید

۱۴۔ نقوش (لاہور) رسول نمبر جلد ۴، حیا کے باب میں بخاری اور شفاء کے حوالے سے

اگر وارثی صاحب اور وہ محترم حضرات جن پر تکیہ کرتے ہوئے انھوں نے اس روشن

روایت پر ایراد اور اس کا استرداد کیا ہے مذکورہ وقیع حوالوں کو مستند و معتبر نہیں مانتے تو ان کی جرأت

انکار انھیں مبارک! (عبدالعزیز خالد، ص ۶۳۲-۶۳۹)

(۲) رشید وارثی صاحب نے شاعر کا تخلص حذف کر کے اپنے اندرونی خوف کا

مظاہرہ کیا ہے۔ باوجود خوف کے رقم طراز ہیں:

”اس شعر میں ذات حق تعالیٰ جل جلالہ کے طرز بیان کو ”کم سے کم“ کہنے

سے قادر مطلق کی صفت کلام، وحی متلو اور غیر متلو (قرآن و حدیث) کی

تنقیص ہوتی ہے... ذرا سوچے کہ جب اللہ تعالیٰ کے لیے یہ گمان رکھا

جائے کہ (نعوذ باللہ) اس کا طرز بیان حضور اکرم V کی ”مدحت

خاص“ کے لیے کم سے کم حیثیت رکھتا ہے تو پھر آپ کی کامل مدحت سرائی

کے لیے ذات قادر مطلق کو بھی مجبور ماننا پڑے گا کہ وہ اپنے محبوب V

کی کما حقہ، مدحت بیان کرنے پر قادر نہیں... لہذا اس قسم کی مدح سرائی

سے اجتناب کرنا بلکہ تائب ہونا نعت گوئی کیا ایمان کا بھی تقاضا ہے۔“

دراصل اس شعر میں جو لطیف نکتہ ہے۔ رشید وارثی صاحب اسے سمجھ ہی نہیں سکے۔ میں

نہیں جانتا کہ یہ شعر کس کا ہے لیکن اتنا نفیس شعر کہنے پر میں تو داد دیتا رہا۔ میری دانست میں اس

شعر کی تشریح یوں ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں ارفع و اعلیٰ ہے تو اسی طرح اس کا کلام

بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس نے اپنے محبوب کے ذکر کو رفعت بخشی اور فرمایا۔ ان اللہ و ملائکتہ

یصلون علی النبی۔ یا ایہا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما۔ اللہ تعالیٰ خود اور

اس کے فرشتے نبی کریم V پر درود بھیجتے ہیں اس درود بھیجنے سے اللہ تعالیٰ کی مجبوری ظاہر نہیں ہوتی

بلکہ یہ مقصود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی نبی کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے ان پر درود بھیج رہا

ہے۔ حضور V کے مقام کو جس طرح اللہ تعالیٰ سمجھتا ہے اُسے کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ جس طرح وہ

اپنے محبوب V کی تعریف کرتا ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ سرکارِ

دو عالم V کی شان بہت اونچی ہے اور اے شاعر (تخلص) تم صدق دل سے چاہے کتنی ہی آپ

کی تعریف و توصیف کرو ان کی تعریف و توصیف کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ حضور V کے

شایان شان تو اللہ تعالیٰ کا طرز بیان ہے۔ ان کی مدحت خاص کا تو تقاضا بھی یہی ہے کہ کم سے کم

وہی طرز بیان اختیار کیا جائے جو طرز بیان اللہ تعالیٰ کا ہے۔ چوں کہ تمھارا طرز بیان وہ نہیں ہو سکتا

جو کہ اللہ تعالیٰ کا ہے لہذا تم ان کی مدحت خاص کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

ہزار بار بشویم دہن بہ مشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است
(نقوی احمد پوری، ص ۸۸۰-۸۷۹)

(۳) ایک شعر کے بارے میں البتہ بصدا دہن عرض کرتی ہوں کہ یہاں میں نے ”شان“ کے لفظ کو واحد ہی کے طور پر برتا ہے۔ شعر ہے:

اپنے کپڑوں میں پیوند خود ٹانکتے اپنی پاپوش بھی بارہا گانٹتے
ماندھی سامنے جس کے ”شان کئی“ زندگی کوئی دیکھے وہ کیسے کئی

آپ نے اس ترکیب کو خلافِ رزمہ اور خلافِ محاورہ کہا ہے۔ میں نے ”شان کئی“ کہہ کر عالی مرتبت ایرانی شہنشاہوں کی شان بیان کی ہے۔ علامہ اقبال کا مصرع ہے:

مانگنے والے کو ہم شان کئی دیتے ہیں (شکوہ جواب شکوہ)

اور مندرجہ ذیل شعر میں موجود شخصی تداخل کی نشان دہی فرماتے ہوئے جہاں اسے سراہا ہے وہاں اسے ہندوئی ثقافت کا مظہر بھی گردانا ہے۔

آپ کے قدموں میں جھک کر پیش میں کرتی سلام
آپ کی لے کے دعائیں کس قدر ہوتی نہال

یہاں بھی بصدا دہن و احترام عرض کروں گی کہ قدموں میں جھکنے سے میری مراد حد درجہ ادب و احترام سے سلام پیش کرنا ہے۔ ہم والدین یا بزرگوں سے کہتے ہیں، آپ کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوں۔ یہ ان کی ذات سے وابستہ بے پایاں عزت و تکریم کا اظہار ہے۔ ہندو تو قدم چھوتے ہیں، ہم ایک قدم اور آگے بڑھ کر قدم چومنے کی بات کرتے ہیں۔ قدموں میں جھک کر سلام کرتے ہیں۔ ہندوانہ رسم و رواج کی جھلک ہے، میں نے یہ نہیں سوچا تھا۔ والدین کی قدم بوسی والی بات کے بارے میں اظہار خیال کریں تو شکر گزار ہوں گی۔

(طلعت سلیم، ص ۵۸۰-۵۷۹)

(۴) مرزا صاحب نے غالب کے دو اشعار ”ورق تمام ہوا۔۔۔ بوسے مری زباں کیلئے“ کو نعتیہ اشعار کے طور پر درج کیا ہے جب کہ یہ نواب تجل حسین خاں کی شان میں لکھے گئے قصیدے کے اشعار ہیں۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

”ابوالخیر شفی نے بالکل ٹھیک کہا ہے ان شعروں کی بابت کہ بے چارے تجل

حسین خاں ان کا مصداق کب ہو سکتے تھے۔ اسی لئے ہمارا اجتماعی ذوق شعری

ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آیا۔“ (ص ۲۴)

یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ غالب اور دیگر عربی، فارسی اور اردو کے قصیدہ گو یوں نے اپنے اپنے ممدوحین (بادشاہ و امراء) کے تعلق سے جو کچھ کہا ہے کیا وہ واقعی ان کے مصداق ہیں؟ دور کہاں جائیے غالب اور ذوق نے ”بہادر شاہ ظفر“ کی شان میں جو کچھ کہا ہے کیا ظفر اس کے مصداق تھے؟ غالب نے جتنے بھی قصیدے لکھے (سوائے حضرت علیؑ کے) تمام کا مقصد صرف حصولِ زرتھا اور کچھ بھی نہیں۔ غالب کی نظر میں اپنی مطلب برآری کے سوا کسی چیز کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ انھوں نے گدھے کو گھوڑا کہنے میں بھی عار محسوس نہیں کیا بلکہ وکٹوریہ کی شان میں لکھے گئے قصیدے پر جب انھیں کوئی ”دکھنا“ نہیں ملی تو وہی قصیدہ معمولی رد و بدل سے نواب واجد علی کے نام منسوب کر کے لکھنو بھیج دیا اور مبلغ دو سو روپے پائے!!

اس لیے ناچیز ”زباں پہ بار خدایا“ والے شعر کو نعت کا شعر تسلیم نہیں کرتا، قارئین سے بھی التماس ہے کہ شاعر اپنے شعر کو جس عنوان سے پیش کرتا ہے اسے اسی کے تحت دیکھنا چاہئے۔ ساحر لدھیانوی کا مشہور نغمہ ہے ”لاگا چڑی میں داگ چھپاؤں کیسے“، کون کر اگر کوئی ساحر کو صوفی جان کر حضرت امیر خسروؒ کی صف میں لا بٹھائے تو اسے کیا کہیں گے؟! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶-۲۷)

الفاظ اور اصطلاحات کا علمی پس منظر

لفظ انھی کا استعمال:

”غلط العوام فصیح“ کی تاویل کے سہارے اردو کی اعلیٰ لسانی قدروں کو مجروح ہونے سے بچایا جائے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر۔ راجا رشید محمود صاحب کے ایک شعر میں لفظ ”انہی“ کے استعمال پر ڈاکٹر سید شمیم گوہر کا حکم تحریف عائد کرنا درست نہیں کہا جاسکتا۔ ”انہیں“ جمع غائب کی ضمیر ہے اور ”انہی“ غائب کی ضمیر کلمہ جصر کے ساتھ مرکب ہے۔ ”تمہی“ کی طرح اصل میں ”ان ہی“ ہے۔ لہذا اس کے درست استعمال پر ناک بھوں چڑھانا درست نہیں۔ اب تو ماہرینِ لسانیات نے بھی اس کے اسی استعمال کی سفارش کی ہے۔ (ملک الظفر سہرامی، ص ۸۴۳)

لفظ استلام کی تحقیق:

لفظ ”استلام“ کے تعلق سے بھی ڈاکٹر گوہر صاحب کی گرفت بے موقع ہے۔ موصوف

نے اسے باب استئصال پر محمول کر کے استئلام کی بات کی ہے۔ جب کہ راجہ صاحب کے شعر میں لفظ ہی دوسرا ہے۔ ایسے ہی موقع کے لیے کہا گیا ہے:

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا
”استلم“ کے تعلق سے ”المنجد“ میں ہے ”(استلم) الحجر: مسحه بالكف (من السلمة ای الحجر) قبله. وربما استعمل فی غیر الحجر فتقول ”استلمت یدہ“ اذا مسحتھا او قبلتها (المنجد). الاب لو ئیس معلوف الیسوعی. الطبع الخامس بیروت)

اس لفظ کے تحت ”المنجد“ عربی اردو کی صراحت یہ ہے۔ ”استلمت الحجر“ پتھر کو ہاتھ سے چھونا یا منہ سے چومنا۔ پتھر کے علاوہ اور چیز کے لیے بھی آتا ہے۔ مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں کہ ”استلمت یدہ“ میں نے اس کے ہاتھ کو چھو لیا یا چوم لیا۔ (ملک الظر سہرامی، ص ۸۴۳)

لفظ مالک کی تحقیق:

”نعت رنگ“ شمارہ نمبر ۴ میں جناب احمد صغیر صدیقی، کراچی کا جو مکتوب چھپا ہے اس میں انھوں نے لکھا ہے:

رسول اللہ V کے نام کے ساتھ جو القاب مستعمل ہیں، مثلاً مولائے کل، آقائے دو جہاں، سرکارِ دو عالم وغیرہ۔ میں ان پر اکثر غور کرتا ہوں، یہ تمام القاب مجھے رحمن و رحیم کے محسوس ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً آقا و مولا تک تو بات ٹھیک ہے لیکن اگر نبی کریم V کو ”مولائے کل“ کہا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کے لیے کیا کہیں گے؟ ہمارے سامنے رحمت للعالمین، رسول مقبول، نبی کریم، حبیب خدا وغیرہ جیسے القاب بھی تو ہیں۔ بہر حال میری خواہش ہے کہ اس طرف بھی کوئی صاحب علم مضمون نگار توجہ دے تو کیا اچھی بات ہوگی۔ اگر علامہ اقبال اور مولانا حضرات کچھ کہتے ہیں تو اسے سند بنا کر سب کو قائل کرنے کی ضرورت نہیں! ضرورت اس بات کی ہے کہ بذریعہ تحقیق غلط اور درست کا فیصلہ کیا جائے۔ (نعت رنگ، شمارہ نمبر ۴، ص ۲۱۳)

چوں کہ احمد صغیر صاحب لکھ چکے ہیں کہ وہ کسی مولانا کی بات نہیں مانیں گے تو اب یہ پتا نہیں کہ انھوں نے ۱۴/۱۵ ویں اور ۱۵/۱۶ ویں صدی ہجری کے مولانا صاحبان کے لیے لکھا ہے یا عہد صحابہ سے لے کر بعد کے ادوار کے تمامی مولانا صاحبان بشمول آئمہ مجتہدین، فقہا و علما وغیرہ۔ لہذا راقم کسی بھی مولانا کا قول نہیں پیش کرے گا حالانکہ دین ہم تک انھیں حضرات سے پہنچا ہے۔ تقلید ہمارے لیے لازم ہے لیکن راقم اس سلسلے میں بھی کچھ نہیں عرض کرے گا۔

راقم احمد صغیر صاحب کے شک و شبہ کو رفع کرنے کے سلسلے میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہے وہ کسی صاحب علم مضمون نگار کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بے بضاعت انسان ایک مسلمان اور نبی ذی شان کے ایک اُمتی ہونے کی حیثیت سے ان کی عظمت کے دفاع اور اختیار و مرتبہ کے اظہار میں۔ بات کوئی بھی کہے اگر وہ دلیل سے ثابت کر دے تو اسے ماننا چاہیے۔ پس یہی حسن ظن رکھتے ہوئے راقم عرض کر رہا ہے:

جس انسان کے قبضہ و اختیار میں کوئی شے یا ملک ہوتی ہے اسے اس شے یا ملک کا مالک کہا جاتا ہے۔ جیسے مالک مکان، مالک جائداد وغیرہ! جو شخص کسی کا ملازم یا غلام ہوتا ہے اس شخص کو مالک کہتا ہے۔ بیوی اپنے شوہر کو مالک کہتی ہے۔ بادشاہ یا ملک کے والی و فرماں روا کو ملک، ملک الملوک، مالک الملک وغیرہ کہا جاتا ہے۔

فقہائے کرام میں ایک فقیہ امام علاء الدین ابوالعلیٰ لیثی نا صحتی رحمۃ اللہ علیہ کا لقب ’شاہان شہ ملک الملوک‘ تھا۔ ان سے استفادہ کرنے والے بھی انھیں ’شاہان شہ ملک الملوک‘ لکھتے تھے اور وہ خود بھی اپنے نام سے پہلے یہ لقب لکھتے تھے۔

صحابہ کرام میں قریب ایک سو دس حضرات کے نام مالک تھے، حضرت امام مالک کا نام بھی مالک تھا اور داروغہ جنم کا نام بھی مالک ہے۔ یہ تمام حضرات صرف مالک کہہ کر بھی پکارے جاتے رہے ہوں گے اور آج بھی مالک کہہ کر پکارے جاتے ہیں۔ تو کیا اس سے مراد اللہ تعالیٰ لے لیا جاتا ہے یا لے لیا جانا چاہیے؟

دنیا کی ہر شے، زمین کا چپہ چپہ، ذرہ ذرہ اللہ کی ملک ہے لیکن انسان کو زمین، جائداد اور ملک کا مالک کہا جاتا ہے۔ اسی طرح افسران کو حاکم، اقربا اور رشتہ داروں کو عزیز، عزت و وجاہت والوں کو عزیز و عظیم، مہربان انسانوں کو رحیم و کریم، نرم دل والوں کو حلیم، علم والوں کو عالم اور طبیب وغیرہ کو حکیم، فوٹو گرافر اور آرٹسٹ وغیرہ کو مصور، ہر سننے دیکھنے والے کو سامع، سمیع و بصیر وغیرہ!

یہ سارے نام۔ مالک، ملک، مالک الملک، حاکم، حکیم، عزیز، عظیم، عالم، رحیم، کریم، حلیم، مصور وغیرہ صرف اللہ کے نام معلوم نہیں ہو رہے ہیں بلکہ ہیں۔ یہ نام رب جلیل کے صفاتی اسماء ہیں۔ لیکن! ان کا اطلاق غیر اللہ کے لیے ہوتا ہے اور آج تک کسی نے بھی ان پر گرفت نہیں کی۔

اللہ تعالیٰ نے خود غیر اللہ کو مالک کہا ہے:

۱۔ ”یہ تو ان کے مالک ہیں۔“ (پ ۲۳، رکوع ۳)

۲۔ ”اور پکاریں گے اے مالک“ (پ ۲۵، رکوع ۱۳)

اللہ جل مجدہ جو مالک یوم الدین ہے، اس نے اپنے محبوب بندوں کو مالک شفاعت بھی کہا ہے۔

۳۔ ”لوگ شفاعت کے مالک نہیں مگر وہی جنہوں نے رحمن کے پاس قرار کر رکھا ہے۔ (مریم: ۸۷)

۴۔ ”اور یہ جن کو اللہ کے سوا پوجتے ہیں شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے۔ ہاں! شفاعت کا اختیار انہیں ہے جو حق گو ہیں دیں اور علم رکھیں۔“ (الزخرف: ۸۶)

نمبر ۴ والی آیت کی تفسیر میں ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ و عزیر علیہما السلام کے لیے ہے یعنی انہیں رب عظیم نے شفاعت کا اختیار دیا ہے اور ہمارے حضور علیہ السلام تو شافع محشر ہیں ہی۔ اس آیت کی رو سے وہ بدرجہ اتم مالک شفاعت ہیں اس لیے کہ وہ نبیوں اور رسولوں کے سردار ہیں۔

ان دو آیات سے محبوبان الہی کا شفع ہونا ثابت ہے۔

حالانکہ یہی اللہ تعالیٰ خود اپنے لیے فرماتا ہے:

۵۔ ”مالک یوم الدین“ اللہ روز جزا کا مالک ہے۔ (سورہ فاتحہ: ۳)

۶۔ ”لمن الملک الیوم“ آج کس کی بادشاہی ہے۔ (پ ۲۲، رکوع ۷)

اسی رب العالمین نے خود کو مالک الملک اور احکم الحاکمین بھی فرمایا ہے۔ حضور نبی

کریم ۷ نے بھی اللہ جل مجدہ کے لیے فرمایا:

لا ملک الا اللہ۔ یعنی بادشاہ کوئی نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے (مسلم شریف)

اپنے دور کے علما میں جو علم و مرتبہ میں بڑا ہوتا ہے اسے لوگ ملک العلماء بھی کہتے ہیں۔

اس طرح تو گویا اسے اللہ اور رسول سے بھی بڑھا دیا گیا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

انصار کرام، حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

”یا رسول اللہ! انت واللہ الاعز العزیز“

یا رسول اللہ! اللہ کی قسم حضور ہی سب سے زیادہ عزت والے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

عزیز بھی اللہ کا نام ہے۔ انصار کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ ۷ کو

عزیز کہا لیکن حضور علیہ السلام نے اس پر ان کی گرفت نہیں فرمائی۔

حکیم بھی اللہ کا نام ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

میری امت کے حکیم ابودردا ہیں۔ (طبرانی فی الاوسط)

تو کیا ایسا فرما کر حضور علیہ السلام نے معاذ اللہ حضرت ابودردا کو اللہ کہہ دیا؟ ہرگز نہیں۔

وفد بنی عامر نے حضور علیہ السلام سے عرض کی:

انت سیدنا۔ یعنی حضور ہی سید ہیں۔ (احمد و ابوداؤد نے حضرت عبداللہ

بن الشخیر العامری رضی اللہ عنہ سے روایت کی)

اس پر حضور علیہ السلام نے فرمایا: ”السید اللہ۔ یعنی سید تو اللہ ہی ہے۔

یہاں حضور ۷ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ حقیقی معنی میں سید یعنی سردار یا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

لیکن حضور علیہ السلام نے یہ منع نہیں فرمایا کہ انہیں سید نہ کہا جائے ورنہ وہ خود ہرگز نہ فرماتے: ”انا

سید ولد آدم“، یعنی میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں۔ (مسلم و ابوداؤد)

حضور علیہ السلام نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا: (۶۷۴)

بے شک یہ میرا بیٹا سید ہے۔ (بخاری شریف)

سید کا اطلاق حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے لیے بھی ہوا اور ان دونوں بھائیوں

کی اولاد رہتی دنیا تک سید کہی جائے گی۔ اس طرح سید اب ایک خاندان، قبیلہ یا برادری سے

موسوم ہو گیا۔

خلاصہ کلام

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ان کے بشر ہونے کی حیثیت سے کچھ حد تک کچھ

اختیارات عطا کر رکھے ہیں اسی بنا پر بندہ بھی مالک کہلاتا ہے ورنہ ہر شے اللہ ہی کی ہے وہی مالک

حقیقی ہے۔ اسی طرح رب عظیم نے بندوں کو اپنی کچھ صفات بھی عطا کی ہیں، مثلاً سننے، دیکھنے اور

جاننے، حکم دینے، فیصلہ کرنے وغیرہ کی، لہذا بندہ بھی بشری حدود میں حاکم، عالم، حکیم وغیرہ

ہے اور سامع و سمیع و بصیر ہے لیکن اللہ اور بندہ کے سمع و بصر میں فرق ہے۔ اللہ بغیر جسم اور آلہ کے سنتا، دیکھتا، جانتا ہے اور بندہ اسی کے عطا کردہ جسم، کان، آنکھ اور عقل سے۔

جس لفظ کا جو معنی محاورات میں شائع و ذائع ہے اس عرف اور محاورہ کو افادہ مقاصد میں پورا دخل ہے۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ“ (پ ۹، رکوع ۱۴)

اب یہاں ان الفاظ کے عرفی معانی مراد لیے جائیں گے اور انہیں استغراق معنوی ہی پر محمول کیا جائے گا نہ کہ لغوی معنی یا استغراق حقیقی پر۔ لیکن جب ان الفاظ کو لغوی معانی میں استعمال کریں گے یا لکھنے بولنے میں ایسا قرینہ پیدا کر دیں گے کہ یہ استغراق حقیقی پر محمول ہو جائیں تو غیر اللہ کے لیے ان کا اطلاق کفر ہو جائے گا، مثلاً مالک حقیقی، حاکم حقیقی، حاکم مطلق، مالک روز جزا، عالم الغیب والشہادۃ وغیرہ۔

لہذا مالک، عالم، عزیز، حکیم وغیرہ جو الفاظ بندوں کے لیے کہے گئے وہ عرفی معانی میں لیے گئے، اسی طرح حضور علیہ السلام کے لیے آقائے دو جہاں، مولائے کل، سرکارِ دو عالم وغیرہ کا استعمال استغراق حقیقی پر محمول نہیں ہوتا۔ یہ سارے القاب رسول کریم ﷺ ہی کے لیے ہیں۔ اللہ تو بہت ہی بلند شان والا ہے۔ وہ تو کل عالم کا بھی خالق و مالک ہے اور مختارِ عالم یا سرکارِ دو عالم کا بھی خالق و مالک۔ اصل مختار و سردار و مولا تو وہی ہے۔ اب جس طرح احمد صغیر صاحب کو حضور علیہ السلام کے یہ القاب اللہ تعالیٰ کے معلوم ہوتے ہیں لہذا اس بنا پر حضور علیہ السلام کے لیے یہ القاب نہیں لکھنا یا استعمال کرنا چاہیے تو مالک، حاکم وغیرہ جن الفاظ کا ذکر ہوا وہ معلوم ہی نہیں ہوتے ہیں بلکہ اللہ ہی کے ہیں تو کیا انہیں احمد صغیر صاحب بند کرادیں گے۔ یا اللہ! اس طرح تو زبان و قلم اور لغت و ادب وغیرہ کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

احمد صغیر صاحب نے یہ بھی کہا ہے کہ ”ہمارے سامنے رحمتہ للعالمین، رسول مقبول، نبی کریم، حبیب خدا وغیرہ جیسے القاب بھی تو ہیں۔“ لہذا ان کے اسی قول ”رحمتہ للعالمین“ سے بھی ثابت ہے کہ حضور علیہ السلام، سرکارِ دو عالم، آقائے دو جہاں اور مالک کل ہیں۔

اللہ عزوجل نے حضور علیہ السلام کے لیے فرمایا:

”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“

اور ہم نے تجھے نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔

عالمین جمع ہے عالم کی، لہذا ثابت ہوا کہ ایک سے زیادہ عالم یعنی دو عالم، دو جہاں یا کل مخلوقات الہی۔ اللہ رب العالمین ہے یعنی کل عالم یا دونوں جہان کا پروردگار، لہذا اللہ عالمین کا رب ہے تو اس کے رسول عالمین کے لیے رحمت ہیں۔ عالم یا عالمین یا کل مخلوقات الہی کہتے ہیں ماسوا اللہ کو تو حضور علیہ السلام لا جرم سب پر رحمت اور سب یعنی کل مخلوقات الہی حضور ﷺ کے زیر رحمت اور رحمت میں اللہ کی نعمت بھی شامل ہے اور اگر نعمت کو شامل نہ کریں تب بھی رحمت ہی کافی ہے۔ بہر حال کل مخلوقات الہی حضور علیہ السلام کی رحمت کی طالب ہے اور حضور رحمت عطا کرنے والے عطاء الہی سے لہذا ظاہر ہوا کہ کل مخلوقات الہی حاجب مند اور رسول اللہ علیہ السلام مالک، مختار، آقا، سرکار، مولا وغیرہ۔ لہذا ثابت ہوا کہ حضور ﷺ رحمتہ للعالمین ہونے کی حیثیت سے عالمین یعنی دونوں عالم کے سرکار اور آقا ہیں اور کل کا شمار بھی مخلوقات ہی میں ہے۔ اللہ کل سے ماسوا ہے، لہذا حضور علیہ السلام مولائے کل بھی ہوئے پس حضور علیہ السلام کو سرکارِ دو عالم، مولائے کل اور آقائے دو جہاں کہنا درست ہے۔ جب اللہ نے ایسا بے پایاں اختیار اپنے اس بندے، رسول اعظم اور اپنے حبیب اکبر کو عطا کیا تو پھر کسی کے لیے اعتراض کا کیا محل؟ یہ اعتراض تو اللہ ہی پر ہوگا۔

اب رہی بات اللہ عزوجل کی تو وہ سب کے لیے رحمت، رحمتہ للعالمین کے لیے بھی رحمت، وہ تو رحمن ہے اور جس طرح کسی بندے کو اللہ نہیں کہہ سکتے اسی طرح رحمن بھی نہیں کہہ سکتے۔ الوہیت اور رحمانیت اسی کے لیے ہے۔ وہی معبود ہے، مالک حقیقی۔ اس کی شان تو انسانی عقل و فہم سے ورا ہے۔ اللہ نے اپنے بندے، رسول اور حبیب سرکارِ دو عالم ﷺ کو رؤف و رحیم بھی کہا ہے۔ ”حریص علیکم بالمومنین رؤف الرحیم“ [۱۲۸/۱۰]۔ لیکن رحمن نہیں کہا۔

لہذا اسی ”رحمتہ للعالمین“ سے ثابت ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ، آقائے دو جہاں، مولائے کل، مختارِ دو عالم، سرکارِ دو عالم، سید الکونین و الثقلین ہیں اور ان القاب سے انہیں یاد کرنا اللہ کی اُلُوہیت یا حقیقی مالکیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ سرکار علیہ السلام کا ان سے اللہ ہونا یا بنا دیا جانا ثابت ہوتا ہے۔

قرآن و احادیث کے بہت سے حوالوں اور دلائل سے سرکار علیہ السلام کے لیے ان القاب کا استعمال ثابت کیا جاسکتا ہے لیکن مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ اگر دو بوند ہی اثر کر جائیں تو طوفانِ نوح لانے سے اشک کو کیا فائدہ؟

احمد صغیر صاحب مولانا صاحبان کی اسناد کے قائل نہیں ہیں حالانکہ جیسا راقم نے ابتدا ہی میں عرض کر دیا ہے کہ مولانا تو صحابہ کرام بھی تھے اور بعد کے علماء، آئمہ، صلحا وغیرہ اور خود سب سے بڑے مولانا اور علامہ سرکار علیہ السلام اور ان کے نائین، صحابہ، تابعین، تبع تابعین، آئمہ مجتہدین، صلحا، فقہا اور علماء، محدثین، مفسرین وغیرہ سے ہی دین ملا ہے اور دین کی سمجھ!

احمد صغیر صاحب لکھتے ہیں کہ بذریعہ تحقیق غلط اور درست کا فیصلہ کیا جانا چاہیے تو کیا مولاناؤں والے حوالوں یعنی قرآن و احادیث یا بزرگان دین کی تشریحات و توضیحات کے علاوہ محض لغت و ادب سے اور یہ فیصلہ صرف زبان و ادب کے محققین کریں گے یا اس طرح کے زبان و ادب کے ماہرین جو فقہ، تفسیر، حدیث، عقائد و کلام اور تمامی علوم و دینیہ نقلیہ کے باوصف علوم عقلیہ کے بھی عالم یا اسکالر ہیں۔ (عبدالنعمیم عزیزی، ص ۶۷-۶۸)

لفظ خدا کی تحقیق:

مولانا کوکب نورانی اوکاڑوی نے ”نعت رنگ“ کے چوتھے شمارے میں شائع ہونے والے کشفی صاحب کے مضمون کے حوالے سے لکھا ”صفحہ نمبر پچاس پر ہے کہ اس لیے بہت سے صاحبان اللہ کے لفظ پر اصرار کرتے ہیں اور خدا کے لفظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں کیوں کہ خدا کی جمع خداؤں استعمال ہوتی ہے۔ اس حوالے سے عرض ہے کہ لفظ خدا اللہ کا نام نہیں ہے، خدا حافظ (وغیرہ) کہنا جائز ہے مگر اللہ کہنے پر ثواب ہوتا ہے، چالیس نیکیاں ملتی ہیں اور مومن کو ثواب کی طلب و خواہش بدیہی بات ہے۔“ یہاں بصدا احترام گزارش کرتا ہوں کہ ایک عالم اور عالم زادہ سے مجھے اس قدر نامکمل جواب کی توقع نہ تھی۔ انھوں نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ لفظ خدا کی جمع کی بنا پر استعمال غلط ہونے کا اعتراض شرعی اعتبار سے کتنا درست ہے، یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ لفظ خدا اللہ کا نام نہیں، نیز اس لفظ کے استعمال سے ثواب میں کمی یا اس سے محرومی کا احتمال کیوں ہے؟

کشفی صاحب نے بھی یہ ظاہر کرنے سے گریز کیا ہے کہ وہ لفظ خدا کے استعمال کے قائل ہیں یا مخالف..... قیاس کہتا ہے کہ اگر قائل ہیں تو اعتراض نقل نہ کرتے یا اس کے رفع کرنے کو دلائل دیتے۔ براہ کرم تاخیر سے سہی، وضاحت فرمائیے!

مندرجات بالا کے حوالے سے اب اپنی معروضات پیش کرتا ہوں۔ دور جدید کی ایک

شان دار اور قابل ستائش علمی کاوش شرح صحیح مسلم کی شکل میں علامہ غلام رسول سعیدی صاحب (مدرس دارالعلوم نعیمیہ، فیڈرل بی ایریا، کراچی) کے قلم سے، کچھ عرصہ قبل منظر عام پر آئی، اس کی ساتویں جلد سے اقتباس پیش خدمت ہے:

”اللہ تعالیٰ کی ذات کو لفظ ”خدا“ کے ساتھ تعبیر کرنے کی تحقیق: اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء اور صفات جن کا ذکر قرآن و سنت میں وارد نہیں ہوا، ان کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہر زبان اور لغت میں علم (عین اور لام پر زبر) اور اسم سے تعبیر کرنا جائز ہے، مثلاً فارسی میں اللہ تعالیٰ کو خدا، ترکی میں تنکری کہنا بالاتفاق جائز ہے البتہ جب اللہ تعالیٰ پر کسی صفت کا اطلاق کیا جائے تو پھر یہ بحث ہے کہ آیا اس صفت کا کتاب و سنت میں ذکر ہے یا نہیں ہے۔ اگر اس کا کتاب و سنت میں ذکر نہ ہو تو بعض علماء اس میں توقف کرتے ہیں اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ لفظ کسی نقص کا موہم ہے تو پھر اس کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق جائز نہیں ہے اور اگر اس لفظ میں کسی نقص کا وہم نہیں ہے تو پھر اس کا اطلاق جائز ہے۔“ آگے علامہ صاحب نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، علامہ سرخسی، علامہ بدرالدین عینی صاحب شراح ہدایہ، علامہ آلوسی اور علامہ شعرانی وغیرہ کے حوالوں اور دلائل سے لفظ خدا کا استعمال (حتیٰ کہ نماز میں) جائز قرار دیا ہے (ملاحظہ کیجیے صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۵)

علامہ سعیدی نے امام اعظمؒ کے ذکر میں لکھا کہ انھوں نے حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ کے سورۃ فاتحہ فارسی میں لکھ کر اہل ایران کے پاس بھیجنے کی حدیث سے استدلال فرمایا۔ حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دو رسالت ۷ یا بہ اختلاف روایت دور فاروقی میں جنگ قادسیہ کے موقع پر سورۃ فاتحہ فارسی میں جو ترجمہ فرمایا، اسے تراجم کی فہرست میں اولیت حاصل ہے، اس ترجمے کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے: ”بنام خداوند بخشناںندہ و مہرباں“ (بسم اللہ کا ترجمہ) صحابی موصوف ایک جلیل القدر صحابی رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام، نصرانیت، یہودیت اور مجوسیت کے عالم تھے، اگر انھوں نے لفظ خداوند (جو لفظ خدا کی ایک شکل ہے) استعمال کرنے میں مضائقہ نہیں سمجھا تو بیسویں صدی کے مسلمان اس لفظ پر کیوں اعتراض کرتے ہیں۔ (حوالہ کے لیے ”نقوش“ کا رسول نمبر ملاحظہ کیجیے)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے عہد تک پہلوی بڑی حد تک فارسی بن چکی تھی، اندازہ یہ ہے کہ لفظ خدا کا ماخذ قدیم زبان پہلوی ہے جو زنداوستا کی زبان ہے۔ زنداوستا میں توحید، رسالت، آخرت، کتب الہامیہ پر ایمان، ملائکہ پر ایمان، نماز، روزے کا حکم جیسے عقائد

واحکام موجود ہیں اور جدید تحقیق کی رو سے زرتشت (ZARTUSHT) یا زردشت (ZOROASTER) توحید پرست اور توحید کے مبلغ تھے۔ محمد حفظ الرحمن صدیقی سیوہاروی نے قصص القرآن میں انھیں پیغمبر لکھا ہے مگر میں اسلامی تعلیمات کے مطابق اس ضمن میں سکوت بہتر سمجھتا ہوں کہ کسی داعی کو پیغمبر قرار دیا جائے یا اس کی تکمیل کی جائے۔

حوالہ جات

1. The World's religions by Stewart Sutherland ETC.
Published by Routledge, London .198. Page NO 552 to 568.
2. Encyclopaedia Britannica, Macropaedia-1986.
3. Do - 1981 Edition
4. Caxton Encyclopedia
5. Paris-Ancient and Modern and their Religion.
By. F.K. Dadachanji, Karachi. 1989.

۶۔ قصص القرآن از محمد حفظ الرحمن صدیقی سیوہاروی

۷۔ وحید۔ تہران (فارسی رسالہ) اکتوبر ۱۹۳۹ء

۸۔ مسلم شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا۔ از ایم ایس ناز

۹۔ ارتقا۔ سلسلہ نمبر ۱۔ مضمون زبانی تعصب از سرکار زینی جارچوی، مئی ۱۹۹۶ء

۱۰۔ سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر۔

مندرجہ بالا ماخذ میں مؤخر الذکر مضمون جدید اذہان کے لیے بہت سے اعتراضات کا سد باب کرتا ہے، اس میں دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ لفظ خدا پر جو بنیادی اعتراضات وارد ہوئے ہیں، غلط ہیں اور تکنیکی و مذہبی بنیاد پر اللہ کے لیے اس لفظ کا استعمال بالکل اسی طرح درست ہے، جس طرح لفظ اللہ کا استعمال! لفظ خدا کے لغوی معنی ہیں: خود سے آنے والا یا خود سے قائم۔ کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ذات اس نام سے موسوم ہو سکتی ہے؟ میری دانست میں لفظ خدا کا مجازی استعمال شرعی اعتبار سے قابل گرفت ہے، لہذا اس کی جمع بھی نامناسب ہے!

آخر میں عرض کروں کہ میں عالم تو نہیں، علماء کا صحبت یافتہ ضرور ہوں۔ لہذا ایسے امور پر روروی میں قلم چلانے کا قائل نہیں! میرے مؤید اور محترم استاد مفتی محمد اطہر نعیمی صاحب خطیب

جامع مسجد آرام باغ نے فرمایا کہ ان معاملات میں تنگ دلی کی بجائے کشادہ ذہنی کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ کوکب نورانی صاحب کی تنقیدی ہوگی، نیز کشنی صاحب و دیگر اس باب میں عقلی و نقلی دلائل کو قبول کریں گے۔ براہ کرم قطع برید کے بغیر اس خط کو شائع فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

سہیل احمد صدیقی

الجواب: (نوٹ: مذکورہ بالا وہ واحد خط ہے جس کا جواب نعت رنگ میں شائع کیا گیا۔ مرتب)

آپ کا پہلا اعتراض ہائیکو کی ایک قسم SENRYO کے اردو تلفظ کے بارے میں ہے۔ اس کا بہتر جواب تو مقالہ نگار موصوف ہی سے متوقع ہے۔ سر دست اتنی وضاحت کی جاتی ہے کہ دیگر زبانوں کی طرح انگریزی زبان میں بھی دوسری زبانوں کے بعض الفاظ کا تلفظ اصل زبان کے تلفظ سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت یعقوب علیہ السلام کو Jacob، یوسف علیہ السلام کو Joseph، یونس علیہ السلام کو Jonah اور ادریس علیہ السلام کو Enoch لکھا جاتا ہے۔ اب اگر انگریزی زبان سے ان انبیاء علیہم السلام کے اسمائے مبارک کا املا اخذ کیا جائے تو عربی زبان بالکل مختلف ہوگا۔ لہذا یہ بات مد نظر رکھی جائے کہ SENRYO جاپانی زبان کے ایک لفظ کا انگریزی تلفظ ہے۔ اس جاپانی لفظ کا اردو میں تلفظ سین دانی یا واخذ کیا گیا ہے جسے بھارت کے ماہر لسانیات کلیم احمد صاحب نے اپنی لغت میں اسی طرح تحریر کیا ہے اور مقالہ نگار نے وہیں سے یہ تلفظ اخذ کیا ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ براہ راست جاپانی زبان سے اس کے الفاظ کا تلفظ اخذ کرنے کے بجائے انگریزی میں وضع کردہ تلفظ کی اردو میں بھی متابعت کی جائے۔

اسی طرح SENRYO کو نعت میں ذریعہ اظہار بنانے کے لیے اسے نئے امکانات سے آشنا کیا جائے تو اس وسعت کے تجربات غزل کی وسعت کی طرح قبول کیے جانے چاہئیں۔

آپ نے علامہ غلام رسول سعیدی صاحب کی شرح مسلم کے جن صفحات کا حوالہ دیا ہے اگر آپ نے خود ان صفحات کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا ہوتا تو یہ نہ لکھتے کہ ”لفظ خدا پر جو بنیادی اعتراضات وارد ہوئے ہیں، غلط ہیں اور تکنیکی و مذہبی بنیاد پر اللہ کے لیے اس لفظ (خدا) کا استعمال بالکل اسی طرح درست ہے، جس طرح لفظ اللہ کا استعمال۔“ کیوں کہ علامہ موصوف نے صفحہ ۲۰۲ پر خود یہ صراحت فرمائی ہے: ”ان حوالہ جات کے نقل کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خدا کہنا جائز ہے اور ہر دور میں آئمہ اور فقہاء اللہ تعالیٰ کی ذات کو خدا سے تعبیر کرنے کو

جائز کہتے رہے ہیں۔ ہر چند کہ افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ اللہ کے لفظ کو ”اللہ“ سے ہی تعبیر کیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ کو خدا سے تعبیر کرنا بھی جائز ہے۔“ اسی طرح صفحہ ۲۰۵ پر علامہ صاحب تحریر فرماتے ہیں ”ہر چند کہ سطور بالا میں پیش کیے گئے دلائل کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر خدا کا اطلاق جائز ہے لیکن افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ اللہ کے لیے اللہ ہی کا لفظ استعمال کیا جائے کیوں کہ قرآن اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کے لیے یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی صاحب کے محولہ بالا اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے خدا کا لفظ استعمال کرنا اگرچہ جائز ہے لیکن خلاف اولیٰ ہے اور بلا کسی عذر کے ترک اولیٰ کہاں کی دانش مندی ہے۔ علامہ موصوف کی تحریر میں آپ کے اکثر اعتراضات کے جواب موجود ہیں۔ آپ اس تحریر کا غور سے مطالعہ فرمائیں تو تشفی ہو سکتی ہے۔

مکتوب گرامی کے آخر میں اگرچہ آپ نے خود یہ اعتراف کیا ہے ”میری دانست میں لفظ خدا کا مجازی استعمال شرعی اعتبار سے قابل گرفت ہے لہذا اس کی جمع نامناسب ہے۔“ لیکن بات صرف اتنی نہیں ہے بلکہ اردو اور فارسی میں لفظ خدا کی جمع کے علاوہ اس کے دیگر مشتقات، اس کی تانیث اور مختلف لاحقوں کے ساتھ اس کا لسانی برتاؤ بھی ہے جس کی کچھ مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:

۱۔ خدائے سخن: فن شعر و شاعری میں باکمال، میر تقی میر کو اردو غزل کے حوالے سے خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ولی دکنی کے بارے میں کہا جاتا ہے:

ولی سے ہوئی ابتداء سخن کہ مشہور ہے وہ خدائے سخن

۲۔ خدائے خیر: ایزد (آتش پرستوں کے عقیدے کے مطابق خیر کا خدا)۔

۳۔ خدائے شر (بدی کا خدا): آتش پرستوں کے عقیدے کے مطابق بدی کا خدا۔

۴۔ خدائے مجازی: بادشاہ وقت، حاکم وقت، خاوند۔

۵۔ خدا فروش: مکار صوفی

۶۔ خدا تراشنا: (محاورہ) اپنے خیالات کے مطابق کسی کو اعلیٰ درجہ دینا ”تراشیں تخیل میں اپنے خدا“

۷۔ خدائی: مالک کی تانیث۔ سردارنی۔ دیوی (خدا + نی) (لاہتہ تانیث)

(استعمال: مرتبہ پاؤگی خدائی کہلاؤگی) طلسم نو خیر جمشیدی

۸۔ خدائی: آقا۔ مالک کی تانیث۔ (لغت۔ انجمن ترقی اردو) ملکہ

۹۔ خداوند: مالک، خدا، حاکم عہدیدار، حاکم۔ بقول ابن انشا

بحر کاہل کے جزیروں کے انہی باسی قسمت مشرقی اقطبی کے خداوند بنے

۱۰۔ خداوند: (کنایت) محبوب، معشوق

اک بوسے کا سائل ہوں خداوند سے اے مہر

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

۱۱۔ خداوند: بادشاہ کو مخاطب کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ (لاہتہ صفت)

”بادشاہ کے سامنے زمین بوس ہو کے عرض کرنے لگا۔ خداوند! میری عمر پچاسی برس کی ہے۔“ (مضامین شرر)

۱۲۔ خداوند زادہ/خداوند زاد: (کنایت) امیر یارکس کا بیٹا

۱۳۔ خداوند طبع: آقا منش، مقدورانہ طبیعت کا مالک۔

”اردو نے تھوڑی سی عمر میں وہ شوخی دکھائی کہ اچھے اچھے خداوند طبع لوگ اس کی محبت کا دم بھرنے لگے۔“ (مقالات ناصری)

۱۴۔ خداوند مجاز: دنیاوی اور ظاہری خداوند، پیر و مرشد، صاحب کرامات

(خداوند + مجاز = لاحقہ صفت) (دیوان حبیب)

تجھے منظور ہو دنیا تو یہ کیا روک سکتا ہے ذریعہ ہے حقیقت میں خداوند مجاز اپنا

۱۵۔ خداوند نعمت: بادشاہوں اور رئیسوں کو مخاطب کرنے کا کلمہ۔ بقول غالب

جگر کو مرے عشقِ خونا بہ مشرب لکھے ہیں خداوند نعمت سلامت

۱۶۔ خداوندان وقت: وہ لوگ (صوفیا) جو زمانے کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔

(ترجمہ کشف المحجوب)

۱۷۔ خداوندی: اللہ کی قدرت، حکم الہی، خدائی (اور اس کے ساتھ)

۱۸۔ خداوندی: امیری، بادشاہت

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مند مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

۱۹۔ خدائی: الوہیت، خدا سے منسوب، بندگی کی ضد۔

”خدا کی خدائی میں کون شریک ہے۔“ (اس کے ساتھ یوں بھی مستعمل ہے)

۲۰۔ خدائی: راج، حکمرانی

رہیں گے اب خدائی میں بتوں کی بہت گزری ہے دور آسمان میں

۲۱۔ خدائی: خدا بنانے کا عمل، ایسا کام جس سے کسی کو خدا ٹھہرا دیا جائے۔ (فرہنگ اقبال)

”گواس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ“ (اقبال)

۲۲۔ خدایان: خدا + ی (اتصال) + ان (لاحقہ جمع) جو لوگ مالک ہیں۔ (فرہنگ اقبال)

۲۳۔ خدایان: بحر و بر: سمندر اور روئے زمین کا علم رکھنے والے۔ قضا و قدر کے کارکن فرشتے۔

”خبر ملی ہے خدایان، بحر و بر سے مجھے“ (بال جبریل)

۲۴۔ خدایان ہمالہ: ہمالیہ کی وادیوں میں رہنے والے ہندو سا دھو۔ ہندو دھرم کے فلسفی۔ ”دیتے

ہیں یہ پیغام خدایان ہمالہ“ (ارمغان جاز)

لفظ خدا کے مشتقات اور لاحقوں کے ساتھ استعمال کی یہ وہ صورتیں ہیں جن کی بنا پر

ذات باری تعالیٰ کے لیے لفظ خدا کے استعمال سے بعض احتیاط پسند حضرات اجتناب کرتے ہیں۔

تاہم اولیائے کرام اور فقہائے عظام نے لفظ خدا اس کے اصل معنی میں کثرت سے استعمال کیا

ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ ذات باری تعالیٰ کے لیے خدا کا استعمال جائز ہے۔ لیکن افضل

واولیٰ یہی ہے کہ ذات باری تعالیٰ کو اس کے اسم ذات یا اسمائے حسنیٰ ہی سے پکارا جائے۔

مکتوب گرامی میں فارسی میں نماز کے حوالے سے یہ وضاحت پیش خدمت ہے کہ امام

اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں اپنے فتویٰ سے رجوع فرمایا تھا (الہدایہ) اور صرف

عذر کی حالت میں یہ حکم ہے یعنی یہ عارضی حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ عذر کے رفع ہو جانے کے بعد یہ

رعایت باقی نہیں رہتی۔ کتابیات کے حوالے سے بھی یہ بات محل نظر ہے کہ خط کے آخر میں صرف

کتابوں کے نام تحریر کر دیے گئے ہیں اور یہ نشان دہی نہیں کی گئی کہ کون سے نکات کہاں سے اخذ

کیے گئے ہیں۔ (نعت نامے، (ادارہ) ص ۴۶۶-۴۶۰)

لفظ مالک کی تحقیق:

ص ۱۹ پر کشفی صاحب لکھتے ہیں: ”الفاظ کے معانی اپنے ماحول اور محل استعمال سے

بدل جاتے ہیں“۔ اور اسی صفحے پر انہوں نے امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں

فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کہی ہوئی نعت شریف کے ایک شعر کا پہلا مصرع لکھا: ”میں تو مالک

ہی کہوں گا کہ ہوا مالک کے حبیب“۔ اس حوالے سے کشفی صاحب لکھتے ہیں: ”جب مالک کا لفظ

لغوی طور پر استعمال کیا جائے جیسے اس مصرع میں (ہے) تو بات اپنی حدود سے نکل جائے گی،

شاعر اس غلو سے اسی وقت بچ سکتا ہے جب اسے آقائے جان و دل کی حقیقی عظمتوں کا دھیان

رہے اور ان عظمتوں کا علم قرآن پاک و احادیث ختم الرسل (۷) سے ہوتا ہے، کشفی صاحب

نے خود فرمایا کہ الفاظ کے معانی اپنے ماحول اور محل استعمال سے بدل جاتے ہیں اور پھر اس مصرع

میں اپنی ہی رائے فراموش کرتے ہوئے اعتراض فرمایا، اگر لفظ ”مالک“ بعینہ اسی معنی میں اور حقیقی

مراد لیا جائے جیسا کہ اللہ کریم کے لئے لیا جاتا ہے تو بلاشبہ اعتراض درست ہوگا مگر کون ہے جو

اللہ کریم کے برابر یا اس کے مثل کسی کو گردانتا ہے؟

اسی صفحہ ۱۹ پر پہلی سطر میں کشفی صاحب فرماتے ہیں: ”رسول اللہ ۷ مالک کے

حبیب ہیں مگر مالک نہیں ہے (ہیں) حکم اور امر صرف اللہ کا ہے اور اللہ کے لئے ہے“، کشفی

صاحب کے پیش نظر شاید یہ قرآنی آیت ہوگی ان الحکم الا للہ۔ کشفی صاحب ذرا ماضی کے

اس دور پر نظر فرمائیں جب خوارج یہی آیت حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے رُو برپڑھتے تھے

تو مولائے غم گسار حیدر کرار فرماتے: ”کلمۃ حق ارید بھا باطل“ جو بات کہہ رہے ہو وہ حق

سچ ہے مگر اس سے جو ثابت کرنا چاہ رہے ہو وہ باطل ہے۔ (کوکب نورانی، ص ۶۱۳)

توحید کی حقیقت:

اب آئیے کچھ مضمون کے مندرجات کی طرف، سب سے پہلے تو تحریر کی بے ترتیبی و

بے ربط پیرا گراف، ہی طبع سلیم پر گراں ہیں کہ فاضل محرر نے اتنے مختلف النوع نثری ٹکڑے باہم

جوڑنے کی کاوش فرمائی ہے۔ بہر حال ان کی ہمت اور حوصلہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنے مافی الضمیر کو

بیان کرنے کے لیے انھیں براہ راست تمہیدی الفاظ نہ ملے تو انھوں نے ”بطور تشبیہ“ یہ

انداز بیان اختیار فرمایا، خیر! یہ بھی ان کا ذاتی معاملہ ہے، مضمون کے عنوان کی مناسبت سے

انھوں نے سب سے پہلے توحید خالص کو تین اقسام، یعنی توحید الوہیت، توحید ربوبیت اور توحید

صفات پر مشتمل و منقسم قرار دیا ہے۔ لیکن ان اقسام اور تقسیم کی کوئی معتبر سند اور مستند حوالہ پیش کرنے

کی زحمت نہیں کی، جو ان پر فرض ہے۔ البتہ یہ مہربانی ضروری کی کہ عصر اسلامی کے نعتیہ کلام اور

قصائد کہنے والے آغوش نبوت کے پروردہ نیک نفس لوگوں یعنی حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کی

نہ صرف تحسین فرمائی ہے بلکہ انھیں انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد روئے زمین کے برگزیدہ لوگ

بھی تسلیم کیا ہے۔

یاد رہے اقسام توحید کی یہ مثلث ”متاثرین تثلیث“ کی ذاتی اختراع اور مقلدین ابن تیمیہ کی ایجاد فرمودہ اعتقادی بدعت ہے۔ قرآن و سنت اور آثارِ صحابہ و سلف میں اس کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ یہ سازش اُمت مسلمہ کے ان موحدین کو مشرکین ثابت کرنے کے لیے تیار کی گئی تھی جو انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیائے عظام رحمہم اللہ تعالیٰ کو باذن اللہ تعالیٰ متصرف و مختار مانتے ہیں اور ان مقبولانِ بارگاہِ الہی میں وسیلہ بناتے ہیں۔ معروف عرب عالم دین شیخ حسن السقاف نے اپنے ”مجموعہ رسائل السقاف“ (۵۹۳/۲) میں اس تشکیلی توحید کا پردہ خوب چاک کیا ہے۔ علامہ سقاف لکھتے ہیں:

یہ تقسیم سلف صالحین میں متعارف و معلوم نہ تھی، اس تقسیم کو ساتویں صدی ہجری کے بعد گھڑ کر منتشر کیا گیا اور اسے پہلی بار ابن بطہ العکبری نے بیان کیا جو عقیدہ تجسیم کا قائل (مجسمہ فرقہ کارکن) مجروح العدالت اور وضاع تھا، جب کہ ابن تیمیہ نے اس من گھڑت اور محدث نظریہ کو شرح و بسط کے ساتھ عام کیا۔

علامہ سقاف نے ”شرح عقیدہ طحاوی“ کے نام سے شائع ہونے والی کتاب کے بارے میں بھی معلومات افزا انکشافات کیے ہیں۔ جن کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

عقیدہ طحاویہ امام ابو جعفر الطحاوی الحنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا تیار کردہ متن ہے جو کتاب و سنت خصوصاً ائمہ احناف کے بیان فرمودہ عقائد پر مبنی مستند دستاویز ہے۔ اس کی ایک شرح ابن ابی العز ”الحنفی“ نے کی ہے اور حواشی میں جگہ جگہ صاحبِ متن کی مخالفت کرتے ہوئے ذاتِ باری سبحانہ و تعالیٰ کے لیے ”حد“ اور ”جہت“ کا اثبات کیا ہے جب کہ امام طحاوی علیہ الرحمۃ نے اس کی نفی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ملا علی القاری نے ”شرح فقہ الکبیر“ (ص ۱۷۲) میں ابن ابی العز کے بارے میں لکھا ہے:

”صاحب مذهب باطل، تابع لطائفة من المبتدعة“

باطل عقائد کا حامل اور بدعتی فرقہ کا پیروکار ہے۔

اقسام توحید کی مذکورہ مثلث ابن ابی العز نے شرح عقیدہ طحاویہ میں کمالِ تلخیص سے تیار فرمائی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے مجموعہ رسائل سقاف کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

ذاتِ ورا کورئی کے لیے حد، جہت، جسم اور اعضا کے قائلین کیا جانیں کہ اس وحدۃ الاشریک کی شان الوہیت و حدانیت کیا ہے۔ فرقہ، مجسمہ و مشبہ کے پیروکار ”لیس کمثلہ شئی“ کی حقیقت تک رسائی سے عاجز ہیں۔ سچ ہے:

توحید متاعیت کہ بردار فروشد گل نیست کہ در کوچہ و بازار فروشد
البتہ خود ساختہ توحیدی مثلث کے ذریعے ذاتِ وحدۃ الاشریک کے پیاروں اور محبوبوں کی عظمت اور شرف و کمالات کی نفی کرنے سے ہی ان کی توحید کا اثبات ہوتا ہے۔
شرک ٹھہرے جس میں تعظیم حبیب اس بُرے مذہب پہ لعنت کیجیے
محمد بن عبد الوہاب نجدی کی ”کتاب التوحید“ اور اسماعیل دہلوی کی ”تقویت الایمان“ اسی توحیدی ٹکون کے دو تیز دھار کوٹنے ہیں۔

سانچہ کر بلا کے تناظر میں نگرانی صاحب نے اہل بیت علیہم الرضوان کے تذکرہ کو نعت کے ساتھ مبالغہ آرائی اور غلو کے ساتھ کیے جانے کا ذکر بھی چھیڑا ہے اور کچھ نعت گو شعرا کے اسما بھی پیش کیے ہیں جن میں کیمت الاسدی و عبل الغزالی اور الشریف رضی شامل ہیں۔ صد شکر کہ مضمون نگار نے ان تینوں شعراء کو بھی دائرہ شرک سے خارج قرار دیتے ہوئے یوں لکھا ہے:

”مذکورہ تینوں شعراء نے اپنے سیاسی اور عقائدی نظریات سے قطع نظر رحمتِ عالم ۷ اور اہل بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے کسی بھی فرد کو ربوبیت کا درجہ نہیں دیا کیوں کہ وہ توحید کی تینوں قسموں اور ان کے معانی و مطالب سے بخوبی آگاہ تھے۔

یہاں بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنے معیار توحید و شرک کی کوئی صراحت نہیں کی البتہ انداز بیان بتا رہا ہے کہ ان کا اشارہ کسی قسم کی توحید اور شرک کی طرف ہے۔ جب کہ اس کی مزید وضاحت ان کی تحریر کا درج ذیل اقتباس پڑھنے سے ہو جاتی ہے:

عربی کی نعتیہ شاعری کو توحید خالص کی ڈگر سے ہٹا کر شرک کے غار میں

دھکیلنے کے گنہ گار ساتویں صدی کے اندسی الاصل شاعر ابن ہانی اور

اسکندریہ کے نعت گو شاعر محمد بن سعید البوصیری تھے۔ (ص ۳۶)

تائید مزید کے طور پر انھوں نے اپنے ایک استاد کا قول بھی نقل کیا ہے جس سے ان کے مزاج و مسلک کا بھی بخوبی اندازہ ہو رہا ہے۔ مضمون نگار نے اندسی الاصل شاعر ابن ہانی کا تعلق ساتویں صدی سے بیان کیا ہے جو درست نہیں۔

ابن ہانی الاندلسی (۳۹۳ھ/۹۷۳م/۳۶۳-۳۲۶ھ) ابوالحسن محمد بن ہانی، الأزدی کا تعلق بلحاظ نسل عیسوی دسویں صدی سے اور تقویم ہجری کے اعتبار سے چوتھی صدی سے بنتا ہے۔ اشبیلیہ میں پیدا ہونے والا یہ ازدی شاعر بن ابی صفرہ الأزدی کی اولاد میں سے تھا اور عقائد کے لحاظ سے اسماعیلی شیعہ تھا۔ ابن خلکان کے بقول ابن ہانی مغرب کا متنبی تھا۔ اسی لیے اسے ”متنبی المغرب“ کہا جاتا ہے۔ ابن ہانی کو ادبیات عربی کے ائمہ نے مغرب کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔ ابن ہانی کا دیوان مطبوع ہے۔ جس کی شرح ”تبین المغانی فی شرح دیوان ابن ہانی“ کے نام سے نظام کالج حیدرآباد دکن انڈیا کے استاذ عربی ڈاکٹر زاہد علی کی تحقیق و تہذیب کے ساتھ (۱۳۵۲ھ) میں ”مطبعة المعارف“ مصر سے شائع ہو چکی ہے۔ فاضل محقق نے اپنے مقالہ کی دوسری جلد میں دیوان کا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس تحقیقی کاوش پر انھیں آکسفورڈ یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی (Ph. D) کی ڈگری سے نوازا تھا۔

باخبر مؤرخین اور ناقدین ادب نے جہاں ابن ہانی کے کلام اور ادبی کمال کو سراہا ہے وہاں اس کے عقائد و نظریات پر تنقید بھی کی ہے جو ہر بڑے ناقد کا حق ہے۔ ابن ہانی نے اپنے کلام میں جا بجا اپنے عقائد کا اظہار کھل کر کیا ہے بلکہ اسماعیلی عقائد کو جاننے کے لیے اس کے مدحیہ قصائد ایک اہم ذریعہ ہیں۔ البتہ اسے نعت گو شاعر تسلیم کرنے میں کم از کم مجھے تامل ہے۔ کیوں کہ اس کا تقریباً سارا کلام مصر کے فاطمی خلفا کی مدح پر مشتمل ہے اور کہیں کہیں وہ ائمہ اہل بیت کے فضائل اور مناقب اسی تناظر میں بیان کرتا ہے۔ اس سلسلہ کی مزید تفصیلات کے لیے اہل علم تاریخ ادب عربی کے موضوع پر لکھی گئی معروف کتب سے رجوع کر سکتے ہیں۔ (محمد شہزاد مجددی ص ۵۴۱-۵۴۰)

لفظ عشق کی حقیقت:

محترم شاہ مصباح الدین شکیل صاحب نے اپنے مضمون ”شاعر جہاد... رحمن کیانی“ میں لفظ ”عشق“ پر اعتراض کیا ہے جو کہ غلط ہے۔ عشق کا صحیح مفہوم ”محبت کی زیادتی“ ہے۔ جس طرح محبت اچھی یا بُری ہوتی ہے اسی طرح عشق بھی اچھا یا بُرا ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ قرآن و حدیث میں کہیں موجود نہیں۔ حالاں کہ یہ بھی غلط ہے۔ قرآن مجید میں نہ ہی لیکن حدیث میں یہ لفظ ضرور استعمال ہوا ہے۔ کافی عرصہ ہوا جعفر شاہ پھلواروی [۱] نامی کسی مولوی نے درودِ تاج

اور دیگر اوراد بزرگانِ دین پر اعتراضات کیے تھے۔ اس کے جواب میں میرے مرشد طریقت حضرت علامہ سید احمد شاہ صاحب کاظمی [۲] نے ایک کتاب بنام ”درودِ تاج پر اعتراضات کے جوابات“ تحریر فرمائی تھی۔ اس کتاب میں لفظ ”عشق“ پر اعتراض کا بھی تفصیلی جواب ہے۔ میں اس خط کے ہمراہ اس کتاب کی ایک جلد شاہ صاحب کے مطالعے کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ موصوف مطمئن ہو جائیں گے۔ (حافظ عبدالغفار حافظ، ص ۶۴۷)

شاعر جہاد-رحمن کیانی، کے عنوان سے شاہ مصباح الدین شکیل کا مضمون ص ۲۷۱ سے ص ۳۰۹ تک پھیلا ہوا ہے۔ ص ۲۸۰ پر وہ رحمن کیانی کے حوالے سے عشق کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”عشق“ یہ لفظ عشقہ سے مشتق ہے۔ اردو میں عشقہ کو آکاس بیل کہتے ہیں۔ اس کے پتے نہ جڑ لیکن جس درخت پر گرتی ہے اسے خشک کر دیتی ہے۔ لغوی طور پر اس کے معنی شدید شہوت کے ہیں۔“

رحمن کیانی کے تصورِ عشق پر بحث اس وقت ہمارا موضوع نہیں بلکہ ہم تو ان کی اپنی تحریر میں ایک عجیب تضاد سے قارئین کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہی عشق جس کے معنی وہ شدید شہوت قرار دیتے ہیں لیکن ص ۲۸۶ پر اسی کو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے لیے روا جاننے ماننے ہوئے کہتے ہیں: اے زعیمانِ ادب عشق کا ان کے الزام آپ لوگوں کو مبارک ہو مرا جھک کے سلام جانتا ہوں کہ یہ ہرگز مرا مقدور نہیں رب سے اپنے ہی رقابت مجھے منظور نہیں یوں ہی ص ۳۰۶ پر ان کے کلام میں ”ناچے گا“ کے الفاظ نعت کے آداب کے خلاف ہیں۔

ص ۳۶۵ پر مشہور نعتیہ قطعہ ”یا صاحبِ الجمال ویا سید البشر“ کا مہتمم دارالعلوم دیوبند سے انتساب محلِ نظر ہے۔ (حافظ محمد عطاء الرحمن قادری رضوی، ص ۶۸۹)

حمد و نعت میں لفظ ”عشق“ استعمال کرنے کے خلاف جاپان کے ایک اردو اخبار میں ایک صاحب نے یہ بے تکی دلیل پیش کی کہ لفظ ”عشق“ بہت ہی خراب ہے، کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اپنی بہو سے عشق کرتے ہیں؟ اتنا خراب لفظ حمد و نعت میں کس طرح استعمال ہو سکتا ہے!۔ راقم الحروف نے انھیں جواب دیا کہ کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ اپنی بہو کا بوسہ لیتے ہیں؟ آپ کے کہنے کے مطابق لفظ ”بوسہ“ بھی فحش و مردود ٹھہرا پھر آپ حجر اسود کا بوسہ لینے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ لفظ کس کے لئے اور کس تناظر میں استعمال ہو

رہا ہے؟ خط طویل ہو گیا ہے اس لئے اب اجازت دیجئے۔ ای میل سے رابطہ رکھیے گا۔ (تنویر پھول، ص ۲۵/۹۲)

تصوف، صوفی اور ڈاکٹر شعیب نگرانی: تحقیق کے آئینے میں:

یہاں نگرانی صاحب سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ کیا یہ جلیل القدر ائمہ اور اُمت کے دینی پیشوا ”شرکیہ نعت گوئی کے شجر خبیثہ“ کی آب یاری کرتے رہے ہیں؟ جناب نگرانی (صاحب) نے عربی ادبیات کا فاضل ہونے کی بنا پر فارسی ادب اور اس سے متعلق شعرا و ادبا کے ساتھ بھی پورے پورے تعصب کا مظاہرہ کیا ہے جو اعتدال و توازن سے بہر حال دور ہے۔ غیر منصف مزاج مؤرخین اور مسلک تشدد کے مؤیدین کا پروپیگنڈا ان کے افکار و نظریات پر خاصا غالب ہے۔

شاید اسی غلبہ جوش میں وہ علامہ ابن جوزی کی کتاب ”تلمیس البلیس“ کو اپنے امام ابن القیم الجوزی کے کھاتے میں ڈال گئے ہیں اور اس تو حیدی استغراق میں ہوش کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور انھوں نے رومی، عطار اور جامی علیہم الرحمۃ کے ایمان و ایقان کی جنس کو مصر کے ادیب احمد امین کے ترازو میں رکھ کر تولنے کی غیر منصفانہ جسارت بھی کی ہے۔

حضرت خواجہ فرید الدین عطار، عارف رومی اور علامہ امام عبد الرحمن جامی رحمہم اللہ تعالیٰ کے علمی و عرفانی مقام کو بیان کرنے کا تو وقت نہیں کہ مکتوب، مقالہ نہ بن جائے۔ البتہ اتنا ضرور کہنا ہے کہ سات آٹھ سو سال سے کم از کم عجم کی اسلامی دنیا ان ہی عرفا و صلحا سے توحید سیکھ رہی ہے اور دینی جامعات و مدارس میں اسلامی عقائد و اخلاق کی تعلیم کے لیے ایسے ہی بزرگوں کا کام بطور نصاب پڑھا پڑھایا جا رہا ہے اور پھر ”مثنوی معنوی“ تو معرف الہی کی کان ہے۔ بقول حضرت جامی مثنوی مثنوی مولوی معنوی۔ ہست قرآن در زبان پہلوی لیکن کیا کریں۔

مع ذوق ایں مے نشناسی بخدا تانہ چشتی

حضرات صوفیا کرام خواہ وہ عطار ہوں، سعدی ہوں، حافظ ہوں یا رومی ایک ہی مسلک درد کے گہر ہائے آب دار ہیں۔ لہذا ان کی طرف سے بطور تبرک عارف رومی علیہ الرحمۃ کے ایک شعر پراکتفا کرتا ہوں۔ رومی فرماتے ہیں:

در نہ یا بد حال پختہ گچ خام پس سخن کوتاہ باید والسلام

عارف رومی اور صوفیا کرام سے بغض و عداوت کی تان نگرانی صاحب نے علامہ اقبال پر آن توڑی ہے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے مشہور نعتیہ اشعار کی بابت وضاحت عرض کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ مضمون میں بڑے عظیم ہندو پاک میں اسلام کی آمد کے حوالے سے جو تحقیق انھوں نے پیش فرمائی ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ نعت رنگ: ۲۲، ص ۳۸ پر لکھتے ہیں:

طلوع اسلام کے چار سو سال بعد درہ خیبر سے ملک (ملکی) ہوش گیری اور جنگی صلاحیتوں سے مالا مال ایسے اسلام کے پیامبر آئے جو خود کتاب و سنت سے اچھی طرح واقف نہ تھے اور پھر توحید خالص کا وہ دین رحمت اسلام جو تمام ادیان اور نظم ہائے زندگی پر غالب ہونے کے لیے آیا تھا۔ برصغیر پہنچ کر مشرکانہ عقائد کے انبار میں دب کر رہ گیا اور کوہ فاران سے توحید خالص کا جو صاف و شفاف چشمہ رواں ہوا تھا لنگا اور جمنا کی آمیزش نے اسے گدلا کر دیا۔

افسوس جناب نگرانی نے بت کدہ ہند میں توحید کی شمع جلانے والوں کو ہی ظلمت شرک کے فروغ کا ذریعہ گردانا ہے۔ احسان ناشناسی اور کفرانِ نعمت کی حد ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

من لم يشكر الناس لم يشكر الله.

ترجمہ: جس نے لوگوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر بھی ادا نہ کیا۔

صوفیا اور تصوف سے بغض و تعصب کی پستی نے ڈاکٹر موصوف کو تاریخی حقائق پر نظر ڈالنے سے محروم کر دیا ہے۔ ابھی صرف اسی پراکتفا کرتا ہوں کہ ابوالفضل، فیضی اور ملا مبارک ناگوری جیسے علماء، کس سلسلہ تصوف کے پیروکار تھے۔ جنھوں نے مسلمانان ہند کو ”دین الہی“ کے نام پر دروغ لایا تھا اور حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ جنھوں نے ”ہند میں سرمایہ ملت کی نگہبانی“ کا فریضہ سرانجام دیا تھا، کیا طریقت کے چاروں سلاسل نقش بند، قادر یہ چشتیہ اور سہروردیہ کے امام اور نمائندہ نہیں تھے۔

علامہ اقبال نے صاحب ”کشف المحجوب“ کی شان میں ہی تو کہا تھا:

بند ہای کوہسار آسماں گسخت در زمین ہند ختم سجدہ ریخت

صوفیائے خام اور حلول و اتحاد کے غلط نظریات کا رد تو خود ائمہ تصوف و طریقت نے بطریق احسن فرمایا ہے اور اس پختگی اور کمال گرفت سے فرمایا ہے کہ غیر صوفی اس کا تصور بھی نہیں

کر سکتا ہے۔ لہذا منکرین صوفیا و تصوف اس قسم کی فضول و زحمت نہ ہی فرمایا کریں تو بہتر ہے۔ اس سلسلے میں تصوف کی اُمہاٹ الکتب سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ مزید برآں علامہ ابن تیمیہ کی کتاب ”الفرقان بین اولیاء الرحمن و اولیاء الشیطان“ بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ گزارش اس لیے کی ہے کہ تصوف میں باطل نظریات کی آمیزش کو جانچنے کے لیے بھی اس میں مکمل مہارت کی ضرورت ہے جو کم از کم غیر صوفی کے بس کی بات نہیں ہے۔

صحیح کہتے ہیں: ”جس کا کام اسی کو ساجے“

نظریہ حلول اور وحدت الوجود کے حوالے سے بھی نگرامی صاحب شدید غلط فہمی اور بدگمانی کا شکار ہیں۔ شیخ اکبر امام محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں:

”العبد عبد ان تعرج. والرب رب ان تنزل“

ترجمہ: بندہ کتنا ہی عروج کرے بندہ ہی رہتا ہے۔ اور رب کتنا ہی نزول فرمائے رب ہی رہتا ہے۔

اقبال عظیم مرحوم کے شعر سے اتفاق کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی مرحوم کا شعر نذر کرتا ہوں:

سنو دو ہی لفظوں میں مجھ سے یہ راز شریعت وضو ہے طریقت نماز
مضمون کے آخری حصے میں موصوف نے اپنے مخصوص مسلک کی ترجمانی نہایت کم زور اور غیر مربوط انداز سے کرتے ہوئے رحمت کائنات V کی نورانیت اور علم غیب کی نفی بلا دلیل کرنے کی کوشش کی ہے جس کے لیے اگر وہ قرآن پاک سے ہی رجوع کر لیتے تو کافی تھا۔

سورۃ المائدہ نمبر ۱۵: ”قد جاءکم من اللہ نور... الخ“ [المائدہ: ۱۵]

اور اس کی تفسیر میں صحابہ کرام، تابعین اور مفسرین سلف کی تحقیقات و فرمودات ملاحظہ فرمائیں تو ان شاء اللہ سینہ منور ہو جائے گا۔ احادیث اور کتب سیرت میں بھی اس حوالے سے تشفی بخش مواد موجود ہے۔ اسی طرح علم غیب نبوی کے حوالے سے بھی قرآن و حدیث اور کتب میں وافر مقدار میں آیات و روایات موجود ہیں۔ اللہ کرے کہ صرف نعت گو شعرا پر برسنے والے حضرات ان کے مطالعہ کی بھی زحمت فرمایا کریں۔ معذرت کے ساتھ غالباً نگرامی صاحب بھی اپنے اکثر ہم مسلک حضرات کی طرح شعر فہمی اور ادبی ذوق سے تہی دامن لگتے ہیں۔ خصوصاً اصناف شعری وغیرہ سے انھیں کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے اس لیے بار بار علامہ کے نعتیہ اشعار کو رباعی لکھا ہے۔ علامہ اقبال کے معروف اور ایمان افروز نعتیہ اشعار کو بھی انھوں نے عقیدت و محبت میں غلو ہی

قرار دیا ہے۔ اشعار دیکھیے:

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآن وہی فرقاں، وہی یسین وہی طہ

نگرامی صاحب لکھتے ہیں: اس (رباعی) کا تیسرا مصرع محل نظر ہے۔ جس میں رحمت عالم V کو وہی اوّل وہی آخر کہا گیا ہے۔ جب کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اولیت و آخریت کی نسبت اپنی ذات والا صفات کی طرف کی ہے۔ آیت شریفہ ہے:

هو الاول والاخر والظاهر والباطن وهو بكل شئ علیم۔ [۳: ۵۷]

یہ تو تھی مخر مضمون کی قرآن فہمی۔ اب آئیے ذرا اُمت کے مستند ائمہ تفسیر و حدیث سے رجوع کرتے ہیں کہ انھوں نے اس آیت قرآنی کو کیسے سمجھا ہے۔

محقق علی الاطلاق حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ اپنی مشہور کتاب ”مدارج النبوت“ کے ابتدائیہ میں رقم طراز ہیں:

هو الاول والاخر والظاهر والباطن، وهو بكل شئ علیم۔

یہ کلام معجز نظام حمد و ثنائے الہی جل شانہ پر بھی مشتمل ہے کہ اس نے قرآن پاک میں اپنی کبریائی کا خطبہ انھی کلمات کو بنایا ہے اور اسی طرح رسالت پناہ V کی نعت و صفات پر بھی مشتمل ہے کہ ذات سبحانہ و تعالیٰ نے انھیں انھی اسماء سے موصوف فرمایا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ قرآن و حدیث میں ایسے ہیں کہ جن سے اس نے اپنے حبیب V کو موسوم فرمایا ہے اور ان کے جمال و کمال کو بیان کرنے کے لیے ان کا زیور و پیرا بہن بنایا ہے۔

اگرچہ آپ اللہ تبارک و تعالیٰ کے تمام اسماء و صفات کا مظہر و عکس ہیں اس کے باوجود خصوصی طور پر آپ بعض اسماء سے موسوم اور موصوف ہیں۔ مثلاً نور، حق، علیم، حکیم، مومن، مہمّن، ہادی، رؤف، رحیم وغیرہ اور ایسے ہی یہ چار اسماء اوّل، آخر، ظاہر، باطن بھی اسی قبیل سے ہیں۔ محدث کبیر نے ان چاروں اسماء کی مدلل شرح بھی احادیث کی روشنی میں بکمال اختصار لکھی ہے۔

فرماتے ہیں:

اول، اس لیے کہ آپ اپنی اصل میں اول ہیں کہ ارشادِ گرامی ہے:
اول ما خلق اللہ نوری۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا فرمایا۔
اسی طرح نبوت میں بھی اول ہیں کہ فرمان ہے:

كنت نبياً وان ادم لمنجدل في طينه اور وعدہ الست بر بكم
کے وقت بھی سب سے پہلے جواب دینے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والوں میں بھی
اول ہیں کہ فرمان ہے:

وبذلک امرت وانا اول المؤمنین۔ [۶: ۱۶۳]
مجھے یہی حکم ہے اور میں پہلا مومن ہوں۔

اور سب سے پہلے آپ ہی کے لیے زمین شق ہوگی اور سب سے پہلے آپ ہی کو سجدہ کی اجازت
ہوگی اور شفاعت کا دروازہ بھی اول اول آپ ہی کے لیے کھلے گا اور جنت میں بھی داخل ہونے
والوں میں آپ اول ہوں گے اور اسی سبقت اور اولیت کے باوجود آخر ہیں۔ بعثت و رسالت کے
معاملہ میں ارشاد ہے ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔ [۳۳: ۴۰] اور ان کی کتاب آخری
کتاب اور دین، دین آخر ہے۔ جیسا کہ فرمایا: نحن الاخرون السابقون۔ اور درحقیقت بعثت
میں یہی خاتمیت و آخریت، فضیلت کے لحاظ سے اولیت و سابقیت کا باعث بھی ہے کہ آپ جمع
کتب و مذاہب کے ناسخ اور ماحی بن کر سب پر غالب و حاوی ہو گئے۔

الظاهر الباطن: ظاہر اس معنی میں کہ آپ کے انوار تمام کائنات کو محیط اور تمام جہاں
کو روشن فرمانے والے ہیں اور کوئی ظہور ان کی طرح اور کوئی بھی نور ان کے نور کی مانند نہیں ہے اور
باطن بایں معنی کہ ان کے اسرار یوں مخفی ہیں کہ کوئی بھی ان کی حقیقت تک رسائی نہیں پاسکا اور
قریب و بعید والا ہر شخص ان کے جمال و کمال کے نظارے سے حیران اور عاجز ہے۔
شیخ تحقیق نے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ”وہو بکل شئی علیم“ کا بھی مصداق
گردانا ہے۔ لکھتے ہیں:

آپ اللہ تعالیٰ کے جملہ شیونات ذاتیہ، احکام صفات باری تعالیٰ اور
افعال و آثار کے اسما سے پورے طور پر واقف اور ان کے ظاہری و باطنی

اور اول و آخر کا علمی احاطہ فرمانے والے ہیں اور یوں آپ فوق کل ذی علم
علیم کا مصداق ہیں۔ (مدارج النبوت (فارسی)، مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر
پاکستان، مدارج: ج ۱، ص ۱)

اس ایمان افروز خطبہ کے بعد اگرچہ مزید کچھ نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن تبرکاً
امام قسطلانی کی ”مواہب الدنیہ“ اور امام جلال الدین سیوطی علیہما الرحمة کی ”الریاض اللایقہ“ سے
اسماء نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تحت کچھ تشریحات بھی ملاحظہ فرمائیے:

امام قسطلانی علیہ الرحمة نے ”المواہب اللدنیہ“ (۳۶۵/۱) میں حدیث نقل کی ہے:

کافی القرآن سبعة اسماء، محمد، واحمد، یسین، و طه
والمزمل والمدثر، وعبد اللہ۔

قاضی عیاض مالکی علیہ الرحمة فرماتے ہیں:

قد خصه اللہ تعالیٰ بأن سماء من أسمائه الحسنی من ثلاثین اسماً۔
اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے تقریباً تیس اسماء سے موسوم فرما کر خصوصیت عطا
فرمائی ہے۔ (ایضاً)

ابن دحیہ کلبی فرماتے ہیں۔ اگر جملہ کتب سابقہ اور قرآن و حدیث میں تلاش کیا جائے
تو یہ تعداد تین سوتک پہنچتی ہے۔ (ص ۳۶۶ ایضاً)

امام قسطلانی علیہ الرحمة اسماء النبی ۷ کی فہرست نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الاول، اول شافع، اول المسلمین، اول المؤمنین، اول من
تشق عنه الارض الباطن۔ (ص ۳۶۶ ایضاً)

الظاهر (ص ۳۶۷) النور (ص ۳۶۶ ایضاً)

یہی امام قسطلانی علیہ الرحمة الزبانی المذاہب (ص ۳۷۶) میں ان چاروں اسماء کو یک
جا نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الاول: آپ اول اس لیے ہیں کہ آپ کی تخلیق انبیاء میں سب سے پہلے ہوئی جب کہ
حدیث گزری ہے۔ ایسے ہی آپ ابتداء میں اول ہیں اور واپسی میں بھی اول ہیں۔ آپ ہی نے
سب سے پہلے ”الست بر بکم“ کے جواب میں ”بلی“ کہا تھا۔

فهو أوّل في ذلك كله على الإطلاق۔

اور آخر: ایسے کہ بعثت میں آخر الانبیاء ہیں۔

الظاهر: فهو الظاهر في وجوه الظهور كلها۔

آپ ظہور کی ہر جہت سے ظاہر و غالب ہیں۔

الباطن: آپ وحی الہی سے جملہ امور خفی و باطنی پر مطلع ہیں۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ایمان افروز اشعار اسی کمال و خصوصیت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

و ضم الاله اسم النبي الى اسمه اذا قال في الخمس المؤذن أشهد

وشق له من اسمه ليحمله فذو العرش محمود وهذا محمد

اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کے اسم پاک کو اپنے نام کے ساتھ ضم کر دیا

ہے جب کہ مؤذن پانچ وقت اذان میں، اشہد ان محمد رسول

اللہ کہتا ہے اور اس نے ان کے نام کو اپنے نام سے اس لیے نکالا ہے

تاکہ ان کا مرتبہ بلند ہو پس عرش والا (رب) محمود ہے اور یہ محمد ہیں۔

(۳۷۱: ایضاً)

امام شمس الدین سخاوی، ابن دجیہ کلبی، قاضی عیاض مالکی، امام سیوطی اور امام بیہقی علیہ الرحمۃ نے بھی ان اسماء و صفات نبوی کو نقل کرتے ہوئے تقریباً یہی مضامین مع اضافہ جات دہرائے ہیں جن کا اعادہ باعث طوالت ہوگا۔ اگرچہ دل چاہتا ہے کہ یہ حدیث محبت دراز تر ہوتی جائے لیکن والد گرامی کا سانحہ ارتحال اور اس کے بعد پیش آنے والے صدمہ و اندوہ نے بے بس کر دیا ہے۔

قاضی عیاض مالکی علیہ الرحمۃ نے اسمائے صفات نبوی کی تشریح کرتے ہوئے اسما و صفات باری تعالیٰ کی یکتائی اور بے مثلیت کو کمال ایمان واضح فرما دیا ہے کہ یہ اشتراک محض اسما کا ہے اور یہی اشتراک لفظی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان و عظمت پر دلالت کرتا ہے ورنہ وہ ذات پاک وراء الوریٰ ہے اور پس کمثلہ شئی، اس کی شان میں وارد ہے۔ مزید تفصیل کے لیے کتاب الشفاء کی طرف رجوع فرمائیں۔

حدیث ”لولاک“ اور ”من رانی“ کے حوالے سے ایک مضمون بھی ارسال خدمت

ہے۔ اردو نعتیہ شاعری میں موضوع روایات کے حوالے سے گزشتہ مصروفیات ہی کے تسلسل میں یہ ایک اور کاوش ہے شاید اہل علم کے التفات کا باعث بن سکے۔ (شہزاد مجددی، ص ۵۵۱)

غالب کی مثنوی ’ابر گہر بار‘ کا منظوم ترجمہ:

سلیم شہزاد صاحب کی بات نکلی ہے تو یہ بھی عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ غالب کی مثنوی کا نام ہم تو ہمیشہ ’ابر گہر بار‘ پڑھتے اور سنتے آئے ہیں، ’ابر گہر بار‘ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں نے ترجمے کو اصل اشعار سے ملا کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ انھوں نے ترجمے کے لیے اشعار کہیں کہیں سے نکال لیے ہیں لیکن وضاحت نہیں کی۔ مثلاً ’ابر گہر بار‘ کا پہلا شعر حسب ذیل ہے۔

سپاسے کز و نامہ نامی شود سخن در گذارش گرامی شود

اور سلیم صاحب کے یہاں پہلا شعر حسب ذیل ہے۔

وہ حمد و ثنا آبروئے بیاں وہ حمد و ثنا عیش نطق و زباں

میرا خیال ہے سلیم شہزاد صاحب نے منتخب اشعار کا ذرا آزاد ترجمہ فرمایا ہے۔ اچھا تھا

کہ وہ، یا آپ نشان دہی کر دیتے کہ کن اشعار کو معرض ترجمہ میں لایا گیا ہے۔

(شمس الرحمن فاروقی، ۷ فروری ۲۰۱۹ء، غیر مطبوعہ)

مجھے اس کتاب میں غالب کی فارسی مثنوی ”ابر گہر بار“ کا منظوم ترجمہ دیکھ کر زیادہ خوشی ہوئی۔ غالب نے ”ابر گہر بار“ کے علاوہ بھی فارسی میں نعتیہ کلام تخلیق کیا ہے۔ ایک نعت کا آغاز یوں ہوتا ہے:

بعد حمد ایزد و نعت رسول می نگارم عکس چند از اصول

جلوہ اوّل کہ حق بر خویش کرد مشعل نور محمد پیش کرد

مُحد عیاں زان نور در بزم ظہور ہر چہ پنہاں بود از نزدیک و دور
ایک اور نعت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بنام ایزد اے کلک قدسی صریر بہر جنبش از غیب نیرد پذیر

محمد کز آئینہ روے دوست جز نیش ندانست دانا کہ اوست

مثنوی ”ابر گہر بار“ ہر لحاظ سے بہت اہم اور اپنے اسلوب میں بے مثال ہے۔ اس کے نثری ترجمے ہوئے ہیں لیکن سلیم شہزاد کا منظوم ترجمہ بہت رواں اور شستہ ہے۔ ترجمے کی بحر بھی وہی ہے جو غالب کی فارسی نعت کی ہے۔ غالب کی فارسی اور قدرت کلام کو ذہن میں رکھیے تو اردو یا کسی اور زبان میں اس کا منظوم ترجمہ ایک کارِ محال معلوم ہوتا ہے۔ ”مہر نیمروز“ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

ع اے ہمہ وبے ہمہ و باہمہ

اب اس بلیغ مصرعے کا اردو میں کیا ترجمہ ہو سکتا ہے بجز اس کے کہ یہی مصرع اردو ترجمے میں دہرا دیا جائے۔ سلیم شہزاد کے ترجمے کو میں ترجمے کے بہ جائے ترجمانی کہوں گا۔ انھوں نے لفظی ترجمے کے بجائے خیال کو اہمیت دی ہے۔ مثلاً یہ شعر:

سپاسے کہ شوریدگان الست دہندش بباغِ قلم دل زدست
کا اردو ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

جسے سن کے شوریدگان الست ”بکی ربتا“ میں ہوئے جذب و مست
بعض ترجمے لفظی بھی ہیں اور بے ساختہ بھی۔ مثلاً: ”ز دل جستہ و بادل آویختہ“۔ کا ترجمہ:
وہ حمد و ثنا موج جس کی اٹھے اگر دل سے تو راہ دل میں کرے
اس ترجمے یا ترجمانی کی داد نہ دینا نا انصافی کے مترادف ہے۔

سلیم شہزاد کی قدرتِ سخن، فارسی اور اردو پر ان کی دست رس لائق ستائش ہے۔ فارسی سے عبرت انگیز دوری کے اس دور میں سلیم شہزاد جیسے اسکا لر خال خال نظر آتے ہیں۔ اگر وہ غالب کے فارسی کلام کے منتخبات کا اردو میں مزید ترجمے کریں تو غالب شناسی کا دائرہ عام قارئین تک بھی وسیع ہو سکتا ہے جو ایک بڑی علمی خدمت ہوگی۔ نبی کریمؐ کی ذاتِ مبارکہ چودہ سو سال سے زیادہ (اب ۱۴۴۰ ہجری ہے) تمام دنیا میں توجہ کا مرکز رہی ہے۔ ان کی مخالفت سے زیادہ حضورؐ کی مدح و ثنا اور رسالت شناسی پر مختلف گوشوں سے تحقیقی کام ہوا اور ہو رہا ہے۔

آپ کی دل چسپی کے لیے ایک حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ بی وی رمن (B. V. Raman) نامی اسکا لر نے جو علم نجوم کے ماہر ہیں، سائنسی بنیادوں پر اکابرِ عالم کے زائچے تیار کیے ہیں۔ انھی میں ایک رسالت مآبؐ کا زائچہ بھی ہے۔ رمن صاحب نے حضورِ اکرمؐ کی تاریخ ولادت اور وقت کا یہ تعین کیا ہے: ۲۰ اپریل ۵۷۱ عیسوی، صبح ایک بج کر دس منٹ۔

پروفیسر رمن کے مطالعے کا خلاصہ یہ ہے کہ ”دنیا کی مذہبی تاریخ میں محمدؐ یقیناً ایک

غیر معمولی شخصیت ہیں۔ وہ ایک پیغمبر، فلسفی اور ماہرِ سیاسیات تھے۔ یہ اس لحاظ سے غیر معمولی زائچہ ہے کہ نویں برج میں سیارہ مشتری، تیسرے برج میں آفتاب اور عطارد ہیں اور ہر ایک کا اثر بہت گہرا ہے۔ اُن کے زائچے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک بے حد منفرد شخصیت تھے۔“

بہر حال یہ بھی ایک علم ہے۔ اور اس کے ذریعے حضورِ اکرمؐ کے فضائل تک رسائی کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے اسے کسی پیش گوئی، علم غیب یا تقدیر پرستی سے ہٹ کر دیکھنا چاہیے۔ (سحر انصاری، ص ۲۸/۵۶۹-۵۶۷)

غالب کی مثنوی ”ابر گہر بار“ اور یحییٰ نشیط کی تنقید:

سید یحییٰ نشیط صاحب نے غالب کی مثنوی ”ابر گہر بار“ کے ایک حصے ”بیان معراج“ میں بڑی محنت کی ہے لیکن ان کی نگارش لائق ستائش نہیں ہے بلکہ قابلِ گرفت ہے کیوں کہ یہ قرآن و حدیث سے متصادم ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امّ ہانیؓ کے یہاں استراحت فرما رہے تھے کہ حضرت جبریلؑ تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں سے حرم شریف لائے جہاں آپ گاسینہ مبارک چاک کیا اور سنہری طشت میں آب زم زم سے دھویا، پھر وہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم براق پر سوار ہو کر جبریلؑ کیساتھ بیت المقدس پہنچے جہاں انبیاء کی امامت فرمائی اور پھر وہاں سے عالم بالا کا سفر شروع ہوا۔

غالب نے اپنی مثنوی میں قمر کو فلکِ اول، عطارد کو دوم، زہرہ کو سوم، شمس کو چہارم، مریخ کو پنجم، مشتری کو ششم اور زحل کو ہفتم فلک بتایا ہے جبکہ یہ علم نجوم کی اصطلاحیں ہیں۔

نشیط صاحب نے ”فلک اور سما“ کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ فلک قرآن کے مطابق وہ اجرامِ فلکی ہیں جو متحرک ہیں جنہیں سائنسی و جغرافیائی اصطلاح میں ”ستارہ“ کہتے ہیں اور علم نجوم کی اصطلاح میں یہ ”ستارہ“ کہلاتے ہیں۔ (ستارہ شناس اور ستارہ شناسی کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے) (۳۹۹/۲۷) اور یہ ہمارے نظامِ شمسی کا حصہ ہیں ایسے کئی نظامِ شمسی خلا میں موجود ہیں ان کے علاوہ غیر متحرک روشن اجرام (ستارے) آسمانوں کی زینت ہیں (جو شیطانوں کو مارے جاتے ہیں) یہ تمام کے تمام ”تحت السماء“ یعنی حقیقی آسمانوں سے نیچے ہیں جو لوگ ”فلک“ کو ”سما“ جانتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

نسیط صاحب نے غالب کے بیان کی وضاحت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر تمام افلاک (قمر، شمس وغیرہ) پر پھیل گئی تھی اور ہر فلک پر آپ کا شاندار استقبال ہوا، سب مفروضات ہیں اگر ایسا ہی ہوتا تو پہلے آسمان کا دربان جبرئیلؑ کی دستک پر یہ نہ پوچھتا کہ کون؟ اور جواب ”جبرئیل“ ملنے پر یہ بھی نہ پوچھتا کہ ”تمہارے ساتھ کون ہے؟“ کیا انہیں طلب کیا گیا ہے؟؟ (ہر آسمان پر یہی صورت حال پیش آئی) اس سوال و جواب سے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ سبع سماوات کے دربانوں کو بھی آپؐ کی آمد کی اطلاع نہیں تھی ورنہ وہ بھی افلاک کے دروازوں پر پھولوں کی مالائیں لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے استقبال کے لیے کھڑے ہوتے!!

اسی طرح وہ تمام روایات بھی ضعیف ہیں کہ حواریں شاندار میک اپ اور گٹ اپ میں آپؐ کی آمد کی منتظر تھیں۔ جنت کو بقیعہ نور بنا دیا گیا تھا اور ان کے خوبصورت لبوں پر طربہ نعمات بھی رہے تھے۔ واقعہ معراج تو اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔ آپؐ کی روایت اور واپسی کا وقفہ ایسا ہے کہ عقل انسانی باور نہیں کر سکتی یعنی حضرت ام ہانیؓ کے دروازے کی کنڈی کی حرکت بند نہ ہوئی تھی کہ آپؐ صیر افلاک اور بارگاہ الہی میں حاضری دے کر واپس بھی لوٹ آئے۔

قرآن وحدیث میں سبع سماوات کا ذکر ہے اور ہر آسمان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء سے ملاقاتیں کیں ان کے نام بھی افلاک کی ترتیب کے ساتھ درج حدیث ہیں جبکہ غالب کی مثنوی میں اس سفر کی روداد بے ترتیب ہو گئی ہے جس کا اظہار خود نسیط صاحب نے بھی کیا ہے۔

نسیط صاحب نے غالب کو ماہر علم نجوم کی حیثیت سے پیش کیا ہے جبکہ غالب نے اپنی مثنوی میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس زمانے میں عام سی باتیں تھیں۔ دہلی میں اس علم کے ماہرین اور کتابیں موجود تھیں اور آج بھی عملیات کی کتابوں میں ستاروں، بروج انکے اثرات اور اس قسم کی تمام باتیں تفصیل سے موجود ہیں۔ (نقش سلیمانی اور شمع شبستان رضا ملاحظہ ہوں) نجوم کی اصطلاحات سے واقفیت اور اسکے اسرار و رموز کا علم دو علاحدہ چیزیں ہیں اس کی واضح مثال غالب اور مومن ہیں، مومن کا شمار ان کے عہد کے نابغہ روزگار ستارہ شناسوں میں ہوتا تھا جبکہ غالب کے ستارہ شناس ہونے کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ میر حسن کی مثنوی ”سحر البیان“ میں بھی علم نجوم کی بہت ساری اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں جبکہ میر حسن ستارہ شناس یا نجومی نہیں تھے۔ غالب کی معلومات اس علم سے متعلق سرسری سی تھیں اس میں انہوں نے مرتج کو سب سے زیادہ روشن سیارہ

کہا ہے جبکہ سائنس اور نجوم دونوں کے مطابق ”مشتري“ سب سے زیادہ روشن ہے۔ غالب کے بیانات کی تصدیق کے لیے نسیط صاحب نے اقبال کے جاوید نامہ کو پیش کیا ہے اور انہوں نے بڑی غلطی کی ہے۔ اقبال نے جاوید نامہ میں چاند پر (فلک قمر) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ”جہاں دوست“ یعنی شکر اور گوتم سے ملاقات اور امرپالی کا ذکر کیا ہے۔ کیا یحییٰ نسیط صاحب بتا سکتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں ان کے متذکرہ ”جہاں دوست“ شکر اور گوتم و امرپالی کا کہیں ذکر آیا ہے؟ اور کیا اقبال، شکر بھگوان، گوتم، امرپالی، بھگوان نٹ راج کے وجود کے قائل تھے؟! جبکہ اسلامی عقیدے میں ان کی کہیں بھی گنجائش نہیں ہے۔

نسیط صاحب کے مضمون میں بہت سارے جھول ہیں، بہتر ہوتا کہ وہ اپنے مضمون میں مذہبی روایات اور مفروضات کے ذکر کی بجائے صرف مثنوی کی ادبی حیثیت اور شاعرانہ اظہار کے عمدہ نمونے کے طور پر پیش کرتے تو بہتر ہوتا کیوں کہ غالب نے شعری تقاضوں کے مد نظر احادیث اور علم نجوم دونوں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۰۱/۲-۵۹۹)

غالب کی مثنوی ’بیان معراج‘: اعتراضات اور ان کے جوابات:

نعت رنگ کے شاروں میں ’نعت ناموں‘ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے قلم کاروں کو کافی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ حالیہ شمارے میں اشفاق انجم صاحب نے میرے مضمون ”غالب کی مثنوی بیان معراج کا تنقیدی مطالعہ“ پر گرفت کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۱) ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ ”یہ قرآن وحدیث سے متصادم ہے“

(نعت رنگ شمارہ ۲۷ ص ۴۹۹)

غالب کی یہ مثنوی شب معراج کی تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ اردو میں کسی رات کی تعریف میں مجھے اس سے عمدہ کوئی نظم نہیں ملی۔ غالب نے معراج کے واقعے کی ابتداء جبرئیلؑ کی آمد سے کی ہے۔ یہاں غالب نے مقام کی نشاندہی نہیں کی۔ البتہ راج قول یہ ہے کہ آپؐ ص حطیم میں لیٹے ہوئے تھے کہ فرشتے (حضرت جبرئیلؑ) نے نوید سنائی۔ ام ہانیؓ کے مکان میں استراحت فرمانے کی روایت کو محدثین کمزور سمجھتے ہیں۔ یہاں اس کی بحث کی چنداں ضرورت نہیں۔ فرشتہ آپؐ ص سے کہتا ہے

خداوند گیتی خریدار تست شبست ایں ولے روز بازار تست

یعنی مالک زمین و آسمان آپ کا طلب گار ہے۔ کہنے کو یہ رات کا وقت ہے لیکن آپ کے لیے یہی روز بازار ہے۔

ترا خوانگار ست یزدان پاک ہر آئینہ از لن ترانی چہ باک
یعنی خداوند عالم خود آپ V سے ملاقات چاہتا ہے تو اب لن ترانی کا کوئی اندیشہ نہیں۔

بیا رائے شمشاد بے سایہ را بہ پیائے اورنگ نہ پایہ را
یعنی اپنے شمشاد جیسے سیدھے قد سے جس کا سایہ نہیں پڑتا، اٹھیے اور نو درجے کے تخت یعنی آسمان کو
طے کر ڈالئے۔ اس کے بعد آپ کو سواری کے لیے ایک گھوڑا پیش کیا گیا۔ اس نے آپ V کو
بیت المقدس کی سیر کرائی اور پھر آپ V آسمانوں کی جانب روانہ ہوئے۔ پہلے آسمان پر (جس
کو نجوم میں فلک قمر کہا جاتا ہے) آپ کی سواری پہنچنے کی روداد میں غالب نے علم نجوم کا سہارا لیا
ہے اور آگے اس علوی سفر کی تمام روداد کو اسی علم کی روشنی میں بیان کرنے کی سعی فرمائی ہے
۔ پروفیسر اشفاق انجم غالب کے اس شعری پیرائے کو قرآن و حدیث سے متصادم سمجھتے ہیں، جبکہ
ہماری نعتیہ شاعری میں نجوم سے ناواقف شعراء بھی کہیں نہ کہیں اس کا استعمال کرتے آئے ہیں۔
خود اشفاق انجم کے یہاں اس کی مثالیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

چوم کے جس کے روشن تلوے چمکا چاند خود وہ کیسا ہوگا خدایا گیسوؤں والا
سورج جس کی پیشانی کا ہلکا پرتو کون و مکاں کے نور کا ہالا گیسوؤں والا
شاید ٹپک گئی تھی پسینے کی کوئی بوند
اسرئی کی شب تجلی ہوئی ماہتاب میں
سفر ہوا کو اسپ کیا، کہکشاں کو جادہ کیا

وہ شب اسرئی سفر کی داستان مل گئے جیسے مکان و لا مکان
نور میں ڈوبے ہوئے تھے سب جہاں رف رف و قصویٰ نشیں تم پر سلام
کہکشاں کا ہر ستارہ نقش پا چاند تلوے چوم کر روشن ہوا
راستے سے آسمان بھی ہٹ گیا راہی عرش بریں تم پر سلام
زیر پا ہے فلک بمحو حیرت ملک نقش پا کی چمک قاب قوسین تک
ماورائے مگن، تم پہ لاکھوں سلام

کیا مندرجہ بالا اشعار کے واقعات قرآن و احادیث سے ثابت ہیں یا صرف ایک

وجدانی کیفیت اور غلوئے عقیدت کے بہاؤ میں لکھے گئے ہیں؟؟ حضور V سے رکھی جانے والی
محبت کا تقاضا ہی ایسے اشعار قلم برداشتہ صفحہ قرطاس پر اتار دیتا ہے۔ ان پر نہ علماء کرام گرفت
کرتے ہیں نہ صوفیاء کرام، بلکہ پیر و مرشد تو دعائیں دیتے ہیں اور خود شاعر ایسے اشعار کو روحانی
فیوض کا ثمرہ گردانتا ہے۔ ایک میلادینہ نعت میں اشفاق انجم نے یہ اشعار قلم بند کیے ہیں:

”حضور“ تشریف لا رہے ہیں، ”صدافرشتوں کی آرہی ہے
فلک ستارے چھڑک رہا ہے، زمین کلیاں بچھا رہی ہے
فرشتے مکہ پہنچ رہے ہیں، ہے غرق انوار کعبۃ اللہ
سواری نبیوں کی وقفے وقفے سے آسمانوں سے آرہی ہے

(اشفاق انجم: ”صلو علیہ وآلہ“ ص ۹۳-۹۲)

یہ نہ تو قرآن و احادیث سے لگا کھاتے ہیں نہ اس واقعے کے تاریخی پہلو سے ان کا
واسطہ، بلکہ شاعر کی عقیدت تو ان ساروں کو جھٹلا رہی ہے۔ پھر بھی یہ اشعار فیوض و برکات کا ثمرہ
سمجھے گئے ہیں۔ ان شواہد سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اگر نعتیہ شاعری کو بالقصد قرآن و
احادیث کی میزان پر پرکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا شاید نوذنی صد سرمایہ دریا برد کرنا پڑے گا
اور تقدیری شاعری کی بربادی کا یہ بڑا سانحہ قرار پائے گا، نیز ہمیں اپنے کلاسیکی ادب سے بھی ہاتھ
دھونا پڑے گا۔ اشفاق انجم کے درج بالا اشعار میں شاعر کی عقیدت کا دھارا اتنا تیز ہے کہ معراج کا
ذکر آتے ہی سیارات و نجوم اور خلاء و سماء کے مضامین نعت کے اشعار سے جڑ جاتے ہیں۔ اس میں
شاعر کی فکر کو دخلِ نفن کا کمال، بس خیالات کی آمد کا سلسلہ ہے جو تھمنے کا نام نہیں لیتا اور اسی جذب
و کیف اور سرشاری و سرمستی میں وہ ”خلاء میں بھی پایادہ سفر کرنے لگتا ہے اور“ آیہ قوسین کے
حوالے سے آسمان کو اپنا مکان لکھنے کا دعویٰ کرتا ہے:

نبی کے عشق میں کچھ ایسا جذب طاری تھا
سفرِ خلاء کا بھی انجم نے پا پیادہ کیا
الہی، آیہ ”قوسین“ کے حوالے سے
میں آسمان کو اپنا مکان لکھتا ہوں

(صلو علیہ وآلہ، ص مختلف)

اس لیے شاعری چاہے وہ تقدیری ہی کیوں نہ ہو، جب تک وہ قرآن و احادیث کی تعلیمات اور

امور شرعیہ سے متصادم نہیں ہوتی، اسے کم سے کم اباحت کے دائرے میں جگہ دی جانی چاہیے۔
(۲) اشفاق انجم کا دوسرا اعتراض یہ کہ میں (مضمون نگار) نے ”فلک اور سما“ کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

”فلک قرآن کے مطابق وہ اجرام فلکی ہیں جو متحرک ہیں جنہیں سائنسی و جغرافیائی اصطلاح میں ”سیارہ“ کہتے ہیں اور علم نجوم کیا اصطلاح میں یہ ستارہ کہلاتے ہیں (ستارہ شناس اور ستارہ شناسی کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے) اور یہ ہمارے نظام شمسی کا حصہ ہیں۔ ایسے کئی نظام شمسی خلا میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ غیر متحرک روشن اجرام (ستارے) آسمانوں کی زینت ہیں (جو شیطانوں کو مارے جاتے ہیں) یہ تمام کے تمام ”تحت السما“ یعنی حقیقی آسمانوں سے نیچے ہیں۔ جو لوگ ”فلک“ کو ”سما“ جانتے ہیں وہ غلطی پر ہیں“ (نعت رنگ شمس ص ۲۷-۵۰۰-۵۹۹)

پروفیسر صاحب کے اس فاضلانہ تبصرے کو پڑھنے کے بعد میں نے قرآن سے رجوع کیا تو پتہ چلا کہ وہاں لفظ ”فلک“ کا استعمال دو جگہ ہوا ہے۔ دونوں جگہ یہ لفظ ”آسمان“ یا ”گھیرے“ دائرے کے معنی میں مستعمل ہے۔ پارہ نمبر ۱۷ سورہ انبیاء کی آیت نمبر ۲۳: وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔ تفسیر موضح القرآن میں اس آیت کے معنی ہیں، ”اور وہ ہے خدا تعالیٰ جس نے اپنے کمال سے پیدا کیا رات کو اندھیری جو آرام کریں اور سوویں اور پیدا کیا دن کو روشن تو اس میں تلاش کسب کی کر کے روزی پیدا کریں اور پیدا کیا اپنی قدرت سے سورج اور چاند کو اور یہ سب آسمان میں پھرتے ہیں“۔ گویا فلک کے معنی یہاں آسمان کے ہیں۔ اشرف علی تھانویؒ نے اس آیت میں لفظ ”فلک“ کے معنی ”دائرہ“ بتائے ہیں، جس سے غالباً جغرافیائی اصطلاح ”مدار“ مراد ہے۔ اس کے علاوہ سورہ یس کی آیت نمبر ۴۰ میں بھی لفظ فلک کا استعمال ہوا ہے، ”وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ“، یعنی ”اور دونوں ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔“ یہاں بھی فلک کے معنی دائرہ یا آسمان ہی ہے۔ ان دونوں آیتوں کے علاوہ لفظ فلک کا استعمال قرآن حکیم میں اور کہیں نہیں ہوا۔ اور نہ ہی اس لفظ کا اطلاق ”اجرام، سیارے یا ستارے کے معنی پر ہوا ہے۔ شاید اشفاق انجم کو یہاں معنی کی تفہیم میں تسامح ہوا ہے۔

قرآن حکیم میں دوسرے ایک لفظ ”سما“ کا استعمال بھی ہوا ہے اور اس کے معنی مترجمین قرآن نے آسمان یعنی فلک ہی کے لیے ہیں۔ مثلاً ”السموات والارض“ سے مراد آسمان وزمین ہے۔ السموات، السما کی جمع کا صیغہ ہے۔ قرآن میں یہ ترکیب جتنی بھی جگہ استعمال ہوئی ہے اس

کے معنی ”زمین و آسمان ہی کے لیے گئے ہیں۔ پھر کس صورت میں کہا جاسکتا ہے کہ ”جو فلک کو سما کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ قرآن میں انجم، کواکب، شہاب وغیرہ کا ذکر ستارے اور سیاروں کے لیے ہوا ہے، اس پر متضاد یہ کہ ”شہاب“ ٹوٹے ہوئے تارے ہی کے لیے استعمال ہوا ہے ان دلائل کی روشنی میں اشفاق انجم کی جرح کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔

(۳) اشفاق انجم کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ جنت کو سبانا، حوروں کا سنورنا جتنا، تمام مفروضات ہیں۔ تو ان سے عرض ہے کہ جنت کو سبانا اور حوروں کے سنورنے کی کئی احادیث آپ بہ آسانی تلاش کر سکتے ہیں۔ پھر آپ نے خود مذکورہ بالا اشعار میں فرشتوں کے استقبال رسولؐ کے لیے آسمانوں سے مکہ میں وارد ہونے اور ”تشریف لا رہے ہیں“ کی صدا لگانے کا اعتراف کیا ہے۔ غالب نے اگر ایسا بلکہ آپ کے ڈھنگ سے کئی درجہ بہتر انداز میں کہا ہے تو اس پر گرفت کیا معنی؟؟

(۴) اشفاق انجم نے ”واقعہ معراج کو اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم الشان معجزہ“ کہا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کا معجزہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان قدرت کہنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ معجزے کی نسبت پیغمبر اور نبی سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔

(۵) اشفاق انجم کا پانچواں اعتراض یہ ہے کہ میں (مضمون نگار) نے ”غالب کو ماہر نجوم کی حیثیت سے پیش کیا ہے جبکہ غالب نے اپنی مثنوی میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس زمانے میں عام سی باتیں تھیں۔۔۔ نجوم کی اصطلاحات سے واقفیت اور اس کے اسرار و رموز کا علم دو علاحدہ چیزیں ہیں، اس کی واضح مثال غالب اور مومن ہیں۔ مومن کا شمار ان کے عہد کے نابغہ روزگار ستارہ شناسوں میں ہوتا تھا جبکہ غالب کے ستارہ شناس ہونے کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔“ (نعت رنگ شمارہ ۲۷ ص ۵۰۰)

مولانا محمد حسین آزاد کی ”آب حیات“ میں مومن کی نجوم شناسی کے دو تین قصے درج ہیں ان کے کلیات میں علم نجوم پر سطحی انداز کے چند اشعار ملتے ہیں جن میں ان کا ایک مشہور شعر بھی ہے۔ اس میں نجوم کے ساتھ فن موسیقی کے نکات پیش کئے گئے ہیں۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیکھ شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
ان اشعار کے علاوہ مومن کے علم نجوم پر دست رس کا کوئی تحریری ثبوت (ان کا اپنا تحریر کردہ) نہیں ملتا جبکہ غالب کی مثنوی ”بیان معراج“ میں علم نجوم اور اس کی اصطلاحات کا ایک دریا

ہے کہ بہت چلا آتا ہے۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے مضمون میں مومن اور غالب کا موازنہ مقصود بھی نہیں ہے۔ ہمیں اس بات سے بھی کوئی سروکار نہیں کہ غالب علم نجوم میں مومن سے زیادہ قابل تھے یا ان کا علم مومن کے مقابلے میں کمتر تھا۔ ہوسکتا ہے کہ علم نجوم میں غالب کی معلومات سرسری رہی ہوں گی لیکن انھوں نے اس مثنوی میں جن نجومی نکات کو بیان کیا ہے اس سے ان کے متعلقہ علم کی گہرائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اشفاق صاحب کا یہ بھی اعتراض ہے کہ غالب نے اپنی مثنوی میں ’مرخ‘ کو زیادہ روشن سیارہ کہا ہے۔ تو عرض ہے کہ مثنوی کے سیاق کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی اصل حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے۔ مضمون میں ان ساری باتوں کی وضاحت کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔

(۶) اشفاق انجم نے اپنے چھٹے اعتراض میں بلاوجہ غلط بحث قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو میں معراج ناموں کی روایت پر میرے شاید تین چار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں میں نے ادب کے ناقدین کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ ”عالمی ادب میں علوی سفر پر جتنی بھی تخلیقات پائی جاتی ہیں، وہ تمام تخیلاتی اور توہماتی ہیں ان کے بالقابل اردو کے معراج نامے رکھے جاسکتے ہیں جن کے واقعات حقیقی اور تاریخی نوعیت کے ہیں“۔ ظاہر ہے کہ ان سفر ناموں کی روداد اور معراج کے سفر کی روداد میں فرق ضرور رہے گا۔ ہاں البتہ ان کے تقابلی جائزے میں ان کے موضوعات پر بحث ہو سکتی ہے اشفاق انجم جانتے ہوں گے کہ اقبال نے ”جاوید نامہ“، دانستے کی ”ڈیوان کا میڈی“ کے جواب میں لکھا تھا وہ خود بھی ایک معراج نامہ لکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے حضرت غوث گوالیاری کی کتاب کی انھیں تلاش تھی جو باوجود بسیار کوشش کے انھیں حاصل نہ ہوئی اور معراج نامہ لکھنے کا ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ میں نے جاوید نامہ میں فلک قمر کی روداد اور غالب کی مثنوی بیان معراج میں فلک قمر کے سفری احوال دونوں کو یکجا رکھ دیئے ہیں۔ واقعہ معراج سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اشفاق انجم صاحب اگر اردو فارسی کے میلاد ناموں اور نور ناموں کا مطالعہ کریں گے تو انھیں پتہ چلے گا کہ اسطوری فکر نے انھیں اسلامی اساس سے کتنی دور دھکیل دیا ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ”(معراج) کی ان ساری تفصیلات کے بیان میں انھوں (غالب) نے اپنے علم و ہنر کو تو خوب آزمایا لیکن نفس مضمون اور موضوع کی انھوں نے مطلق پروانہ کی اور واقعہ معراج کے حقائق اور تفصیلات جو حادثات میں مذکور

ہیں، ان سے سراسر اغماض برتا۔ یہاں تک کہ اس میں مختلف علوم کے پرتو تو نظر آتے ہیں لیکن واقعہ معراج کی روشنی کہیں نظر نہیں آتی کہیں چمقناق کی سی چنگاریاں نظر آتی ہیں وہ غالب کے حسن تدبیر، تفکر اور تخیل کے سائے میں آنکھ مچولی کرتی نظر آتی ہیں۔ اس مثنوی میں غالب کا کمال فن اوج پر دکھائی دیتا ہے۔ اس میں تقدس کا بھی خیال رکھا گیا ہے، لیکن معراج سے رکھی جانے والی عقیدت اور حضور سے رکھی جانے والی انسیت کا اس مثنوی میں فقدان نظر آتا ہے۔“ آخر میں میں ایک بار اور کہتا ہوں کہ ”بیان معراج“، خالصتاً مذہبی موضوع کی حامل مثنوی ہے۔ مگر غالب نے شعری جمالیات کے سہارے اور مضمون و معنی آفرینی کے ذریعہ اس کے کشف کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔ عقیدت میں فن کو سامنے کا یہ ہنر بڑا مستحسن ہے۔ مذہبی امور کا یوں فنکارانہ اظہار کہ تقدس مجروح بھی نہ ہو، نہایت مشکل عمل ہے۔ واقعہ معراج بیان کرتے وقت انھوں نے علم نجوم کے غوامض کو ماہر فن کی طرح منکشف کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس علم میں درک رکھتے تھے بلکہ سیاروں کے سعد و نحس اثرات کو بھی مانتے تھے۔ شب معراج کی تعریف میں غالب نے جو اشعار قلم بند کئے ہیں، اردو میں کسی رات کی تعریف میں مجھے ایسے اشعار دکھائی نہیں دیئے۔ میرا اپنا ماننا ہے کہ اگر غالب واقعہ معراج کو منظوم نہ کرتے اور صرف منقبت شب معراج ہی پر اکتفا کر لیتے تو بھی ”معراج“ پر نظم لکھنے کا حق ادا ہو جاتا۔ (ڈاکٹر بیچا نشیط، ص ۲۸/۵۶۵-۵۶۰)

ذات محمدیہ اور حقیقت محمدیہ:

اس مضمون میں میں رشید وارثی صاحب نے بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ ذات محمدیہ اور حقیقت محمدیہ دو مختلف حقائق ہیں۔ ان دو حقائق کو ایک قرار دینا ممکن کو واجب اور واجب کو ممکن قرار دینے کے مترادف ہے۔ (ڈاکٹر حسین فراہی، ص ۲۴۵)

فارسی شعری روایت کے اردو حمد و نعت پر اثرات:

عاصی کرناہی صاحب کے مضمون کے عنوان سے جو اُمید بندھی تھی وہ مضمون کے مشمولات سے پوری نہ ہو سکی۔ سوال یہ ہے کہ فارسی شعری روایت نے اردو نعت اور حمد پر صرف بحور و اوزان کی حد تک تو اثرات مرتب نہیں کیے۔ معانی، مضامین، تراکیب، تلمیحات اور بیان و بدیع کی میسوں صورتیں ہیں جن سے ہمارا حمدیہ نعتیہ شعری ادب متاثر ہوا ہے۔ عاصی صاحب کو

ان امور سے بھی اعتناء کرنا چاہیے تھا۔ حواشی میں ایک جگہ انھوں نے ایک شعر مستغرق گناہیم، ہر چند عذر خواہیم... درج کر کے اسے معین الدین چشتی سے منسوب کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معین الدین چشتی کے نام سے جس دیوان فارسی کا ہمارے یہاں چلن ہے وہ ان کا نہیں معین الدین ہروی کا ہے اور اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو حافظ محمود شیرانی نے اپنے مقالات میں ایک جگہ اس کے معین الدین چشتی سے انتساب کو یہ دلائل غلط قرار دیا ہے۔ بہر حال اپنے مخصوص دائرے میں عاصی کرنا کی کا یہ مضمون مفید اور معلومات افزا ہے۔ باقی مشمولات ابھی پوری طرح نہیں پڑھ پایا اس لیے ان کے بارے میں رائے نہیں دے سکتا۔ (ڈاکٹر تحسین فراقی، ص ۲۴۶-۲۴۵)

عرفی کے ایک شعر کی تفہیم:

آپ نے مراسلے میں عرفی کا ایک مشہور نعتیہ شعر لکھا ہے جسے اقبال نے ایک موقع پر بہت سراہا تھا۔ شعر یہ ہے:

سایہ من ہجومن در ملک ہستی اُمت

سایہ تو در عدم پیغمبر ہمتائے من!

آپ نے کرم کیا کہ میرے استفسار پر بتایا کہ علامہ کا یہ پسندیدہ شعر ”روزگار فقیر“ (سید وحید الدین) کی پہلی جلد میں (ص ۱۴۷) پر مذکور ہے جہاں علامہ نے اس کی پسندیدگی کی وجہ بھی بیان کی ہے۔

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اس شعر کی توضیح پیش ہے مگر پہلے یہ صراحت ضروری ہے کہ یہ شعر عرفی کے مشہور قصیدے ”در نعت حضرت رسول (ص ۷)“ کا حصہ ہے جس کا مطلع یہ ہے:

صجدم چوں در مد دل صور شیون ز ای من

آسمان صحن قیامت گردد از غوغای من

تشریح طلب شعر کی وضاحت کے ضمن میں چند امور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں۔ پہلا یہ کہ شعر چونکہ قصیدے کا ہے اس لیے اس میں تعلق کا ہونا گویا اس کے عناصر ترکیبی میں سے ہے۔ دوم یہ کہ آپ کے فرستادہ شعر کی توضیح کا حق اس صورت میں اطمینان بخش طریقے سے ادا ہو سکتا ہے جب اس کے ساتھ اس کے معا بعد کا شعر بھی پیش نظر رکھا جائے یعنی:

آسمان وحدتم بر عالم فطرت محیط

تو اُمیت برنتابد پیکرِ جزای من

سوم یہ کہ یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ اس عالم ناسوت میں حضور اکرم ص کے پیکر مبارک کا سایہ نہیں تھا (امی ودقیقہ دان عالم۔ بے سایہ و سائبان عالم --- فیضی) گویا یہ ایک معجزہ تھا منجملہ اور متعدد معجزوں کے۔ چہاں یہ کہ قصیدے کے میدان میں بقول عرفی کوئی اس کا ہمسرا و حریف نہیں۔ اقبال نے درست فرمایا ہے کہ عرفی کے مذکورہ شعر میں خوبصورت تعلق موجود ہے۔ اب آئیے ان دونوں شعروں کی توضیح کی جانب:

پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں شاعر حضور اکرم ص کی ذات بابرکات سے اپنے کمال والہانہ پن کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے نبی والا صرف میں ہی نہیں میرا سایہ بھی اس دنیا میں آپ ص کا اُمّتی ہے۔ دوسرے مصرعے کا مفہوم گچھ اس طرح ہے کہ چونکہ آپ ص کے پیکر مبارک کا سایہ معدوم ہے تو گویا وہ عالم موجودات میں نہیں عالم عدم میں ہے۔ اس دنیا میں شاعری کے باب میں میرا بھی کوئی ثانی نہیں گویا میرا حریف بھی معدوم ہے یعنی ملک عدم میں ہے۔ لہذا وہاں آپ ص کا سایہ میرے حریف کا پیغمبر ہوگا۔ اگلے شعر کا مفہوم سابقہ شعر کی تکمیل کرتا ہے۔ عرفی کہتا ہے کہ میں وحدت کا آسمان ہوں (یعنی شاعری کے میدان میں واحد ہوں) جو عالم فطرت پر چھایا ہوا ہے اور میری شاعری کا پیکر دوئی کا تحمل نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شاعر نے اپنے پیکر شعری کو بارہ بروج میں سے ایک برج ---- جو قرار دیا ہے جس کی شکل و شبیہہ دولڑکوں کی صورت میں ہے جو پشت کی جانب سے جڑے ہوئے ہیں گویا توأم ہیں۔ شاعر کے نزدیک اس کی شاعری ہے تو برج جو اسے مماثل مگر یہ پیکر شعری واحد ہے، اس کا جوڑا یا حریف وہمسرنا پید ہے۔ مطلب یہ کہ میری شاعری اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اب سوال یہ ہے کہ عرفی نے اپنے شعر کی پیکر کو جو اس لیے قرار دیا ہے تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ منطقۃ البروج میں برج جو اسب سے بڑا، سب سے زیادہ باشکوہ اور غیر معمولی شان امتیاز کا حامل ہے۔

(ڈاکٹر تحسین فراقی ۲۸/۵۶۷-۵۶۶)

مسدس حالی کی بحر اور اس کا ایک شعر: غلط فہمی کا ازالہ:

”منظور حسین منظور کی نعت گوئی، مصنف کی دیدہ وری کا آئینہ ہے اور ایک خوب صورت کاوش۔ موصوف نے ’جنگ نامہ اسلام‘ کے اشعار کی بحر ہزج مثنیٰ سالم لکھی ہے اور درست رقم فرمایا ہے کہ اسی بحر میں حفیظ جالندھری کا شاہ نامہ اسلام اور اقبال کی نظمیں ’تصویر درد‘ اور ’طلوع

اسلام بھی تصنیف ہوئی ہیں۔ مگر مسدس مدو جز اسلام خواجہ الطاف حسین حالی نے بحر متقارب مثنیٰ سالم میں لکھا ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

کسی نے یہ بقرط سے جا کے پوچھا مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا صاحب مضمون کو مغالطہ ہو گیا ہے۔ انھوں نے مسدس حالی کو بھی بحر ہرج سالم ہی میں بتایا ہے۔ جنگ نامہ سے انھوں نے یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

فقط وہ ملہم ازلی حقیقت دان او ادنیٰ کہ جس کی تفسیر ہے اک آدم الاسما لفظ ازلی میں تو خیر تین متحرک میں دوسرے کو ساکن کرنے کی اجازت دی گئی ہے مگر دوسرے مصرعے کا کیا ہوگا؟ (طلحہ رضوی برق، ص ۵۶۵)

ظہیر صاحب نے اپنے مضمون میں رسول اکرم ۷ کی شان میں گستاخی کے پہلو پر بحث کرتے ہوئے مولانا حالی کی ”مسدس“ کا ایک شعر صفحہ نمبر 136 پر درج کیا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ مولانا حالی (خدا نخواستہ) حضور ۷ کا موازنہ عام انسان سے کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی نے بند نمبر 33 سے 38 تک تعلیم توحید کے سلسلے میں حضور سرور کائنات ۷ کے ارشادات کو نظم کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کار خداوندی میں نہ رسول مداخلت کر سکتے ہیں اور نہ کوئی عام انسان۔ چنانچہ اس مقام پر دونوں برابر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ رسول، اللہ کی اجازت سے گناہ گاروں کے شفیع ہوں گے۔ ظہیر صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ مسدس کے ان اشعار کو غور سے پڑھ لیتے۔ (امیر الاسلام صدیقی، ص ۲۲۸)

حضرت حسان رضی اللہ عنہ اور منبر رسول: ایک غلط فہمی کا ازالہ:

آج روز نامہ ”جنگ“ کراچی کے ادبی صفحہ پر ”اردو نعتیہ شاعری اور عصری تقاضے“ کے عنوان سے شائع ہونے والی پروفیسر حفیظ تائب صاحب کی تحریر نظر سے گزری، جس میں یہ پیرا گراف شامل ہے۔ ”سب سے پہلے انھوں نے شاعر دربار رسالت حضرت حسان ابن ثابت کے رہنمایانہ کردار کو یاد کیا ہے۔ جنہیں اس وقت منبر رسول ۷ پر بیٹھ کر مدح رسول ۷ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، جب منعویت ہر جہاں فرشتوں میں پر جلوہ گر ہوئے۔“

اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، حفیظ تائب صاحب سے سخت مغالطہ ہوا ہے۔ دیگر واعظوں کی طرح وہ بھی اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں کہ نعوذ باللہ حضرت حسان منبر رسول ۷ پر بیٹھ کر

مدح رسول بیان کرتے تھے۔ جب کہ تحقیقی بات یہ ہے کہ جب حضور اکرم ۷ کو ضعیف العمری کی وجہ سے وعظ کے لیے قیام میں زحمت ہوئی تو 8ھ میں آپ کے لیے مسجد نبوی میں جھاؤ کی لکڑی کا منبر بنایا گیا (اور استوانہ کو دفن کر دیا گیا) (فتح الباری)۔ اور اسی سال فتح مکہ کا واقعہ ہے۔ 9ھ میں جب بنو تمیم کے وفد نے مدینہ منورہ آ کر مفاخرت کی تو ان کے ایماء پر آپ نے ان کے شاعر کا جواب دینے کے لیے حضرت حسان کو حکم دیا اور انھوں نے کھڑے ہو کر اسلام کی مدافعت میں اشعار سنائے۔ اس کے بعد ایک چوکی نما منبر تیار کیا گیا۔ حضور اکرم ۷ مسجد نبوی میں حضرت حسان بن ثابت کے لیے یہ منبر رکھواتے تھے تاکہ وہ اس پر کھڑے ہو کر حضور اکرم ۷ کی مدحت بیان کریں (مدارج نبوت)۔ اس طرح اب یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت حسان جس منبر کو اشعار سنانے کے لیے استعمال کرتے تھے وہ منبر رسول ۷ نہیں تھا بلکہ ایک چوکی نما Portable (نقل پذیر) منبر تھا جس پر وہ بیٹھ کر نہیں بلکہ کھڑے ہو کر مدحت گوئی فرماتے تھے۔ رہا رسول اکرم ۷ کا منبر شریف، تو وہ تین زینوں پر مشتمل تھا۔ زمین سے پہلے دو زینے Steps قیام کے لیے استعمال فرماتے تھے اور تیسرے زینے پر آپ نشست فرماتے تھے۔ آپ کے پردہ فرمانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کی نشست والے حصہ پر بیٹھنے کے بجائے آپ کے قدم مبارک رکھنے والے دوسرے زینے پر نشست فرماتے اور ان کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ادب کی وجہ سے زمین سے پہلے حصہ پر نشست فرماتے تھے۔ (یہ تمام باتیں متفقہ علیہ ہیں)۔ لہذا منبر رسول ۷ پر حضرت حسان کے بیٹھنے کی بات بالکل غلط ہے۔ اس کو ذہن سے محو کر دینا چاہیے۔ کیوں کہ اس میں حضور اکرم ۷ کی بے ادبی کا پہلو ہے۔ (رشید وارثی، ص ۳۵۵)

خالق اور مخلوق کا باہمی تعلق: ایک نقطہ نظر کی اصلاح:

”نعت رنگ“ کے تازہ شمارے کے جن مشمولات سے آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں ان میں پروفیسر اقبال جاوید صاحب کا مضمون ”ظہور قدسی اردو نعت کے آئینے میں“ بھی ہے۔ موصوف کے مضامین میں ایک فکری تنوع ہے۔ وہ لفظوں سے کھیلنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ جدت تراکیب ان کی تحریر کا ظاہری وصف خاص ہے۔ بعض جملے اور ترکیب تو بوسہ گاہ نظر بن جاتی ہیں لیکن کبھی کبھی اس کھیل میں کہیں کہیں توازن فکری بگڑتا ہے تو پھر قلم بے آبرو ہو جاتا ہے اور تحریر بے وقعت،

مطالعے کے دوران ایک جملے پر نظر رکھی اور ذوقِ ایمانی کو ٹھیس لگی:

حق یہ ہے کہ ثنائے رسول ۷ ہی وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرشتے اور بندے ایک ہی سطح پر اور ایک ہی بات کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ ”نعت رنگ“ (شمارہ نمبر ۱۶، ص ۵۳)

میرے ناقص خیال میں اللہ فرشتے اور عبد کی یہ تثلیث (اصطلاحی معنی میں نہیں) اصلاح طلب اور قابل گرفت ہے۔ اللہ فرشتے اور بندے کو ایک سطح پر لا کر اور ایک بات کا آرزو مند بنا کر کس اسلامی فکر کا شرہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ یہ جملہ اگر کسی اور طبقے کی جانب سے منظرِ عام پر آیا ہوتا تو پتا نہیں کتنی قیامتیں اٹھادی گئی ہوتیں۔

بعض مقامات پر تو ناروا نبوت کا ڈانڈا الوہیت سے ملانے کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو عبدیت کا ڈانڈا الوہیت سے ملتا نظر آ رہا ہے اگر نہیں تو تنفی فرمائی جائے۔ محقق موصوف نے موضوع کی مناسبت سے جن اشعار کا انتخاب فرمایا ہے اس سے ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ بعض اشعار تو ”از دل خیزد بردل ریزد“ کی منزل میں ہیں۔ (ملک الظفر سہرامی، ص ۸۴۷-۸۴۵)

استمداد، استعانت کا تصور اور ڈاکٹر یحییٰ نشیط:

ص ۵۶۵ پر نشیط صاحب نے استمداد اور استعانت کے خلاف مفتی سعودی عرب عبدالعزیز بن باز کا فتویٰ نقل کیا ہے۔ یہ بن باز صاحب وہی ہیں جنہوں نے سرکارِ دوعالم، نورِ مجسم ۷ کے والدین کریمین کو معاذ اللہ کا فر قرار دیا تھا۔ یہ اور اس جیسے فتوؤں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ موصوف بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت سے بھی محروم تھے۔ نشیط صاحب کے اور بھی کئی تسامحات ہیں بلکہ الزامات ہیں۔ طوالت سے ڈرتے ہوئے ان پر کچھ نہیں لکھ رہا البتہ علامہ کوکب نورانی صاحب سے ملتئم ہوں کہ وہ نشیط صاحب کی اصلاح فرمائیں۔ (حافظ محمد عطاء الرحمن قادری، ص ۶۹۶)

نواب صدیق حسن خاں کی تصنیفی زندگی: حقیقت یا افسانہ:

اسی طرح صفحہ ۴۱۴ پر ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ نواب صدیق حسن خاں کی کتابیں ان کی اپنی تصنیف نہیں ہیں۔ ان کے تمام معاصرین اور فوراً بعد آنے والے تمام علما نواب صدیق حسن خاں کے معترف اور ثنا خواں ہیں اور کسی نے کبھی یہ نہیں اشارہ کیا کہ وہ اپنی کتابوں

کے مصنف نہیں تھے۔ ان کے دو صاحب زادگان کے بارے میں ضرور بعض لوگوں نے دبی زبان سے کہا ہے کہ ان کی کتابیں ان کی اپنی تصنیف نہیں ہیں۔ لیکن یہ بھی محض افواہ ہے اور بہر حال دلیل کے بغیر ایسی بات نہ کہنی چاہیے تھی۔ (شمس الرحمن فاروقی، ص ۵۱۳)

ثانوی ماخذ کا استعمال: تحقیق کی معذوری؟

جناب عزیز احسن نے اپنے مضمون ”نعت اور تصور مقصود کائنات“ کے آخر میں ایک حدیث کے دو مختلف متون پیش کیے ہیں اور دوسری حدیث کے نیچے بطور حوالہ ”کشف الحجب“ (اردو ایڈیشن) کا ذکر کیا ہے۔ کیا یہی بہتر ہوتا کہ وہ حدیث کا حوالہ حدیث ہی کی کتاب سے پیش کرتے، کیوں کہ علم و تحقیق کا تقاضا یہی ہے اور پھر احادیث کشف الحجب کی تو تخریج بھی ہو چکی ہے۔ حدیث کے متن کی تصحیح فرمالیجیے۔ ”لا تجمع“، ”نہیں بلکہ“ ”لا تجمع“ حدیث شریف کے الفاظ ہیں۔ ابن ماجہ الفلق رقم: ۳۹۴۰، ترمذی: الفتن، رقم: ۲۰۹۳، (محمد شہزاد مجددی، ص ۵۳۵)

متروکات:

ڈاکٹر سید شمیم گوہر نے اپنے تبصرے میں متروک افعال کے حوالے سے بھی راجہ رشید محمود کے نعتیہ اشعار پر لسانی گرفت فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں لسانیات کے حوالے سے اصولی گفتگو تو راجہ رشید محمود نے اپنے تجزیے میں کی ہے۔ لیکن میری حیرت کا باعث تو راجہ رشید محمود کے شعر میں ”رہے ہے“ پر متروک کا دعویٰ دائر کرنے والے ڈاکٹر گوہر کا یہ شعر ہے: (مشمولہ، مجلہ ”شناخوان محمد“، ص ۶۲ مطبوعہ، کراچی)

روز یہ دل ترا انداز نیا مانگے ہے ہر گھڑی ناز و ادا تیرے جدا مانگے ہے

موصوف کا یہ شعر دیکھ کر بے ساختہ فارسی زبان کا یہ مقولہ یاد آیا:

من نہ کردم شاہد ز بکنید (ملک الظفر سہرامی، ص ۸۴۴)

عبدالعلیم آسی کا ایک متنازعہ شعر:

اس وقت میرے زیر نظر جناب ظہیر غازی پوری صاحب کا مضمون ”نعتیہ شاعری کے لوازمات“ ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے کئی نعت گو شعرا کے نعتیہ اشعار کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے، جن میں حضرت شیخ محمد عبدالعلیم آسی غازی پوری علیہ الرحمہ کا ایک عارفانہ شعر ص ۱۲۸ پر یوں نقل

کیا گیا ہے:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر اُتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر
دراصل یہ شعر ”دیوانِ آسی“ المعروف بہ عین المعارف مؤلفہ حضرت سید شاہد علی
رشیدی علیہ الرحمہ مطبوعہ گورکھ پور بار دوم، ص ۴۱ پر اس طرح سے تحریر ہے:

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر اُتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر
محترم جناب ظہیر غازی پوری صاحب کے مضمون کے علاوہ جناب ڈاکٹر اسماعیل فتح
پوری صاحب نے بھی اپنے مضمون ”نعت کے موضوعات“ میں اس شعر کو بھی نشانہ تنقید بنایا ہے۔
مگر ان کے مضمون میں ص ۱۱۵ پر یہ شعر درست نقل ہوا ہے۔ خواہ پہلے مصرعے میں لفظ ”تھا“ رکھ کر
شعر سمجھنے کی کوشش کی جائے یا لفظ ”ہے“ رکھ کر، ہر دو صورت میں شعر کا صحیح مفہوم وہی سمجھ سکتا ہے
جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اولیاء اللہ کے فیضانِ نظر سے عقیدت و محبت کا نور اور حسنِ نظر عطا کیا ہو۔
جو شخص اولیاء اللہ کی صحبت سے فیض یاب نہ ہوا ہو اور جسے ان کے صدقے سے احوال و مقامات
اولیاء اللہ کا علم و شعور اور ادراک و عرفان حاصل نہ ہوا ہو وہ صرف عقلی و خیالی گھوڑے دوڑاتا رہے
گا۔ مگر اُسے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ایک نابالغ کسی بالغ کے جذبات اور اس کی کیفیات کا
ادراک نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح سے کوئی ظاہر بین عام انسان، اولیاء اللہ (جو اصحاب کشف و
شہود، اربابِ قلب و روح، مقربین بارگاہِ الہی اور متمکن علی عین الیقین و حق الیقین ہیں) کے احوال
و مقامات کا ادراک نہیں کر سکتا اور اسی طرح اولیاء اللہ بھی، انبیاء و رسل علیہم السلام کے احوال و
مقامات اور اسرار کا ادراک یا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ہر عارف حق، اللہ تبارک و تعالیٰ کا اتنا ہی عارف
ہوتا ہے جتنی کہ اللہ رب العزت نے اُسے اپنی معرفت عطا کی ہوتی ہے۔

وہ سا لکانِ راہ طریقت جنہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنا قرب عطا فرمایا جب ذکر عروج
کے ذریعے سیرالی اللہ کرتے ہیں تو انہیں عرشِ معلیٰ پر ”الرحمن علی العرش استوی“
[۱] کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ ہوتا ہے اور جب وہ وہاں سے ذکر نزول کے ذریعے سیر من اللہ
کرتے ہیں تو مدینہ منورہ میں انہیں ”وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین“ [۲] کے انوار و
تجلیات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس روحانی سفر میں تلمیذِ رحمن شاعر کو جو تجلی و دونوں مقامات پر مشترک
نظر آتی ہے وہ صفت ”رحمت“ کی تجلی ہے جس کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی علیہ الرحمہ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف
”فصوص الحکم“ میں نظریہ ”وحدۃ الوجود“ کا جو خاکہ بیان فرمایا ہے اسے تمام سلاسل طریقت کے
صوفیائے کرام و اولیائے عظام نے تسلیم کیا ہے اور اس مسلک کے حامی اولیاء اللہ نے اللہ رب
العزت کو ”وجودِ مطلق“، یعنی واجب الوجود قرار دیا ہے۔

مسلمان متکلمین میں جو علم الکلام و فلسفہ اور منطق کے امام گزرے ہیں، انہوں نے بھی
اس باب میں اپنی کتب میں کافی وضاحتیں اور مثالیں تحریر فرمائی ہیں، مثلاً اگر زمین پر کئی برتنوں میں
پانی بھر کر رکھ دیا جائے یا بہت سارے آئینے رکھ دیے جائیں تو ہر برتن اور ہر آئینے میں دن کے
وقت سورج کا عکس نظر آئے گا لیکن آسمان سورج سے خالی نہیں ہوگا۔

اس طرح اگر رحمن اپنے محبوب مکرم V کو اپنی صفات کا مظہر بنائے اور اس مقدس
ہستی سے اپنی صفت رحمت کے انوار و تجلیات کو منعکس کرے تو عرشِ الہی بھی اُس کے انوار و تجلیات
سے خالی نہ ہوگا۔ لہذا زمانہ حال میں دونوں مصرعوں میں لفظ ”ہے“ کا استعمال درست ہوگا۔ لہذا
اگر کوئی عام ناقد یا مبصر اپنے مبلغِ علم کے مطابق کسی عارف کامل کے کسی قول و فعل کی تشریح کرے گا
تو نظریہ ”وجود الوجود“ سے ناواقفی اور اس کی تشریح سے لاعلمی کی بنا پر غلطی و خطا کا مرتکب ہوگا اور
اُسے عالم جذب و سر کی شطیحات ہی سمجھے گا۔

اس لیے میری گزارش ہے کہ مستند و مقبول اور مشہور اولیاء اللہ عارفین کا ملین کے اقوال
و افعال اور احوال و اسرار پر تنقید یا تبصرہ کر کے عوام الناس سے داد و تحسین وصول کرنے کے بجائے
ایسے مضامین سے ”نعت رنگ“ کو مزین کیا جائے۔ جنہیں پڑھ کر اولیاء اللہ کے عقائد و نظریات
سے متنفر ہونے کے بجائے اُن سے عقیدت و محبت کے جذبات پروان چڑھیں۔ وہ علوم و معارف
جنہیں اکابر اولیاء اللہ نے اسرارِ الہی کے زمرے میں رکھا ہے اور جن کے افشا کرنے کے بارے
میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری میں ”قطع هذا لبلعوم“ (یہ گلا کاٹ دیا
جائے) یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت میں ”کلم الناس علی قدر عقولہم اتریدون ان
یکذب اللہ و رسولہ“ (لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور
اس کے رسول کو جھٹلایا جائے) کے الفاظ وارد ہیں انہیں عامیانا انداز میں عوام الناس تک نہ پہنچایا
جائے تاکہ وہ انہیں غلط سمجھ کر گم راہ نہ ہوں یا ان کی تکفیر کر کے خود موجب عذاب نہ ہوں۔ قدیم
کتب فقہ میں بعض مسائل کے بارے میں ظاہری علم شریعت کے باوجود یوں ممانعت ہے کہ ”یہ

مسئلہ جاننے کا ہے بتانے کا نہیں ہے۔ (ڈاکٹر ناصر الدین صدیقی، ص ۸۶۸-۸۶۶)

رسول اکرم ﷺ اور علم غیب:

موصوف (کوکب نورانی) نے علم غیب رسول ﷺ کے بارے میں بھی جو قرآنی آیات پیش کی ہیں وہ تھوڑی سی دلچسپی رکھنے والے کے علم میں ضرور ہوں گی اور یہ آیات بھی حضور ﷺ کا علم غیب ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اس کے علاوہ آل حضور ﷺ نے جو بے شمار پیشین گوئیاں کی ہیں (مثلاً عمار بن یاسر کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا وغیرہ) جو بعد میں سچ ثابت ہوئیں، ان کے آئندہ واقعات کے علم کا ثبوت ہیں اور ان کا یہ فرمانا کہ ”میں جانتا ہوں کہ کس کا باپ کون ہے“ بتاتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے گزشتہ رازوں کا بھی علم عطا فرمایا تھا اور یہی علم لدنی ہے۔ تاہم میرے کچھ معروضات ہیں جو درج ذیل ہیں: صفحہ ۳۸۰ پر جو آیت (و علمک ما لم تکن تعلم و کان فضل اللہ علیک عظیما۔) اور سکھا دیا آپ کو جو کچھ کہ آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا فضل عظیم ہے) درج ہے۔ اس آیت کے تحت تفسیر خازن کے حوالے سے لکھا ہے، ”یعنی احکام اور امور دین اور کہا گیا ہے کہ آپ کو سکھا دیا اس علم غیب میں سے جس کو آپ نہیں جانتے تھے اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو امور مخفیہ، دلوں کے راز، منافقین کے احوال اور ان کی مکاریوں کا علم عطا فرمایا گیا ہے۔“

میری گزارش یہ ہے کہ مفسر نے ان کے بیان کے مطابق صرف چار علوم یعنی (۱) امور مخفیہ (۲) دلوں کے راز (۳) منافقین کے احوال (۴) اور ان کی مکاریاں تک ہی کیوں محدود کر دیا ہے، جب کہ آیت میں ایسی کوئی حد (Limit) نہیں ہے۔

آیت پر غور کریں، ”جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے“ وہ سب کچھ کا علم عطا کیا گیا ہے۔ مزید برآں آیت کا آخری حصہ ”اور آپ پر اللہ کا فضل عظیم ہے“ اس کی مزید تائید کرتا ہے کہ آپ کو تمام علوم عطا فرمائے گئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تمام علوم میں ہر علم شامل ہے جیسے علم فلکیات، علم طبیعیات، حیاتیات، ارضیات اور کیمیا وغیرہ تو قابل گرفت نہ ہوگا۔ یعنی اگر آئین اسٹائن اُس وقت ہوتا تو حضور ﷺ سے سبق لیتا۔ ”سکھا دیا آپ کو جو کچھ کہ آپ نہ جانتے تھے“ سے تو اعلان یہی مطلب نکلتا ہے بلکہ اس میں تحت الارض کا علم بھی شامل ہے۔ اگر آصف بن برخیا جس کو صرف ایک اسم اعظم عطا ہوا تھا۔ یہ کر سکتا ہے کہ پلک جھپکنے میں ملکہ سبا کو مع تحت عدن سے شام تک پہنچا

دے تو ہمارے رسول ﷺ کو تو ۷۳ میں سے ۷۲ اسمائے اعظم عطا ہوئے تھے۔

صفحہ ۳۸۳ پر آیت ”و کل شیء احصینہ فی امام مبین“ [۲] کا ترجمہ لکھا ہے۔ ”اور ہم نے ہر شے کو لوح محفوظ میں محفوظ کر رکھا ہے۔“ یہاں امام مبین کا ترجمہ لوح محفوظ بتایا گیا ہے جو کسی طرح بھی عقل میں نہیں آسکتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے ”مبین“ یعنی روشن (کھلا ہوا) اور ترجمہ ہے ”محفوظ“ (یعنی پوشیدہ) یعنی بالکل ہی برعکس۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب قبلہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو: ”اور ہم نے ہر چیز کو ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے۔“ یہاں بھی امام مبین کے معنی ”کھلی کتاب“ لیے گئے ہیں جو کہ صحیح نہیں ہیں۔ کسی نے لوح محفوظ ترجمہ کر دیا ہے تو کسی نے ”کھلی کتاب“ یہ لفظ ”امام“ سے کترانا کیا؟ اصل میں اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی امام مبین سے مراد ہے امام مبین اور کچھ نہیں یعنی ”کھلا پیشوا“۔

کچھ اور تراجم ملاحظہ ہوں:

علامہ ذیشان حیدر جوادی: ”اور ہم نے ہر شے کو ایک روشن امام میں جمع کر دیا ہے۔“
مولانا سید فرمان علی صاحب: ”اور ہم نے ہر چیز کو ایک صریح روشن پیشوا میں گھیر دیا ہے۔“
مولانا سید مقبول احمد صاحب قبلہ دہلوی: ”اور ہم نے ہر چیز کو امام مبین میں (از روئے علم و شمار) جمع کر لیا ہے۔“

بات دراصل یہ ہے کہ قرآن تو ہے ثابت اور جب تک قرآن کی آیات کو شان نزول اور متن کے حوالے (with reference to the context) کو سامنے رکھ کر ترجمہ اور تفسیر نہ کریں گے لازماً غلطی کا ارتکاب ہوگا۔ ہمارے اکثر علما شان نزول اور متن کے حوالے کے بغیر ترجمہ یا تفسیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور قیاس آرائیوں سے کام لیتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

آئیے اب حدیثوں کی طرف رجوع کرتے ہیں:

۱۔ معانی الاخبار میں جناب امام محمد باقرؑ سے روایت اپنے والد ماجد اور جد امجد سے منقول ہے: ”جب رسول خدا ﷺ پر آیت کل شیء احصینہ فی امام مبین نازل ہوئی تو حضرات ابو بکرؓ اور عمرؓ اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور عرض کی ”یا رسول اللہ ﷺ آیا امام مبین سے مراد تو رات ہے؟“ فرمایا ”نہیں“ انھوں نے عرض کی ”پھر انجیل ہے؟“ فرمایا ”نہیں“ پھر ان دونوں نے عرض کی ”آیا قرآن ہے؟“ فرمایا ”نہیں“۔ اتنے میں جناب

امیر المومنین (حضرت علیؑ) تشریف لے آئے۔ آں حضرت ۷ نے فرمایا دیکھو وہ امام جس میں خدا تعالیٰ نے ہر چیز کے علم کا احصاء فرما دیا ہے۔

۲۔ احتجاج طبرسی میں جناب رسول خدا ۷ سے ایک حدیث منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ”اے گروہ انسان کوئی علم ایسا نہیں ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے تعلیم فرمایا ہو اور میں نے علیؑ کو نہ سکھا دیا ہو۔“

۳۔ تفسیر قمی میں جناب امیر المومنین سے منقول ہے کہ ان حضرت نے خود فرمایا کہ واللہ وہ امام مبین میں ہوں۔ حق و باطل کو صاف صاف بیان کر دیتا ہوں اور میں نے یہ عہدہ جناب رسول خدا ۷ سے وراثتاً پایا ہے۔ (سید ہاشم حسین، ص ۸۹۲-۸۹۳)

سر قہ:

بطور جملہ معترضہ، یہ بات عرض کر دوں، میں نعت پر ۱۹۷۶ء سے کام کر رہا ہوں۔ میرا مقالہ ”اردو شاعری میں نعت“ ۱۹۸۲ء میں داخل ہو چکا تھا، جو لکھنؤ یونیورسٹی کے تھیسس سیکشن میں محفوظ ہے۔ ”اُن صاحب“ کا مضمون ”نعت رنگ“ نمبر ۵ دوسرے نمبر پر ”اردو نعت گوئی کے موضوعات“ کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ مضمون پورا کا پورا میرے مقالہ سے ادنیٰ تصرف کے ساتھ مستعار ہے۔

میرا اپنا مضمون جو ان کے بقول ”نعت رنگ“ کے گیارہویں نمبر میں مشمول ہے، میرے اپنے مضمون سے تھوڑا بہت ماخوذ ہے۔ بیش تر حصہ جدید ہے، کیوں کہ اس میں جن چند کتابوں پر تبصرے بطور استشہاد ہے، وہ مقالہ کی ترتیب اور اس کی اشاعت تک راقم کے نظر نواز نہیں ہوئی تھیں۔ واضح ہو کہ میرا مضمون میری جس کتاب سے ماخوذ ہے وہ بیس سال قبل کی مکتوب ہے۔ (محمد اسماعیل آزاد، ص ۱۰۷-۱۰۶)

”نعت رنگ“ کے شمار: ۱۹ پر ہونے والے مذاکرے میں بہت سی حیرت انگیز باتوں کا انکشاف دیکھنے کو ملا خصوصاً مولوی فیروز الدین (فیروز سنز) والے کے بارے میں کہ کس طرح انھوں نے فیروز دین ڈسکوی کی محنت پر ہاتھ صاف کیا۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۸۰-۷۹)

صلاح الدین پرویز اور جیلانی کا مران کے مذہبی خیالات پر تحقیقی نظر:

لفظ ”نعت“ کے استعمال کے سلسلے میں محترم مبین مرزا صاحب کی تحریر نظر سے گزری،

جی خوش ہوا۔ ع ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند

اللہ تعالیٰ مرزا صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے انھوں نے اس مسئلے پر مختصر مگر جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اور اس پر اضافہ کرنا مشکل ہے۔ البتہ صلاح الدین پرویز صاحب اور جیلانی کا مران صاحب کے خیالات سے آگاہی کے بعد ایک نیا پہلو اس عاجز کے ذہن میں ابھرا ہے۔ وہ پیش خدمت ہے۔

چوں کہ پرویز صاحب اور کا مران صاحب دونوں اردو ادب کی جانی پہچانی شخصیات ہیں اور عام قاری نہیں تو کم از کم ادبی حلقے ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں لہذا بہتر ہوگا ان حضرات کے خیالات کی تہہ میں اور تحریر کے بین السطور جو پیغام مستور ہے اسے عیاں کر دیا جائے تاکہ قارئین بالخصوص راسخ العقیدہ مسلمان قارئین چند حقائق سے آگاہ رہ کر ان حضرات کی تحریروں سے لطف اندوز ہوں اور اگر اس میں کہیں شر یا شرارت کا پہلو ہو تو اس سے کما حقہ بچیں۔ اس ضروری تمہید کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی (۱۸۳۷ء-۱۹۰۸ء) کے خیالات و تعلیمات سے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔

غالباً عام مسلمانوں کے علم میں ہوگا کہ موصوف نے نہ صرف نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے سے بھی (نحوذ باللہ۔ نقل کفر کفر نباشد) انکار کر دیا تھا اور باوجود اس کے کہ اس ضمن میں کسی بحث کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نہ صرف نئی شریعت بلکہ نبوت کا دروازہ بھی قیامت تک بند ہو چکا ہے (اور حضرت عیسیٰ علیہ اسلام بھی قیامت سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی بن کر تشریف لائیں گئے) مرزا قادیانی صاحب نے ان تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا جو ان کی جھوٹی نبوت پر ایمان نہیں لاتے۔

یہی نہیں مرزا قادیانی صاحب نے ۱۸۹۱ء کے لگ بھگ مہدی اور مسیح موعود ہونے کا بھی دعویٰ کر دیا۔ اگرچہ ان کا انتقال بیضے سے ہوا تھا لیکن موصوف نے نہ صرف مہدی اور مسیح ہونے کا دعویٰ کر دیا بلکہ غالباً سکھوں اور ہندوؤں کی ہم دردیاں حاصل کرنے کے لیے یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ وہ گرو گوہند سنگھ (سکھوں کے دسویں گرو) اور مہاراج کشن (ہندوؤں کے نزدیک خدا کے اوتار) بھی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ رجعون۔ گویا ہندو مت کا نظریہ تاسخ یا آواگون (اور جسے انگریزی میں Soul re-incarnation اور Transmigration Of کہتے ہیں) بھی اپنا

لیا یہ سوچے سمجھے بغیر کہ یہ سراسر غیر اسلامی عقائد ہیں اور نعوذ باللہ اگر نبی ہونے کے دعویدار تھے تو کم از کم اسلامی عقائد تک ہی محدود رہتے۔

اس ضمن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ کرشن بت پرست تھا اور بت پرستوں کا جھوٹا خدا یا ان کے جھوٹے خدا کا اوتار تھا۔ جب کہ کبھی کوئی نبی بت پرست نہیں رہا۔ کیوں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی ۷ تک تمام انبیاء نے بنیادی طور پر ایک ہی دین یعنی ایک سچے رب کی تعلیمات کو پھیلایا لہذا کوئی بت پرست، کوئی شرک، کوئی کافر، کوئی وحدانیت کا منکر نہ تو بنی ہو سکتا ہے۔ نہ نعوذ باللہ ”اگلے جنم“ میں دوبارہ نبی بن سکتا ہے۔

معافی چاہتا ہوں کہ تمہید کے بعد یہ عرض ذرا طویل ہو گئی لیکن ناگزیر تھی۔ التماس یہ ہے کہ اگر محترم جیلانی کا مران صاحب (اور صلاح الدین پرویز صاحب بھی) کافر و مشرک کرشن کو نعوذ باللہ قادیانیوں کی طرح نبی سمجھتے ہیں تو بہتر ہوگا کہ وہ اپنے بقیہ عقائد کا بھی اعلان کر دیں اور قارئین بھی خبردار رہیں کہ شعر و ادب کے پردے میں کون ان کے دین و ایمان کی دولت بے بہا پر ڈاکے ڈالنے کی سازش کر رہا ہے۔

چوں کہ مرزا قادیانی کا ذکر نکلا ہے تو یہ وضاحت کر دی جائے کہ ان کے قریبی ساتھی محمد علی لاہوری (۱۸۷۴ء-۱۹۵۱ء) نے (اور ان کے پیروکاروں نے بھی) پوری کوشش کی ہے کہ کسی طرح یہ ثابت کر دیا جائے کہ مرزا قادیانی نے کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا لیکن خود قادیانی صاحب کی کتابوں میں اپنی نبوت کے واضح دعوے اور دلائل ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ محمد علی لاہوری نے مرزا قادیانی کے انتقال کے بعد خلیفہ نہ بنائے جانے پر اور پھر دوبارہ ایسا موقع آنے پر بھی خلیفہ نہ بنائے جانے پر احمدیہ جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اور لاہوری گروپ کی بنیاد رکھی۔

ایک مزے کی بات اور قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے تھے (جبکہ قرآن میں واضح طور پر ہے کہ اللہ نے انھیں زندہ اور اٹھایا تھا اور نہ قتل کیے گئے نہ مصلوب ہوئے) اور بقول ان کے قبر کشمیر میں کہیں ہے۔ ابھی حال ہی میں آپ نے شاید اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ کوئی امریکی محقق اور سائنس دان کشمیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کسی مزار کے قریب سے مٹی کے نمونے بھی لے گئے ہیں تاکہ ان کا ڈی این اے (DNA) چیک کر کے اس امر کی تصدیق کی جاسکے کہ وہ قبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے یا نہیں (گویا نعوذ باللہ ان کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ڈی این

اے کا نمونہ پہلے سے موجود ہے جس سے ان نمونوں کا تقابل کیا جاسکے) لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ قطع نظر اس امر سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حقیقت آسمانوں پر زندہ ہیں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آپ کا انتقال ہو گیا تھا تو انھیں بیت المقدس سے نکل کر کشمیر جیسے پہاڑی، دشوار گزار اور دور افتادہ مقام پر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ بات یہ ہے کہ امریکی ان قادیانیوں کے اس عقیدے کے تصدیق کرنا چاہتے ہیں تاکہ جھوٹے نبی کے مسخ ہونے کے دعوؤں کو سچ مان کر ان کی قبر کی پہلشی کی جاسکے۔

در اصل یہ حضرات شروع ہی سے انگریزوں کے ایجنٹ رہے اور غالباً انھی کے اشارے پر مرزا قادیانی نے جہاد کی بڑی شد و مد سے مخالفت کی۔ کیوں کہ علمائے حق نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف باقاعدہ جہاد میں حصہ لیا تھا اور آزادی سے قبل کے ہندوستان میں بھی انگریزوں کے لیے یہ خطرہ موجود تھا۔ آج بھی جھوٹے نبی کے پیروکاروں کا مرکز لندن میں ہے۔ بہر حال، اردو ادب کے تمام قادیانیوں، احمدیوں اور ”لاہوریوں“ (اس سے مراد مولانا محمد علی لاہوری کے پیروکار ہیں) سے گزارش ہے کہ اپنے چہرے سے نقاب اتار کر کھلم کھلا سامنے آئیں۔ تاکہ ”اردو ادب کی ترقی میں قادیانیوں کا حصہ“ کے موضوع پر کوئی احمدی مقالہ لکھ کر کوئی ڈگری وغیرہ حاصل کر سکے۔

ع خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں چلتے چلتے دونوں محترم اہل قلم سے (اہل علم تو کہنا مشکل ہے) عرض ہے کہ یوں تو اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر دنیا میں بھیجے لیکن قرآن میں ”پچیس چھبیس“ ہی کا ذکر ملتا ہے۔ اور ان کے علاوہ چند ایک کے بارے میں علماء بھی متذہب ہیں۔ اور جب تک بقیہ کے بارے میں کوئی واضح ثبوت نہ ہوں کسی مشرک کو نبی کہنا اللہ کے رب العالمین ہونے کا اعتراف نہیں اپنی نادانی اور نبوت کے عظیم مقام نہ سمجھ سکے کی جہالت کا اعتراف اور اعلان ہے۔ و ما توفیقی الا باللہ۔ (ڈاکٹر رؤف پارکھی، ص ۳۶۸-۳۶۶)

نعتیہ ادب: موضوعات کی چند جہتیں:

آپ نے ہندو پاک کی جامعات کو نعت پر تحقیقی کام کرنے کے لیے جو فہرست دی تھی، یقیناً وہ ہمارے پی ایچ۔ ڈی اسکالرس اور پروفیسرس کی رہنمائی کر سکے گی۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہے

کہ اردو کے بعض گائیڈس ایسے بھی ہیں جو ایسے موضوعات کو تحقیق کے لیے پسند نہیں کرتے۔ ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتح پوری نے، عرصہ ہوا اس جانب توجہ مبذول کروائی تھی۔ مگر شاید ہماری بے حسی کی وجہ سے ان کی آواز صدابہ صحرا ثابت ہوئی۔ پھر بھی ان کی کاوشوں سے کانپور اور اس کے اطراف کی جامعات میں حمد و نعت پر بہت کام ہوا۔ اپنی اس محنت پر عند اللہ وہ ماجور ہوں گے۔ آپ کی فہرست کے علاوہ محترم ریاض مجید کا مضمون بھی تحقیق نعت میں راہ نمائی کر سکتا ہے۔ میں نے نعت رنگ کے گزشتہ شماروں میں بعض ایسے مضامین سپرد قلم کئے تھے جو اپنی جگہ نعتیہ تحقیق کے مستقل موضوع بن سکتے ہیں۔ مثلاً اردو میں معراج ناموں کی روایت، منظوم سیرت نگاری، نور ناموں کی روایت، نعت نگاری میں اسطوری فکر، قصیدہ بردہ کے منظوم ترجم کا تقابلی جائزہ وغیرہ۔ چند برس قبل امریکہ میں مقیم محترمہ نیر جہاں معروف بے اردو آپا نے ”عالمی زبانوں میں نعت کا سرمایہ“ کے ایک پروجیکٹ پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں نعت کے سرمایہ کو جمع کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔ میں نے بنگالی، ملائیم کنڑ، راجستھانی، مراٹھی، ہندی، گجراتی، کشمیری، اڑیا، تیلگو اور بعض لوک ادب کی نعتیں ترجمے کے ساتھ انھیں ڈاک سے بھیج دی تھیں۔ آپا نے بھی فریچ، انگریزی، جرمن، عبرانی، جاپانی، براعظم افریقہ کی زبانوں اور بولیوں میں لکھی گئیں نعتوں کا وافر حصہ اور قطب شمالی کے قریب ترین علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں میں لکھی گئی نعتوں کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا لیکن اپنی پیرائہ سالی کی وجہ سے شاید وہ یہ کام مکمل نہ کر سکیں۔ اس دوران ان کے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا تھا اور وہ بالکل نڈھال ہو کر رہ گئی تھیں۔ اگر محترمہ کے اس پروجیکٹ پر کام کیا جائے تو ساری دنیا کی زبانوں کا نعتیہ سرمایہ نعت ریسرچ سینٹر میں جمع ہو سکتا ہے۔ (ڈاکٹر یحییٰ فیض، ص ۲۸/۵۵۹)

(۱) ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد کا مضمون ”نعت کے موضوعات“ نہایت معلوماتی مضمون ہے۔ مگر افسوس انھوں نے آخر میں نہایت اہم موضوعات کی ایک فہرست دے کر انھیں... بغیر کسی نقد و تبصرہ کے چھوڑ دیا ہے حالانکہ ان پر نقد و تبصرہ کے بغیر یہ مضمون بالکل نامکمل رہ جاتا ہے۔ ذرا ان موضوعات کو دیکھیں:-

(۱) نبی اکرم ﷺ کا سبب تخلیق کائنات ہونا (۲) نبی رحمت کا عالم الغیب ہونا (۳) آپ ﷺ کا مختار کل ہونا۔ (۴) آپ کا سایہ نہ ہونا (۵) میم کا پردہ (۶) جبریل امین کا آپ کا دربان ہونا... یہ ایسے موضوعات ہیں جو بے حد اہم ہیں جن پر ضرور نقد کی نظر کرنی تھی۔ انھیں

چاہیے کہ وہ اب ان پر ایک اور مضمون لکھیں۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۵۱)

(۲) جناب گوہر ملیانی نے ”تذکرہ نعت گویان بہاول پور“ لکھ کر سب کو راستہ دکھایا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسے مضامین ہر شہر کی طرف سے لکھے جائیں۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۷۶)

(۳) جس طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی اچھا غزل گو غزل کے تاریخ اور فنی ارتقا سے ماہرانی واقفیت رکھتا ہو، اُسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کوئی اچھا نعت گو، نعت گوئی کے تاریخی و فنی ”اسرار و رموز“ سے پوری طرح آشنا ہو لیکن آپ پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہوتا۔ آپ ما شاء اللہ بیک وقت اچھے نعت گو بھی ہیں اور نعت گوئی کی تاریخ اور فنی گہری نظر رکھتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ نو عمری ہی میں ان اوصاف سے متصف ہیں۔ اس لیے جی چاہتا ہے کہ آپ اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر اردو نعت کے اس ذخیرے کو منظر عام پر لائیں جو عام نگاہوں سے اوجھل ہے۔

اردو نعت کا وہ ذخیرہ جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں صورتوں میں برصغیر کے کتب خانوں میں مدفون ہے۔ آپ کو ان کتب خانوں میں بہت سے مطبوعہ نعتیہ دیوان ایسے ملیں گے جن سے عام اہل ادب واقف نہیں ہیں، مثلاً انجمن ترقی اردو کراچی، کتب خانہ خاص میں نعت کے مطبوعہ دیوان خاصی تعداد میں ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کا ذکر نعت سے متعلق کسی تحقیقی و تنقیدی جائزے میں نہیں ملتا۔ ایسے دیوانوں اور ان کے مصنفوں کو متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ بعض کتب خانوں میں غیر مطبوعہ یعنی قلمی نعتیہ دیوان بھی موجود ہیں، اُن پر بھی تحقیقی کام ہونا چاہیے۔ غزلوں کے مطبوعہ اور قلمی دیوانوں سے بھی نعتوں کی بہت بڑی تعداد دستیاب ہو سکتی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اردو کے بے شمار شعروں کے دواوین ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ تقریباً ہر دیوان میں دو چار اور بعض میں خاصی تعداد میں نعتیں ملتی ہیں۔ مثنویوں کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں میں بھی آپ کو نعت کا خاصا سرمایہ ملے گا۔ ہر مثنوی نگار اپنی مثنوی کا آغاز حمد و نعت سے کرتا ہے۔ اگر مثنویوں کے نعتیہ حصوں کو الگ کر لیا جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ پاکستان میں قلمی کتابوں کے بڑے ذخیرے انجمن ترقی اردو کراچی، قومی عجائب گھر کراچی اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں ہیں۔ کوئی ایسا منصوبہ بنائیے کہ ان ذخیروں میں موجود نعتیہ ادب کو شائع کیا جاسکے۔

نعتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ ان نعتیہ گلدستوں میں مل سکتا ہے جو گزشتہ صدی کی آخری دو اور موجودہ صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں برصغیر کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ گلدستے بھی آپ کو مختلف کتب خانوں میں مل سکتے ہیں۔ نواب شاہ میں میرے ایک کرم فرما حاجی محمد یعقوب خان خویشتگی مرحوم تھے۔ ان کے پاس گلدستوں کا بڑا عمدہ ذخیرہ تھا۔ اس میں چند نعتیہ گلدستے بھی تھے۔ ان میں ایک ”منشور شفاعت“ تھا جو بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے ۱۸۸۸ء کے کچھ شمارے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ”سفینہ نجات“ نام کا ایک ماہنامہ گلدستہ بھی خویشتگی صاحب کے پاس تھا۔ یہ دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۶ء تک کے متعدد شمارے میں نے دیکھے تھے۔ ان دونوں گلدستوں میں ہر مہینے کی نعتیں شائع ہوتی تھیں۔ ہر مہینے مصرع طرح کا اعلان کیا جاتا تھا، برصغیر کے تمام شہروں کے شعرا طرحی نعتیں لکھ کر بھیجتے تھے جو شائع کی جاتی تھیں۔ میرے پاس بھی ایک نعتیہ گلدستہ ”حسن الکلام“ بمبئی کا پہلا شمارہ ہے جو جمادی الاول ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ۳۷ شاعروں کی نعتیں ہیں اور یہ سب غیر طرحی ہیں۔ ایک حمد بھی ہے جو ایک ہندو شاعر نشی بلی رام رام کی لکھی ہوئی ہے۔ گل دستوں میں غیر مسلم شعرا کا کلام بھی اکثر شائع ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی نعتیہ گل دستے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر آپ مختلف کتب خانوں میں نعتیہ گل دستوں کو تلاش کریں اور ان کی بہترین نعتوں کا ایک انتخاب شائع کر دیں تو یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ اس کام کا ایک ضمنی فائدہ جو بہت بڑا فائدہ ہے، یہ ہوگا کہ بہت سے ایسے شاعر سامنے آئیں گے جنہیں زمانے نے فراموش کر دیا ہے۔ (مشفق خواجہ، ص ۸۰۴-۸۰۲)

(۴) کل رات تم سے skype پر رابطہ ہوا تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اب میری یہ کوشش ہوگی کہ قدامت کی کچھ نعتیں تلاش کر کے نعت رنگ میں ایک ایک کر کے شائع کرواؤں تاکہ تذکروں، مثنویوں، دواوین اور دیگر علمی تحریروں میں چھپا ہوا نعتیہ ادب کا خزانہ بھی نعت رنگ میں محفوظ ہو جائے اور اس خزانے کو دیکھ کر اہل تحقیق کو مزید تحقیق کرنے کا حوصلہ اور ہمت ہو!

مجھے یاد پڑتا ہے کہ مرحوم مشفق خواجہ صاحب نے ایک خط میں تمہاری توجہ ”کتب خانوں“ میں محفوظ ایسے نعتیہ خزانے کی طرف مبذول کروائی تھی جو اہل تحقیق کی نظروں سے اب تک پوشیدہ ہے۔ ان کی یہ بات میرے دل کو لگی تھی کہ سیکڑوں مثنویاں لکھی گئی ہیں جن میں سے کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ ان مثنویوں کی ابتداء حمد و نعت ہی سے ہوئی ہے۔ چنانچہ اگر ہم

ہر بار کسی ایک مثنوی سے نعت کے اشعار منتخب یا مکمل شکل میں، نعت رنگ کی زینت بنا سکیں تو ہماری یہ کاوش، نعتیہ ادب کے مطبوعہ خزانے میں اضافے کا بھی باعث ہوگی اور تحقیقی آفاق کی وسعتوں کی راہ بھی ہموار کرے گی! (عزیز احسن، ص ۶۸۷-۶۸۶)

(۵) پھر عرض کر رہا ہوں کہ مستقبل کا کوئی فاضل محقق آپ کے نعت ریسرچ سینٹر کے تعاون سے اگر ان عنوانات پر تحقیق کر لیں مثلاً:

- (۱) سرکاری و نیم سرکاری جامعات و کلیات (یونیورسٹیز و کالج) میں نعتیہ تحقیق
- (۲) پاکستان کے دینی مدارس میں نعتیہ تحقیق

تو اس موضوع پر میری محدود معلومات کے مطابق ابھی بہت تحقیقی کام کی گنجائش اور ضرورت ہے دینی مدارس میں بھی شہادۃ العالمیہ درس نظامی وغیرہ کے آخری سالوں میں مقالات لکھے جاتے ہیں ممکن ہے کہ نعت کے موضوع پر بھی بعض دینی مدارس نے عنوانات تجویز کیے ہوں! اس تناظر میں حمد و نعت کا مجموعی کام بھی سامنے آ سکتا ہے اسے بھی شمار کر لیا جائے اور اس کی بھی indexing ہو جائے یہ مفید مددگار ہوگا۔

پیارے بھائی! اگر آپ مسلسل مستقل ہر نعت رنگ میں تازہ ترین نعتیہ مطبوعات پر ”ریویویشن“ ”Review-Supplement“ آخر میں شامل کر لیا کریں تو اس سے ”نعت رنگ“ کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جائے گا اکثر تحقیقی جرائد میں کتب پر تبصرے کا کالم آخر میں شامل ہوتا ہے۔ ماہرین کے تبصروں اور آراء سے بھی قلم و فکر کے نئے زاویے پھوٹتے ہیں ماشاء اللہ! اس شمارہ میں ”حاصل مطالعہ“ کے عنوان سے یہ حصہ شامل ہے ۵۱۴ تا ۵۳۰ صفحات پر درج ہے بہتر اور واضح ہوگا کہ ہر کتاب پر تبصرہ نئے صفحے سے درج ہوا گزرزیر تبصرہ کتب کا Scanned ٹائٹل کا چھوٹا سا عکس ساتھ دے دیا جائے تو دلچسپی اور توجہ بڑھنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

نعت ریسرچ سینٹر کی خدمات عالیہ کو مزید وسعت دینے کے لیے چند موضوعات پیش خدمت ہیں:

- (۱) ہر سال کسی سرکاری رنجی جامعہ کے ہال یا آڈیٹورم میں ”تحقیق و ارتقاء نعت“ یا ”نعت تحقیق و ارتقاء کے آئینے میں“ کے عنوان کے تحت کانفرنس کے بارے سوچا جائے۔

- (۲) سالانہ نعت کانفرنس کا عنوان مخصوص بھی سالانہ مقالات کی نسبت سے رکھا جاسکتا ہے۔
- (۳) اردو نعت کے ساتھ ساتھ نعت ریسرچ سینٹر کے لیے دیگر زبانوں میں نعت پر فروغ تحقیق کے لیے دیگر زبانوں کے محققین نعت کے ساتھ بھی روابط استوار کیے جائیں۔

(۴) نعت مبارک پر تحقیق اور فروغ و ارتقاء کے لیے اس شعبہ کے اصحاب علم و فن کی مدد سے موضوعاتِ نعت کی فہرست مرتب کروائی جائے۔

(۵) شعبہ اسلامیات، شعبہ اردو، شعبہ صحافت، شعبہ عربی، شعبہ انگریزی، شعبہ فارسی، شعبہ سندھی، شعبہ پنجابی وغیرہ میں ماسٹر درجہ، ایم۔ فل۔ درجہ، پی۔ ایچ۔ ڈی درجہ کے لیے مقالات کے عنوانات عصری تقاضوں کے پیش نظر نعت پر تحقیق کے لیے تجویز کرواتے جائیں۔

(۶) الیکٹرونک میڈیا پر پرنٹ میڈیا کے کلچرل ونگز کے تحت منعقد ہونے والی محافلِ نعت کا بھی ریکارڈ مرتب کرنے کے لیے اسائنمنٹس لکھنے، مضامین تحریر کرنے کی ترغیب دی جائے۔

(۷) سالانہ نعت کانفرنس میں اسلامیات، عربی، صحافت، قرآن و سنت اور لسانیات کے شعبہ جات کے ایسے مبارک نفوس جن کا اس موضوع کی طرف خوب میلان و رجحان ہو ان کی مشاورت کے حصول کی سعی و کاوش فرمائی جائے۔

(۸) یونیورسٹی کی سیرت چیئرمین کے ساتھ اس سلسلہ میں ربط و مراسلت رکھی جائے۔

(۹) ماہرینِ نصابیات و درسیات کو ماسٹر لیول پر مذکورہ بالا متعلقہ شعبہ جات میں نعت مبارک کے موضوع پر ایک کورس / ایک پپر تشکیل دینا چاہیے اور ایڈوانسڈ لیول پر بھی یعنی ایم۔ فل۔ پی۔ ایچ۔ ڈی درجہ بھی کورسز میں اس موضوع کی نمائندگی ہونی چاہیے۔

(۱۰) ملکی نصابیات و درسیات کے لیے تدریسی کورسز میں نعت سے متعلقہ مواد کی ترتیب و تدوین کے دوران ”انتخابِ نعت“ برائے نصابیات، پر تحقیقی و فنی مضامین لکھے جانے چاہیں جن میں ضرورتِ نعت، اہمیتِ نعت، کلاس لیول سے متعلقہ موضوعاتِ نعت، کلاس لیول سے متعلقہ ادبی محاسنِ نعت، کلاس لیول سے متعلقہ منتخب شدہ نعت پر مشقی و امتحانی سوالات کی تیاری وغیرہ جیسے عنوانات پر بھی مقالات تحریر کرنے کی ضرورت ہے اس طرف قدم اٹھایا جائے۔

(۱۱) اہل ثروت اور اہل دل نعت پاک جیسے مبارک و مستحسن تحقیقی کام کو پروان چڑھانے کے لیے ایسے اداروں کی معاونت کے لیے آگے بڑھیں اور ان اداروں کو بہتر وسائل اور اچھی سہولیات فراہم کرنے کے لیے مساعی فرمائیں۔

(۱۲) نعت رنگ پر پوز زیادہ سے زیادہ تعداد میں ادبی و تحقیقی جرائد، قومی اخبارات میں شائع کروائے جائیں۔ (۹۰۹/۲۵)

(۱۳) محققینِ نعت کا نیشنل انٹرنیشنل پینل ترتیب دیا جائے۔ ہر ”نعت رنگ“ میں کسی ایک

محقق نعت کا انٹرویو شائع فرمایا جائے!

(۱۴) پاکستان کی سرکاری و پرائیویٹ جامعات میں نعت پاک کے موضوع پر لکھے جانے والے معیاری اور مستند مقالات کی طباعت اور وسیع ترسیل کا نعت ریسرچ سنٹر کے فورم سے باقاعدہ اہتمام کیا جائے۔ اگر ممکن ہو سکے تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت مبارک پر تعلیم و تحقیق کے لیے ”حُسنِ فیلوشپ“ (سکالرشپ سکیم) کا اجرا فرمایا جائے۔ امید ہے اس میں عاشقانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خوشی سے حصہ ڈالیں گے۔

۱۵ (۱) نعت رائٹرز (ب) نعت (ج) نعت ری سائٹرز

ریسرچرز

(د) نعت کریکولم سلیبس ڈیزائنرز (محققینِ نعت) (نعت خوانان، نعت گو بیان)
(مصنفینِ نعت) (تدوین کاران / تشکیل کنندگان)

Na'at Reciters Na'at Na'at

Researcher Writers

Na'at / Na'at Curriculum

Designers

کے ہر زبان میں الگ الگ فورمز کی تشکیل پر توجہ فرمائی جائے۔

(۱۶) ارادے بلند، عزائم پختہ، توکل بر خدائے عزوجل، تمنائے نظر عطاء، مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ واللہ کے ہمراہ یہ امید، خواہش اور سوچ بھی وقت کی ضرورت ہے کہ اس نعت ریسرچ سنٹر کی چاروں صوبائی صدر مقامات پر ذیلی شاخوں کا قیام بھی عمل میں آئے! (سلیم اللہ جندران، ص ۲۵-۹۱۰-۹۰۷)

(۱۷) پاکستان میں تمام زبانوں میں پبلک / پرائیویٹ سیکٹر میں ماسٹر، ایم فل، پی۔ ایچ۔ ڈی درجہ پر جتنے بھی مقالات قیام پاکستان سے لے کر اب تک لکھے جا چکے ہیں اگر ان کا ایک مفصل، جامع انڈیکس کوئی محقق تیار فرمادے تو یہ اس شعبہ میں عظیم خدمت ہوگی۔ لاہور سے ایک فاضل دوست جناب حاجی محمد یوسف ورک صاحب نے نعت مبارک کے موضوع پر پیش ہونے والے مطبوعات کو اپنی مختلف اشاعتوں میں اپنی شاہدہ نعت لائبریری کی طرف سے شائع فرمایا

ہے بہر حال اگر ”پاکستانی جامعات و کلیات پر نعتیہ تحقیق“ کے عنوان کے طور پر مطبوعہ/ غیر مطبوعہ ماسٹر/ ماسٹر آف فلاسفی/ ڈاکٹر آف فلاسفی لیول کے سبجیکٹ/ ڈسپلن وائر مقالات کے مکانی و زمانی اشاریہ کے تحت اشاریے تیار ہو جائیں تو اس کی منفرد جہت ہوگی۔ اس کام کے دوران انگریزی زبان میں اس مجوزہ کام کے سلسلہ میں بوقت ضرورت راقم الحروف نعت پاک سے متعلقہ اپنے تین (۱) ایم ایڈ (۲) ایم اے (TEFL) (۳) پی ایچ ڈی درجہ کے تحقیقی مقالات کی تفصیل فراہم کر سکتا ہے۔ (ایضاً، ص ۲۵/ ۹۰۷)

(۷) ”نعت رنگ“ کے شماروں میں آپ نے نعت سے متعلق تقریباً سارے ہی اہم موضوعات پر مضامین و مباحث پیش کیے ہیں۔ لیکن شاید اب بھی نعتیہ ادب کی تخلیق، تنقید اور تحقیق کے کئی تازہ افق نادر یافت ہوں گے کیونکہ یہ صنف جو کم آب نہیں بحر یکراں ہے۔ دنیا کے دیگر اسلامی ممالک میں اور مختلف زبانوں میں کس طرح کا نعتیہ ادب لکھا جا رہا ہے، ان کی اصناف اور مضامین کی نوعیت کیا ہے؟ اس پر بھی تحقیق اور ترجمے کے لیے بڑی گنجائش موجود ہیں۔ (فراست رضوی، ص ۲۵/ ۹۰۴)

(۸) میری نظر سے ”شفاء الفواد“ سے پہلے کوئی اور کتاب ایسی نہیں گزری جس میں یہ تمام اشعار درج ہوں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی اگر عربی سے واقف ہیں تو ”كشف الظنون“ اور ایضاً المكنون، اور ”ہدیۃ المؤلفین“ وغیرہ سے محنت کر کے نعت رنگ کے لئے ایسی فہرست مرتب کر سکتے ہیں جس میں سیکڑوں کتابوں کے نام (مصنفین و مؤلفین کے نام، سنین وفات سمیت) جمع ہوں جو کہ نظم و نثر میں میلاد و سیرت اور مدائح وغیرہ کے حوالے سے یادگار بنائی گئی ہیں، یوں اُردو دان اہل تحقیق اس فہرست سے استفادہ کر لیں گے۔ قصیدہ بردہ کے حوالے سے مجھے خیال آیا تھا کہ اس کی شروح جو عربی میں ہیں، ان کا تذکرہ جمع کر دوں لیکن مجھے اتنی فرصت مل جائے تو جانے اور کتنے کام نمٹا لوں۔ (کوکب نورانی، ص ۳/ ۸۶)

(ب) تنقید

شاعرانہ اور غیر شاعرانہ لفظیات:

(شمس الرحمن فاروقی کا تنقیدی نقطہ نظر)

آپ کا تازہ شمارہ دیکھنے پر بھی وہی تاثر قائم ہوتا ہے جو گذشتہ کتابوں نے قائم کیا تھا

یعنی رطب اور یابس دونوں کو ماشاء اللہ وافر جگہ ملی ہے۔ ہم اردو والوں کی یہ عادت بھی پرانی ہے کہ الفاظ کا صرف بے دریغ کرتے ہیں اور بات بھی بہت ذرا سی نکلتی ہے، اگر نکلتی ہے۔ موجودہ شمارے کے اکثر مضامین کا یہی حال ہے۔ بعض لوگوں نے نئی یا گہری بات کہنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن ان کے مقدمات محل نظر ہیں۔ سلیم شہزاد صاحب نے بطور کوڈ لفظیات کو مختلف اقسام میں بانٹا ہے اور فرض کیا ہے کہ شعری زبان کچھ اور شے ہے اور نثری زبان کچھ اور شے۔ پھر وہ ’شعری‘ زبان کی مزید بہت سی قسمیں بیان کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے یہاں معلم صاحبان ’شاعرانہ‘ اور ’غیر شاعرانہ‘ الفاظ میں تفریق کرتے تھے حالانکہ اصول یہ ہے کہ کوئی بھی لفظ کسی صنف یا بیان کے لیے خاص نہیں۔ لفظ اگر مؤثر اور با معنی ہے اور مناسب جگہ پر استعمال ہوا ہے تو صحیح اور ’فصیح‘ ہے۔ بنیادی بات طریق استعمال اور موقع صرف کی ہے۔ امام عبدالقادر جرجانی سے لے کر علامہ شبلی نے اس اصول کو بیان اور قائم کیا ہے۔ نعت ہو یا غزل یا قصیدہ یا ہجو، ان کے لیے کوئی لفظیات مقرر نہیں۔ معاملہ صرف سیاق و سباق کا ہے۔ ’شاعرانہ‘ لفظ بھی غلط جگہ استعمال ہو تو لغو اور فضول اور ’غیر شاعرانہ‘ ٹھہرے گا۔ شہزاد صاحب نے بطور خود لفظیات کی تقسیم کر کے شعر کو اور خود اس صنف سخن کو، جس میں شاعر طبع آزمائی کر رہا ہے، ہر طرف سے بند کر دیا ہے۔ فلاں لفظ نعت میں نہ آنے پائے، نعت کی ایک مخصوص لفظیات ہے، فلاں لفظ مرثیے میں نہ آنے پائے، مرثیے کی ایک مخصوص لفظیات ہوتی ہے۔ ایسی پابندیاں تو اسکو لی استاد بھی عائد نہیں کرتے تھے۔ شاعر کا کام زبان کے امکانات کو وسیع کرنا ہے نہ کہ زبان کو تنگ اور محدود کرنا۔ پرانے لوگوں نے خود پر یہ لازم کر لیا کہ بعض الفاظ کو ’متروک‘ قرار دیا جائے۔ بھلا سوچیے، کوئی بھی شخص، کواد وہ کتنا ہی بڑا شاعر کیوں نہ ہو، یہ استحقاق کہاں سے لاسکتا ہے کہ کسی بھی اچھے بھلے لفظ کو برادری سے خارج کر دے؟ آخر یہ حماقت تھی کہ نہیں کہ ’استادوں‘ نے ’سیتی‘، ’ملک‘، ’آگو‘، ’اندھیاری‘ جیسے سیکڑوں الفاظ کو ’غیر شاعرانہ‘ یا ’غیر فصیح‘ قرار دے لیا؟ زبان کا دائرہ تنگ ہوا تو بلا سے ہوا۔ عام طور پر لسانی تہذیبوں میں تو شاعر اس بات پر فخر کرتا ہے کہ ہم نے زبان میں الفاظ اضافہ کیے لیکن ہم اس بات پر اکتڑتے تھے کہ ہم نے الفاظ کم کر دیے۔ اب سلیم شہزاد صاحب ’شاعرانہ‘ اور ’نثری‘ الفاظ کو الگ الگ قرار دینے ہی پر اکتفا نہیں کرتے، ہر صنف سخن کی بھی لفظیات کو متعین کرنے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ وہ نعت کی لفظیات میں صرف انھیں خوش نصیب لفظوں کو باردینے کا حق اپنے لیے مخصوص کرتے ہیں جو ان کے خیال میں ’نعتیہ‘ ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ قرآن شریف کا

حوالہ دے کر بحث کو ادبیات کے بجائے دینیات کے میدان میں لے جاتے ہیں۔ اگر سلیم احمد کی نعت میں وہ الفاظ نہیں ہیں جو شہزاد صاحب کے خیال میں نعت سے مختص ہیں، تو سلیم احمد مطعون ہوتے ہیں اور یہی نہیں، بلکہ وہ قرآن شریف کی روشنی میں مردود بھی ٹھہرتے ہیں۔ معلوم نہیں سلیم شہزاد صاحب نے اقبال کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں۔ اور اگر ہاں، تو کیا انھیں اقبال کے نعتیہ کلام میں وہی اور صرف وہی لفظ دکھائی دیتے جنہیں وہ نعت کا لازمہ سمجھتے ہیں؟ اگر نئے مضمون نکالنا، نئی بات کہنے کی کوشش کرنا، اگر گھسے پٹے راستوں سے ہٹ کر چلنا اور پھر بھی نعت رسول کا حق ادا کرنا لغو دانشورانہ اظہار کے سوا کچھ نہیں، تو سعدی سے لے کر غالب اور غالب سے لے کر اقبال تک سب بڑے شاعر اس لغو دانشورانہ اظہار کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

(شمس الرحمن فاروقی، ۷ فروری ۲۰۱۹ء، غیر مطبوعہ)

تنقید نعت اور شعری تخلیقی رویے:

پچھلے دنوں میں، سر آرتھر ڈگلن کا ایک خطبہ پڑھا تھا۔ سر آرتھر ڈگلن نے سوارتھ مور لیکچر شپ (Swarthmore Lectureship) کے زیر اہتمام ”دارالاحباب“ (Friends House) لندن میں، سن 1929ء میں ”غیب و شہود“ کے عنوان سے اپنا یہ خطبہ پڑھا تھا۔ اس خطبے کا اردو ترجمہ معروف اسکالر سید نذیر نیازی نے کیا ہے۔ یہ نذیر نیازی علامہ اقبال کے بہت قریب رہے ہیں۔ علامہ کے خطبات ”The Reconstruction of Religious Thought in Islam“ کا ترجمہ بھی ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ کے عنوان سے، ان ہی نے کیا تھا۔ علامہ کی سوانح حیات بھی دانائے راز“ کے نام سے لکھی تھی۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ جناب نذیر نیازی کے ترجمے کے باعث مجھے ”غیب و شہود“ کا مطالعہ کرنے میں سہولت رہی۔ مترجم کے بقول، ڈگلن کا شمار سربراہان سائنس دانوں میں ہوتا ہے۔ یہ اور بات کہ وہ سائنس کے ساتھ ساتھ فلسفے اور مذہب کے موضوعات میں بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے دوران میں جب تم میرے پاس آئے تھے تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ڈگلن نے دو باتیں بڑی معنی خیز کہی ہیں..... وہ کہتا ہے:

۱۔ ”برقی ذروں کے اجتماع سے جو شروع شروع کی حالت فساد میں ہر طرف پراگندہ تھے،

مادے کی ۹۲ مختلف قسمیں یا ۹۲ کیمیائی عناصر پیدا ہوئے۔“

۲۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس حقیقت کا اظہار کیا جائے بھی تو کیسے کہ فطرت کے حساب میں اگر ۶ کا عدد نہ ہوتا تو حیات نامیہ کا آغاز بھی نہ ہوتا۔“

میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ڈگلن کی دریافت نے مجھے، حقیقت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تفہیم کا سائنسی نکتہ بھمایا ہے۔ کیوں کہ ۹۲ کا عدد حضور اکرم ﷺ کے نام نامی ”محمدؐ“ کا عدد ہے۔ لہذا، اس انکشاف سے میرے لیے اس قطعے کی تفہیم اور آسان ہو گئی ہے جو اقبال نے فلک مشتری پر حسین بن منصور حلاج کی زبان سے ادا کروایا تھا:

ہر کجا بنی جہان رنگ و بو آں کہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفیٰ اور را بہا ست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جہان مشہود میں جہاں جہاں بھی آرزوؤں کی پیدائش کا منبع ہے، اس میں جتنی بھی روشنی اور، چمک دمک ہے..... اور جس کے باعث اس کی قیمت یا قدر (Value) متعین ہو چکی ہے، وہ مصطفیٰ ﷺ کے نور کا فیضان ہے..... اور جہاں یہ روشنی نہیں ہے وہ عالم شہود، حضور اکرم ﷺ کے نور کا متلاشی ہے کیوں کہ وہ [عالم شہود]، غیب (پوشیدہ حقیقت محمدیہ ﷺ) سے اتصال کے بغیر نامکمل ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک سائنس داں تو ۹۲ کی حقیقت جاننے کے لیے عالم شہود سے عالم غیب کا سراغ لگانے کے لیے بے چین ہے۔ لیکن جو مسلمان حضور اکرم ﷺ کے لائے ہوئے دین کے طفیل ”عالم غیب“ پر ایمان رکھتے ہیں وہ حقیقت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی معرفت کی طرف قدم بڑھانے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ ان لوگوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں جو حقیقت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی معرفت کے مراحل طے کر کے، ان کی طرف علامتی زبان میں اشارے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فی الحال میرا یہ ارادہ نہیں ہے کہ میں اس ادق موضوع پر قلم فرسائی کروں۔ تاہم یہ اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، کہ نعتیہ شاعری کے تخلیقی رویوں کا مطالعہ سہ ابعادی (Three dimensional) پہلوؤں سے کیا جانا چاہیے۔ یعنی [۱] عوامی سطح کی شاعری..... [۲] شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی شعری تخلیقات..... [۳] صوفیانہ مشاہدات و تجربات کے عکس کی حامل نعتیہ شعری تخلیقات۔

ناقدین کو ہر قسم کی شاعری کو اسی ذہنی و فکری تناظر میں دیکھ کر بات کرنی چاہیے۔

مثلاً جو لوگ حضور اکرم ﷺ سے براہ راست مخاطبہ کرتے ہیں انھیں ”حاضر و ناظر“ کے شرعی نکتہء نظر کے یک رخ پہلو کی روشنی میں رد کرنے کا رویہ اپنانے کے بجائے۔ عام شعری تخلیقات کے محرکات پر غور کرنا چاہیے۔

میں اس موضوع پر پہلے بھی کسی تحریر میں اپنا موقف بیان کر چکا ہوں، یہاں بھی اشارۃً کہہ دیتا ہوں کہ دنیا کا ہر شاعر، اپنے محبوب کو سامنے بٹھا کر نہ تو اس کے حسن کی تعریف کرتا ہے اور نہ ہی اس سے گلے شکوے کرتا ہے۔ وہ تو ہر شعر اپنے محبوب کو سامنے تصور کر کے ہی کہتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ عالم شہود کے علاوہ کسی اور عالم کی کیفیات کو لایعنی اور باطل تصور کرنے والے ناقدین، ان اشعار کی تشریح کیسے کریں گے؟؟؟

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومن)
دل سے مٹا تری انکسرتِ حنائی کا خیال ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا (غالب)
کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ (فراز)
کیا کوئی نقاد یہ کہہ سکتا ہے کہ ہر شاعر کا محبوب اس کے گھر کے سامنے والے گھر کی، کھڑکی میں موجود تھا..... اس واث شعراء نے یہ اشعار کہہ کر اس کو مخاطب کیا؟؟؟
اگر ان اشعار کی تشریح اس طرح کی صورت حال کو سامنے رکھ کر کی جائے گی تو ادبی مزاج رکھنے والا کوئی معمولی درجے کا طالب علم بھی یہ کہہ دے گا کہ، اس طرح کا وصال میسر ہونے کی صورت میں شاعری کیوں کر ممکن ہوئی..... کیوں کہ ایسی صورت میں شاعر صرف، کچھ ایسے اشعار کہتا ہے، فراق کا شکوہ نہیں کرتا:

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں؟
(یعنی شاعری کروں)..... (فراق گورکھپوری)
تو میرے بھائی صبیح! جو لوگ عام دنیاوی محبوبوں کے شعری ذکر کو حاضر و ناظر کے زمرے میں رکھ کر نہیں دیکھتے وہ ایسا کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ نعتیہ شاعری کرتے ہوئے ہر شاعر حضور اکرم ﷺ کو اپنے سے دور سمجھے گا؟؟؟

میں اس موضوع پر تفصیل سے کبھی لکھوں گا..... ان شاء اللہ!
خط کے آغاز میں، میں نے ایڈیٹنگ کے حوالے سے دو نکات پر اشارۃً کچھ عرض کرنے کی ٹھانی تھی۔ پہلا نکتہ تو کسی حد تک سطور بالا میں آ گیا ہے۔ رہا دوسرا نکتہ یعنی..... ”میری سمجھ میں نہیں

آتا کہ اس حقیقت کا اظہار کیا جائے بھی تو کیسے کہ فطرت کے حساب میں اگر ۶ کا عدد نہ ہوتا تو حیات نامیہ کا آغاز بھی نہ ہوتا..... ایڈیٹنگ کا بیان کردہ یہ نکتہ، قرآن کی چھ یوم میں تخلیقی کام کی تکمیل والے نکتے کی تشریح معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چھ یوم میں کام کی تکمیل کے اشارے سورہ اعراف، یونس، ہود، فرقان، السجدہ، حق، حدید اور سورہ مجادلہ میں کیے ہیں۔ کہیں صرف ارض و سموات کا ذکر کیا ہے اور کہیں ”وما بینھما“ کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مثلاً سورہ ”حق“ کی آیت ۳۸ میں ارشاد ہوا.....

”وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ..... بلاشبہ پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان سب چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں، چھ دنوں میں۔“
اس لیے میرا خیال ہے کہ سائنسی ذہن رکھنے والے ناقدین کو اس طرف متوجہ کرنا ضروری ہے کہ علم کا کام شہود سے غیب اور غیب سے شہود کی گتھیوں کو سلجھانے سے عبارت ہے۔ لہذا احمد و نعت کے شعری لوازم (Matter) کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

صوفیانہ کیفیات کو شعری سانچوں میں ڈھلتا ہوا دیکھ کر فتاویٰ جاری کرنے کے بجائے، شعراء کی روحانی واردات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ یہ الگ بات کہ کچھ باتیں شطیحات کی سطح کی بھی ہوتی ہیں۔ جن کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ..... یہ حال [کیفیات عالم غیب] کی باتیں ہیں، عالم شہود میں رہنے والے اہل قال، ان باتوں سے نابلد ہیں۔ لہذا انھیں چاہیے کہ بغیر سمجھے بوجھان باتوں کو اپنا موضوع تفہیم نہ بنائیں۔ (ڈاکٹر عزیز احسن، ص ۲۸/۳۷-۵۷-۵۷)

نعت غیر تخلیقی شاعری اور شاعرانہ حسن بیان:

یاد نبی کی جوت سے جو دل جگمگ جگمگ جگمگ ہے
اس کے سر پر رحمت باری پگ پگ پگ پگ پگ پگ ہے
اسی شعر سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کلام کس پائے کا ہوگا اور یہ ”پگ پگ پگ“ کی آواز کدھر کی مترنم کہی جاسکتی ہے۔ بس محض یہ نعرہ ہی لگایا جاسکتا ہے ”اللہ غنی“ (احمد صغیر صدیقی ص ۶۲)
مدحتوں کے حصے میں بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا چاہوں گا کہ نعتوں میں وہ شاعرانہ حسن، شعری جمالیات کا اہتمام اور کرافٹ نظر نہیں آیا جو ہونا چاہیے۔ اشعار میں جب تک شعری حسن نہ ہو وہ Versification بن جاتا ہے۔ یعنی نثر کو نثریت کے ساتھ نظم کر دینا۔ سادے

سادے سے اشعار کہنے کے بجائے اس شعری حسن کے ساتھ پیش کرنے کی کوششوں کی ضرورت ہے تاکہ نعت شاعری میں اپنا مقام بنا سکے۔ اب ذرا یہ شعر دیکھیں:

جو گالی دیں آقا پر بر سائیں پتھر حضور ان کے حق میں دُعا کر رہے ہیں
ظاہر ہے کہ یہ شعر عروضی سے لحاظ ٹھیک ہے مگر اس میں برہنہ گفتاری ہے۔

اب ذرا ماجد خلیل کا یہ شعر دیکھیں:

اک لفظ سے بنے ہوئے جہاں میں اک نام سے روشنی ہوتی ہے
اس شعر میں شعری رچاؤ ہے۔ یا یہ شعر دیکھیں جناب احسان اکبر کہتے ہیں:

رکھو مجھے نظروں میں مجھ پر ابھی گزرے گا اک اور زمیں اندر اک اور زمانہ بھی
یہ شعر کھلا ڈالا نہیں اور پورے شاعرانہ حسن کو سمیٹے ہوئے ہے۔ جناب شیو بہادر سنگھ کی
لکھی نعت دوسری نعتوں سے بہتر لگی: (احمد صغیر صدیقی ص، ۸۰)

معطر کر رہی ہے بزم عالم کی فضاؤں کو صبا شاید کہ چھو کر آ رہی ہے آپ کا دامن
عزیز احسن اور رشید وارثی:

سات مضامین میں چار تو معرکہ آرا کہے جاسکتے ہیں۔ خصوصیت سے عزیز احسن صاحب کے مضمون ”نعت اور شعریت“ نے بہت متاثر کیا۔ اُن کے علم اور مطالعے اور ذوق نے مجھ پر گہرے اثرات ڈالے۔ عزیز احسن کے تنقیدی مضامین میں نے ادبی جریوں میں پہلے نہیں دیکھے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک سچے اور بہترین ناقد ہیں اور یہ جو ہمارے پاس ڈھیروں دانش ور ”پروفیسر“ اور ”ڈاکٹر“ قسم کے ناقد بھرے ہوئے ہیں ان سے وہ رُتبے میں کہیں افضل نظر آئے۔ کچھ ایسا ہی میں نے رشید وارثی صاحب کے مضمون کو پایا کیا ہی عمدہ باتیں لکھی ہیں۔ انھوں نے اور کیا خوبی ہی سے انھوں نے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف برتنا اس کی داد دینا نا انصافی ہوگی۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ اس قسم کی نشان دہی شعرائے کرام کو اتنی بری لگتی ہے کہ اُن کے دہانوں سے کف نکلنے لگتا ہے۔ (احمد صغیر صدیقی ص، ۴۶)

شاعری اور عجز بیانی:

سوال یہ ہے کہ اسے نعتیہ شعر کہا جاسکتا ہے؟ میرے خیال میں اسے قوم کا مرثیہ ضرور کہا جاسکتا ہے۔ اب ذرا اس نعت کا مطلع دیکھیں:

خواہشیں ہوں حرف کی صورت بیاں کیوں کر حضور

ترجمانِ حالِ دل ہے جب یہ چشم تر حضور

اس شعر کو سمجھیے یوں لکھنا ہے کہ چشم تر نے حالِ دل کا ترجمان بن کر شاعر کے لیے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے اور اب وہ اسی سبب سے اپنی خواہشوں کو بہ صورت حرف بیان ہی نہیں کر سکتا... حالانکہ صورت یوں ہے کہ شاعر کہنا چاہتا تھا کہ اب خواہشوں کو حرف کی صورت بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی کیوں کہ اس کی غم آنکھیں اس کے دل کی ترجمانی کر رہی ہیں... یہ شعر عجز بیان کا ایک نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ نعت کے بقیہ شعر بھی شاعر کی شہرت کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

(احمد صغیر صدیقی ص، ۶۸)

دوسرا مضمون گوہر ملیانی صاحب کا ہے۔ ”جمال محسن انسانیت نعت کے آئینے میں“ اس کے بارے میں میں کیا کہوں۔ اس میں بہت سی ایسی نعتوں اور بہت سے ایسے اشعار کو ڈالا گیا ہے جو اپنی کم زوری کی وجہ سے مضمون کو سنبھالا نہیں دے سکے ہیں۔ ان میں زبان کے سقم بھی ہیں اور خیال کی کم زوریاں بھی۔ صرف چند ایک پیش ہیں:

۱۔ مصرع ہے: مرے نبی کی نوائے باطل گدازا بھری (باطل گداز؟)

۲۔ مکہ کے سرداروں اہل طائف نے۔ کیسے کیسے ظلم نبی پر ڈھائے ہیں (یہ شعر سپاٹ سا ہے نثر جیسا۔ اور جمال محسن انسانیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں بنتا۔)

۳۔ مصرع ”انھیں کے نقش پا سے گنبد بے در چمکتا ہے۔ (ذرا شاعر کا علو خیال ملاحظہ ہو۔)

۴۔ ”لے جاؤں لحد میں میں تمنائے محمد“ (اس میں ”میں میں“ پر توجہ دیں)

جمال محمد مصطفیٰ ۷ کے بیان کے لیے اعلا درجے کی نعتیں اور عمدہ اشعار کی ضرورت تھی جو اس مضمون میں نہیں ملتے۔

میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ یہ سب کیا لکھا گیا ہے۔ صحابی عربی تھے اور نعت کا مقطع انھوں نے فارسی زبان میں اُحد کی ریت میں لکھ دیا۔ عجب ہی ماجرا ہے کچھ۔

(احمد صغیر صدیقی ص، ۸۵)

رسالے کے ”فکرفن“ کے حصے میں پانچ عدولت گو شعرا کے کلام کے محاسن لکھے گئے ہیں۔ تبھی سب کے سب تقریظی ہیں۔ ان میں عزیز احسن صاحب کا مضمون جو جناب احسان اکبر

پر ہے اس لائق ہے کہ اس پر کچھ گفتگو کی جائے۔ اُمید تو یہی تھی کہ مضمون ”ناقدا نہ“ ہوگا مگر یہ ”فدویانہ“ ثابت ہوا۔ عزیز احسن صاحب لکھتے ہیں:

پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر کا شعر عقیدت میرے لیے شعری و شرعی اعتبار سے نہ صرف قابل قبول ہے بلکہ انتہائی درجے پر لائق تحسین ہے۔ کیوں کہ ان کی شاعری اسلوب بیانی سطح پر دل میں ترازو ہو جانے والی اور Content کے حوالے سے سند قبول پانے کی حامل ہے۔

یہ بیان بتا رہا ہے کہ مضمون نگار اپنے ممدوح سے کس حد تک متاثر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تاثر کے تلے دبے مضمون نگار سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ معروضی انداز میں تنقید کا حق ادا کر سکے گا۔ عزیز احسن صاحب کو اپنے ممدوح کے کلام میں ”اسلوب بیانی سطح پر نازاں کتوں کا از حد خیال نظر آتا ہے۔ سو ذرا اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

انھوں نے جناب احسان اکبر کی شاعری کے جو نمونے کوٹ کیے ہیں، ذرا ان میں سے یہ مصرع دیکھیے:

ع وہ جو کوئی کچھ نہیں جانتا وہ بھی جانتا ترانا نام ہے

”جانتا ترانا نام ہے“ یہ کون سی زبان ہے؟ کیا اس مصرع کا Construction شعری اعتبار سے اچھا کہا جاسکتا ہے۔ فیصلہ آپ خود کریں۔

اب ایک اور مصرع دیکھیے: ”کوئی تقویٰ نہ کوئی پاس فضیلت اپنے“ کہنا تھا کہ اپنے پاس کوئی فضیلت ہے نہ تقویٰ اور شعر میں ”کوئی پاس فضیلت اپنے“ لکھا گیا۔ یہ تنقید کی ایک بڑی مثال ہی نہیں شاعر کے عجز بیان کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اس بیان کو اسلوب بیانی سطح پر دل میں ترازو ہو جانے والا کہا جاسکتا ہے مگر اس Sense میں نہیں جس میں عزیز احسن صاحب نے لکھا ہے۔

اور دیکھیے، یہ مصرع: فن نعت کوئی ہنر نہیں یہ ہے قلب و چشم کی حاضری اس میں ذرا ”فن نعت“ پڑھیے۔ کیا اس میں عیب تافریج جھلک نہیں ملتی؟ اب ایک مصرعے کا آخری حصہ دیکھیں۔

”ہیں بشر تو مگر ساتھ اللہ کے آپ کے مشترک تیں نام ایک ہیں“

اور مشترک تیں نام سے اندازہ لگائیں کہ یہ مصرع اپنے اندر کیا ”خوبی“ رکھتا ہے۔

اب یہ مصرع ملاحظہ ہو۔ ع ”دیں دنیا کے درد کا مرہم V“

”دیں دنیا“ کیسا لگ رہا ہے۔ یہ آسانی سے ”دنیا و دیں“ لکھا جاسکتا تھا۔ اس سے سلاست پیدا ہو جاتی ہے اور ”دیں دنیا“ کا مفہوم دین دنیا سے الگ ہے یہ بھی دیکھیں۔

ایک مصرع اور دیکھیں: ع ”پیام آپ کو بہ کو آگیا“

”کو بہ کو آنا؟“ کیا اسی طرح بولا جاتا ہے؟ کو بہ کو پھیلتا، پہنچتا تو چل سکتا تھا مگر یہ ”آنا؟“ کیا اسلوب بیانی سطح کی بلندی یہی ہے؟

ایک مصرع اور دیکھیں: ع ”پتھروں بیچ نرمی کا اکھوا کھلا“

اکھوا پھوٹنا محاورہ ہے کھلنا نہیں۔ پھول کھلتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ مثالیں کافی ہیں جن کی بنیاد پر مضمون کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس مضمون کا نام ”اسلوب شناس شاعر“ رکھا گیا ہے جب کہ صاحب اسلوب وغیرہ ہونا چاہیے تھا۔ اس کا ”رمز“ سمجھ میں نہ آسکا۔

اب ہم دوسرے تقریبی مضمون کی سمت رجوع کریں گے۔ یہ مضمون جناب پروفیسر منظر ایوبی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک نعت طاہر سلطانی کی حمد یہ شاعری پران کی جانب سے نچھاور کیے ہوئے پھولوں جیسا ہے۔ اس میں بھی مضمون نگار اپنے ممدوح کے ”لب و لہجہ کی پاکیزگی اور اسلوب کی طہارت“ میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اس حد تک اسے ممدوح کے کلام میں تلمیحی اشاروں کے غیر محتاط رویوں کا ذرا بھی پتا نہیں چل سکتا ہے۔ اس نے جوش عقیدت میں اپنے ممدوح کا یہ شعر بھی کوٹ کر دیا ہے:

کس کو ادراک جہاں تو ہے وہاں کوئی نہیں

تو ہی موسیٰ کا عصا مصر کے بازار میں تو

شاعر محترم نے اس میں اللہ تعالیٰ کو موسیٰ کا عصا قرار دے دیا ہے۔ ”تو ہی موسیٰ کا عصا“

اب کچھ ذکر ظفر علی راجا صاحب کے مضمون ”انور سدید کی حمد و نعت“ مجھے اس کا عنوان خاصا دلچسپ محسوس ہو رہا ہے۔ اسے توجہ سے پڑھیں۔ یہ مضمون بھی حسینی ہے اس میں مضمون نگار نے بعض بعض اشعار بغیر احتساب کیے تعریف کے لائق قرار دے دیے ہیں۔ یہ شعر دیکھیں:

نعت پیغمبر آخر لکھوں دل کو ہے فکر کہ کیوں کر لکھوں

اس میں ”آخر“ پر توجہ دیں (یعنی خ ر پر زیر ہے) جب کہ ”آخر“ کے معنی آخری نہیں

بلکہ ”اور“ ایک دوسرا ایک اور وغیرہ ہیں۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

زادِ حیات اسوۂ نبی کریم ہے انورِ سدید کا ہے یہ ارمان یا رسول
اس شعر کی نثر بنائیے۔ یا رسول انورِ سدید کا ارمان ہے کہ زادِ حیات اسوۂ نبی کریم ہو۔ لگتا
ہے اسوۂ نبی کریم کوئی اور چیز ہے۔ جس کی فرمائش رسول سے کی جا رہی ہے۔ حالانکہ کہنا یوں تھا
کہ یا رسول انورِ سدید کا ارمان ہے کہ ان کا زادِ حیات آپ کا اسوۂ ہو۔ شاعر اچھی طرح بات لکھ نہیں
سکا اور پھر ذرا ”اسوۂ نبی کریم“ پر توجہ دی۔ یہ ”اسوۂ نبی کریم“ ہونا چاہیے جو اس شعر میں فٹ ہی نہیں
ہو رہا ہے۔ راجا صاحب نے اس تحریر پر بہت محبت بھری نظر ڈالی ہے۔ ایک اور شعر دیکھیں:

میں خزاں دیدہ شجر ہوں یہ یقین ہے مجھ کو
مجھ پہ برسے گا ان کا گھٹا کی صورت

”خزاں دیدہ“ کے بجائے محل ”خزاں رسیدہ“ کا تھا اور کیا خزاں رسیدہ شجر پر گھٹا نہیں
برستی؟ بات اس طرح کہی گئی ہے گویا یہ کوئی امر محال ہوتا ہے۔ ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

میں انائے ذات میں کرتا رہا ہوں پرورش
توڑ ڈالا اب مگر یہ سلسلہ تیرے لیے

نہیں معلوم کہ انائے ذات میں کیا پرورش کرتے رہے تھے؟ یہ شعر اچھا تو نہیں کہا جاسکتا۔

ان باتوں کے باوجود ایک بات ضرور کہنے کی ہے کہ جناب انورِ سدید کی ”شاعری“
سے ان کی نعتیہ شاعری کہیں اچھی ہے۔ ان کی اس شاعری سے مجھے راجا صاحب کے مضمون کے
ذریعے تعارف حاصل ہوا ہے۔ راجا صاحب کا یہ مضمون بہر حال اچھا لکھا ہوا ہے اور جو کلام کوٹ
کیا گیا ہے اس کا بڑا حصہ اچھے اشعار پر مشتمل ہے جس کا کریڈٹ انورِ سدید صاحب کو جاتا ہے۔

اب ذرا ”مطالعات نعت“ کا حصہ دیکھتے ہیں۔ اس میں 3 عدد مضامین ہیں جو تین اہل
قلم کی کتابوں کے جائزے سے متعلق ہیں۔ انھیں جائزہ تو نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ ”تعارف“ ضرور
کہے جاسکتے ہیں۔ اس میں عارف منصور صاحب کے لکھے کتابوں پر تبصرے بھی شامل ہیں۔ عارف
منصور کے تبصرے Balanced ہوتے ہیں ان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

رسالے کا وہ حصہ جو ”مدحتوں“ سے متعلق ہے اس میں اس چھتیس اشعار کی نعتیں شامل
ہیں افسوس یہ حصہ حسب سابق کوئی اچھا Impact نہیں دے رہا ہے۔ امجد اسلام امجد، خورشید
رضوی (ایک نعت) سجاد خن، ریاض حسین چودھری، راجندر سکسینہ، قاضی عنایت الرحمن، ناز قادری
اور رشید امین کی نعتیں قدرے بہتر ہیں۔ ورنہ اس میں ایک بڑی تعداد میں ایسی نعتیں ہیں اور ایسے

اشعار موجود ہیں جسے ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

(۱) ہر ایک نبی انھیں کے لیے ایک ولی انھی کے لیے

وہ کنزِ خفی حدیث پر ڈھو خدا بہ خدا نبی کے لیے

(۲) اپنے تو ہے ہر غم کی دوا شہرِ نبی میں

(۳) ہودیدہ ہُندُم (دیدہ نہیں دیدہ ہُندُم، اور یہ دیدہ کیسا لگ رہا ہے؟)

(۴) لفظِ شرب میں کہاں ہے کوئی خوبی و کمال

اس لیے کہنا پڑا تھا آپ کو طیبہ حضور

(۵) مجھ کو پکڑیں نہ اگر فضلِ خدا دیکھیں تو

اسی حصے میں ایک ”زبردست“ نعتیہ نظم بھی ہے جس کا عنوان ہے، ”سنہری گردِ طیبہ“
چند لائنیں ملاحظہ ہوں:

(۱) کہ ہم، ہمارے گزشتہ کو۔ پرت پرت سامنے سے دیکھیں۔ (کہ ہم ہمارے) کے بارے
میں کیا خیال ہے؟

(۲) تمھاری راہ فرار کے نقشِ پاتلا شیں (راہ فرار پر توجہ دیں۔ یہ بیان نبی کے لیے ہے اور راہ
فرار کے نقشِ پاکیا ہوتے ہیں۔

(۳) جہاں بہ نفس نفیس تم خود... ڈٹے ہوئے تھے۔ (ڈٹے ہوئے پر توجہ دیں)“

(۴) کہ گردنے ہی شکمِ مبارک (”شکمِ مبارک پر“ توجہ دیں یہ شکمِ مبارک نہیں ہے)

(۵) یہی تمھاری دعا کے نخل اثر ہے جس کی گداز بحسب (شاعر کے علو خیال کو دیکھیں اور الفاظ
کے میل جول کو سمجھیں)

یہاں اشعار کے نام نہیں دیے جا رہے ہیں بات صرف ان کی تخلیقات کی ہو رہی ہے جو رسالہ کے
مدحتوں کے سیشن میں اپنی چھب دکھا رہی ہیں۔ (احمد صغیر صدیقی ص ۸۹-۸۵)

اقبال کی نظم ”ذوق و شوق“: ایک مطالعہ:

تازہ شمار، علامہ اقبال کی نظم ”ذوق و شوق“ پر پروفیسر افضال احمد انور کی کاوش
پسندیدہ ہے۔ انھوں نے نہایت محنت سے عرق ریزی اور جاں فشانی سے علامہ اقبال ہی کے
اشعار سے ثابت کر دیا ہے کہ ذوق و شوق حمد نہیں بلکہ خالصتاً نعت ہے۔ ڈاکٹر عبدالغنی بہت بڑے

ادیب، بلند پایہ محقق اور نقاد ہوں گے لیکن ان کے دلائل بودے، کم زور اور حقائق سے بعید ہیں۔ ایک وجہ یہ بھی ہے شاید کہ بریلویوں کے مقابلے میں ایسے گروہ اور افراد پیدا ہو رہے ہیں جو بزمِ خویش توحید پرست بنتے ہیں اور نعت کو بہت کم اہمیت دیتے ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ اس لیے نعت گو شاعر بریلویوں سے قریب ہو جاتا ہے اس لیے اب اُسے ”توحیدی“ ثابت کرنے کے لیے ایسا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے خیال میں وہ نقاد ہونے کے زعم میں اور نیا خیال و نظریہ پیش کرنے کی کوشش میں راہِ حق سے بھٹک گئے ہیں۔ جس طرح فلسفی کے بارے میں مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا تھا:

ڈور کو سلجھا رہے ہے اور سرا ملتا نہیں
فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں

(اس شعر کے مصرع آگے پیچھے ہو سکتے ہیں فقط یاد کے سہارے لکھ رہا ہوں۔) اس طرح آج کل کے نقاد حضرات، تنقید کے شوق فراوان کے ضبط میں مبتلا ہو کر ایسی ایسی بے پرکی ہانک جاتے ہیں کہ انسان شش در رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ”حسن ازل“ کی ترکیب سے ”محبوب حقیقی“ مراد لے لیا ہے۔ حالانکہ اصل ترکیب ”حسن ازل کی نمود“ ہے۔ جوش استدلالیت میں ڈاکٹر موصوف نے ”نمود“ کو نظر انداز کر دیا ہے جس سے دراصل معانی واضح ہو جاتے ہیں۔

درحقیقت ہمارے خیال میں ”ذوق و شوق“ قصیدہ نمائند ہے بلکہ قصیدہ کے معیار پر پورا اُترتا ہے، اس لیے تغزل بھی موجود ہے۔ اس میں پہلا بند بالکل قصیدے کی طرح ہے۔ قصیدے میں آغاز ہمیشہ کسی جگہ مقام یا موسم یا وقت کی تعریف و توصیف ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے پہلے بند میں شہرِ مدینہ کے نواح میں ”صبح“ کے وقت کو موضوع بنایا ہے اور اسی پر اپنا زورِ قلم صرف کر دیا ہے جس کا ثبوت پہلے ہی مصرع میں ”صبح کا سماں“ کی ترکیب میں موجود ہے اور دوسرے مصرع میں چشمہ آفتاب سے ”نور کی ندیاں“ رواں کہہ کر اپنے دعویٰ کی دلیل پیش کر دی ہے۔ آپ کسی ریگستان یا صحرا میں ”صبح کے سماں“ کا تصور کیجیے، آفتاب طلوع ہو رہا ہو، کھلے اور صاف شفاف میدان میں سورج کی کرنیں پھیل رہی ہیں۔ (ہوا تازہ اور صاف و شفاف ہے۔) علامہ اب آگے بڑھتے ہیں تو اس منظر کو ”حسن ازل کی نمود“ قرار دیتے ہیں، سورج اور اُس کی روشنی، حسن ازل کی نمود نہیں تو اور کیا ہے؟ علامہ اس منظر کو شعری حسن دیتے ہوئے ”نور کی ندیاں“ قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد سرخ و کبود، نیلی اور سرخ بدلیاں کیا خوب صورت منظر نگاری ہے،

راقم کو مدینہ شریف میں صبح کے وقت ان بدلیوں کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ سورج کے طلوع کا منظر بھی دیکھا ہے۔ جسے دیکھ کر خاکسار وہاں وجد کے عالم میں جھومتا رہا اور ذوق و شوق کے اشعار پڑھ کر محظوظ ہوتا رہا۔

اسی طرح کوہِ اضم، وادی کاظمہ کی تراکیب، سرزمینِ مدینہ کو ثابت کر دیتی ہیں۔ دراصل علامہ کا یہ قصیدہ، مشہور قصیدہ نگار امام سعید بوصیریؒ کے تتبع میں لکھا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ بوصیریؒ سے بہت متاثر ہیں، چنانچہ دو مقامات پر بوصیریؒ کا ذکر کرتے ہیں:

اے بوصیریت را ردا بخشنده بربطِ سلمیٰ مرا بخشنده
(رموز بے خودی، عرض حال مصنف بحضور رحمت للعالمین)

یعنی یا رسول اللہ ﷺ! جس طرح آپ نے بوصیریؒ کو اپنی ردا (چادر) عطا فرمائی ہے، جابی اس چادر کو بردِ یمانی کہتے ہیں اسی طرح مجھے شعر و شاعری کا ذوق اور ملکہ عطا کیا ہے۔ دوسری جگہ مثنوی ”پس چہ باید کرد“ میں ”در حضور رسالت مآب“ میں فرماتے ہیں:

چوں بوصیریؒ از تو می خواہم کشود
تا بمن باز آید آں روزے کہ بود

یہاں علامہ اقبالؒ خواب میں سرسید احمد خاں کے ارشاد پر عمل کرتے ہوئے اپنی صحت کے لیے دعا گو ہیں اور عرض کرتے ہیں جس طرح آپ نے اپنی چادر مبارک بخش کر بوصیریؒ کو صحت سے ہم کنار کیا تھا اسی طرح مجھ پر کرم فرمائیے تاکہ میری صحت بحال ہو جائے اور میری تن درستی کے دن لوٹ آئیں۔ اس بند کے اختتام پر، آئی صدائے جبرئیل... ”گریز“ کا شعر ہے اور اس کے بعد وہ اپنے ممدوح سے مخاطب ہیں:

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ علامہؒ نے اپنے پورے کلام میں صرف دو مقامات پر قدرے مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ ایک تو مصرع بالا میں اور دوسرا ”پیامِ مشرق“ میں:

مرا اے کاشکے مادرِ نژادے

کہہ کر اظہار کیا ہے ورنہ علامہ ”امید“ کے شاعر ہیں اور اُن کے کلام میں مایوسی کا ذکر نہیں بلکہ وہ مایوسی کو کفر کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ اگر ہم رموز بے خودی میں ”عرض حال بحضور رحمت للعالمین“ اور ”بحضور رسالت مآب (پس چہ باید کرد) کو پیش نظر رکھیں تو پتا چلتا ہے کہ علامہ

جہاں کہیں بھی سرور کائنات V کا ذکر کرتے ہیں، وہاں سراپا ادب و احترام بن جاتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ گوسفند سلیم۔ وہ ذاتی پریشانیوں یا قوم کی بدحالی کا ذکر کرتے ہیں تو دل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ ”پیام مشرق“ کی غزلیات میں ہے:

با خدا در پردہ گویم از تو گویم آشکار

یا رسول اللہ اُو پنہان و تو پیدائے من

یعنی میں اللہ تعالیٰ سے چھپ کر باتیں کرتا ہوں اور حجاب قائم رہتا ہے لیکن آپ سے آشکار ہو کر عرض کرتا ہوں یا رسول اللہ، اللہ تعالیٰ تو میرے لیے پوشیدہ ہے، غائب ہے، لیکن آپ میرے سامنے ہیں جنھیں میں دیکھ رہا ہوں۔ (۳۱۸)

حتیٰ کہ ”عرض حال“ میں تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں:

مدتے با لالہ رویاں ساختم عشق با مرغولہ مویان با ختم
بادہ با ماہ سیما باں زدم بر چراغ عافیت داماں زدم
برقبا رقصید گرد حاصلم رہزناں بردند کالائے دلم
کہہ کر دل کھول کر رکھ دیتے ہیں اور پھر اپنی کم زوری بیان کرتے ہیں:
ساہبا بودم گرفتار شکے از دماغ خشک من لایفکے

علامہ کا اسلوب اور انداز قدم قدم پر ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ وہ ذوق و شوق میں اللہ تعالیٰ کی بجائے صرف اور صرف حضور رسالت مآب V سے مخاطب ہیں۔ اس کا ثبوت اس شعر سے بھی ملتا ہے جو علامہ نے ابتدا میں درج کیا ہے:

در بلع آمد، ز اں ہمہ بوستاں تہی دست رفتن سُوئے دوستاں

یہ شعر مشہور صوفی شاعر۔۔۔۔۔ [کذا] کا ہے جس سے اس واقعہ کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے جو فلسطین میں وقوع پزیر ہوتا ہے۔ اُس واقعہ کے مطابق علامہ ”ارض فلسطین“ میں پہنچنے اور ارادہ کے باوجود حجاز مقدس جانے کا ارادہ ترک کر دیتے ہیں اور ساتھی مولانا غلام رسول مہر سے عرض کرتے ہیں کہ ”میں اعمالی محمود کے سرمایہ سے محروم ہوں اس لیے کس منہ سے مدینہ جاؤں۔“ اور اس تصور کے آتے ہی سفر کا ارادہ بدل دیتے ہیں اور اسی ”تہی دتی“ یعنی خالی دامن ہونے کا ذکر درج بالا شعر میں ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اس ”تاثر“ کی تصدیق اُن کی معروف رباعی

سے ہو جاتی ہے جو اُن کے کلام میں موجود نہیں لیکن انھی کی ہے:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر روز محشر عذر ہائے من پذیر
در حسابم را تو بنی ناگزیر از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر
یعنی حضور رسالت مآب V کا احترام اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے فریاد ہے کہ روزِ محشر آں حضرت V کی موجودگی میں میرا نامہ اعمال نہ کھولنا، اُن کی نگاہ سے بچ کر، اُن سے ذرا ڈور ہٹ کر کھولیں کیوں کہ نامہ اعمال، اعمالِ نامحمود سے پُر ہے۔

اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور اقبال پیش ہونے کو تیار ہیں لیکن رسول اللہ V سے حیا و شرم کا یہ عالم ہے کہ اُن کے سامنے ”نامہ اعمال“ کھلوانے سے گریزاں ہے۔ علامہ اقبال کے پورے کلام میں نگاہ ڈالیے، اللہ تعالیٰ کا جہاں بھی ذکر آیا ہے، اس کا انداز اور پیرایہ بالکل مختلف ہے، بعض اوقات وہاں علامہ کا انداز بیان باغیانہ ہو جاتا ہے۔ ”شکوہ“ کے اشعار بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال

کرتا کوئی اس بندہ گستاخ کا منہ بند

یا پھر: یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

اس لیے ذوق و شوق کے پیرایہ اظہار سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ حمد ہرگز نہیں۔ یہ محض نعت ہے جو قصیدے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ تغزل کی موجودگی نے اس کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ پروفیسر افضال احمد انوار نے چوتھی دلیل میں ”عشق تمام مصطفیٰ“ کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالمعنی کی دلیل کا معقول رد پیش کیا ہے۔ درحقیقت علامہ نے ”عشق“ کا ذکر زیادہ تر عشقِ مصطفیٰ V کے حوالے ہی سے کیا ہے یا پھر یہ لفظ مقصود اور نصب العین کے لیے استعمال کیا ہے اور اگر گہرائی میں جائیں تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ علامہ کا ”مقصود“ بھی رسول اکرم V کی ذاتِ مبارک ہی ہے۔ اس کا ثبوت ”اسرار و رموز“ کے اُس شعر سے ہوتا ہے جہاں علامہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حوالے سے کہا ہے:

معنی حرم کئی تحقیق اگر بگری بادیدہ صدیق اگر

توت قلب و جگر گردد نبی از خدا محبوب تر گردد نبی

یعنی اگر آپ تحقیق کریں اور حضرت ابوبکر صدیق کی نگاہ پاک میں سے دیکھیں تو نبی اکرم ﷺ کی ذات بابرکات قلب و جگر کی قوت بن جاتی ہے اور ان سے عشق و محبت کی انتہا کا یہ عالم ہے کہ حضور رسالت مآب کی ذات اقدس اللہ تعالیٰ سے محبوب تر لگتی ہے۔

یہ ہے وہ ”عشق“ جس کا علامہ جا بجا ذکر کرتے ہیں اور ذوق و شوق میں ”عشق تمام مصطفیٰ“ کہہ کر فرماتے ہیں کہ ”عشق کی تکمیل“ مصطفیٰ کی ذات میں ہے۔ عشق کامل ہوتا ہے تو وہ محمد مصطفیٰ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ تو کیا خود اللہ تعالیٰ (قرآن کے مطابق) اُن پر درود و صلوة بھیجتا ہے اور مومنوں کو اس کا حکم دیتا ہے۔

اس کے باوجود ڈاکٹر عبدالمغنی کو ذوق و شوق، حمد نظر آئے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ان کی ایک بھی دلیل معقول نہیں جس سے حمد ثابت ہو۔ پروفیسر افضال احمد انوار کے دلائل بہت ٹھوس ہیں اور انھوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب ذوق و شوق کے اس شعر پر توجہ دیتے تو ذوق و شوق کو کبھی نہ کہتے:

عین وصال میں مجھے حوصلہ نظر نہ تھا

گر چہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب

نقادوں کی میں بات نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ دُور کی کوڑی لانے کے عادی ہوتے ہیں، خواہ انھیں اندھیرے ہی میں دُور کی سوچھ جائے۔

اہل نظر کے نزدیک درج بالا شعر میں علامہ اپنے ”خواب“ کا ذکر کرتے ہیں جس میں آپ نے حضور رسالت مآب ﷺ کو دیکھا۔ یہ کیفیت حضوری کی ہے اور پاسِ ادب بھی ہے۔ محبوب کی خدمت میں حاضر ہو کر، محبت ہمیشہ سراپا احترام بن جاتا ہے اور اُسے ہمت نہیں پڑتی کہ وہ دیدے پھاڑ کر دیکھے جو سوئے ادب ہے۔ علامہ کو چوں کہ رسالت مآب ﷺ سے بے حد و حساب عشق ہے اسی لیے احترام و ادب کی بھی انتہا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ حوصلہ نظر نہیں پاتے لیکن وہی عقل والی بات، جستجو کا مسئلہ، وصال کی انتہائے آرزو کہ کنکھیوں سے دیکھنے کی کوشش جس کو وہ ”نگاہ بے ادب“ قرار دیتے ہیں۔ یہ کیفیت اہل دل جانتے ہیں بھلا یہ بے چارے نقاد کیا جانیں۔ علامہ کو تو رسول اکرم ﷺ سامنے نظر آتے ہیں وہ انھیں زندہ تسلیم کرتے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں:

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا

’حرف تمنا‘ جسے کہہ نہ سکیں ’رو برو‘ (بال جبریل)

حقیقت یہ ہے کہ ذوق و شوق کا ہر لفظ، ہر ترکیب، ہر استعارہ، ہر مصرع اور ہر شعر بلکہ ہر بند نبی اکرم ﷺ کی تعریف و توصیف کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے باوجود کوئی نہ سمجھے تو کیا کیا جائے۔ آحر میں ہم اس شعر پر ختم کرتے ہیں:

کور ذوقاں داستاں ساختند وسعتِ ادراک اُو فشناختند

ورنہ علامہ اقبال کا یہ شعر بھی ثابت کرتا ہے کہ علامہ شدید خواہش کے باوجود حضور رسالت مآب ﷺ کے حضور پیش ہونے سے ڈرتے ہیں اور سخت گھبراتے ہیں ایک جگہ کہا ہے: (سعید بدرس، ۴۲۲-۴۱۶)

آہ تیرے سامنے آنے کے ناقابل ہوں میں

منہ چھپا کر مانگتا ہوں تجھ سے وہ سائل ہوں میں

تاثراتی تنقید کی جلوہ گری:

”نعت رنگ“ شماره ۲۲ پیش نظر ہے۔ ڈاکٹر شعیب گرامی کا مقالہ ”نعت نبوی اور توحید و رسالت کے مابین فرق کی اہمیت“ پڑھ ڈالا۔ مصنف مقالہ کے نام کے بعد ”سعودی عرب“ دیکھتے ہی خیال آیا کہ مقالے میں کتاب التوحید مصنفہ ابن عبد الوہاب نجدی کی صدائے بازگشت ابا واستکبر و کان من الکافرین [سورة البقرة: آیت: ۳۴] کی روشنی لیے اس مقالے میں اپنی پوری شدت سے نمایاں ہے۔

جس کی نظر میں شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی، شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری، صاحب مثنوی معنوی مولانا جلال الدین رومی اور فنائے عشق رسول حضرت عبدالرحمن جامی رحمۃ اللہ علیہم عقاید خبیثہ کے حامل ملحد اور مشرک ہوں۔ ایسے خط الحواس کی باتوں کو کیا اہمیت دی جائے۔ قرآن حکیم ناطق ہے ویتخبطہ الشیطان من المس۔ [سورة البقرة: آیت: ۲۴۵] وہی شیطان جس نے لاکھوں برس خدائے واحد کی عبادت کی مگر اسی کے حکم فاسجد لادم [سورة البقرة: آیت: ۳۴] کی سرتابی کر کے مردود و لعنتی ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اللہ والوں یعنی اپنے ولیوں کے لیے فرمایا: لا خوف علیہم ولا

يعززون ط [سورة البقرة: آیت: ۲۶۴] جو اللہ کا ہو گیا اللہ اس کا ہو گیا اور پھر نبیوں اور رسولوں کا مرتبہ تو وہی بہتر جانتا ہے۔ اس کی آنکھ اللہ کی آنکھ، اس کا کان اللہ کا کان، اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ، اس کا پاؤں اللہ کا پاؤں، ایسا کہنے میں کون سا الحاد ہے، کون سا شرک کہ:

علم حق در علم صوفی گم شود این سخن کے باور مردم شود
گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود
اولیاء را ہست قدرت از الہ تیر جستہ باز گرد اند ز راہ

(بحوالہ مشکوٰۃ شریف) کیا اجل صحابی رسول امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ اللہ والے نہ تھے جن کی آنکھ اللہ کی آنکھ بن کے مسجد نبوی کے منبر سے جنگ نہا و نہ کا مشاہدہ کر رہی تھی، کیا جلیل القدر صحابی میدان جنگ کے کمان دار حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ اللہ والے نہیں تھے جن کے کانوں نے اللہ کا کان ہو کے معرکہ کارزار نہا و نہ میں یا ساریہ الجبل یا ساریہ الجبل کی صداے عمر فاروق سُن لی۔

تصوف پر عجمیت و ویدانت کا اثر اور یونانی فلسفے سے متاثر ہونے کا بہتان لگنی گزری بات ہو چکی۔ صوفیائے کرام، مشائخ عظام اور عارفان باللہ کی شان میں منہ آنے والے اسی گستاخ ازلی کے چیلے چپاٹے ہیں جس نے بارگاہ ایزدی میں یہ کہنے کی جرأت کی تھی:

فبعز تک لأغوينهم اجمعين ۵ لا عبادک منهم المخلصين ۵

[سورہ ص، آیت: ۸۲-۸۳]

رسول پر ایمان اور رسول سے عشق و محبت ہی اصل ایمان ہے جس کا اظہار ایک مومن اپنے عمل نیک سے اور اگر وہ شاعر بھی ہے تو اپنے اشعار سے کرتا ہے جو اپنے حبیب یعنی حضور رحمۃ للعالمین کی شان اقدس میں کہے ہوں۔ اولیاء، اقطاب، غوث جو فنا فی الرسول و فنا فی اللہ ہوں ان کی شان میں ایسی دریدہ و بی عبرت ناک بد انجामी ہے اور دراصل یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے فرمان الہی ہے:

ختم اللہ علی قلوبہم و علی سمعہم و علی ابصارہم غشاوۃ۔

[سورة البقرة، آیت: ۷]

یہ کتنا مہمل جملہ ہے کہ ”صوفی شعر انعت گو نے نبی رحمت ﷺ کی ذات مبارکہ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو برہمنوں نے بدھ مذہب کے ساتھ کیا تھا۔“

بے خبری کی بھی حد ہو گئی۔ برہمنوں نے تو بدھ دھرم کو دلش نکالا دیا وہ اس کی تعریف میں پُل کیا باندھتے۔ کاش ڈاکٹر نگرامی علامہ اقبال کے عشق رسول کو سمجھتے اور عالم بے بدل علامہ محسن کا کوروی کے مرتبہ علمی سے کما حقہ واقف ہوتے۔ علامہ محسن کا کوروی کے مشہور و مقبول نعتیہ قصیدہ ”سمت کاشی سے چلا جانبِ مٹھر ابادل“ پر حرف زنی کرتے ہوئے اس سے زیادہ لکھنے کی جرات نہ ہوتی کہ

”قصیدے کی پوری فرہنگ پر ہندو ادبیات و معاشرت کی پوری چھاپ ہے۔“

صاحبِ مثنوی معنوی کہ ہست قرآن در زبانِ پہلوی، حکایت شبان و موسیٰ میں فرماتے ہیں:

ہندواں را اصطلاح ہند مدح سندیاں را اصطلاح سند مدح
من مگردم پاک از تنبیج شاں پاک ہم ایشاں شوند و دُرفشاں
ما زباں را تنکریم و قال را ما دروں را بنگریم و حال را
زانک دل جوہر بور گفتن عرض پس طفیل آمد عرض جوہر غرض
چند ازیں الفاظ و اضمار و مجاز سوز خواہم سود با آں سوز ساز
آتش از عشق در جاں بر فروز سر بسر فکر و عبادت را بسوز
ملت عشق از ہمہ دینہا جداست عاشقان را ملت و مذہب خداست

مذہب اسلام اور ملکی، علاقائی، تہذیبی، معاشرتی اور لسانی تقاضے ایک الگ موضوع ہیں جس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے اور لکھا جا چکا ہے۔ بلھے شاہ پنجاب کے مسلمان صوفی شاعرِ نعت گو نے کیا خوب کہا ہے:

جس تن لاگے سوت جانے دو جا کوئی نہ جانے عشق اسماں نال کبھی کبھی لوک مریندے طعنے
بھر ترے نے جھلی کر کے کھلی نام سراپا صم بکم غمی ہو کے اپنا وقت لگھایا
ڈاکٹر نگرامی امیر خسرو کے پیر بھائی میر حسن کے مصرع:

ع زینتِ یس توئی زیبا لیش طہ توئی

اور علامہ اقبال کے ”وہی قرآن، وہی فرقان، وہی یس، وہی طہ“ کہنے پر آتش زیر پا ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ”تلمیس ابلیس“ کے اسیر کچھ جاہل دنیا دار ٹھگ بھی بدل کر مشیخت کے لبادے میں ذریاتِ شیاطین کا کام بھی کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے عقل و فہم والے انھیں خوب پہچانتے ہیں مگر اہل اللہ باقی باللہ جو شکر و الحاد و زندقہ کے الفاظ استعمال کرنا لاعلمی و بے خبری نہیں نجدیت و شیطنت

ہے۔ اگر عہد عباسی کی عرب دشمن تحریک 'شعوبیت' کے نام سے جانی جاتی ہے تو ڈاکٹر نگرامی کی تصوف پیزاری کو 'شیعیت' کا نام دیا جائے گا۔

علامہ اقبال کے عاشق رسول ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ وہ شاعر دانا بھی تھے اور فلسفی معنی بھی، اگرچہ خود کہتے ہیں:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے
مگر ان کے دل کی آواز یہ تھی:

دم عارف نسیم صمد ہے اسی سے رشیت معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر شبانی سے کلیسی دو قدم ہے
ہاں شعیب کام کا ہو، نام کا نہیں ورنہ:

ع شیر قالیں اور ہے شیر نیتاں اور ہے
تصوف کو مورد لعنت و ملامت دکھانے کے لیے نگرامی صاحب نے بہت دُور سے گھیرا
باندھا ہے اور اُردو و فارسی نعت گوئی کو اپنے دھوکے کی ٹٹی بنا کر طریقت و تصوف کا شکار کیا ہے۔
جناب نگرامی رقم طراز ہیں:

عہد عباسی کی ابتدا میں فارسی شاعری پر عربی تہذیب و تمدن کا بہت کچھ اثر
رہا لیکن چوتھی صدی ہجری آنے تک بالخصوص شیراز میں آکر اس کا
ڈھانچہ بالکل بدل گیا... بلحدوں زنادقہ اور صوفیا کی گرم بازاری سب سے
زیادہ شیراز میں ہی ہوئی۔ میر حسن علی نے اپنی کتاب 'تصوف کا تنقیدی
جائزہ' میں عطار، رومی اور جامی کو مشترکاً نہ نعت گوئی اور عقیدہ وحدت
الوجود کے مبلغین میں شمار کیا ہے۔

ڈاکٹر نگرامی ان کے ہم نوا ہیں، گوان کا موضوع سخن اُردو میں نعت گوئی ہے۔ محبوب
الہی حضرت نظام الدین اولیا کے میر حسن کے اشعار بے سمجھے بوجھے ان پر ویسی (?) عقیدے کا
بہتان لگایا کہ:

رسول رحمت نعوذ باللہ کائنات ہیں، صاحب تصرف ہیں اور اللہ تعالیٰ کی
الوہیت و ربوبیت میں آپ کا بھی حصہ ہے۔

میری گزارش ہے کہ نگرامی صاحب میر حسن کے مصرع:

ع صاحب معراج سبحان الذی اسریٰ توئی
کی صحیح قرات فرمائیں، حسن اضافت کی معنویت سمجھیں اور پھر حکم لگائیں۔ شعر فہمی بھی بڑی چیز
ہے۔ ابن الجوزی کی کتاب 'تلمیس البلیس'، شبلی کی 'شعر العجم'، کاسہار لے کر مصری ادیب احمد
امین اور قاہرہ یونیورسٹی کی صدر شعبہ عربی اپنی استانی جی ڈاکٹر سہر قلمادوی کی بے تکی و بے اصل
باتوں سے وہ اپنے مفروضات و معروضات میں زور پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ ایسا
لگتا ہے ڈاکٹر نگرامی کو تصوف و طریقت کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ وہ اکبر الہ آبادی کے یہ آسان
اشعار ہی سمجھ کر پڑھ لیں:

سنو دو ہی لفظوں میں مجھ سے یہ راز شریعت وضو ہے، طریقت نماز
شریعت میں ہے صورت فتح بدر طریقت میں ہے معنی شق صدر
شریعت میں ہے قیل و قال حبیب طریقت میں حسن و جمال حبیب
نعتیہ اشعار جس زبان میں ہوں حسن و جمال کی تجلیاں پیش کرتے ہیں۔ نعتیں محض
علوے فکر و خیال کی عکاسی ہی نہیں آئینہ بندی جمال بھی کرتی ہیں۔

تصوف کے خلاف غوغا آرائی، طعن و تشنیع و تنقید کی ہغوات سامانی دراصل ان مستشرقین
نے کی ہے جو مذہب اسلام کے خلاف عالمی سازشوں میں شریک ہو رہے ہیں۔ ان بد بختوں میں
نمایاں نام ہارٹون (Hartton)، بلوشت (Blochet)، ماسی نون (Massignon)، گولڈ زیہر
(Gold Ziher)، براؤن (Brown) اور اولیری (Oleary) کے ہیں۔

ان کے باطل مشن کو تقویت پہنچانے میں ان دنیا دار، مفاد پرست، مصلحت کش علماؤ کا
بھی ہاتھ ہے جنہوں نے اسلاف اور بزرگوں کے برحق اقوال کو لوگوں کی نگاہوں سے دُور رکھا،
مثلاً سید الطایفہ حضرت جنید بغدادیؒ کا یہ ارشاد:

ایں راہ کس باید کہ کتاب اللہ بردست راست گرفته باشد و سنت مصطفیٰ صلی
اللہ علیہ وسلم بردست چپ۔

شیخ ابوبکر طلسمانی کا یہ زریں قول بھی طریق تصوف کا معیار پیش کرتا ہے:

الطریق واضح والکتاب والسننہ والفقہہ قائم بین اظہر نا۔

(راستہ کھلا ہوا ہے اور کتاب و سنت و فقہ ہمارے سامنے موجود ہے)

شہر شیراز نے، جہاں بقول ڈاکٹر نگرامی 'اسلام کا شیرازہ اخلاق بگڑ گیا'، ہمیں حافظ

دیا، سعدی دیا، عرفی دیا۔ عرفی کا یہ شعر ہر نعت گو کے پیش نظر ہونا چاہیے:

عرفی مشابہ ایں رہ نعت است نہ سحر است ہشدار کہ رہ بردم تیغ است قدم را
اور شیخ سعدی شیرازی تو شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید خاص ہی تھے، فرماتے ہیں:
جز یاد دوست ہر چہ کنی عمر ضائع است جز سر عشق ہر چہ نجوانی بطلالت است
سعدی بشوی لوح دلست راز نقش غیر علمے کہ راہ حق نہ نماید جہالت است
معجزات انبیا اور کرامت اولیا کے منکرین کو آپ کیا کہیں گے جب کہ یہ قرآن سے
ثابت ہے۔ نعت گو صوفی شعر انھی حقائق کو نظم کرتے ہیں۔ اب کوئی انھیں شرک والحا دوزندہ کہے
تو کہتا رہے اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔ اللہ اگر توفیق نہ دے ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ (طلحہ
رضوی برق ص ۶۷۳-۵۶۹)
پروفیسر اکرم رضا نے نعت نگاری میں احتیاط کے تقاضے لکھا ہے۔ اس میں انھوں نے
شعر لکھا ہے:

شان ان کی سوچے اور سوچ میں کھو جائیے

نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جائیے

اور لکھا ہے ادب و احتیاط کا یہ عالم ہونا چاہیے۔ میں ان کی بات سمجھ نہیں سکا۔ اگر نعت کے خیال
سے چپ ہو جانا چاہیے تو پھر یہ جو ہم سب نعتیں لکھ رہے ہیں کیا یہ کوئی گستاخی ہے؟
(احمد صغیر صدیقی، ص ۷۸)

اسلوبیاتی تنقید: تخلیقی لفظیات کی باز آفرینی:

نعت رنگ کی مجلس ادارت و مشاورت میں شامل سبھی شخصیات درجہ اعتبار کی حامل ہیں
اس کے باوجود بعض ایسی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں جو قرآن و حدیث کے خلاف جاتی ہیں اس
طرف خصوصی توجہ دیں۔ مثلاً

یہ دھماکہ کن فیکون تھا کہ یہ کائنات سنور گئی

کئی آسمان بکھر گئے مگر اک زمین نکھر گئی

”کن فیکون“ سائنسی نقطہ نظر Big Bang Theory کی طرح کوئی ”دھماکہ“

نہیں تھا اور نہ ہی یہ کائنات اک دھماکے سے معاً وجود میں آگئی جبکہ قرآن کہتا ہے کہ ”اللہ نے چھ

دنوں (فی ستة ایام۔ سورہ الم سجدہ) میں کائنات کی تخلیق کی۔ ”کئی آسمان بکھر گئے“ بھی محل نظر
ہے۔ اللہ نے آسمان بکھیرے نہیں بلکہ ایک خاص ترکیب اور خصوصیت کے ساتھ خلق کئے ہیں۔

تری کہکشاں کے نظام میں ہے جو انتشار کی کیفیت

یہی وجہ ارض و قمر بھی ہے یہی وجہ شان ربوبیت

یہ شعر بھی سائنسی نقطہ نظر سے کہا گیا ہے جبکہ قرآن و حدیث سے کہیں بھی ثابت نہیں
ہے کہ ”ارض و قمر“ کی پیدائش کہکشاں کے انتشار کی وجہ سے ہوئی نیز کہکشاں کو شان ربوبیت کی
”وجہ“ بنانا سخت قابل گرفت بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی وجہ کی ضرورت نہیں وہ قادر مطلق ہے وہ جو
چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔

یہ دیار کون و مکاں ہے کیا تری جلوہ گاہ شہود ہے

تری قدرتوں کا ہے معجزہ یہاں زندگی کا وجود ہے

”قدرتوں کا معجزہ“ بھی غلط ہے۔ یہاں ”قدرت کا مظہر“ کی ضرورت ہے۔

فیاض ٹانڈوی کے درج ذیل حمدیہ اشعار۔ ص ۲۹

پروردگار! تیری کوئی کیا مثال دے خلقت کو رزق جب تو سدا بے سوال دے

کیا اللہ تعالیٰ صرف ”رزق“ ہی بے سوال دیتا ہے؟ میرے خیال میں مصرع یوں ہونا

تھا: ”خلقت کو نعمتیں تو سدا بے سوال دے“

قسمت نے جو لکھا ہے وہ سب حسب حال دے

لیکن مرے خدا مجھے رزق حلال دے

کیا اللہ تعالیٰ کسی کی قسمت میں ”رزق حرام“ بھی لکھتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن حکیم

میں حلال اور حرام کی مکمل تفصیل دے دی ہے۔ اب یہ انسانوں کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنا رزق

کس طریقے سے حاصل کرتا ہے حلال یا حرام؟

ایڑی رگڑ دے گر کوئی معصوم دشت میں تیرا کرم وہاں پہ بھی چشمہ ابال دے

یہ معجزہ الہی صرف حضرت اسماعیلؑ کیلئے تھا اب کسی معصوم کے ایڑیاں رگڑنے سے

چشمہ نہیں ابل سکتا۔ ایسی خواہش نہیں کرنی چاہئے۔ ”دے“ کی جگہ اگر ردیف ”دیا“ ہوتی تو شاید

بات بن جاتی۔ (۱۱۶)

فیاض جس سے شوکت اسلام ہو عیاں روئے حیات کو تو وہی خود خال دے

تخلص کا استعمال بہت غلط مقام پر ہوا ہے۔ روئے حیات کے خدو خال کا مطالبہ اللہ سے ہے یا فیاض سے؟ ”تو“ فیاض کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ضمیر کاظمی (ممبئی) کی حمد کا مطلع ص ۳۰

یا خدا! مجھ پر اگر تیری عنایت ہو جائے
حمد وہ لکھوں فرشتوں کو بھی حیرت ہو جائے
اب تک میں اس بات سے لاعلم تھا کہ ”فرشتے بھی ادبی ذوق رکھتے ہیں۔“ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ ”ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی الخ۔ اللہ اور اس کے فرشتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ بس یہی درود ملائکہ کی نعت ہے۔ شعر میں ”اگر“ بھی حشو ہے۔ شاعر نے اب تک جو کچھ لکھا ہے کیا وہ خدا کی عنایت نہیں ہے؟ اولی مصرع یوں ہونا تھا ”یا خدا! مجھ پر تری ایسی عنایت ہو جائے“، ”حیرت ہو جانا“ بھی زبان نہیں ہے۔

میرے اسلوب کو ندرت کی ارم بھی ہو عطا
لجہ وہ دے کہ جو فردوس سماعت ہو جائے
”ارم“ شداد کی بنائی ہوئی جنت کا نام ہے۔ میں نعت و حمد میں خصوصاً اس لفظ کے استعمال کے حق میں نہیں ہوں اس تعلق سے میں نے اپنے خط (مطبوعہ نعت رنگ ۲۲ ص ۵۷۹) میں اظہار خیال کر چکا ہوں۔

مقالات کے آغاز میں محترم ریاض مجید کا ایک شعر درج ہے۔ ص ۳۳
کر احتیاط سے طے راستہ مدینہ کا
ہجوم شوق تجھے واسطہ مدینہ کا
شعر اچھا ہے لیکن میرے خیال میں ”ہجوم“ کی بجائے ”جنون“ ہوتا تو ”احتیاط“ کا اطلاق زیادہ صحیح و بہتر ہوتا۔ کیونکہ جنون میں بے ادبی اور گستاخی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں بہ نسبت ہجوم کے۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید صاحب کا مقالہ ”اسوۂ حسنہ اردو نعت کے آئینے میں“ بڑی محنت سے لکھا گیا ہے لیکن ان کے پیش کردہ کچھ اشعار میں بھی مجھے کچھ اسقام نظر آئے۔ مثلاً
اتنا کشادہ ذہن، مروت کا اک دیار
اتنا بڑا رسول، رسولوں میں شاہ کار
”اتنا بڑا رسول“ بڑا عجیب سا لگ رہا ہے اس کی بجائے ”اللہ کا حبیب“ کہہ دیتے تو ”رسولوں میں شاہ کار“ بھی بھرتا۔

نبی کے اسوۂ حسنہ سے یہ پیغام ملتا ہے
قیہوں کی خبر رکھنا، غریبوں کا بھلا کرنا
لفظ ”حسنہ“ ہے ’س‘ متحرک ہے جبکہ شاعر نے اسے ساکن نظم کیا ہے۔ اسی طرح

عبدالکریم ثمر صاحب نے بھی ”حسنہ“ ہی نظم کیا ہے۔ ص ۵۲
انہیں خلق کر کے نازاں ہوا خود ہی دست قدرت

کوئی شاہکار ایسا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا
اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ حمیدہ تو بیان کئے ہیں لیکن کہیں بھی ایسی کوئی آیت یا اشارہ تک نہیں ملتا کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کی تخلیق پر ”نازاں“ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تو ہر تخلیق بے مثال ہے اتنی ترقی کے باوجود انسان مٹی کا ایک ذرہ یا ایک باریک سا کنکر نہیں بنا۔ سا اور نہ ہی بنا سکتا ہے۔ اس لیے وہ بار بار کہتا ہے ”وہو علی کل شیء قدیر“ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق کے ساتھ ہی اللہ کی خلاقانہ حد ختم ہوگئی ایسا سوچنا بھی کفر ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات لیکن اگر رحمانی صاحب اس شعر کے مصرعہ اولیٰ کو یوں بھی کہتے تو بہتر ہوتا ”انہیں خلق کر کے شیدا ہوا خود ہی دست قدرت“ (رب اکبر)

رات دن کھنگالتے ہیں بحر ملتا ہی نہیں

آپ کی عظمت کا گوہر کتنی گہرائی میں ہے

عارف متین صاحب نے لفظ ”کھن گالتے“ استعمال کیا ہے۔ ”ن“ اعلانیہ کیساتھ جبکہ لفظ ”ن غنہ“ کے ساتھ درست ہے۔

وہ اپنی خوبیوں میں ہے جہاں میں یکہ و تنہا

صفات و ذات میں کوئی نہیں کونین میں ثانی

یہ شعر حمد کا تو ہو سکتا ہے نعت کا نہیں۔ ”کونین“ میں تو ساری کائنات سما جاتی ہے جس میں اللہ کی ذات بھی شامل ہے۔ اگر ”کونین“ کو ”مخلوق“ سے بدل دیں تو شعر یقیناً نعت کا ہو جائے گا۔

اک فقر کہ جس فقر پہ خود فخر ہے اس کو
اک شاہ کہ جو شاہِ سمندر ہے سخا کا
”شاہِ سمندر“ کی ترکیب غلط ہے شاہِ فارسی اور سمندر ہندی ہے ان دونوں میں ترکیب جائز نہیں ہے۔

نشیب فرش کو بخشے غرور و رعنائی
فرازِ عرش کو روندے حضور کی سیرت
شعر میں لفظ ”روندے“ بڑا قبیح معلوم ہوتا ہے۔ روندنا پامال اور تباہ و برباد کرنے کے معنی میں مستعمل ہے اور اس عمل میں کبر و نخوت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

ذاتِ اقدس سے ایسا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا اسکے علاوہ ”سیرت“ کا تعلق صرف انسانوں سے ہے آسمان یا آسمانی مخلوق سے نہیں۔

ہوں بزمِ دوستان میں تو حرفِ سبک ہیں آپ
اور رزمِ دشمنان ہو تو کوہِ گراں ہیں آپ
شعر میں تقابلِ ردیفین کا عیب ہے۔ لفظ ”سبک“ دوا ملے کیساتھ مستعمل ہے اول ”سبک“ جسکے معنی ہیں طور طریقہ راستہ اور ”سبک“ جس کے معنی ہیں خوار کم عزت ہلکا کم مایہ ان دونوں کا استعمال ”حرف“ کے ساتھ کسی طرح درست نہیں ہے اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تو قطعی نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ شعر اس طرح بھی کہا جاسکتا تھا۔

ہیں بزمِ دوستان میں شگوفہ بہار کا
میدانِ کارزار میں کوہِ گراں ہیں آپ
گزر رہے ہیں شب و روز کی تمنا میں
مرے چلن میں جھلکنے لگے چلن تیرا
شعر میں غالباً کمپوزنگ کی خامی ہے ”اس“ کی جگہ ”کی“ ٹائپ ہو گیا ہے۔
درخشاں عالم امکاں میں ہے خلقِ عظیم ان کا
کرم کی روشنی سے پُر ضیا کون و مکاں دیکھا
شعر میں واحد جمع کا سقم ہے۔ ”کون و مکاں دیکھے“ چاہئے۔

جمال کون و مکاں گرد کاروانِ نبی جلال فقر و غنا ہم رکاب شاہ ام
”کون و مکاں“ میں عرش و کرسی اور جنتیں بھی شامل ہیں یہ ”گرد کاروانِ نبی“ کس

طرح ہو سکتے ہیں؟

ڈاکٹر الطاف حسین لنگڑیال (بہاولپور) نے ایک اچھے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ مضمون کی بُنت بھی عمدہ ہے۔ بس اس مقام پر نگاہ اٹک گئی جہاں انھوں نے شفقتِ تنویر مرزا کی نظم ”پہلی پکار“ درج کی ہے۔

”خداے عالم! بلند و برتر! کبھی تو نیلی بلندیوں سے کسی سہانی سحر کے پردے سے لمحہ بھر کو ادھر نظر کر کھنڈر یہ مخلوق! اشرف المخلوق ظلم کی تیرگی سے نکلے کھنڈر یہ مخلوق! اشرف المخلوق ظلم کی تیرگی سے نکلے“ (ص ۸۱)

نظم کے ٹکڑے ”لمحہ بھر کو ادھر نظر کر“ سے تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ ”خداے عالم“ کشمیر و فلسطین سے غافل ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور اس کی مشیت کے مطابق ہے بھی یا نہیں؟ مطلوب علی زیدی مطلوب کے دو اشعار بطور نمونہ درج کئے گئے ہیں اور دونوں کے مصرعہ ہائے ثانی بحر سے خارج ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۱۲۰-۱۱۵)

(۲) (۱) نعرہ تکبیر سے ناراض ہنومان ہے ہنومان پڑھئے تو بحرِ درست ہوتی ہے

جبکہ اصل لفظ ”ہنومان“ ہے۔ (احمد صغیر صدیقی ص ۸۴)

(۲) جلد ہو جائے سحر مطلوب! اب یہی ارمان ہے

(۳) گزشتہ سال بارہ ربیع الاول کی شب پی ٹی وی کراچی سینٹر سے ایک نعتیہ مشاعرہ پیش کیا گیا، ایک معروف نعت گو شاعر نے طائف کی سنگ باری کا حوالہ دیتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کے لیے ”سنگسار“ کا لفظ استعمال کیا:

کیا لاؤ گے طائف کا کوئی ایسا مسافر؟ جو ان کی طرح راہ میں ”سنگسار“ ہوا ہو!

یہ لفظ نہایت قابلِ اعتراض ہے کیوں کہ ”سنگ باری“ اور ”سنگساری“ میں بڑا فرق ہے۔ موخر الذکر پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کو کہتے ہیں جو شریعت میں بدکاری کی سزا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی شاعر موصوف کا یہ مصرعہ سقیم ہے کیوں کہ انھوں نے ”سنگسار“ بروزن ”سمنسار“ استعمال کیا ہے، جو غلط ہے۔ ”سنگسار“ میں نون غنہ نہیں ہے بلکہ اس کا اعلان ہوگا، جس کی وجہ سے مصرعہ ساقط الوزن ہو کر بحر سے خارج ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے ذرائع ابلاغ کو احتیاط برتنی چاہیے۔ (تنویر پھول ص ۲۴۷)

(۴) بعض اصحابِ نعت پر تنقید کے قائل نہیں لیکن اگر کوئی فنی غلطی ہو یا شرعی اعتراض ہو تو تنقید بلاشبہ درست ہے۔ ’نعت رنگ‘ یہی فریضہ انجام دے رہا ہے، اس موقع پر میں توجہ دلانا چاہوں گا کہ عصرِ حاضر کے ایک معروف نعت گو اپنی نعت میں اکثر اس مفہوم کا شعر پڑھتے ہیں کہ ’حضور ﷺ نے خلل کے چراغ بجھا دیے۔ چراغ ہمیشہ اچھے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اگر خلل کے چراغ، کہنا درست ہے (۲۴۸) تو پھر جہالت کی شمع اور باطل کا نور کہنے میں کیا مضائقہ ہے؟ اسی طرح ایک شاعرہ کی نعت کا یہ مصرعہ دیکھیے ’کفر کے روشن ایوانوں میں آ کے اندھیرا کس نے کیا؟‘ یہ مصرعہ بھی قابلِ اعتراض ہے۔ کفر کے ایوانوں کو روشن کہنا درست نہیں اور اندھیرا کہنا اچھا فعل نہیں، جسے حضور ﷺ سے منسوب کرنا کھٹکتا ہے۔ یہ دونوں نعتیں شائع بھی ہو چکی ہیں اور اکثر

مشاعروں میں سنی گئی ہیں۔ اس تنقید کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں صرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ (تنویر پھول ص، ۲۳۹)

(۵) ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کا طویل مقالہ ”نعت اور گنجینہ“ معنی کا طلسم“ شمارے کی جان ہے، جو مقالہ نگار کے تبحر علمی اور ژرف نگاہی کا جواز ہے۔ موصوف نے ”لفظ“ کی تخلیقی اہمیت و غایت سے متعلق حوالوں کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ شعر کی صوری و معنوی، جمالیاتی و تاثراتی سطح پر بھی بحث کی گئی ہے..... تلازمہ خیال یعنی Association of Thought کے ضمن میں عرض ہے کہ ضیغ، سرخ لیلیٰ کی انگلیاں، مجنوں کی پسلیاں وغیرہ کو علامتوں، استعاروں اور پیکروں سے منسوب کیا جاسکتا تھا نہ کہ تلازمہ خیال سے۔

☆☆☆

نعت گوئی: اصلاح سخن کی چند نمایاں صورتیں:

فنی تناظر

۱۔ عروض اور تقطیع کے مسائل:

(عروض: وہ علم جو پابند شاعری کی بحر کی ماہیت، اصلیت، اجزائے ترکیبی، جماعت بندی اور تقابلی مطالعے کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کی مدد سے اشعار کے موزوں یا غیر موزوں ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔
تقطیع: اطلاقی عروض کا دوسرا نام ہے۔ پابند شاعری کی بحر پر اشعار کو پرکھنا تقطیع کہلاتا ہے۔ عروضی بحر کے ارکان کی مطابقت شعر کے ٹکڑے کر کے تلاش کی جاتی ہے۔ عروضی رکن کے ہر متحرک حرف کے مقابل شعر میں قابل شمار حروف کا متحرک ہونا لازم ہے۔ یہی صورت ساکن حروف کی بھی ہے۔)

(۱) راجہ صاحب کا مصرع: سدرہ کی منزل پہ رُکنے کی اہمیت سمجھ بالکل درست ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم سب عام گفتگو میں کیفیت، اہمیت، حیثیت وغیرہ کو یائے مشدد سے استعمال نہیں کرتے لیکن عام گفتگو اور شاعری یا ادب کی زبان میں جو نازک سا فرق ہے وہ اگر کوئی شاعر یا ادیب ملحوظ رکھے تو کسی کو اعتراض بھی نہیں کرنا چاہیے، البتہ سدرہ کی یائے ہوز کا دہنا دُور ہو سکتا تھا ذرا سی توجہ سے یوں بھی ہو سکتا ہے: ع منزل سدرہ پہ رُکنے کی اہمیت سمجھ

ایک اور مصرع: ع پیچھے پڑی ہیں آج کل بیماریاں بہت میں اس کا وزن نہیں سمجھ سکا۔ میرے فہم ناقص کے مطابق اس کل کا لام تقطیع سے خارج ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ میرے عجز فہم اور عروض و اوزان سے ناواقفیت کا کھلا ثبوت ہے۔ یہاں ڈاکٹر گوہر کا اعتراض درست ہے کہ لفظ کل کا لام تقطیع سے خارج ہے اور ایسا ہی الجھاؤ راجا صاحب کے اس مصرع میں بھی ہے: ع تھے اور بھی رسل مگر رب نے حبیب کو

راجا صاحب کا مصرع ہے: ح ح حاضری کی کوئی نہ کوئی تو صورت چاہیے
اس پر ڈاکٹر گوہر نے کہا کہ مصرع خارج از بحر ہے۔ راجا صاحب نے تقطیع کر کے
ثابت کر دیا کہ مصرع خارج از بحر نہیں لیکن راجا صاحب کی وضاحتی سطر اور بیان کردہ اوزان میں
یکسانی نہیں انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ:

حضرت اس مصرع میں کوئی کی ”ی“ دہی اور ”واو“ دب گیا مصرع خارج از بحر کس
طرح ہو گیا۔ تقطیع اس طرح ہے:

حاضری کی	کوئی نہ کو	ئی تو صورت	چاہیے
فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن

محترم راجا صاحب نے تقطیع درست کی اور تقطیع میں نہ کہیں ”ی“ دہی اور نہ ”واو“ گرا
پھر انھوں نے معلوم نہیں کیوں یہ لکھا کہ ”ی“ دب گئی اور ”واو“ دب گیا۔ البتہ دوسرے رکن میں
یعنی ”کوئی نہ کوئی“ کی تقطیع میں لفظ ”نہ“ کو یا تو آپ ”نا“ پڑھیں یا ”نہ“ کی ہائے ہوز کو واضح
کریں تب وزن درست ہوگا ورنہ نہیں۔ (قمر عینی ص، ۷۴۱-۷۴۰)

محمد فیروز شاہ کی لکھی نعت میں ایک آدھ جگہ کتابت کی غلطی نظر آئی ہے۔ مثلاً اُن کا ایک مصرع
”جیسے اگٹھی میں اُن مول گینہ آیا“ (اس کے قطع نظر کہ ”گینہ آیا“ ہی کچھ اچھا نہیں لگتا اس مصرعے
میں عروضی سقم موجود ہے) ان کا ایک اور مصرع ہے:

”دوڑ کر آئی صبا نکبت و خوش بوسینہ“ اس میں نکبت و خوش بو کے الفاظ ہم معنی ہیں اس لیے مصرع
لطف نہیں دے رہا ہے۔ (احمد صغیر صدیقی ص، ۶۸)

(۲) ص ۲۷۷ پر سلیم کوثر صاحب کے مصرع ”ذرا سنبھل کے سنبھل کے ذرا اے یار اے یار“
میں پہلے ’اے‘ کی ’ی‘ تقطیع سے خارج ہے۔

ص ۳۵۹ پر قیصر خجفی صاحب نے قمر عینی کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

انھوں نے کہیں کہیں لفظ پاؤں استعمال کیا ہے جو بروزن ’فعلن‘ ہے حالانکہ درست
لفظ پاؤں بروزن ’فعل‘ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بطور مثال قمر عینی صاحب کا مصرع بھی لکھا ہے
’ان کے مکتوں کے پاؤں کے نیچے‘ فاضل تبصرہ نگار کی خدمت میں عرض ہے کہ قمر صاحب نے لفظ
پاؤں بروزن ’فعل‘ ہی باندھا ہے جو صحیح ہے۔ (حافظ عبدالغفار حافظ، ص ۶۴۶)

(۳) گردشِ ارض و سماتاروں کی چال ان کے لیے دو جہاں کا ذرہ ذرہ ہے فعال ان کے لیے
چاند سورج، زحل، زہرہ، مشتری، مریخ سب نور افشانی پہ ہیں اپنی نہال ان کے لیے
ہیں حبیب ربِ دو عالم ہو ہنگام نزول خنداں و فرحاں خدائے ذوالجلال ان کے لیے
جنبشِ انگشت سے دو نیم ہو جائے قمر وسطِ دو عالم نہیں کچھ محال ان کے لیے

ص ۴۰۰ پر یعقوب تصور صاحب کی نعت ہے۔ انھوں نے دوسرے شعر کے دوسرے
مصرع میں لفظ ’فعال‘ بروزن ’فعل‘ باندھا ہے جب کہ یہ لفظ مفعول کے وزن پر درست ہے
کیوں کہ اس میں ’ع‘ مشدہ ہے۔ آٹھویں شعر کے پہلے مصرعے میں ’زحل‘ کو ’زحل‘ باندھا گیا ہے۔
اسی طرح دسویں اور تیرھویں شعر میں ’دو عالم‘ کو مفعول کے وزن پر باندھا ہے جب کہ یہ لفظ فعلون
کے وزن پر ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ’دو عالم‘ میں ’و‘ معدولہ ہوتا ہے۔

ص ۳۹۶ پر حسن بریلوی کی نعت پر میری تفسیر میں کمپوزنگ کی غلطیاں ہیں۔
دوسرے بند کے تیسرے مصرع میں صحیح لفظ ’خسروا‘ ہے۔ اسی طرح پانچویں بند کا تیسرا مصرع یوں
ہے: ’اے مرے تیمار دار و رب اکبر کی قسم‘۔

ص ۳۹۲ پر جناب محمد علی شیدا بستوی کی نعت ہے۔ موصوف سے صرف اتنی گزارش ہے
کہ وہ اپنا کلام اشاعت کے لیے بھیجنے سے پہلے کسی استاد سے اصلاح لے لیا کریں۔ (حافظ
عبدالغفار حافظ، ص ۶۴۷-۶۴۶)

(۴) ”محمد علی اثر کی حمد یہ نعتیہ شاعری“ پر ڈاکٹر نسیم الدین فریس (بھارت) نے کافی عمدہ
مضمون تحریر فرمایا ہے لیکن انھوں نے بعض اشعار ایسے بھی درج کر دیے ہیں جن کا مضمون میں نہ
ہونا ہی بہتر ہوتا۔ مثلاً

کاسہ ہنر میں فن کے موتی ڈال کر
جو تصور سے پرے ہو وہ خوشی دیتا ہے تو

اگر کمپوزنگ کی خامی نہیں ہے تو مصرع اولیٰ کی بحر درست نہیں ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۵)

(۵) اے سبز گنبد نبی گواہ ہے عرش کا مکیں

ملا ہے میری چشم دل کو نور کوہ طور کا

گواہ کا ”ہ“ سا قاطع الوزن ہے۔ شاگر صاحب کی ”چشم دل“ کو کیا واقعی ”کوہ طور“ کا
نور ملا ہے؟ نعت میں اس قسم کی تعلق درست نہیں ہے اور پھر ستم یہ کہ عرش کے مکیں کو گواہی میں پیش

کر رہے ہیں!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۰)

(۶) طائر روح کا مسکن ہے ریاض احمد

کیسے اغیار کے اشجار پہ ٹھہرے جا کر

ریاض یہاں بہ حیثیت تخلص استعمال ہوا ہے جو بے محل ہے۔ یہاں ”ریاض“ باغ کے معنی نہیں دیتا اور اگر ریاض احمد پڑھیں تو سکتہ در آتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۱)

(۷) رذالت، ظلم، حق تلفی، جہالت اس کا شیوہ تھا

غرض ہر اک قدم تخریب کا ہی پیش خیمہ تھا

”تلفی“ کا ”ل“ ساکن نظم کیا گیا ہے۔ جب کہ اسے متحرک ہونا چاہیے تھا۔ (غلطی ہائے مضامین مت پوچھ) اصل لفظ تلف ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۲)

(۸) معروف نعت گوا عجاز رحمانی صاحب کا مجموعہ نعت ”آسانِ رحمت“ جو حال ہی میں شائع ہوا ہے میری نظر سے گزرا، اس میں ان کا یہ مقطع موجود ہے:

ورفعنا لک ذکرک ہے کس کی شان میں آیا!

بھلا عجاز اپنے گی وہاں فکرِ سخن کس کی!

اس شعر کا پہلا مصرع بحر سے خارج ہے، یہ شعر بحر ہزج مثنیٰ سالم (مفاعیلین مفاعیلین مفاعیلین) میں ہے۔ وزن برقرار رکھنے کے لیے ”رفعنا“ کو ”رافعنا“ اور ”لک“ کو ”لکا“ پڑھنا پڑے گا جو دینی اور فنی دونوں لحاظ سے قابل اعتراض ہے کیوں کہ یہ سورہ انشراح کی آیت ہے تاہم اس سے دل شکنی مقصود نہیں، اگلے ایڈیشن میں اس مصرع کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

(۹) کاتبِ قسمتِ بشر کیسے نہ پُر اُمید ہو

تیری رضا پہ چھوڑ کر اپنے معاملات دل

میرا گمان ہے کہ اس شعر کا مصرع اولیٰ کتابت کی غلطی سے اس طرح چھپا ہے ورنہ یہ کچھ یوں ہونا چاہیے تھا: کاتبِ قسمت! بشر کیسے نہ پُر اُمید ہو (تنویر پھول، ص ۶۱-۲۶۰)

(۱۰) ”نعت رنگ“ کراچی (شمارہ: ۱۳، دسمبر ۲۰۰۲ء) میں جناب شارق جمال صاحب کا مضمون بہ عنوان ”نعت کے اشعار اور فنی سقم“ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جس میں حروف علت کے تعلق سے فنی سقم کے بعض گوشوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ الف، واو اور یائے معروفہ کے غیر قانونی محل

استعمال کو واضح کرتے ہوئے یہ بتایا گیا کہ اس نوعیت کا ناجائز استعمال قانوناً غلط ہے۔ خواہ اساتذہ سخن ہی کے ہاں یہ عیب کیوں نہ پایا جائے قانون بخشنے کا نہیں۔ بطور مثال آتش کا یہ مصرع پیش کیا گیا:

ع شہر میں قافیہ پیمائی بہت کی آتش

تقطیع کے تحت پیمائی کی ”ئی“ کے سبب یائے معروفہ کو زائد مانتے ہوئے اس مصرع کو خارج از بحر قرار دیا گیا جب کہ بقریہ صوت و قرأت ءئی ہی کی منزل میں ہے۔ ایسی صوتی نزاکت میں نہ کوئی مضائقہ ہے اور نہ ہی فصاحت و بلاغت کے خلاف۔ بعد کے اس قانونی توضیح نے حروف علت کی بعض اہم کارکردگی کے پیش نظر بعض حرفی و صوتی اتصال و تعلق کا لحاظ نہیں رکھا جو اردو شاعری کا بنیادی خاصہ ہے۔ ضرورت شعری کے تحت بعض اوقات وزن کے ایک حرف کو دو کے برابر تسلیم کر لیا جاتا ہے جو فطری لہجے کے مطابق صوتی وابستگی کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ شاعری تقطیع کی روشنی میں نہیں اوزان کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اگرچہ اوزان، تقطیع ہی کے تابع ہوتے ہیں اور تقطیع، صوتی ہم آہنگی سے الگ نہیں رہ سکتی۔ بہت سے شعرا محض گنگنائے (یعنی لے کاری) ہی کے سہارے بحروں کو اپنی گرفت میں لے کر شاعری کرتے رہتے ہیں۔ نہ وہ بحروں کے اصول سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی تقطیع کی توضیح سے لے کاری یا ردھم کی بنیاد پر بڑی سے بڑی شاعری کے نمونے پیش کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں مصرع مذکورہ کے لفظ پیمائی کے ہمزہ مکسور کو ہائے معروفہ کے ساتھ مدغم کر دینے میں کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً حالی کا یہ شعر:

وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم میں عداوت اس کی عذاب الیم جاں کے لیے
اگر مصرع اولیٰ میں یہ دیکھا جائے کہ ”جیتے“ کی یائے معروفہ زائد ہے تو پھر مصرع ثانی میں یہ بھی غور کرنا پڑے گا کہ ”عداوت اس کی“ کے مابین الف بے تعلق کیوں رہ گیا۔ یہ بے تعلقی قانوناً صوت و قرأت کے سبب ہے تقطیع کی بنیاد پر نہیں۔ چنانچہ ایسے وضع قانون سے جماعت شعرا کبھی متفق نہیں ہو سکتی۔ جس کے زیر اثر اساتذہ سخن کے سیکڑوں، ہزاروں اشعار فضول بحروج ہو جائیں۔

ع اے بے کسوں کے آقا ب تیری دہائی ہے

یہ پورا مصرع ہی غلط نقل کیا گیا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اس بے بحر مصرع کا وزن تک بتاتے ہوئے اس کی تقطیع بھی کر دی گئی۔ مفعول مفاعیلین، مفعول مفاعیلین حالاں کہ مصرع

یوں ہونا چاہیے تھا:

اے بے کسوں کے آقا اب ہے تری دہائی

جس کی بحر مضارع مثنیٰ اُخرَب کے تحت مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن ہے اور رُل مثنیٰ مشکول کے تحت فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن ہے۔ ہزج مثنیٰ اُخرَب یعنی مفعول فاعلیں مفعول مفعول فاعلیں کے تحت مصرع کا وزن یہ ہونا چاہیے تھا:

اے جانِ وفا تیرے اندازِ نرالے ہیں

(ڈاکٹر شمیم احمد گوہر ص، ۵۱۵-۵۱۴)

(۱۱) خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والا ہے تو

سن اسے شیشوں کے میچا دل شکستہ میں بھی ہوں (صہبائت)

اساتذہ فن و سخن نے حرفِ ندا 'اے' کی تخفیف یعنی اس سے حرف یا گرا نا غلط اور عجربیان بتایا ہے۔ حالاں کہ مضمون میں اچھے اور بہت اچھے اشعار کا میلہ ہے۔ (طلحہ رضوی رق ص، ۵۶۴)

(۱۲) یعقوب تصور صاحب کی نعت کا مطلع ہے:

عظمتِ تخلیق کا ہر اک کمال ان کے لیے

حسنِ کائنات اوصافِ جمال ان کے لیے

’حسنِ کائنات‘ کو وزن میں ’حسن‘ کا ’نات‘ پڑھنا ہوگا جو غلط ہے۔ اسی نعت کے

بارہویں شعر میں یہ لفظ اصلاً درست استعمال ہوا ہے۔ شعر بھی پڑھ ہی لیجیے:

ان کی اقلیمِ بصیرت میں ہے ساری کائنات

بازیِ طفلان ہے کارِ دانیال ان کے لیے

دوسرے شعر میں قافیہ فعال لائے ہیں:

گردشِ ارض و سماتاروں کی چال ان کے لیے

دو جہاں کا ذرہ ذرہ ہے فعال ان کے لیے

حالاں کہ اس معنی میں لفظ فعال عین مشدد کے ساتھ ہے۔ فعال کے معنی لغت میں کچھ

اور ہیں جن کا یہ محل نہیں۔ ایک مصرع ہے:

ع چاند، سورج، زحل، زہرہ، مشتری، مریخ سب

اس میں زحل بروزن فعل استعمال ہوا ہے جب کہ لفظ زحل بروزن فعل ہے۔

(طلحہ رضوی برق ص، ۵۶۷)

(۱۳) بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ واؤ عطف کی طرح ’’نہ‘‘ اور ’’کہ‘‘ کا تلفظ اشعار میں یک حرفی ہوتا ہے نہ کہ دو حرفی۔ پروفیسر منور غازی لکھتے ہیں:

الفاظ ’’نہ‘‘ اور ’’کہ‘‘ کے دو حرفی الفاظ کے طور پر استعمال ہونے اور محسوب

ہونے کے سلسلے میں قدیم اور جدید عہد کے نام ور شعرا کے کئی اشعار پیش

کیے جاسکتے ہیں۔

مجھ کم استعداد کو یقین ہے کہ موصوف اپنے اس دعوے کی دلیل لانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ پروفیسر غازی آگے لکھتے ہیں:

میر تقی میر کا ایک شعر تقطیع کے ساتھ پیش خدمت ہے:

تشنہ لب مرگئے ترے عاشق نہ ملی ایک بوند پانی کی

فاعِلن فاعِلن مفاعِلن فاعِلن فاعِلن مفاعِلن

پروفیسر غازی سے سہو ہوا ہے۔ فاعِلن فاعِلن مفاعِلن کسی بحر کا وزن نہیں ہے۔ میر کا

یہ شعر بحرِ خفیف مسدس مجنون محذوف میں ہے۔ شعر کی صحیح تقطیع یوں ہوگی:

تشنہ لب مرگئے تیرے عاشق نہ ملی ایک بوند پانی کی

فاعلاتن مفاعِلن فاعِلن فاعلاتن مفاعِلن فاعِلن

چونکے نہیں! دوسرے مصرع میں پہلا رکن فاعلاتن ہے۔ اس بحر میں ’’صدر‘‘ و ’’ابتدا‘‘

میں زحافِ خبن کو روا رکھا گیا ہے کہ اس سے صورت شعری و ترنم میں کوئی نقص نہیں ہوتا۔ مثال

میں ایک دو نہیں سیکڑوں اشعار اساتذہ کے پیش کر سکتا ہوں۔ سر دست استاد ذوق کا شعر ملاحظہ ہو:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا اندازِ نصیب

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ذوق کا یہ شعر بحرِ رمل مثنیٰ مسکن محذوف میں ہے جس کا وزن ہے:

فاعلاتن فاعلاتن فاعِلن

اس شعر کے پہلے مصرع کے ’’صدر‘‘ میں فاعلاتن مجنون ہو کر فاعلاتن ہو جائے گا اور وہ محض اس لیے

کہ لفظ ’’نہ‘‘ دو حرفی استعمال نہیں ہوتا۔

شاعری میں علم العروض کے اصول و ضوابط کی پابندی لازم ہے۔ یہاں آزادی اور من مانی جائز نہیں۔ بحرِ رمل کے بیان میں استاد یاس یگانہ چنگیزی فرماتے ہیں:

صدر وابتدا میں سالم و مجنون کا اجتماع جائز ہے۔ رمل مثنیٰ مجنون میں صدر وابتدا اور حشو کے مقام پر فعلات کو تسکین اوسط کے مفعول بنالینا صحیح ہے۔ چاہیں تو اس شعر پر بھی غور کر لیں:

ہمہ از بہر نو سرگشتہ و فرماں بردار شرط انصاف بنا شد کہ تو فرماں مبری حافظ شیرازی کے بھی ایک دو شعر ملاحظہ ہوں:

نشوی واقف یک نکتہ ز اسرار وجود تا نہ سرگشتہ شوی دایہ امکاں را عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو نفی حکمت مکن از بہر دل عامی چند اشک نماز من از سرخ برآمد چہ عجب سخن از کردہ خود پردہ درے نیست کہ نیست ان اشعار میں ”نہ“، ”کہ“، ”و ادعطف“ کا یک حرفی استعمال اور فنی بروزن وحی بھی نظر آئے گا۔ پروفیسر ڈاکٹر منور غازی نے حفیظ جالندھری کا یہ مشہور مصرع بھی:

تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

اپنے اس دعوے کی دلیل میں پیش کیا ہے کہ اس میں لفظ ”نہ“ دو حرفی استعمال ہوا ہے اور اس مصرع کی یوں تقطیع کی ہے جو اصولاً اور صریحاً غلط ہے۔ تقطیع یوں کی ہے:

تم نے ہے بھلا دیا ہم نہ (نا) تے بھلا سکے
مستفعلن مستفعلن مفاعیلن مفاعیلن

جاننا چاہیے کہ بحر جز مفرد بحر ہے جس کے سالم ارکان آٹھ بار مستفعلن ہیں۔ انیس زحافات اس بحر میں لگتے ہیں جس سے اس کے سات مستعملہ اوزان بنتے ہیں مگر مستفعلن مفاعیلن مستفعلن مفاعیلن ان میں آتا ہی نہیں۔

حفیظ جالندھری کا مصرع دراصل بروزن:

مستفعلن مفاعیلن مستفعلن مفاعیلن

ہے جو بحرِ زج کا پانچواں مستعملہ مشہور وزن ہے۔ اسی بحر و وزن میں یہ شعر بھی

ملاحظہ ہو جس میں لفظ ”نہ“ یک حرفی ہی استعمال ہوا ہے۔

آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے

سوچھا پھر آنکھ سے نہ کچھ منزل یار دیکھ کر

ہو سکے تو تقطیع کر کے دیکھ لیں۔ رہ گئی بات لفظ وحی کے صحیح تلفظ کی، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ”جن اشعار میں اسے (وحی) متحرک ح کے ساتھ استعمال کیا ہے، ان اشعار کو بے وزن نہیں کہا جاسکتا۔“

دلیل یہ ہے کہ فیروز اللغات، نور اللغات اور رافع اللغات وغیرہ میں لفظ وحی کے حرف ح کو متحرک لکھا گیا ہے۔ اسی کو انگریزی میں کہتے ہیں Lame Excuse۔ وحی عربی لفظ ہے نفی و سعی کی طرح قرآن سے بڑھ کے سند کیا ہوگی۔ سورہ نجم کے شروع میں ہی دیکھ لیں ان ہو الا وحی یوحی ط [آیت: ۴]

سند کسی عربی یا فارسی مستند نعت سے دی ہوتی یا اردو ہی کے کسی استاد شاعر کا شعر پیش کرتے۔ احمد فراز اچھے شاعر ہیں مگر وہ فن شعرو زبان کے استاد نہیں۔ ”وحی“ بروزن ”ڈہی“ عوام بولتے ہیں وہی جوسان وادب سے لاعلم ہوتے ہیں۔ اسی لیے ”غلط العام فصیح“ کہا گیا ہے۔ ”غلط العوام“ نہیں۔ ”حکایت شبان و موسیٰ“ کا یہ مشہور شعر تو بہتوں کو یاد ہے:

وحی آمد سوے موسیٰ از خدا بندہ مار ازما کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

فارسی اشعار میں بھی ”نہ“ یک حرفی ہی استعمال ہوتا ہے اور اگر وزن کا تقاضہ دو حرفی کا ہو تو ”نہ“ کو نے استعمال کرتے ہیں جیسا کہ اوپر کے شعر سے ظاہر ہے اور یہی چلن اردو اشعار میں بھی ہے۔

آگے بڑھے تو کامران جاوید عرفانی کا خط دیکھا۔ ”نہ“ اور ”کہ“ سے متعلق جناب

عارف منصور کے موقف کو غلط ثابت کرنے میں انھوں نے بھی بہت زور لگایا ہے۔ لکھتے ہیں:

”عارف منصور جیسے ایک آدھ نامعتبر عروضی نے ان الفاظ کے بارے میں غلط رائے دی ہے جسے دسیوں اساتذہ کے اشعار غلط ثابت کر رہے ہیں۔“

انھوں نے دلیل و مثال میں (بالترتیب) بیدل حیدری، حالی، غالب، درد اور میر کے یہ اشعار نقل کیے ہیں:

نہ سہی آشیاں قفس ہی سہی سر تو آخر کہیں چھپانا ہے
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں رہ گئی شرمِ پارسائی کی
نہ سنو گر برا کہے کوئی نہ کرو گر برا کرے کوئی
جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہو گا
یہ چاروں اشعار متذکرہ بالا بحر خفیف مسدس مخبون محذوف میں ہیں جن کا وزن ہے:

فاعلاتن مفاعلن فعلن

جو اس شعر کا وزن ہے:

تشنہ لب مر گئے ترے عاشق نہ ملی ایک بوندِ پانی کی
میر تقی میر کے درج ذیل شعر کی تقطیع بھی عرفانی صاحب نے بالکل غلط کی ہے:
ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسی کے ساتھ
لے جاتے دل کو خاک میں اس آرزو کے ساتھ

اس شعر کا صحیح وزن ہے: مفعول فاع لاٹ مفاعیل فاعلن

تقطیع آتی ہو تو کر کے دیکھ لیں۔

ان کا غلط تقطیع کردہ وزن مستفعلن مستفعلن فعل بحر جز کے تحت آتا ہی نہیں۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

(طلحہ رضوی رقص، ۵۷۸، ۷۷۷)

(۱۴) ”نعت رنگ“ شمارہ نمبر ۲۱ میں خورشید ناظر کی کتاب ”بلغ العلیٰ بکمالہ“ پر محترم عارف منصور صاحب کا تبصرہ شائع ہوا۔ دوسری باتوں سے قطع نظر فاضل مبصر نے جو عرضی غلطیوں کی نشان دہی کی وہ اس میں حق بجانب ہیں۔ الفاظ ”نہ“ اور ”کہ“ ہمیشہ سے ایک حرفی ہی استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ کسی نے بھی انہیں دو حرفی نہیں باندھا مگر حیرت کی بات ہے کہ شمارہ نمبر ۲۲ میں پروفیسر ڈاکٹر عمران صاحب، پروفیسر ڈاکٹر منور غازی صاحب اور کامران جاوید عرفانی صاحب نے علم عروض سے نااہل ہونے کی بنا پر طوفان کھڑا کر دیا۔ تینوں حضرات نے اساتذہ کے کلام سے مثالیں دے کر تقطیع کی لا حاصل کوشش کی حالاں کہ ان میں سے ایک مثال بھی خورشید ناظر صاحب کے حق میں نہیں:

ان حضرات نے مثال میں جو اشعار پیش کیے ہیں، وہ یہ ہیں:

لے پھرا میں کہاں کہاں دل کو نہ لگائے گیا جہاں دل کو
نہ ملا وہ نفاق کے مارے کیا کریں ہم وفاق کے مارے
ہو چکا حشر بھی حسن لیکن نہ جیے ہم فراق کے مارے
جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
نہ سمجھ مجھ کو رائیگاں نہ سمجھ نہ سہی تیرے کام کا نہ سہی
نہ ملا کر اداس لوگوں سے حسن تیرا بکھر نہ جائے کہیں
تشنہ لب مر گئے ترے عاشق نہ ملی ایک بوندِ پانی کی
نہ سہی آشیاں قفس ہی سہی سر تو آخر کہیں چھپانا ہے
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں رہ گئی شرمِ پارسائی کی
نہ سنو گر برا کہے کوئی نہ کہو گر برا کرے کوئی

ڈاکٹر منور غازی صاحب نے ان اشعار کے ارکان ”فاعلن فاعلن مفاعیلن“ بتائے ہیں۔ حالاں کہ یہ اشعار بحر خفیف میں ہیں اور مختلف تبدیلیوں کے ساتھ اس بحر کے آٹھ اوزان بنتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن

۲۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن

۳۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن

۴۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن

۵۔ فعلناتن مفاعلن فعلن

۶۔ فعلناتن مفاعلن فعلن

۷۔ فعلناتن مفاعلن فعلن

۸۔ فعلناتن مفاعلن فعلن

اب ذرا یہ حضرات تقطیع کر کے بتائیں کہ کس استاد نے ”نہ“ اور ”کہ“ کو دو حرفی باندھا

ہے۔ اسی طرح منور غازی صاحب نے حفیظ جالندھری کے مصرع

ع تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

کے ارکان ”مستقلین مفاعیلن مستقلین مفاعیلن“ لکھے ہیں جب کہ اس کے ارکان یہ ہیں:

مقتعلین مفاعیلن مقتعلین مفاعیلن

کامران جاوید عرفانی صاحب نے تو ایک مصرع کی خود ساختہ تقطیع کرتے ہوئے عروض کی ٹانگ توڑ کے رکھ دی۔ تیر کے شعر:

ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسو کے ساتھ

لے جاتے دل کو خاک میں اس آرزو کے ساتھ

کے ارکان مستقلین مستقلین مستقلین فاعول بتائے ہیں جب کہ اس کے ارکان ہیں مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔

غرض یہ کہ حوالہ کے لیے دیے گئے تمام اشعار میں ”نہ“ اور ”کہ“ ایک حرفی ہی استعمال ہوا ہے، کسی بھی شعر میں دو حرفی نہیں۔ میں ان حضرات کی معلومات کے لیے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن بحروں میں گجائش نہیں ہوتی ان میں شعرا ”نہ“ کے بجائے فارسی لفظ ”نہ“ استعمال کرتے ہیں۔

مثلاً مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن کے وزن پر غالب کا مصرع:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یا مفاعیلن مفاعیلن فاعولن کے وزن پر اقبال کا مصرع:

نہ خود ہیں نے خدا ہیں نے جہاں میں

یا مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن فاعلن کے وزن ہی کا مصرع:

نہ سیم وزر سے محبت ہے نہ غم افلاس

یا مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کے وزن پر راقم الحروف کا مصرع:

اندازِ بیاں کافی نے طرزِ ادا کافی

حقیقتاً جون پوری کے شعر:

ٹھہری ہے اب تو آپ کے وعدے پہ زندگی

وہ زندگی کہ جان ہے جس سے عذاب میں

کے ارکان ہیں مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔ مجھے بتایا جائے کہ اس شعر میں ”کہ“ دو حرفی کہاں استعمال ہوا ہے؟ میرے خیال میں کسی بھی علم پر خامہ فرسائی سے پہلے اپنا مبلغ علم جانچنا ضروری ہے ورنہ ایسی ہی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوگی جیسی اب ہوئی ہے۔ (حافظ عبدالغفار حافظ ص ۶۶۳-۶۶۰)

(۱۵) زیر نظر شمارہ کے مندرجات میں جو تسامحات نظر آئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

پروفیسر محمد اقبال جاوید صاحب کے مضمون میں صفحہ نمبر ۳۶ پر ز کی کیفی صاحب کے اشعار میں مصرع ”دامن شرف و نام کی بکھری ہوئی تھی دھجیاں“ بحر سے خارج ہے کیوں کہ لفظ ”شرف“ میں ”ز“ متحرک ہوتی ہے جب کہ مصرع میں ”ز“ پرسکون ہے۔

پروفیسر محمد اکرم رضا صاحب نے اپنے مضمون میں صفحہ نمبر ۹۳ پر صابر براری صاحب کے دو اشعار درج کیے ہیں۔ ان میں پہلے شعر کا پہلا مصرع لفظ ”الم نشرح“ میں ”ح“ سا قحظ ہونے کی وجہ سے بحر سے خارج ہو گیا ہے۔

ضو بد اماں صورت میں جب گونجتی ہے برملا المزل ، المدثر ، المبشر کی صدا صفحہ نمبر ۳۶۹ پر صہبا اختر صاحب کی نعتیہ نظم ہے۔ اس کے پانچویں بند کے دوسرے مصرع میں انھوں نے ”المزل“ اور ”المدثر“ کو غلط طور پر باندھا ہے۔ المزل میں ”ز“ پر اور المدثر میں ”ذ“ پر تشدید ہونی چاہیے۔

صفحہ نمبر ۳۷۵ پر سید محمد طلحہ برق صاحب کی نعت میں ساتویں شعر کا دوسرا مصرع ہے: ”تمھاری حاضری ناظری جب کہ عطائی ہے“ لفظ ”کہ“ تقطیع میں ایک حرفی شمار ہوتا ہے مگر یہاں دو حرفی استعمال ہونے کی وجہ سے مصرع بحر سے خارج ہو گیا ہے۔

صفحہ نمبر ۳۷۶ پر سید شمیم احمد گوہر صاحب کی نعت ہے۔ اس کے پانچویں شعر کا دوسرا مصرع ہے ”قرآن کو دیکھا گویا ہے دیدار آپ کا“۔ یہاں ”دیکھا“ کی جگہ ”دیکھنا“ چاہیے تھا۔

مدعی ہے جہاں مدعا آپ ہیں، خالق و خلق کا رابطہ آپ ہیں

عرش اور فرش میں فاصلہ نہ رہا، مرجہا مرجہا مصطفیٰ مرجہا

خود یہ قرآن میں کہہ رہا ہے خدا، میرے محبوب کی گفتگو اور عمل

ہے مطابق وحی کے جو ہم نے کہا، مرجہا مرجہا مصطفیٰ مرجہا

اپنے روضہ پہ بلوالیں یا مصطفیٰ، روز و شب ہے میری التجا آپ سے

ہے نظیر عابدی کے لبوں پہ صدا، مرجہا مرجہا مصطفیٰ مرجہا

صفحہ نمبر ۳۸۱ پر سید نظیر حسین عابدی صاحب کی نعت ہے۔ اس کے دوسرے شعر کا مصرع ثانی بحر سے خارج ہے کیوں کہ لفظ ”نہ“ تقطیع میں ایک حرفی شمار ہوتا ہے، لیکن انھوں نے دو حرفی استعمال کیا ہے۔ چھٹے شعر میں ”وحی“ کا تلفظ غلط ہے۔ اس لفظ میں حائے حلی پر جزم ہوتا

ہے۔ مقطع کے پہلے مصرع میں ”میروی“ کی جگہ ”مری“ ہونا چاہیے مگر یہ کمپوزنگ کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس قسم کی غلطیاں اس شمارے میں بہت ہیں۔ مقطع کے دوسرے مصرع میں ”نظیر عابدی“ کی ”ع“ ساقط ہے۔

دکھا دیا اسے کردارِ مصطفیٰ نے ہمیں خدا کا حکم جو لکھا ہوا قرآن میں ہے صفحہ نمبر ۳۸۵ پر جمال نقوی صاحب نے چھٹے شعر میں لفظ ”قرآن“ فاعل کے وزن پر باندھا ہے جب کہ مفعول کے وزن پر ہونا چاہیے۔

لمبائی تھی بالشت میں دو انگلیاں زیادہ اور تسے تسے گل دستہ نعلیں محمد صفحہ نمبر ۳۸۹ پر مقصود احمد تبسم صاحب کا کلام ہے۔ انھوں نے بالکل نئی زمین تراشی ہے جو مجھے بہت پسند آئی لیکن نوں شعر میں انھوں نے لفظ ”زیادہ“ فاعل کے وزن پر باندھا ہے جو کہ غلط ہے۔ اس کی وجہ سے مصرع خارج از بحر ہو گیا۔ یہ لفظ فاعل کے وزن پر ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر شمیم احمد گوہر صاحب اپنے خط میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مصرع ”اے بے کسوں کے آقاب تیری دہائی ہے“ کے متعلق فرماتے ہیں:

یہ پورا مصرع ہی غلط نقل کیا گیا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اس بے بحر مصرع کا وزن تک بتاتے ہوئے اس کی تقطیع بھی کر دی گئی۔ مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن۔ حالاں کہ مصرع یوں ہونا چاہیے تھا۔ ”اے بے کسوں کے آقاب ہے تری دہائی“۔ اس کی بحر مضارع مثنیٰ اعراب کے تحت مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن ہے اور رمل مثنیٰ مشکول کے تحت فعلات فاعلاتن فعلات فاعلاتن ہے۔

سبحان اللہ، کیا کہنے، قربان جائیے اس عروض دانی کے۔ محترم گوہر صاحب نے جو دو بحریں رقم فرمائی ہیں، ان میں مؤخر الذکر بحر کا تو اعلیٰ حضرت کے مصرع سے کوئی تعلق بنتا ہی نہیں۔ رہی اول الذکر بحر تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اعلیٰ حضرت کی یہ نعت مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کے وزن پر ہی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ مذکورہ مصرع کا پہلا کلمہ ازوالہ بحرین ہونے کی وجہ سے مفعول فاعلاتن کے وزن پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ مزید تسلی کے لیے ”نعت رنگ“ شمارہ نمبر ۱۲ میں صفحہ نمبر ۱۳ پر ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب کا مضمون ”اشعار نعت اعتراضات کی حقیقت“ اور راقم الحروف کے خط کے مندرجات کا مطالعہ فرمائیں۔ میں نے اپنے مذکورہ خط میں میر تقی میر اور فانی

بدایونی کے اس قسم کے اشعار بطور حوالہ درج کیے ہیں۔

دو قمر دو پنچہ خود دو ستارے دس ہلال

ان کے تلوے، پنچے ناخن پائے اطہر ایڑی

صفحہ نمبر ۲۷۸ پر احمد صغیر صدیقی صاحب اعلیٰ حضرت کا ایک شعر اور ۳ مرتفع مصرعے لکھ کر فرماتے ہیں، ”دی ہوئی مثالیں شعریت کی صفت کو جا کر کرنے والی نہیں بلکہ مجروح کرنے والی ہیں“۔ صدیقی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ان میں شعریت کی کون سی صفت مجروح ہوئی۔

صفحہ نمبر ۲۸۰ پر محترم پروفیسر قیصر نجفی صاحب نے میر تقی میر سے منسوب ایک روایت کا ذکر کیا ہے مگر اس کی حیثیت من گھڑت افسانے سے زیادہ نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خدائے شن کا مصرع بحر میں ہے اور ”خیال“ کی ”ی“ گرنے کا خیال ہی دل سے نکال دینا چاہیے بلکہ اس کی جگہ ”ہی“ کی ”ی“ گرائیں میر کی یہ غزل جس بحر میں ہے اس کے ارکان مندرجہ ذیل ہیں:

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

اس بحر میں زحافات بہت ہیں جن کے استعمال کے بعد شعر کیا تقطیع اس طرح ہوگی:

فعلن	فعلن	فعلن	فعلن	فعلن	فعلن	فعلن	فعلن
عشق	برے ہی	خیال	پڑا ہے	چین	فعلن	فعلن	فعلن
رام	گیا آ	چین	پڑا ہے	چین	فعلن	فعلن	فعلن
دل کا	جانا	ٹھہر	گیا ہے	صبح	گیا یا	شام	گیا

(حافظ عبدالغفار حافظ ص ۶۵۵-۶۵۲)

(۱۶) ڈاکٹر شمیم گوہر صاحب نے راجا صاحب کے مصرع ”حاضری کی کوئی نہ کوئی تو صورت چاہیے“ کے بارے میں لکھا تھا کہ مصرع خارج از بحر ہے۔ اس کے جواب میں راجا صاحب فرماتے ہیں:

حضرت اس مصرع میں ”کوئی“ کی ”ی“ دبی اور ”و“ دب گیا۔ مصرع

خارج از بحر کس طرح ہو گیا۔

پھر اس کے بعد انھوں نے مصرع کی تقطیع کر کے اُسے بحر میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں راجا صاحب سے مؤدبانہ عرض ہے کہ آپ ڈاکٹر گوہر صاحب کا اصل اعتراض نہ سمجھ سکے۔ زیر بحث مصرع خارج از بحر صرف اس لیے ہے کہ اس میں لفظ ”نہ“ دو حرفی بندھا ہے

جب کہ یہ ایک حرفی استعمال ہوتا ہے۔ مصرع کی تقطیع اس طرح ہوگی:

فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلاتن
حاضری کی	کوئی نہ کو	کی تصویرت	چاہیے

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ لفظ ”نہ“ دو حرفی استعمال ہونے سے مصرع بحر سے خارج ہو گیا۔

اسی طرح صفحہ نمبر ۱۵۳ پر راجا صاحب کا مصرع ”تھے اور بھی رسل مگر رب نے حبیب کو“ اس وجہ سے خارج از بحر ہے کہ اس میں ”مگر“ کا ”ز“ ساقط ہے۔

صفحہ نمبر ۱۶۲ پر جناب افتخار عارف کا مصرع ”اک عبد مولا صفات ہے اور روشنی ہے“ ”عبد“ کی ”ع“ ساقط ہونے سے بحر سے خارج ہو گیا۔ اسی طرح صفحہ نمبر ۱۶۷ پر مصرع ”ایک عالم ہے اس عالم کی خبر لاتا کون“ بھی ”ع“ ساقط ہونے سے بحر سے خارج ہے۔ ان کے علاوہ کمپوزنگ کی غلطی سے بھی ان کے بعض مصرع غلط ہو گئے۔

صفحہ نمبر ۳۱۹ پر جناب محمد علی شیدا کے مجموعہ کلام ”الصلوة والسلام“ پر پروفیسر قیصر نجفی صاحب کا تبصرہ ہے۔ صاحب کتاب کے مصرع ”یہ کائنات مطیع اک عرب کے شاہ کی ہے“ کے بارے میں قیصر صاحب فرماتے ہیں، ”مصرع وزن سے باہر ہے۔ ”مطیع“ کی ”ع“ گر رہی ہے۔“ فاضل تبصرہ نگار کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مصرع بحر میں ہے کیوں کہ ”مطیع“ کی ”ع“ گری نہیں۔ اُسے ”الف“ سے سہارا مل گیا۔ (حافظ عبدالغفار حافظ ص ۶۵۸-۶۵۶)

(۱۷) صفحہ ۳۱۵ پر پروفیسر غلام رسول عدیم کے مضمون میں حنیف نازش قادری کے ایک نعتیہ شعر کی توصیف کی گئی ہے جو یہ ہے:

حسان جو ہے رونقِ بستانِ مصطفیٰ میں نے اُس عندلیب کا دامن پکڑ لیا

اس شعر کا مصرع ثانی بحر سے خارج ہے کیوں کہ عندلیب کا ”ع“ تقطیع سے باہر ہے۔

محترم پروفیسر محمد اقبال جاوید نے صفحہ ۱۴۰ پر تعلیٰ نہ خود نمائی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ راقم الحروف کے دو اشعار بھی اسی موضوع پر ہیں جو نعتیہ مجموعے ”قذیلِ حرا“ میں شامل ہیں:

ثوابِ نعت گوئی کے بھلا کیا مستحق ہیں ہم

کریں کچھ غور، شہرت کی طلب میں ہر سخن ور ہے

(تنویر پھول ص ۲۳۸)

(۱۸) یہاں یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ قیصر نجفی صاحب کے مجموعے ”رب آشنا“ کے ص ۶۳ پر ایک شعر ہے:

حوالے سے ترے اے سنگِ اسود! اک عظمت کی کہانی لکھا رہا ہوں

چوں کہ مصرع ثانی میں عظمت ”ع“ گر رہا ہے اس لیے یہ مصرع بحر سے خارج ہے کیوں کہ یہاں الف کا وصل نہیں ہے۔ (تنویر پھول ص ۲۳۸)

(۱۹) جناب عزیز احسن کی نظم ”رمزِ معراجِ مصطفیٰ“ کا کیا کہنا مگر اس کا پانچواں مصرع:

عالمِ انسانیت میں صرف اک انسان ہیں آپ

میرے ناقص خیال میں اگر یوں ہوتا تو بہتر تھا:

عالمِ انسانیت میں آپ وہ انسان ہیں (طلحہ رضوی برق ص ۵۷۴)

(۲۰) مگر درج ذیل شعر میں لفظ ”دھیان“ کے استعمال میں فنی سقم پایا جاتا ہے۔ دھیان

بروزن ”دھان“ باندھا جاتا ہے۔

تابندہ کس کی یاد ہے اور کس کا تذکرہ

روشن ہیں جسم و جاں مرے کس کے دھیان سے

درست استعمال کی مثال پیش خدمت ہے۔ خواجہ میر درد فرماتے ہیں: (قیصر نجفی ص ۷۵۳)

ان دنوں کچھ عجب ہے دل کا حال سوچتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے

میں نے سوچا تھا کہ خط میں اختصار سے کام لوں گا لیکن یہ خط طویل ہوتا جا رہا ہے۔

میں اسے یہیں ختم کرنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر محمد اسلم فرخی صاحب اور شبنم رومانی صاحب نے آنکھیں

دکھانا شروع کر دیں۔ ان کی آنکھوں کا ہر گوشہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ہمارا گوشہ تو خصوصی گوشہ ہے۔

ہمارے معاملے میں بخل سے کیوں کام لیتے ہو اور اظہارِ خیال کیوں نہیں کرتے ہو؟... اب انھیں

کیسے ناراض کروں... ان کی نعتوں پر تبصرے سے پہلے مرتبین سے شکوہ کروں گا کہ اس خصوصی

گوشے کی طرف انھوں نے خصوصی توجہ نہیں کی ورنہ کتابت کی اتنی غلطیاں نہ ہوتیں... مثلاً (اسلم

فرخی کے) مندرجہ ذیل اشعار کو دیکھیے:

ہے نفس و آفاق میں رونقِ ترے دم سے

اے صاحبِ طبل و علم اے سرورِ کونین

اس شعر میں لفظ ”نفس“ کے ”الف“ کی کتابت نہیں ہوئی جس سے شعر وزن سے گر گیا ہے۔

فاصلہ کوئی مدینے میں نہیں ہے باقی

تھم گئی وقت رفتار مبارک باشد

اس شعر کے مصرع ثانی میں لفظ ”وقت“ اور ”رفتار“ کے درمیان لفظ ”کی“ ہوگا

جو غائب ہے اور یوں شعر بے وزن ہو گیا ہے۔

یہی جی میں تھا اور ٹھہروں اور کچھ ٹھہروں

پڑھا میں نے سلام آخری آہستہ آہستہ

اس شعر کے مصرع اولیٰ میں شاعر کا تخلص ”اسلم“ ہوگا جو کتابت ہونے سے رہ گیا ہے

اور یوں یہ مصرع بے وزن ہو گیا ہے اصل مصرع یوں ہوگا: یہی جی میں تھا اسلم اور ٹھہروں اور کچھ ٹھہروں۔

(۲۱) درکارے حضور نہ دولت نہ عز و جاہ پڑ جائے مجھ پہ صرف عنایت کی اک نگاہ

بے دین معاشرے کی نضاؤں میں لوٹ کر ہو جائے یہ غلام نہ آقا کہیں تباہ

اعدا ہوئے ہیں در پے آزاد یا نبی اب ان کے شر سے بچنے کی مل جائے مجھ کو راہ

میں ہوں میان شر و فساد و ظلم حضور رہ کر عجم میں میرا مقدر ہیں اشک و آہ

ص ۲۵۹ پر عزیز: احسن کی نعت کے اشعار نمبر ۱، نمبر ۳، نمبر ۶، نمبر ۸ کی سہو کتابت سے

خارج وزن ہو گئے۔ (ملک الظفر سہرامی ص ۸۴۸)

(۲۲) پیش نظر شمارہ میں ”طلوع فجر“ کے عنوان سے محترم ریاض حسین چودھری صاحب کی

طویل معرّ النعتیہ نظم کے تیس بند ہیں۔ محترم شاعر نے ابتدا میں وضاحت کی ہے کہ نظم ہذا ۱۲۱/ریج

الاؤل یعنی پیدائش رسول مقبول ۷ کے حوالے سے ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے مگر چند مقامات محل

نظر ہوئے مثلاً نظم کے ہر بند کا پہلا مصرع ”افلاک پر ہے دھوم کہ آتے ہیں وہ رسول“ حضور ۷

کے سفر معراج کا تاثر دیتا ہے حالاں کہ آگے چل کر بات واضح ہو جاتی ہے۔ نظم کے بند نمبر ۶ کے

چوتھے مصرعے میں لفظ ”گلمہ“ باندھا گیا ہے جب کہ اسے کلمہ یعنی ل متحرک بالکسر ہونا

چاہیے۔ (ماجد خلیل ص ۷۷۹-۷۷۸)

(۲۳) اس جگہ ایک غلطی کا ازالہ کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ پچھلے شمارے میں راقم الحروف

نے ماجد خلیل صاحب کے ایک شعر کو حسینی کلمات کے ساتھ کوٹ کیا تھا۔

اک لفظ سے بنے ہوئے جہاں میں اک نام سے روشنی ہوئی ہے

حقیقتاً یہ شعر سقیم ہے۔ اس کا پہلا مصرع بحر سے خارج ہے۔ ایک رکن اس میں بڑھ گیا

ہے۔ راقم الحروف کی اس غلطی کی سمت توجہ عزیز عزیٰ احسن نے دلائی تھی میں ان کا ممنون

ہوں۔ (احمد صغیر صدیقی ص ۹۰)

(۲۴) صفحہ نمبر ۲۷ پر ڈاکٹر اشفاق انجم کی جو حمد ہے اُس کے چھٹے شعر کا دوسرا مصرع ”وہی کہ

اخلاص و نشر والا، وہی کہ رعد و دُخان والا“ شاعر کی نظر ثانی کا طلب گار ہے، ”نشر“ کی جگہ

”فتح“، (سورۃ الفتح) یا ”ناس“ (سورۃ الناس) یا اسی کا ہم وزن کوئی لفظ استعمال ہو سکتا

ہے۔ (تنویر پھول ص ۲۵/۹۲۰)

(۲۵) تنویر پھول صاحب نے میری حمد (نعت رنگ نمبر ۲۴، ص ۳۷) کے چھٹے شعر کے تعلق

سے لکھا ہے:

”چھٹے شعر کا دوسرا مصرع ”وہی کہ اخلاص و نشر والا وہی کہ رعد و دُخان

والا“ شاعر کی نظر ثانی کا طلب گار ہے۔ ”نشر“ کی جگہ ”فتح“، (سورۃ فتح)

یا ”ناس“ (سورۃ ناس) یا اسی کا ہم وزن کوئی لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔“

تنویر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ”اخلاص و نشر اور رعد و دُخان“ میں کیا خرابی ہے اور ”فتح و ناس“

کیوں استعمال کرنا چاہئے تھا! تنویر پھول صاحب سے میری مودبانہ درخواست ہے کہ نقد و

اغراض کریں تو اس کی توجیہات و جواز بھی پیش کریں ورنہ یہ صرف اعتراض برائے اعتراض

کہلائے گا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۲۶/۶۵۱)

(۲۶) صفحہ نمبر ۶۵ پر اشفاق انجم صاحب نے اپنے مصرع ”وہی کہ اخلاص و نشر والا،

وہی کہ رعد و دُخان والا“ کے بے وزن ہونے کے بارے میں وضاحت چاہی ہے اور وضاحت نہ

کرنے پر اعتراض کیا ہے۔ عرض ہے کہ راقم الحروف نے اپنی بات کو بالکل عام فہم سمجھ کر اس کی

وضاحت ضروری نہیں سمجھی تھی۔ ظاہر ہے کہ ”نشر“، بروزن ”فعلن“ ہے جبکہ بحر میں صرف

”فاع“ کی گنجائش ہے، اس لیے ”نشر“ کی جگہ ”فتح“، یا ”ناس“ یا اسی کے ہم وزن یعنی ”فاع“

کے وزن پر کسی لفظ کے استعمال کی تجویز دی گئی تھی۔ اشفاق صاحب کی حمد کی بحر یہ ہے:

”مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن“ (۴ بار)۔ مذکورہ بالا مصرع بحر میں نہیں ہے

کیوں کہ تقطیع میں حرف ”ح“ بحر سے خارج ہے۔ تقطیع کر کے خود دیکھ لیں یا کسی عروض داں سے

سمجھ لیں۔ (۵۲۴/۲۷) ویسے شاید یہ تقطیع سمجھ میں آجائے:

وہی ہ اخ لاص و نش رَح والا وہی ہ رَح دو دخان والا
مفاع لا تن م فاع؟ لاتن مفاع لاتن مفاع لاتن
غالب کا مصرع ”دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو“ سیاق و سباق سے الگ کر کے
پیش کیا گیا ہے، پہلا مصرع بھی تو دیکھیں: طاعت میں تارہے نہ مے وانگیں کی لاگ: (تنویر پھول
ص، ۵۲۵/۲۷)

(۲۷) سید صاحب! ”اپنی بات“ کے عنوان سے آپ نے بڑی عمدہ باتیں کہی ہیں لیکن آپ
نے بھی چند شعرا ایسے پیش کئے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی نقص موجود ہے۔ مثلاً ذوق کا یہ مصرع:
”یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے“

اس میں شکست ناروا کا ایسا عیب موجود ہے جس سے ذم کا پہلو نکلتا ہے ”لوٹنے“ کی
تقطیع کی جائے تو ”ٹ“ متحرک (مفتوح) ہو جاتا ہے۔

جلوہ روئے محمد کا ہے واصف طارق

اس کی ترتب میں اُجالے ہی اُجالے ہوں گے

اس سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ ”جلوہ روئے محمد“ کے وصف سے قبر میں اُجالا ہوگا یا
نہیں! شعر میں ”اُجالے ہی اُجالے ہوں گے“ غیر فصیح ہے۔ فصحاء زبان نے ہمیشہ ایسے مواقع
پر ”اُجالا ہی اُجالا ہوگا“ استعمال کیا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۶۳۱-۶۳۰)

(۲۸) دو جہاں میں ہے رواں سکہ رسول اللہ کا
اصل لفظ ”کلمہ“ ہے، ”کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی“

(ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۶۳۶/۲۶)

(۲۹) روح کونین کا ترجمان چاہئے مدح احمد کو وہ زباں چاہئے
اگر کمپوزنگ کی خامی نہیں ہے تو غامی مصرع بحر سے خارج ہے۔ ”وہ“ کی بجائے ”ایسی“ چاہئے۔
نیز زبان کی مناسبت سے ”کا ترجمان“ کی بجائے ”کی ترجمان“ چاہئے۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۶۳۷/۲۶)

(۳۰) جلیل عالی کی نظم کا راحت اور پرویز صاحبان نے نہایت عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔
صرف ایک چیز مجھے کھٹک رہی ہے جس کے لیے میں ماہر فن (علم؟) عروض سے رجوع ہونا چاہتا
ہوں کہ نظم کے یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

اللہ! اللہ! آقا! آقا!! کیسی منزل کیسا رستہ
قدم قدم قرباں دل اس پر جس کے وسیلے پایا رستہ
پہلے شعر کی تقطیع رکن ”فعلن“، مثنیٰ سالم پر یوں ہوگی جب کہ دوسرے شعر کا پہلا مصرع اس وزن
پر نہیں ہے تو کیا ماہرین عروض نے اسے جائز قرار دیا ہے؟ ”سید ضیاء الدین نعیم“ (ڈاکٹر اشفاق
انجم ص، ۶۴۱/۲۶)

(۳۱) ”تمہارے بزرگ اوّل کا یہ رافع کرشمہ تھا“
کلمہ حاذق صاحب نے ”بُزرگ“ کو ”بُزرگ“، نظم کیا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۵۰۹/۲۷)
(۳۲) صفحہ نمبر ۳۸۵ پر جو نعت ہے اس کے مطلع کا دوسرا مصرع یہ ہے:
”کوئی کیا بتائے لیکن تو کیا ہے کیا نہیں ہے“۔

استفہامیہ ”کیا“ کو ہمیشہ ”کا“ کے وزن پر باندھا جاتا ہے جبکہ اس مصرع میں دوسرے
”کیا“ کا وزن مختلف ہونے کی وجہ سے مصرع بحر سے خارج ہو گیا ہے۔ (متفاعلن فعلن
متفاعلن فعلن) (تنویر پھول ص، ۵۲۲/۲۷)

(۳۳) صفحہ ۵۴۲ پر دوسرے شعر میں اضافت کے بغیر ”مرآشتی“ مفہوم نہیں دے رہا ہے
اور اضافت کے ساتھ مصرع بحر سے خارج ہے۔ اسے اس طرح کیا جاسکتا ہے: کہ وجہ زندگی و آشتی
اسم محمد V ہے۔ (تنویر پھول ص، ۵۲۲/۲۷)

(۳۴) ”نعت رنگ“ ۲۴ کے ص ۵۳۹ پر نعت کی اشاعت کے لیے سپاس گزار ہوں۔ اس
عرض کے ساتھ کہ نعت کے تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں ”وہی ہے“ کے بعد لفظ ”حق“ چھپنے
سے رہ گیا ہے۔ جس سے شعر کے وزن اور معنی دونوں پر منفی اثر پڑا ہے۔

(رئیس احمد نعمانی ص، ۹۱۱/۲۵)

(۳۵) ص ۵۰۰ پر حافظ عبدالغفار حافظ صاحب نے جناب محمد علی شیدا کے مصرع (یہ کائنات
مطیع اک عرب کے شاہ V کی ہے) پر پروفیسر قیصر خفگی کے اعتراض کو رد کیا ہے کہ ”مصرع وزن
سے باہر ہے مطیع کی ع“ گر رہی ہے۔ پہلی بات یہ کہ ”ع“ مذکر ہے مؤنث نہیں، اس لیے خفگی صاحب
کو لکھنا چاہیے تھا کہ ”مطیع“ کا ”ع“ گرا نہیں اسے الف سے سہارا مل گیا۔ (تنویر پھول ص، ۲۲۸)

(۳۶) اک حیات ہے میرے نبی کا نام صحرا میں ایک باغ ہو جیسے کھجور کا
(شبنم رومانی کے) پہلے مصرع میں کوئی لفظ کتابت ہونے سے رہ گیا ہے جس کی وجہ

سے مصرع وزن سے گر گیا ہے اور شعر بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

اُدھر عرش پر مہمان خصوصی اُدھر فرش پر میزبان ہیں محمد
(شبنم رومانی کے) دوسرے مصرع میں لفظ ”مہمان“ کی بجائے ”مہمناں“ ہوگا۔ پہلی
میم کے بعد ”ے“ کے دو نقطے کتابت ہونے سے رہ گئے ہیں اس خامی کی وجہ سے شعر وزن سے گرا
ہوا معلوم ہوتا ہے۔ (نقوی احمد پوری، ص ۸۸۳)

(۳۷) صہبا اختر کا شعر ہے:

خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والا ہے تو

سن اے شیشوں کے میساج! دل شکستہ میں بھی ہوں

تیکھے تیور کے علاوہ اس میں ”شتر گربہ“ بھی ہے اور اس تذہفن و سخن نے حرفِ ندا ’اے‘
کی تخفیف یعنی اس سے حرف یا کا گرانا غلط اور عجیب بیان بنایا ہے۔ حالاں کہ مضمون میں اچھے اور
بہت اچھے اشعار کا میلہ ہے۔ (طلحہ رضوی برق ص ۵۶۴)

خود اکرم رضا صاحب کا وہ شعر جو انھوں نے مضمون کے آخر میں لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ اس کا آخری
مصرع ہے۔ ”پر اس سے آپ نہ کیجیے کنار ایا رسول اللہ ۷۔“ اس میں ذرا ”نہ“ کا وزن ملاحظہ
ہو جس نے شعر کو کسی مبتدی کا شعر بنا دیا ہے۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۵۱)

(۳۸) سید صاحب! ”اپنی بات“ کے عنوان سے آپ نے بڑی عمدہ باتیں کہی ہیں لیکن آپ
نے بھی چند شعرا کیسے پیش کئے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی نقص موجود ہے مثلاً ذوق کا یہ مصرع:
”یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے“

اس میں شکست ناروا کا ایسا عیب موجود ہے جس سے ذم کا پہلو نکلتا ہے ”لوٹنے“ کی
تقطیع کی جائے تو ”ے“ متحرک (مفتوح) ہو جاتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۳۰-۶۲۹)

(۳۹) ہر کدورت سے قلب صاف کرو اپنے دشمن کو بھی معاف کرو

نسبتِ رحمتِ دو عالم کا عملاً بھی تو اعتراف کرو

حصہ مدحت بھی خوب اور رنگارنگ ہے۔ حضرت وقار صدیقی اجیری کی نعتیہ

رباعیوں میں آخری (چوتھی) رباعی، رباعی کی بحر میں نہیں ہے۔

گھمبیر ہو جب بھی غم کا سایہ جب قلب پریشاں نے مجھے تڑپایا

جب کوئی بھی تسکین کی صورت نہ رہی بے ساختہ نام آپ کا لب پہ آیا

اسے قطعہ کہہ سکتے ہیں۔ جناب قمر عینی کی تیسری رباعی میں ’بے ساختہ نام آپ کا لب پہ آیا‘ اس
مصرع میں پہ کی جگہ ’پُر‘ لکھنا تھا۔ پہ، نہ، کہ وغیرہ صرف ایک حرکت شمار ہوں گے، نہ کہ سبب
خفیف۔ تخفیف سے مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے۔ آصف اکبر کے مقطع میں بھی یہی بات ہے۔
شاعری میں زبان و بیان کا معاملہ مشکل بھی ہے، آسان بھی ہے۔
(طلحہ رضوی برق ص ۵۶۶)

(۴۰) اے سبز گنبد نبی گواہ ہے عرش کا مکیں ملا ہے میری چشم دل کو نور کوہ طور کا
گواہ کا ”ہ“ ساقط الوزن ہے۔ شاکر صاحب کی ”چشم دل“ کو کیا واقعی ”کوہ طور“ کا
نور ملا ہے؟ نعت میں اس قسم کی تعلی درست نہیں ہے اور پھر ستم یہ کہ عرش کے مکیں کو گواہی میں پیش
کر رہے ہیں!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۰)

(۴۱) شعری حصے میں کچھ اشعار میرے خیال میں سہو کتابت کی نذر ہو گئے ہیں۔ مثلاً اقبال
عظیم کا ایک شعر ص ۴۸ پر:

حرمِ قدسی میں محفوظ تھی جو روزِ اوّل سے

وہ نعمتِ آمنہ کی محترم آغوش نے پائی

ص ۵۰ پر عابد علی عابد کا ایک شعر:

اب تاجدارِ یثرب و بطحا کا ہے ظہور تاجِ مصر و شام، بہ الحراف روم ورے

ص ۵۰ پر اکرام علی اختر کا شعر:

آپ کے آنے سے روشن ہو گئے دشت و جبل

عرشِ تاباں ہو گیا فرشِ زمیں میں روشن ہوا

(ملک الظفر سہرامی، ص ۸۴۷)

(۴۲) نہ آیا ہے نہ آئے گا، جہاں میں آپ سا کوئی

جہاں حسن سے ہے تابندہ وہی ہے آپ کا دامن

صفحہ ۵۰ پر شیو بہادر سنگھ دلبر کی نعت کے پانچویں شعر کے مصرع ثانی میں

”جہاں حسن سے ہے تابندہ وہی آپ کا دامن“ بے وزن ہے

قدم قدم پہ گود شوار یوں کا سامنا ہے زُہد شعار مگر کامیاب آپ کے ہیں

صفحہ ۵۱ پر علی اصغر عباس کی نعت کے آٹھویں شعر کے مصرعِ ثانی میں ”زُہد شعار...“

میں لفظ ”زُہد“ ایک کے بجائے دو رکنی ہو گیا ہے۔ (غالب عرفان، ص ۷۰۳)

(۲۳) سریر بقدر نور ہے ان کا زیبا اس نور سے ماخوذ ہے ہر پیکر انوار صفحہ ۴۹ پر شہزاد مجرودی کی نعت کے چوتھے شعر کے مصرع اولیٰ میں لگتا ہے کوئی ایک رکنی لفظ چھوٹ گیا لہذا بے معنی ہے۔ (غالب عرفان، ص ۷۰۳)

(ب) قافیہ اور ردیف کے معائب:

(قافیہ: اصطلاح میں قافیہ لفظ کے آخر میں واقع ایسے متعین حروف کو کہا جاتا ہے جن کی تکرار دوسرے الفاظ میں مساوی مقام پر ہوتی ہے۔ یعنی یہ حروف و حرکات کا ایسا مجموعہ ہوتا ہے جو معنوی لحاظ سے تو اکثر اوقات مختلف ہوتا لیکن تکرار کے ساتھ آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دو یا دو سے زیادہ مصرعوں کے آخر میں (اگر ردیف استعمال ہوئی ہو تو اس سے پہلے) آنے والے ایسے الفاظ جو ملتی جلتی آواز پر ختم ہوں۔ مثلاً بلبل اور قتل یا گلشن اور جو بن وغیرہ۔

ردیف: دو یا دو سے زیادہ مصرعوں کے آخر میں آنے والے ایسے الفاظ جو پورے کے پورے دہرائے جائیں ردیف کہلاتے ہیں۔ یہ ایک لفظ پر بھی مشتمل ہوتے ہیں اور ایک سے زیادہ الفاظ پر مشتمل بھی۔ (۱) جہاں کن سے ادھر کیا تھا کون جانتا ہے مگر وہ نور کہ جس سے یہ زندگی ہوئی ہے ”جہاں کن“ یہ کون سا جہاں ہے؟ ”یہ“ حشو ہے۔ تقابلاً ردیفین کا نقص بھی ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۲۸۵)

(۲) رائیگاں ہوتا نہیں ہے کسی مقتول کا خون وہی قاتل کو بھی اک روز سزا دیتا ہے سرچل دیتا ہے اللہ ہر اک ظالم کا اور مظلوم کو جنت میں جگہ دیتا ہے دوسرے شعر میں قافیہ غلط ہے۔ سزا، افسانہ، پروانہ کے ساتھ ”جگہ“ کسی طور استعمال نہیں ہو سکتا۔ اس کا اصل املا ”جگہ“ ہے جگہ نہیں اگر اسے بہ اعتبار قافیہ پڑھیں تو ”جگا“ پڑھنا پڑے گا اور اس کے معنی بدل جائیں گے۔ جیسا کہ افسانہ، پروانا، دیوانا لکھنے کی باوجود ان کے معنی نہیں بدلتے۔ اگر سزا کے ساتھ جگہ کو قبول کر لیں تو پھر ”وجہ“ میں کیا برائی ہے؟

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۶)

(۳) جب نشید خیر مقدم گا رہی تھیں بچیاں

آنکھوں میں سرمہ ثنا کا تھا لبوں پر نعت رنگ

جس طرح ”سزا-جگہ“ ہم قافیہ نہیں اسی طرح ”ذات-نعت“ بھی ہم قافیہ نہیں ہیں۔ رات-نشاط-صوتی اعتبار سے قافیہ ہو سکتے ہیں لیکن ”ذات-نعت“ نہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۹)

(۴) یاد کر کے جو مدینہ نہ بہائیں آنسو

ایسی آنکھوں سے تو بہتر ہے کہ نا ہوں آنکھیں

”نا“ قافیہ غلط ہے۔ ”نہ“ درست ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۲)

(۵) نور کیا نور خدا ہے آپ کا مرتبہ سب سے جدا ہے آپ کا اس میں ایسا کا عیب بھی موجود ہے۔ توانی میں حرف روی ”ضمہ“ کی حرکت سے ہے (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۲)

(۶) اب جہاں تک اجتماع ردیفین کا تعلق ہے پہلے متحولہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

حضور ایسا کوئی انتظام ہو جائے سلام کے لیے حاضر غلام ہو جائے
حضور آپ جو سن لیں تو بات بن جائے حضور آپ جو کہہ دیں تو کام ہو جائے
یہ چار مصرعے نہ رباعی کے ہیں نہ قطعہ کے، بلکہ غزل کے دو اشعار ہیں جس کی ردیف ”ہو جائے“ ہے۔ تیسرے مصرعے کے آخر میں ”بات بن جائے“ ہے جس کا ردیف سے کوئی تعلق نہیں۔ مضمون نگار نے اس کو ردیف سے تعبیر کرتے ہوئے اجتماع ردیفین کا عیب قرار دے دیا اور اس عیب سے چھٹکارہ دلانے کے لیے الگ سے ایک مصرع بھی کہہ ڈالا:

حضور آپ جو سن لیں تو میری بات بنے

یہاں پر اجتماع ردیفین کی نزاکت ”میری بات بنے“ کی بنیاد پر بات نہیں بنا سکتی۔ یہاں پر صرف حرف یائے معروف ہی کے سبب یہ خرابی لازم آرہی ہے۔ یائے معروف ہٹ جائے اجتماع ردیفین کا عیب خود بخود ساقط ہو جائے۔ مصرع کو یوں ہونا چاہیے تھا:

حضور بات بنے میری آپ جو سن لیں

”توان شاء اللہ ضرور بن جائے گی محض سن لیں“ کے تحت یہ عیب جاتا رہا۔ (ڈاکٹر شمیم

احمد گوہر، ص ۵۱۵-۵۱۶)

(۷) ہمارے قلب میں فاران سے ہوئی روشن کلیم لائے تھے جو آگ طور سے اپنے کیا شاعر فاران پر موجود تھا؟ یا پھر اب بھی فاران پر وہ آگ موجود ہے؟ حضور نے ”دلوں کو نور“ عطا کیا تھا یا آگ؟! ردیف ”اپنے“ بھی ضائع ہو گئی یعنی اس کے بغیر بھی شعر مکمل

ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۹)

(۸) اس امر پر کہ سب سے عظیم آدمی ہے کون ہے اتفاق دیدہ وراں آپ کے لئے شعر کی ردیف ضائع ہوگئی۔ اتفاق کے ساتھ ”کیلئے“ نہیں ”پڑ“ کی ضرورت ہے۔ یعنی ”دیدہ وروں کا آپ پر اتفاق ہے۔“ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۰)

(۹) خیر اندیش آپ اپنے دشمنوں کے بھی رہے بغض رکھا ہی نہیں دل میں کسی کے واسطے رحمتہ اللعالمین کا امتی ہے تو تعیم دل میں ہرگز بغض مت رکھنا کسی کے واسطے دونوں شعروں میں ردیف ”کے واسطے“ ضائع ہوگئی، اس کی بجائے صرف ”سے“ چاہئے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۱)

(۱۰) ڈاکٹر اشفاق احمد انجم صاحب نے میرے تین اشعار کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے:

مدینے کے جزیرے میں مری کشتی بھی آ پہنچی
خزانہ سامنے ہو تو بھلا نقشہ میں کیا مانگوں
ریاض خوش نوا کو بھی رعایا میں رکھیں شامل
محمد کی غلامی کی خدا کی انتہا مانگوں

دوسرے ردیف ”مانگوں“ غلط ہے یعنی ریاض اور مانگنے والا یہاں دو الگ الگ شخصیتیں ہو جاتی ہیں۔ مطلب مانگنے والا ”ریاض خوشنوا“ کے لیے مانگ رہا ہے۔ جبکہ ریاض خود اپنے لیے مانگ رہا ہے۔ اس صورت میں ردیف مانگنے ہونی چاہیے۔ نیز جب خدا سے مانگا جا رہا ہے تو ”رکھیں“ صیغہ جمع قطعی غلط ہے۔ اسے ”رکھے“ ہونا چاہیے تھا۔ (ریاض حسین چودھری، ص ۲۷/۴۹۴-۴۹۳)

(۱۱) سبیل ہے اور صراط ہے اور روشنی ہے اک عبد مولیٰ صفات ہے اور روشنی ہے کتاب و کردار ساتھ ہے اور روشنی ہے درود جزوِ صلوة ہے اور روشنی ہے بیان معبود و عبد یشاق نور کے بعد نظر میں بس ایک رات ہے اور روشنی ہے افتخار عارف صاحب نے صراط، صفات، ساتھ، صلوة بطور قافیہ استعمال کیے ہیں۔

اہل ہندو۔ ت۔ وغیرہ کا تلفظ ”ت“ سے کرتے ہیں لیکن لکھتے تو صحیح ہیں۔ مملکت اہل عرب میں ان کا تلفظ بالکل جدا ہے اس لیے اصل تلفظ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ورنہ لوگ چراغ، آگ، باغ، ناگ، قمیص، رئیس، خبیث جیسے الفاظ بھی ہم قافیہ استعمال کرنے لگیں گے۔ ماہرین لسانیات

اور عروض دانوں نے مل فوظی قوافی کو مکتوبی قوافی کے مسائل تسلیم نہیں کیا ہے تو قوافی کے لیے مکتوبی شکل میں یکسانیت لازمی ہے۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷/۵۰۸)

(۱۲) بچھے دلوں میں یقین سحر سلامت ہے کہ اسم پاک ترا صبح کی علامت ہے کبھی سے دور رہی تیرے گلستاں کی بہار کہ تیرے باغ کا ہر نخل سرو قامت ہے وہ اب ہوں کوچہ طائف کہ شام کے بازار ترے لہو کا تقاضا ہی استقامت ہے تو وہ چراغ جو نور ازل سے روشن ہے تو وہ حدوث کہ جس کی بنا قدامت ہے صفحہ ۵۴۸ پر مطلع کے قوافی ”سلامت“ اور ”علامت“ ہیں، اس وجہ سے دیگر قوافی میں بھی ”لامت“ ہونا چاہئے جیسے ”لامت“۔ علاوہ ازیں چوتھے شعر میں تقابل ردیفین ہے جسے اس طرح دور کیا جاسکتا ہے: ”تو وہ چراغ جو نور ازل سے ہے روشن“۔

دیدار کیا کرتا ہر آن محمد کا اے کاش کے میں ہوتا دربان محمد کا صفحہ ۵۵۷ پر مطلع میں ”کہ“ کی جگہ ”کے“ غلط کمپوز ہوا ہے۔ (تویر پھول، ص ۲۷/۵۲۳-۵۲۲)

(۱۳) یہاں انسان خود انسانیت سے نا شناس تھا

تباہی اس کی منزل تھی منزل اس کا منشا تھا

”نا شناسا“ غیر فصیح ہے نا آشنا کہتے ہیں۔ قافیہ بھی ناموزوں ہے۔ منشا یعنی مرضی، خواہش، کوئی اپنی منشا سے منزل نہیں چاہتا۔ یہاں توشہ جیسا کوئی قافیہ ہونا چاہیے تھا۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۴-۱۴۳)

(۱۴) اٹھا کے آنکھ کو میں نے جہاں جدھر دیکھا تو جلوہ تیرا ہی رب العلا ادھر دیکھا جدھر، ادھر غلط قوافی ہیں اور اگر کچھ رعایت کی جائے تو ”ایطاء“ ہے۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۵)

(۱۵) دوسرے شعر میں قافیہ فعال لائے ہیں:

گردش ارض و سما تاروں کی چال ان کے لیے

دو جہاں کا ذرہ ذرہ ہے فعال ان کے لیے

حالاں کہ اس معنی میں لفظ فعال عین مشدد کے ساتھ ہے۔ فعال کے معنی لغت میں کچھ اور ہیں جن کا یہ محال نہیں۔ (طلحہ رضوی برق، ص ۵۶۷)

(۱۶) لب، زباں، آنکھ، جگر، قلب مری ہر اک شے
آپ کی جانِ جہاں مدح کناں ہو جائے
صفحہ نمبر ۳۸۶ پر افضال احمد انور صاحب نے دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں قافیہ
”مدح کناں“ استعمال کیا ہے جو کہ جمع ہے جب کہ یہاں واحد کا تقاضا تھا۔
(حافظ عبدالغفار حافظ، ص ۶۵۳)

(۱۷) یاد کر کے جو مدینہ نہ بہائیں آنسو
ایسی آنکھوں سے تو بہتر ہے کہ ناہوں آنکھیں
”نا“ قافیہ غلط ہے۔ ”نہ“ درست ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۲)

(۱۸) ”مدحتیں“ کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:
اس اک نگاہ کی وسعت پہ دو جہاں صدقے جسے خدا شب اسرئی دکھائی دیتا ہے
اگر یہ شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے تو اسکی ردیف غلط ہے۔ اسے ”دکھائی دیتا تھا“ ہونا
چاہئے تھا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۶-۱۲۵)

(۱۹) سامنے ہیں سرور کون و مکاں آہستہ بول اے لب لرزاں! دل گر یہ کناں آہستہ بول
”لب لرزاں! دل گر یہ کناں“ دو چیزیں ہیں اس لئے ردیف ”بول“ کی بجائے ”بولو“ ہونی
چاہئے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶-۶۳۶)

(۲۰) ڈاکٹر سید یحییٰ شیط نے اپنے مضمون میں صفوت علی کے یہ شعر بھی پیش کیے ہیں۔
دربار محمد ہے مری آنکھ کے اندر بیٹھے ہوئے وہ صاف نظر آنے لگے ہیں
پہلا سوال تو یہ اٹھتا ہے کہ کیا واقعی ایسا ہے؟ دوسرا یہ کہ کیا اسکی ردیف صحیح ہے؟ ”آنے لگے ہیں“
کی بجائے ”نظر آرہے ہیں“ ہونا چاہئے تھا۔

لوسانس بھی آہستہ کہ ٹوٹے نہ مرا خواب سرکار دو عالم مرے پاس آنے لگے ہیں
کسی اور کے سانس لینے سے شاعر کا خواب کیسے ٹوٹے گا؟ یہاں بھی ردیف کا وہی
حال ہے یعنی ”آنے لگے ہیں“ بجائے ”آرہے ہیں“ کی ضرورت ہے۔ صفوت صاحب کس
اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کی آنکھوں میں دربار محمد لگتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بیٹھے نظر
آتے ہیں اور آپ ان کے پاس وقت بے وقت آنے بھی لگے ہیں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق
سے حقیقت سے بعید یا منافی شعر کہنا بھی باعث عذاب ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۵)

(۲۱) سمیعہ ناز صاحبہ کے درج ذیل اشعار میں تقابل ردیفین کا نقص موجود ہے:
عطا حسن ارادت ہو، بصیرت بھی ملے مجھ کو سبق سیرت کا جواز برکرائے ایسی مدحت ہو
وہ مدحت ہو کہ جس میں حرمت سرور مجسم ہو جو میری فکر کو اعلیٰ بنائے ایسی مدحت ہو
ثنائے شاہ طیبہ کا قرینہ بھی میسر ہو گہرا فکر کے ہر سولٹائے ایسی مدحت ہو
تینوں اولیٰ مصرعے اس طرح تبدیل کرنے سے یہ نقص دور ہو جائے گا (۱) عطا حسن ارادت
ہو، ملے مجھ کو بصیرت بھی، (۲) وہ مدحت ہو کہ جس میں ہو مجسم حرمت سرور، (۳) ثنائے شاہ طیبہ کا
میسر ہو قرینہ بھی۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶-۶۵۰/۶۲۹)

(۲۲) ڈاکٹر صاحب نے علامہ کے چار مصرعے اس جملے کیساتھ درج کیے ہیں، ”ایک نعت
پاک میں چار کے عدد سے کیا ہی مضمون آفرینی کی ہے کہ پڑھ کر دل وجد کرنے لگتا ہے۔

چار رسل فرشتے چار چار کتب ہیں دین چار
سلسلے دونوں چار چار لطف عجب ہے چار میں
آتش و آب و خاک و بادان ہی سے سب کا ہے ثبات
چار کا سارا ماجرا ختم ہے چار یا ر میں
چوتھے مصرعے کی ردیف مضمون کے اعتبار سے ”میں“ کی بجائے ”پر“ کا تقاضا کرتی ہے۔ (ڈاکٹر
اشفاق انجم، ص ۱۳۸)

(۲۳) جملہ جاں تری خوشبو سے مہک اٹھتا ہے
گوشہ دل میں نہاں غارِ حرا لگتا ہے (ابرار سالک)
”اٹھتا ہے اور لگتا ہے“ میں تقابل ردیفین کا عیب ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۱۲/۲۷)

(۲۴) سن کے دیکھو زمانے کے اہل قلم تم سے کہتی ہے کیا سورہء والقلم
شان محبوب میں کیوں ہوں گستاخیاں حق تعالیٰ نے کھائی قسم والقلم
اے قلم کار عشاق آگے بڑھو کردو اُن پر ثار آج اپنے قلم
حفظ ناموس آقا و مولائے کل ہے تقاضائے ”تعلیم حق“ بالقلم
صفحہ ۴۹۵ پر ولی اللہ عظیم آبادی کی مکمل نعت (جس کے چار شعر درج بالا ہیں) اگر مردف ہے تو
قافیہ کہاں؟ غیر مردف ہے تو ہر مصرع میں قلم؟ (غالب عرفان، ص ۷۰۳)

ایطاء:

(ایطاء: کسی قافیہ میں معنی واحد پر ایک کلمے کی تکرار ایطاء ہے۔ عام طور پر ایطاء کا تعین قوافی سے زائد حروف کو ساقط کر کے کیا جاتا ہے۔ اگر سقوط کے بعد لفظ اپنے اصلی معنی پر قائم رہتا ہے تو ایسے قوافی کو ایطاء سمجھا جاتا ہے۔ جیسے میخانہ اور بت خانہ میں خانہ کو علیحدہ کرنے سے ع اور بت اپنے اصلی معنی پر قائم رہتے ہیں لیکن بعض مقامات پر یہ طریقہ صحیح نہیں ہوتا۔ اس لیے ایطاء کے تعین کے لیے مفرد الفاظ کے اشتقاق اور مرکب الفاظ کے اجزا کو مد نظر رکھنا لازمی ہوتا ہے جیسے کھلے اور پکے الفاظ سے زائد حروف کے سقوط کے بعد کھل اور پک بامعنی الفاظ بنتے ہیں۔ یہاں ایطاء کا تعین آسانی سے ہو جاتا ہے لیکن آیا اور گیا میں الف کے سقوط کے بعد پہلی مثال کی طرح ایطاء کا تعین نہیں ہو سکتا اس لیے یہاں الفاظ کے اشتقاق اور ان کی فعلی گردان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً پکے اور رُلے قوافی میں حرف روی ے دونوں الفاظ میں مضارع کے حکم میں ہے جس کے سقوط سے پک اور رُل قافیہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے شعر میں ایطاء واقع ہو جائے گا۔ اسی طرح آب اور گلاب قوافی ہیں۔ یہاں دونوں الفاظ میں آب ایک معنی کا حامل ہے اس لیے یہاں ایطاء ہے۔

ایطاءے جلی: ایسے ایطاء کو کہا جاتا ہے جس میں واضح طور پر حرف روی یا قافیہ کا جزو ایک معنی پر دلالت کرتا ہے جیسے ہندوستان اور گلستان کے قوافی میں ”ستان“ دونوں جگہ ایک ہی معنی کا حامل ہے۔ ان الفاظ سے ”ستان“ کے سقوط سے ہند اور گل بامعنی الفاظ بنتے ہیں جو کہ آپس میں قافیہ نہیں ہے۔ ایطاءے جلی اکثر مرکب الفاظ یا زائد حروف پر مشتمل الفاظ میں واقع ہوتا ہے جو کہ کثرت استعمال کی وجہ سے اپنی مرکب صورت کو نہاں کر کے مفرد لگتے ہیں۔ جیسے سیلاب = سیل + آب اور گلاب = گل + آب کی مرکب شکل ہیں لیکن یہ الفاظ بظاہر مفرد معلوم ہوتے ہیں یا زائد حرف جیسے مسلمان اور عورتاں میں ”اں“ حروف زائد ہیں۔ ان زائد حروف کو اصلی حروف قرار دینے سے قوافی میں ایطاءے جلی پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی سیلاب کا قافیہ گلاب اور عورتاں کا قافیہ مسلمان کرنا ایطاءے جلی ہے۔

ایطاءے خفی: ایسے ایطاء کو کہا جاتا ہے جس میں پوشیدہ الفاظ کے آخری جزو کی تکرار ایک ہی معنی پر ہوتی ہے۔ یعنی دو الفاظ کے آخری حروف پر اصلی ہونے کا قوی گمان ہوتا ہے جیسے رنجور اور مزدور قوافی میں ”و“، ”ز“ قواعد کے اصول کے مطابق زائد حروف ہیں۔ رنجور کے معنی ہیں صاحب رنج اور مزدور کے معنی ہیں صاحب مزدور رنج اور مزدور آپس میں قافیہ نہیں ہیں۔ چونکہ یہ دونوں الفاظ کثرت استعمال کی وجہ سے اصل

لفظ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اس لیے یہاں ایطاء کے جلی نہ ہو کر ایطاءے خفی ہے۔ علمائے قافیہ کے نزدیک ایسے قوافی کم قبیح ہوتے ہیں۔)

(۱) ڈاکٹر شہزاد احمد کا مضمون ”نعتیہ کلیات کی روایت، ایک مطالعاتی جائزہ“ معلومات افزا مضمون ہے لیکن ان کے انتخاب کردہ اشعار میں سے بعض میں فنی نقائص موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو: اٹھا کے آنکھ کو میں نے جہاں جدھر دیکھا تو جلوہ تیرا ہی رب العلا ادھر دیکھا جدھر، ادھر غلط قوافی ہیں اور اگر کچھ رعایت کی جائے تو ”ایطاء“ ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۲۳۶-۲۳۵)

(۲) نور کیا نور خدا ہے آپ کا مرتبہ سب سے جدا ہے آپ کا ”نور کیا“ استعجابیہ یا استغنیامیہ لکڑا ہے اور دونوں اعتبار سے غلط ہے۔ اس میں ایطاء کا عیب بھی موجود ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۲)

(۳) ان کی نسبت سے مجھے سارا جہاں جانتا ہے ورنہ میں کیا ہوں مجھے کوئی کہاں جانتا ہے (علی رضا) ”جہاں اور کہاں“ میں ایطاءے جلی کا عیب ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۱۱/۲، ۵۱۰)

(ج) زبان و بیان سے متعلق تسامحات

(صرف ونحو، فصاحت، تعقید، حشو، شتر گر بہ)

۱۔ صرف ونحو، فصاحت:

(صرف: وہ علم جس میں کسی زبان کے مختلف اقسام کے الفاظ کا تجزیہ، ساخت، ڈھانچہ، درجہ بندی، گروہ بندی، اور الفاظ کی تشکیل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں زبان کی ان بامعنی اکائیوں کا مطالعہ جو لفظ کی سطح تک محدود ہو صرف کہلاتا ہے۔

نحو: مختلف الفاظ کن اصولوں کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ترکیب میں اور پورے جملے میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس کا مطالعہ نحو میں کیا جاتا ہے۔ صرف میں ہم لفظ کی سطح تک زبان کا مطالعہ کرتے ہیں جب کہ نحو میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ کس طرح مل کر جملے کی تشکیل کرتے اور معنی پیدا کرتے ہیں، اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

فصاحت: اصطلاح میں فصاحت ایسی صورت حال اور معیار سے عبارت ہے جس کے تحت شعر میں الفاظ، محاورے، فقرے، ان کی صوتی ترتیب اور ان کا محل استعمال مستند اہل زبان اور مستند شعرا کے مطابق کیا جاتا ہے۔ یعنی فصاحت مستند اہل زبان کا زبان کے سلسلے میں رویہ اور طریقہ ہے۔

(۱) پہلی نعت جناب تابش دہلوی کی ہے۔ یہ ایک سادہ سی نعت ہے۔ ان کا ایک مصرع ہے۔ (مدینہ میں کچھ ایسی راحت ملی ہے) اور دوسرا بھی (مدینہ میں اپنا قیام اللہ اللہ) دونوں میں انھوں نے ”مدینے“ کی بجائے ”مدینہ“ لکھا ہے۔ جب کہ میرے خیال میں یہاں ”مدینے“ لکھنا مناسب تھا۔ ذرا یہ جملہ دیکھیں ”وہ گھوڑا پر بیٹھا تھا“ اور یہ جملہ دیکھیے ”وہ گھوڑے پر بیٹھا تھا“۔ بہر حال تابش صاحب استاد ہیں فصاحت کے رموز ان سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔

(احمد صغیر صدیقی، ص ۶۷)

(۲) جو دل پہ گزری ہے وہ واردات اس کی ہے

ورق یہ اس کا ہے اور لفظیات اس کی ہے

لفظیات کی مناسبت سے ثانی مصرع میں ردیف میں ”ہے“ کی بجائے ”ہیں“ کا محل ہے۔

عطا ہو ژرف نگاہی کا بھی ہنر مجھ کو

ترے کرم سے مرا ذوق دکنیات میں ہے

”ژرف نگاہی“ فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ اسے ہنر کہنا غلط ہے۔ ہنر کسی چیز ہے اور ژرف نگاہی سیکھی نہیں جاسکتی۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۵)

(۳) جہاں رنگ و بو ہے بس مرے سرکار کا صدقہ

نواد و قلب تاباں ہے شہ ابرار کا صدقہ

”نواد، قلب“ دونوں ایک ہی ہیں۔ اگر قلب کو روح سے بدل دیں تو!! ثانی مصرع

میں ”ہے“ کی بجائے ”ہیں“ کی ضرورت ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۹-۱۲۸)

(۴) قلم کو چاند ستاروں کا پیر بن آقا یہ التماس یقیناً مری وفا کی ہے

”التماس“ مؤنث نہیں مذکر لفظ ہے۔ مصرع اس طرح ہوگا۔ ”یہ التماس یقیناً مری وفا کا ہے“ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۹)

(۵) فلک کو میزبانی کی سعادت جب ملی ہوگی

تو بے چاری زمیں کی رات آنکھوں میں کٹی ہوگی

شعر میں ”ہوگی“ شکلیہ صیغہ ہے اور زمانہ ماضی ہے تو یہاں ہوگی نہیں ”تھی“ کا محل ہے۔

(ریاض حسین چودھری، ص ۵۰۶/۲۷)

(۶) چلی باد صبا کچھ ایسے فاراں کی چٹانوں سے

گلابوں کی مہک آنے لگی صحرائی خاروں سے

”فاراں“ پہاڑ ہے چٹانوں کا مجموعہ نہیں! ”صحرائی خاروں“ کی بجائے ”صحرا کے خاروں“ کا محل ہے۔

یہ اس معمار اعظم ہی کی سب تعمیر لگتے ہیں

جنہیں خیر البشر کے نام سے ہم یاد کرتے ہیں

”تعمیر لگتے ہیں“ شکلیہ صیغہ ہے شاید شاعر کو یقین نہیں ہے کہ یہ سب واقعی ”خیر البشر“

کی تعمیر ہیں؟ شاعر کے لیے ضروری ہے کہ تلازمات لفظی و معنوی پر خصوصی توجہ دے۔ ریاض حسین چودھری کی نعت:

در حضور سجا طشت روشنی کا ہے چراغ باٹنا منصب مرے نبی کا ہے

طشت روشنی کا ہے تو روشنی، نور باٹنا جائے گا یا چراغ؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۴)

(۶) مولانا عبد الرحمن جاتی کی نعت میں کمپوزنگ کی بہت ساری خامیاں ہیں۔ اس کے علاوہ

جہاں جہاں فارسی شعر یا عبارتیں شائع ہوئی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ملتی ہے اس طرف توجہ دیجیے۔

اس شمع ہدایت سے ملتی ہے ضیا سب کو جاری ہے مدینے پر فیضان محمد کا

ثانی مصرع میں ”مدینے“ کی بجائے ”زمانے“ ہوتا تو شعر آفاقی ہو جاتا۔

صفحہ ۶۵۹ پر محمد اللہ قادری صاحب نے ایک شعر درج کیا ہے،

اور بھی ارض وطن میں ہیں ولے سب شماروں سے جدا ہے نعت رنگ

شعر میں ”شماروں“ کی بجائے ”رسالوں“ کا محل ہے شاعر نے شمارے اور رسالے کا فرق ملحوظ نہیں رکھا۔ تنویر پھول صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں:

”نعت نامے میں احمد صغیر صدیقی صاحب کا مکتوب زیر نظر آیا۔ افسوس کہ ان کو راقم

الحروف کی حمد کا یہ سادہ سا قطع پسند نہیں آیا۔“

پامال ہے یہ گلشن ہستی میں ہو رہا فریاد لایا پھول ہے تیری جناب میں

احمد صغیر صدیقی صاحب کو مقطع پسند نہیں آیا تو اس کی وجہ بھی صاف ہے کہ یہ فصاحت و بلاغت اور صرف و نحو کے اصولوں پر کھرا نہیں اترتا۔

شعر اگر اس طرح ہوتا تو صدیقی صاحب کو یقیناً پسند آتا۔

پامال ہو رہا ہے خس و خار کی طرح
(ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۵۱۲/۷)

(۸) سامنے ہیں سرورِ کون و مکاں آہستہ بول اے لبِ لرزاں! دلِ گریہ کنناں آہستہ بول
 ”لبِ لرزاں! دلِ گریہ کنناں“ دو چیزیں ہیں اس لئے ردیف ”بول“ کی بجائے ”بولو“ ہونی
 چاہئے۔ یہی حال اس مصرع کا ہے

ع اے وفورِ شوق! اے جذبِ رواں آہستہ بول

”جذبِ رواں“ کا مطلب بھی میری سمجھ میں نہیں آیا؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۶۴۶/۲۶)

(۹) صفحہ ۴۴ پر بھارت کے ڈاکٹر اشفاق انجم صاحب نے اپنے مضمون میں پھر ”تُو“ اور ”آپ“ کی بحث چھیڑ دی اور وہ رشید وارثی (مرحوم) پر برس پڑے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ نظم کا مزاج نثر کے مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ استاد ذوق کے قصائد کا مطالعہ کر لیں۔ وہ نظم میں بادشاہِ وقت کو بھی ”تُو“ سے خطاب کرتے ہیں۔ اسی طرح علامہ اقبال بھی جب نظم میں اپنی والدہ سے مخاطب ہوتے ہیں تو کہتے ہیں، ”آسمان تیری لہر پر شبنم افشانی کرے“۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مباحثہ اب ختم ہو جانا چاہیے اور جو شعر العنت میں ”تُو“ کی ضمیر کو جائز سمجھتے ہیں اُن پر اعتراض نہ کیا جائے۔ (حافظ عبدالغفار حافظ ص ۶۶۳)

(۱۰) اسلم کہ ترے در کا غلام ازلی ہے اے سید والا حتم، اے سید کونین (اسلم فرخی کے) مندرجہ بالا شعر کو پڑھ کر احساسِ تشنگی رہ جاتا ہے۔ پہلے مصرع میں لفظ ”کہ“ کسی عرضِ مدعا کا تقاضا کرتا ہے جو اس میں نہیں ہے۔ ”کہ“ کی بجائے لفظ ”تو“ ہوتا تو یہ خامی نہ رہتی۔

(۱۱) روزِ اوّل بیان ہوئے تھے تمام اسم روشن کیا جہاں کو محمد کے نام نے مصرعِ اوّلیٰ میں لفظ ”اوّل“ کتابت کی غلطی معلوم ہوتا ہے۔ یہ ”ازل“ ہوگا۔ اگر (اسلم) فرخی صاحب نے ”اوّل“ لکھا ہے تو انھیں اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

اک حیات ہے میرے نبی کا نام صحرا میں ایک باغ ہو جیسے کھجور کا

(شبنم رومانی کے) پہلے مصرع میں کوئی لفظ کتابت ہونے سے رہ گیا ہے جس کی وجہ سے مصرع وزن سے گر گیا ہے اور شعر بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

اُدھر عرش پر مہمانِ خصوصی اُدھر فرش پر میزبان ہیں محمد

(شبنم رومانی کے) دوسرے مصرع میں لفظ ”مہمان“ کی بجائے ”مہمباں“ ہوگا۔ پہلی میم کے بعد ”ے“ کے دو نقطے کتابت ہونے سے رہ گئے ہیں اس خامی کی وجہ سے شعر وزن سے گرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

گر یہ جو میں نے صبح و مساء، روز و شب کیا

آخر مرے حضور نے مجھ سے طلب کیا

(شبنم رومانی کے) دوسرے مصرع میں ”مجھ سے طلب کیا“ مجھے اچھا نہیں لگا۔ حضور ۷ نے کیا طلب کیا؟ وہی گریہ جو صبح و مسا کیا گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دوسرے مصرع میں کتابت کی کوئی غلطی ہے یا کچھ اور ہے۔ (نفقوی احمد پوری، ص ۸۸۳)

(۱۲) مدحت کے حصے میں مولانا محمد قاسم ہاشمی کی نعت کی ردیف ’میری طرف کو دیکھنا‘ کچھ بھلی نہ لگی۔ اس میں ’کو‘ کھٹکتا ہے، غلط ہونہ ہو۔ (احمد صغیر صدیقی ص، ۷۳)

(۱۳) اذاں ہوئی ہے جب ہمیں نبی قریب جاں ملے

تصور اپنے ذہن میں کہاں ہے ان سے دور کا

”تجربہ ہے یہ کیسا عشق نبی ہے جو صرف اذان کے وقت ہی جاگتا ہے؟“ ”دور“ کی بجائے ”دوری“ کا محل ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۰)

(۱۴) سید صاحب! اپنی بات کے عنوان سے آپ نے بڑی عمدہ باتیں کہی ہیں لیکن آپ نے بھی چند شعرا ایسے پیش کئے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی نقص موجود ہے مثلاً ذوق کا یہ مصرع:

”یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے“

اس میں شکست ناروا کا ایسا عیب موجود ہے جس سے ذم کا پہلو نکلتا ہے ”لوٹنے“ کی قطع کی جائے تو ”ٹ“ متحرک (مفتوح) ہو جاتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ۶۳۰/۲۶)

(۱۵) جلوہ روئے محمد کا ہے واصف طارق
ان کی تربت میں اُجالے ہی اُجالے ہوں گے

اس سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ ”جلوئے روئے محمد“ کے وصف سے قبر میں اُجالا ہو گیا نہیں! شعر میں ”اُجالے ہی اُجالے ہوں گے“ غیر فصیح ہے۔ فصحاءِ زبان نے ہمیشہ ایسے مواقع

پر ”اُجالا ہی اُجالا ہوگا“ استعمال کیا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۲۳۱-۲۳۰)

(۱۶) ڈاکٹر شہزاد احمد کا مضمون ”نعتیہ کلیات کی روایت، ایک مطالعاتی جائزہ“ معلومات افزا مضمون ہے لیکن ان کے انتخاب کردہ اشعار میں سے بعض میں فنی نقائص موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اٹھا کے آنکھ کو میں نے جہاں جدھر دیکھا تو جلوہ تیرا ہی رب العلا ادھر دیکھا
”کو“ حشو ہے۔ آنکھ کو اٹھا کر دیکھنا غیر فصیح ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۲۳۶-۲۳۵)

(۱۷) جو دنیا میں تراکھا کرتے شکوے کریں یارب تعجب ہے کہ ان پر بھی رہے لطف و کرم تیرا
”ترے شکوے“ یہاں غیر فصیح ہے ایسے مواقع پر فصحا ”ترا شکوہ“ کہتے ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۲۳۶)

(۱۸) دل کی خواہش ہے کہ گل گشت جہاں سے نکلے

دشتِ طیبہ کے کسی خار پہ ٹھہرے جا کر

”نکلے“ نہیں ”چھوٹے“ چاہئے اور ”خار“ پہ کیوں ٹھہرے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۱)

(۱۹) احمد صغیر صدیقی صاحب کی حمد کا مطلع ہے:

پتھروں کو بھی نمی دیتا ہے ساری توفیق وہی دیتا ہے

شعر میں ”بھی“ حشو قبیح ہے۔ بھی کے معنی ہیں ”نیز۔ علاوہ“ اس لیے پتھر کے ساتھ کسی اور غم ناک شے کا ذکر ضروری تھا۔ اس کے علاوہ نمی کی بجائے نموکا محل ہے اور ایک توفیق کے لیے ”ساری“ کا استعمال بھی غلط ہے یہاں ”ایسی یا اس کی“ کہنا تھا:

بے زبانی کو جو دیتا ہے وہ نطق نغمہ و نغمہ گری دیتا ہے

یہاں ”جو“ کی بجائے ”جب“ کی ضرورت ہے۔ ہاں اگر شعر میں ”وہ“ نہ ہوتا تو جو درست ہوتا۔ اسد ثنائی کی نظم تشنگی کا مصرع ”مشتیوں کے کواڑ سر کے“ پڑھ کر ہنسی آگئی۔ شاید اسد صاحب سمجھتے ہیں کہ مشیت کوئی کمرہ ہے یا کسی کمرے میں رکھی ہوئی ہے اور کواڑ سر کھلنے پر اس کا نزول ہوتا ہے۔ انھیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ کواڑ کھلتے ہیں سرکتے نہیں اور Sliding Doors میں کواڑ نہیں ہوتے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۲)

(۲۰) ڈاکٹر سراج احمد قادری صاحب نے علامہ احمد یار نعیمی کی ایک طویل نعت پیش کی ہے

جس کا یہ شعر:

خوشی میں سب کی کھلی ہیں باچھیں رچی ہے شادی مچی (ہیں؟) دھو میں

چرند ادھر کھلکھلا رہے ہیں پرند ادھر چچہ چہا رہے ہیں

چرندوں کے تعلق سے رینکنا، ہنہننا، ڈکارنا وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔ ”کھلکھلانا“ نہیں۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۸)

(۲۱) ”نعت شناسی“ کا سلسلہ بھی بہت خوب ہے جن شعرا تک ہماری رسائی نہیں ہے وہ اس

کے ذریعے ہم تک پہنچ رہے ہیں لیکن اس تعلق سے عرض خدمت ہے کہ بعض مضمون نگار و مبصرین اپنے مضامین میں عیب دار اشعار بھی درج کر دیتے ہیں جن کی بنا پر مضمون کمزور اور شاعر کی فن کاری مشکوک ہو جاتی ہے، مثلاً پروفیسر اکرم رضا نے ڈاکٹر ریاض مجید کی نعت شناسی میں یہ ایک شعر درج کیا ہے:

دفورِ جذب سکینت بتا رہی ہے ریاض

یہ نعت بھی مری صل علی قبول ہوئی

”دفور“ مذکر لفظ ہے اس لیے بتا رہی کی بجائے ”بتا رہا ہے“ چاہیے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۲-۱۳۱)

(۲۲) میری بینائیاں عرش سے جا ملیں دیدہ ور آئینہ دیکھتے رہ گئے

شعر کی بے معنویت سے الگ ”میری“ کے ساتھ ”بینائیاں“ کا استعمال غلط ہے صرف بینائی استعمال ہوتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۲-۱۳۱)

(۲۳) مظہر صدیقی صاحب کی نظم میں بھی کئی خامیاں ہیں۔

عرب کی سرزمین تپتے ہوئے پیتل کی صورت تھی

وہ دن کی روشنی میں ہول ناک آتش کی صورت تھی

روشنی میں تپش نہیں ہوتی اس لیے ”ہول ناک آتش“ کا استعمال درست نہیں ہے۔ نیز

”سرزمین“ کو ”آتش کی صورت“ کہنا بھی غلط ہے۔ آج تک کسی نے زمین کو صورت سے تشبیہ نہیں دی ہے۔

سیاہی رات کی جب اپنی چادر لہلہاتی تھی

گناہوں کے نہ جانے کتنے دفتر کھول جاتی تھی

چادر پھیلا نا، چادر بچھنا، چادر اوڑھنا تو محاورے ہیں لیکن چادر کے ساتھ لہلہانا کا

استعمال آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔

لٹیرے شیر تھے اس ریگ کے پتے کچھاروں میں
نقب زن گدھ کی صورت پھر رہے تھے ریگزاروں میں
ریگستان میں کچھار نہیں ہوتے، دریا کی ترائی کو کچھار کہتے ہیں:

یہاں انسان خود انسانیت سے ناشناس تھا

تباہی اس کی منزل تھی تنزل اس کا منشا تھا

”ناشاسا“ غیر فصیح ہے نا آشنا کہتے ہیں۔ قافیہ بھی ناموزوں ہے۔ منشا یعنی مرضی، خواہش، کوئی اپنی منشا سے تنزل نہیں چاہتا۔ یہاں تو شہ جیسا کوئی قافیہ ہونا چاہیے تھا۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۲-۱۴۳)

(۲۲) چراغِ مدحت آقا منڈیرے پر رکھا ہے موڈب ہوگی سرکش ہوا الحمد للہ
”چراغِ مدحت آقا“ کس شکل و صورت کا ہوتا ہے؟ منڈیرے شاید مقامی زبان ہے ورنہ ”منڈیر“ یا ”منڈیری“ کہا جاتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۷-۱۴۶)

(۲۵) انور شعور کی نعتیں ”میرے مولا بلالو مدینے مجھے“ یہ مصرع داوین میں ہونا چاہئے کیوں کہ یہ شعور صاحب کا نہیں ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶-۲۳۸)

(۲۶) شاہ عرب کے پیٹ پہ پتھر بندھے ہوئے دیکھے تو کوئی طرزِ معیشت حضور کی طرزِ مونث نہیں ”مذکر“ لفظ ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶-۲۳۹)

(۲۷) نہ کوئی آپ سے ذی مرتبت زمانے میں نہ کوئی آپ سے ذی جاہ یا رسول اللہ دونوں مصرعوں میں ”سے“ کی بجائے ”سا“ چاہئے۔ شاید کمپوزنگ۔۔۔۔۔؟ اگر نہیں تو ”آپ سے زیادہ/ بڑھ کر“ کہنا چاہئے تھا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶-۲۳۹)

(۲۸) امید و بیم میں رکھتا ہے شوق دید ہمیں کبھی قرار کبھی اضطراب آتا ہے ”بیم“ (خوف) کا استعمال بے محل ہے۔ اضطراب ”آتا“ نہیں، ہوتا ہے۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶-۲۴۰)

(۲۹) تعیم ان کی محبت تھی رب سے بے پایاں رضا پہ رکھتے تھے اس کی نظر خدا کے رسول مصرع ثانی میں ”کی“ کی بجائے ”کو“ چاہئے اور جملے کی ترکیب یوں درست ہوگی ”اس کی رضا پہ نظر رکھتے تھے خدا کے رسول“

انھوں نے تزکیہ فرمایا اہل ایمان کا نکال لے گئے ظلمت سے روشنی کی طرف
عجیب سا شعر ہے ”انھوں نے اہل ایمان کا تزکیہ فرمایا اور انھیں ظلمت سے روشنی کی طرف نکال لے گئے!“ کیا اہل ایمان ظلمت میں تھے؟ یہاں ”اہل ایمان“ کی بجائے ”اہل عصیاں“ ہونا چاہئے!!

سرشار صدیقی کے درج ذیل اشعار نے ذہن کے در پتے کھول دیئے

مدینے والے کو سب کچھ بتا دیا میں نے بہت سکوں ہے گناہوں کے اعتراف کے بعد
اس میں اگرچہ ”مدینے والے“ حسِ سمع و بصر پر گراں گزرتا ہے اس کی بجائے ”مدینے جا کے کبھی کچھ بتا دیا میں نے“ جیسا مصرع ہوتا تو لطف اور بھی دو بالا ہو جاتا۔

کبھی غلاموں کو دے رہے ہیں وہ باغِ جنت کی راہ داری

کبھی فقیروں کو دستِ رحمت سے جامِ کوثر پلا رہے ہیں

شعر میں دو نقائص ہیں: (۱) راہ داری دینا غلط ہے ”پروانہ راہ داری“ دیا جاتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶-۲۳۶-۲۳۷)

(۳۰) شب دنیا میں ضیاء تیری ہے اے ماہِ عرب فرش سے عرش تک طاری ہے ہالہ تیرا
”شب دنیا“ سے ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں صرف رات ہی رات ہے اسے ”ظلمتِ دہر“ ہونا چاہئے تھا۔ حضور کیلئے ”اے“ کا اس طرح استعمال میرے نزدیک نامناسب ہے کیوں کہ یہ ہماری غیر منقسم ہندوستانی تہذیب کی نشانی ہے جو ”اپنوں سے چھوٹے یا کمتر شخص“ کیلئے مستعمل ہے۔ نیز ”ہالہ“ طاری نہیں ہوتا ”گھیرتا“ ہے۔

ملیں قبائیں مجھے ہنر کی، وقارِ صوت و صدا بھی نکھرا

رسولِ اکرم کا ذکر انور، اسی کی پہچان ہو گیا ہے

”وقار“ نکھرتا نہیں ”گھٹتا، بڑھتا“ ہے۔

دن میں کتنی بار ادب سے ان کا انجم جی بھر کر میں نام نہ لوں تو رو پڑتا ہوں
”کتنی“ غلط زبان ہے، ”کئی کئی“ کا محل ہے، ویسے کیا انجم صاحب واقعی اس طرح روتے ہیں یا پھر یہ زری شاعری ہی ہے؟! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶-۲۴۷-۲۴۶)

(۳۱) خواہش دید نبی کس کو نہیں ہے لیکن رب اکبر سا طلب گار کوئی اور نہیں

”دید“ کے معنی ہیں ”نگاہ، نظر، دیکھا ہوا“ اور یہ مرکبات میں استعمال ہوتا ہے جیسے ”چشم دید“!

یہاں ”خواہش دیدار“ کہنا چاہئے تھا۔ ”رب اکبر سا طلب گار“ کے لئے قمر وارثی صاحب عزیز احسن صاحب کا مضمون ”نعتیہ ادب کی تحقیق۔۔۔ ص ۱۰۳-۱۰۸ نعت رنگ نمبر ۲۵ پڑھ لیں تو ان کے لئے بڑا نافع ہوگا۔

آپ احمد بھی محمد بھی ہیں محمود بھی ہیں ان چراغوں سے ضیا بار کوئی اور نہیں ”سے“ کی بجائے ”سے زیادہ“ یا پھر ”سا“ کہنا تھا۔

دل کو دنیا کے جھیلوں میں الجھنے نہ دیا اس کو بس جستجوئے باغ ارم میں رکھا محترمہ نورین صاحبہ سے التماس ہے کہ ”ارم“ کا استعمال نہ کیا کریں کہ یہ ”شدا“ کی جنت تھی۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۶۲۸)

(۳۲) خدا کی بزم جہاں پر ہے یہ عنایت خاص کہ دے کے آپ کو بھیجا گیا ہدایت خاص ”ہدایت“ کی مناسبت سے ”بھجی گئی“ کا محل ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۶۲۹)

(۳۳) ڈاکٹر اشفاق احمد انجم صاحب نے میرے تین اشعار کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے:

مدینے کے جزیرے میں مری کشتی بھی آہنچی

خزانہ سامنے ہو تو بھلا نقشہ میں کیا مانگوں

ریاض خوش نوا کو بھی رعایا میں رکھیں شامل

محمد کی غلامی کی خدا کی انتہا مانگوں

چراغِ نعت جلتے ہیں مرے چھوٹے سے کمرے میں

مرے آنگن کی چڑیاں بھی درودِ پاک پڑھتی ہیں

آئیے ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی ارشادات کو ایک مرتبہ پھر پڑھ لیں:

(i) ”مدینہ جزیرہ تو نہیں ہے۔“

(ii) ”پہلا مسئلہ تو غلامی کی انتہا کا ہے۔ یہ کیسی ہوتی ہے؟ دوسرے ردیف ’مانگوں غلط ہے یعنی ریاض اور مانگنے والا یہاں دوا لگ الگ شخصیتیں ہو جاتی ہیں۔ مطلب مانگنے والا ریاض خوشنوا کے لیے مانگ رہا ہے۔ جبکہ ریاض خود اپنے لیے مانگ رہا ہے۔ اس صورت میں ردیف مانگے ہوئی چاہیے۔ نیز جب خدا سے مانگا جا رہا ہے تو ’رکھیں‘ صیغہ جمع قطعی غلط ہے۔ اسے ’رکھے‘ ہونا چاہیے تھا۔“

(iii) ”چھوٹے سے کمرے میں صرف ایک ہی چراغ کافی ہے، جلتے، کی بجائے جلتا، بہتر

ہوتا۔ اس کے علاوہ شجر و حجر کے تعلق سے تو روایات صحیحہ موجود ہیں کہ یہ سب تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے ہیں۔ لیکن یہ روایت کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتی کہ چڑیاں درود شریف پڑھتی ہیں۔ اور اگر چڑیاں سے ’مراڈ گھر کی بچیاں ہیں تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ گھر کی بجائے آنگن میں کیوں پڑھتی ہیں؟ نیز چراغِ نعت صرف آپ کے کمرے میں جلتا ہے؟“ (ریاض حسین چودھری، ص ۲۷، ۴۹۴-۴۹۳)

(۳۴) سید افتخار حیدر کا یہ شعر:

رحمت للعالمین، یسین و طہ، ص، ق، جبرئیل آداب سے پیغامِ حق لاتے رہے
شعر میں آداب کی بجائے ”ادب“ کی ضرورت ہے۔

وہ محمد ہیں احمد بھی محمود بھی، حسن مطلق کا شاہد بھی مشہود بھی

علم و حکمت میں وہ غیر محدود بھی ظاہراً اُئیوں میں اٹھایا گیا

ثانی مصرعے میں ”اُئیوں میں اٹھایا گیا“ عجیب ٹکڑا ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُئی نہیں تھے بلکہ اہل عرب اُئی تھے!! اس کے علاوہ ”غیر محدود“ بھی اردو میں غیر فصیح ہے ”لامحدود“ مستعمل ہے۔

کیونکر ڈریں نہ تجھ سے عدو، شاد دوست ہوں پایا خطاب تو نے بشیر و نذیر کا
افتقر (بہاری) صاحب نے ”بشیر و نذیر“ کی رعایت سے ”ڈریں، عدو، دوست، شاد“ استعمال کیا ہے لیکن اس پر توجہ نہیں دی کہ ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے ڈرانے آئے تھے خود سے نہیں!! مصرع یوں ہونا تھا:

ع ”کیوں نہ ڈریں خدا سے عدو، شاد دوست ہوں“

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷، ۵۰۳-۵۰۲)

(۳۵) ص ۱۶۰ پر سعدیہ روشن کی نعت میں پہلا شعر سہو کتابت کی نذر ہے۔ ص ۲۶۱ پر یعقوب تصور کی نعت کے اس شعر میں:

جرم و خطا کے باوجود جود و سخا کی انتہا

ہم عاصیانِ دہر کی جانب کرم نگاہ بھی

”کرم نگاہ“ کی ترکیب درست نہیں معلوم ہوتی۔ (ملک الظفر سہرامی، ص ۸۲۸)

(۳۶) کسی بھائی کی دل زاری نہ کیجیے مرے آقا نے یہ سب سے کہا ہے

”دل زاری“ بے معنی ترکیب ہے یہاں دل آزاری کا محل ہے۔ زاریدن یعنی رونا، گریہ کرنا اور آزار دہن یعنی تکلیف دینا، رنج پہنچانا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۲-۱۴۱)

(۳۷) حفیظ ثابت صاحب کا مصرع ہے،

ع روح رواں کی ہے صد اصلی علی نبینا (ص ۲۷۹)
مجھے ”روح رواں“ کی ترکیب سے متعلق کچھ کہنا ہے:

”روح اور رواں“ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں میرے خیال میں ان میں اضافت لگانا غلط ہوگا۔ ہم معنی الفاظ میں اضافت کی بجائے ”واو عطف“ لگایا جاتا ہے۔ اس مقام پر ایک نکتہ یہ بھی بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ ”روح“ کا جسم میں کہیں ایک مقام متعین ہے یعنی یہ ”رواں“ نہیں ہے یعنی سارے جسم میں بہہ نہیں رہی ہے کہ اسے روح کیساتھ ترکیب دیا جائے، اسکے علاوہ رواں کا ایک مطلب ”جان“ بھی ہے جو صرف جانوروں سے متعلق ہے یعنی جانوروں میں صرف جان ہوتی ہے ”روح“ نہیں اس لیے انہیں ”جانور یا جاندار“ کہتے ہیں۔ روح صرف انسانوں میں ہے اور اسی لیے یہ مکلف بھی ہے۔ اس لیے ”روح رواں“ کی بجائے ”روح و رواں“ استعمال کرنا چاہیے۔“ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۰۳/۲۷)

(۳۸) دم اخیر اگر ٹوٹے دور سانسوں کی شفیق حشر کا لب پر مرے قصیدہ رہے وہ ذات جس سے قمر بھوک و پیاس ہار گئی حسین سا کہاں کوئی ستم رسیدہ رہا اول تو یہ نعت کا شعر نہیں یہ منقبت ہے دوسرے ”بھوک و پیاس“ کی ترکیب غلط ہے۔
دونوں ہی ہندی الفاظ ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۸)

(۳۹) وجاہت اس قدر جیسے کسی سردار سر کا ہو لیتق تاجدار و شان و شوکت ہے سراقس اس شعر میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سراقس کو ”کسی سردار کے سر سے تشبیہ دی گئی ہے“ جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیا اور انس و جان کے سردار ہیں۔ ”لیتق تاجدار“ کی ترکیب بھی بے محل ہے۔ ”لیتق تاج“ چاہیے تھا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۶)

(۴۰) احسن زیدی کا مطلع ہے،

غروب تیرہ شمی اور طلوع صبح جمال تری نظر کا کرشمہ تری جبین کا جمال
”غروب تیرہ شمی“ عجیب سی ترکیب ہے۔ نہ شب غروب ہوتی ہے نہ تیرگی!؟ غروب

تو آفتاب ہوتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۱۰/۲۷)

(۴۱) اورنگ سلیمان کیلئے رشک کا باعث اے سید کونین ترے در کی چٹائی
”اورنگ سلیمان“ کوئی جاندار شے نہیں ہے کہ اس میں رشک و حسد کا جذبہ کار فرما ہو!! دیگر ”چٹائی“ گھر کے اندر بچھائی جاتی ہے، در پر پانتختہ (پاندان) بچھاتے ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۳۳)

(۴۲) فیاض جس سے شوکتِ حیات ہو عیاں روئے حیات کو تو وہی خد و خال
(فیاض ٹانڈوی کے شعر میں) ”روئے حیات“ کی ترکیب آفاقی مفہوم رکھتی ہے۔ میری دانست میں اپنی حیات یا اپنے کلام کے الفاظ زیادہ مناسب لگتے۔ (خضر حیات، ص ۲۶/۲۳)

(۴۳) کافور کیا جس نے زمانے کی سیاہی وہ روشنی شمع فروزانِ نبی ہے
”کافور کیا“ غلط ہے ”کی“ چاہیے۔ ”روشنی شمع فروزان“ بھی عجیب سی ترکیب ہے۔
فروزان کا مطلب بھی روشن ہی ہے۔ اردو ترجمہ کریں تو ”روشن شمع کی روشنی“ ہوگا یعنی ”روغن آلمہ کا تیل!!“۔

معیار ہے دنیا کے لیے اسوہ حسنہ سرنامہ توحید کے ہیں نقشِ حسین آپ
عبدالکریم شمر کے شعر میں لفظ ”حُسنہ“ ہے ”حُسنہ“ نہیں۔ مصرعہ ثانی میں واحد جمع کا عیب ہے یعنی ”سرنامہ توحید کے ہیں نقشِ حسین آپ“ چاہیے۔

سرمایہ حیات ہے سیرت رسول کی اسرارِ کائنات ہے سیرت رسول کی
ساغر صدیقی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تو ایک کھلی کتاب ہے ”اسرار“ سے اس کا دور کا بھی علاقہ نہیں ہے، یہاں اسرار کی بجائے ”اظہار“ ہونا چاہیے تھا۔ فدا خلدی کا شعر دیکھیے:
چروں سے برسنے لگے انوارِ یقین کے ایمان سے ہونے لگی قلوب کی صفائی
قلب کی جمع ”قلوب“ غیر فصیح ہے ”قلوب“ کہتے ہیں۔ (ریاض حسین چودھری، ص ۵۰۷/۲۷)
(۴۴) بھولا ہوا تھا اپنی حقیقت کو آدمی آئینہ آدمی کو دکھایا حضور نے
”آئینہ دکھانا“ محاورہ ہے جس کا مطلب ہے ”کسی کو اس کی اصلیت، اوقات یا عیب دکھانا!“ اس صورت میں میرے خیال میں یہاں آئینہ دکھانا کا استعمال صحیح نہیں ہوا ہے۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۴۱/۲۶)

(۴۵)

بلاوا عرش سے ہوا ہے جب مرے حضور کا
تو سامنا ہوا ہے نور سے نبی کے نور کا
”بلاوا ہونا“ غیر فصیح ہے۔ ”بلاوا آیا۔ آنا“ محاورہ ہے۔ شعر کے تیور سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”نور اور نبی کا نور“ دو مختلف النوع انوار ہیں اور ان دونوں میں عرش پر ”مقابلہ“ ہوا تھا۔ ”سامنا“ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے اور بلائے والی کوئی تیسری ہی ہستی ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۱۲۹،

(۴۶) کھلتا ہے جو بابِ ذکر طائف ہو جاتی ہے آنکھ آنکھ نم ناک
”آنکھ آنکھ“ غیر فصیح ہے۔ ہر ایک آنکھ بھی کہا جاسکتا تھا۔

فرمایا! انا مدینۃ العلم اس قول نے سب فسوں کیے چاک
فسوں چاک نہیں کیا جاتا ”توڑا“ جاتا ہے۔ سلیم شہزاد قواری کے بیچاک و فتراک میں الجھ کر رہ گئے ہیں اس لیے ان کے یہاں شعریت نام کی کوئی چیز نہیں ملتی۔

وہی فردوس کی خوشبو معطر ان سے چاروں سو

کہاں شب رنگ زلف ایسی یوں ہندی تل کہاں مہکا

(احسان اکبر کے) شعر میں ”چاروں سو“ غیر فصیح ہے ”چار سو“ یا ”چاروں طرف/ سمت“ کہتے ہیں۔ یہ ”ہندی تل“ کیا چیز ہے اور اس کی خوشبو کیسی ہوتی ہے؟ (منیر سیفی، ص ۵۳۱) (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۵۱۰/۲۷-۵۰۹)

(۴۷) حافظ عبدالغفار حافظ صاحب کے ”قصیدہ نعت رنگ“ پر ”صلی اللہ علیہ وسلم“ کا عنوان دیا گیا ہے جو نامناسب ہے۔ ویسے قصیدہ اچھا ہے مطلع میں ذرا سی ترمیم کر دیں تو بہتر ہوگا یعنی ”اردو زبان“ کی جگہ ”خیر اللہ“ رکھ دیں۔ حافظ صاحب کا مطلع یوں ہے،

فخر پاک و نازش ہندوستان ہے نعت رنگ

بالیقیں ”اردو زبان“ کا ترجمان ہے نعت رنگ

کاشف عرفان صاحب کی نعت اچھی ہے اس کے مطلع اور مقطع پر کچھ کہنا چاہوں گا۔

اس رنگِ محبت کے اثر میں ہوں ابھی تک

گھر لوٹ بھی آیا ہوں، سفر میں ہوں ابھی تک

”رنگ“ کی جگہ ”جذب“ زیادہ بہتر ہوتا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۵۱۱/۲۷)

(۴۸) ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ راز صاحب نے اپنے مسدس کے ٹیپ کے مصرع (مرحبا! صل علی! اے آئینہ! اے روشنی!) میں سب حقائق کو سمودیا ہے لیکن بصد ادب عرض ہے کہ منفی پہلو اور دور جاہلیت کی منظر کشی کرتے وقت اس مصرع کی تکرار بری طرح کھلتی ہے اور مفہوم غلط تاثر دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے (یہ رائے تاجدار عادل صاحب کی ہے جس سے مجھے بھی اتفاق ہے) مثال کے طور پر ان مصرعوں کے ساتھ۔ (۱) جیسے ویرانے میں ہونڈی کوئی سوکھی ہوئی۔ (۲) ہر طرف تو بین حوا، چار سو بے حرمتی۔ (۳) کیسا رب اور کیسا قرآن، کون سا دین نبی ۷ ہاں مثبت پہلو بیان کرتے وقت یہ مصرع بڑے کام کا ہے۔ مثال کے طور پر یہ خوب صورت بند ملاحظہ کیجئے:

کام صدیوں پر محیط اور عمر اتنی مختصر آپ کے نقش کف پا کے اُجالے دیکھ کر
محو حیرت ہیں سبھی، کیا فکر، کیا قلب و نظر میں ناشائستگی لکھوں یا شائستگی گر
کیا کروں یہ نوک خامہ سوچتی ہی رہ گئی
مرحبا! صل علی! اے آئینہ! اے روشنی!

اس مسدس میں کچھ مقامات پر تذکیر و تانیث کی غلطیاں ہیں مثلاً صفحہ نمبر ۹۱ پر ”مخلوق“ اور صفحہ نمبر ۱۳۳ پر ”گود“ کو بطور مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ صفحہ نمبر ۱۷۰ پر ”محمد ۷ کے سپاہ“ کی جگہ ”محمد ۷ کی سپاہ“ ہونا چاہئے اور ”منفرد ہیں“ کی جگہ ”منفرد ہے“ درست ہوگا۔ اسی طرح صفحہ نمبر ۲۵۲ پر ایک شعر ہے:

یہ سلامِ بندگی ہے خانماں برباد کی مرحبا صل علی! اے آئینہ! اے روشنی!

پہلا مصرع آخر میں ”کی“ نہیں بلکہ ”کا“ کا تقاضا کر رہا ہے۔ (تنویر پھول ص ۵۲۰/۲۷) (۴۹) صفحہ نمبر ۲۰۲ پر مرحوم ماجد خلیل صاحب (اللہ تعالیٰ اُن کی اور ہماری مغفرت فرمائے) کے ایک مصرع کا حوالہ ہے۔ عرض ہے کہ راقم الحروف نے وہ مصرع اس طرح تجویز کیا تھا:

”اک لفظ سے بنے ہوئے جہاں میں“ کی جگہ ”اک لفظ کن سے بنے جہاں میں“ یا (اک حرف کن سے بنے جہاں میں)۔ اس طرح تبدیل شدہ صورت (اک کن سے بنے ہوئے جہاں میں) میں حرف ”ک“ کی وجہ سے جو تنافر پیدا ہو رہا ہے، اس سے بچا جاسکتا تھا۔

جو شعرا ”صل علی“ کو حضور اکرم ۷ کا اسم گرامی سمجھتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں لیکن جو اسے ”صل علی محمد“ کے مخفف کے طور پر استعمال کرتے ہیں وہ درست ہیں جس طرح ”بسم اللہ“ کہہ کر

پورا تسمیہ مراد لیتے ہیں اور ”الح“ مخفف ہے ”الی آخرہ“ کا۔ صفحہ ۶۴۱ پر ”رحمۃ للعالمین“ ۷ لکھتے وقت ”ل“ سے پہلے الف لکھا گیا ہے جو زیادہ ہے اور سورۃ الانبیاء کی آیت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ صفحہ نمبر ۶۴۵ پر پیر زادہ قاسم صاحب کے مصرع میں ”تردامنی“ کے استعمال پر اعتراض درست نہیں، تردامنی کا مطلب ہے خطا کاری یعنی گناہ کاری۔ ایک مشہور شعر ہے: تردامنی پہ شیخ! ہماری نہ جائیو☆ دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔ صفحہ نمبر ۶۴۸ پر قمر وارثی صاحب کے مصرع ”خواہش دیدنی ۷ کس کو نہیں ہے لیکن“ پر اعتراض درست نہیں۔ ”دید“ کے معنی ”نگاہ اور نظر“ کے علاوہ ”دیدار اور نظارہ“ بھی ہیں جیسا کہ نسیم اللغات (جس کے مرتبین میں آغا محمد باقر نبیرہ آزاد بھی شامل ہیں) میں صفحہ نمبر ۴۹۰ پر درج ہے، نیز ملاقات (دیدار) کے خواہش مند کے لیے ”دیدخواہ“ استعمال ہوتا ہے (بحوالہ فیروز اللغات، صفحہ نمبر ۶۷۰)۔ (تنویر پھول ص ۵۲۳/۲۷)

(۵۰) اسی طرح کا ایک شعر اعجاز رحمانی کے مجموعہ نعت ’آسمان رحمت‘ کے صفحہ نمبر ۷۷ پر بھی ہے:

ہر اک موسم ہے اُن کے کیسو و رخسار کا موسم نہ کوئی شب ہماری ہے، نہ کوئی دن ہمارا ہے یہ حقیقت ہے کہ غلطیاں سبھی سے ہوتی ہیں کیونکہ سب انسان ہیں۔ استاد قمر جلالوی کی غزل کا یہ مشہور مصرع بھی معیاری نہیں لگتا: غنچے اپنی آوازوں میں بجلی کو پکارا کرتے ہیں اس مصرعے میں ”آوازوں میں“ کا استعمال کھلتا ہے، اس کی جگہ شاید یہ مناسب ہوتا: خاموش زباں سے غنچے بھی بجلی کو پکارا کرتے ہیں۔ (تنویر پھول ص ۶۶۰/۲۶)

(۵۱) خزاں کا کب ہے مدینے میں داخلہ ممکن ہر ایک پھول یہاں حسن دائمی کا ہے خزاں، بہار، سردی، گرمی، بارش، کا چکر نظام قدرت ہے زمین کا کوئی خطہ ان سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اگر کہیں صرف ایک ہی موسم مستقل ہوگا تو نظام زندگی میں خلل واقع ہوگا۔ شعر میں نہ رمز و کنایہ ہے نہ استعارہ! پھول کا ذکر ہے تو اس کا مرجعانا فطری ہے۔ ثانی مصرعے کی نثر کریں تو یوں ہوگی۔ ”ہر ایک پھول یہاں دائمی حسن کا ہے“ کیا یہ عبارت درست ہے؟

مرے نصیب کا کیا پوچھتے ہو ہم سفر و مرے نصیب میں موسم ثنا گری کا ہے حمد و ثنا کا کوئی موسم نہیں ہوتا۔ شعر میں ”ہم سفر“ بھی حشو ہے۔ ہاں اگر موسم کی بجائے ”توشہ“ رکھ دیں تو ہم سفر و بھی نہ جانے گا اور موسم کی قید بھی ختم ہو جائے گی۔

فقیہہ شہر کو چیخیں سنائی کیا دیں گی حضور، دور مسلسل یہ بے بسی کا ہے

بے چارہ فقیہ، فتویٰ دینے کے سوا کیا کر سکتا ہے؟ یہ بادشاہ یا حاکم تو ہے نہیں!! اگر ”امیر شہر“ بھی کہہ دیتے تو بات بن جاتی۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۵-۱۴۴)

(۵۲) اسی طرح عزت بخاری سے منسوب شعر:

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

کا مفہوم شرکائے مذاکرہ کے ذہن میں واضح نہیں ہوا۔ ”نفس گم کردن“ کے معنی ہیں، سانس روک لینا، خاموش رہنا اور شعر کا مطلب یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے ایک ایسی جگہ ہے جس کی پاکیزگی اور تقدس عرش سے بھی زیادہ نازک ہے (یعنی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار مبارک)۔ لہذا اس خوف سے کہ کہیں اس کی نزاکت کو ٹھیس نہ پہنچے، جنید اور بایزید جیسے سرگشتہ اور مغلوب الحال اور بلند مرتبہ خدا شناس شخص بھی جب پیغمبر کے روضے پر پہنچتے ہیں تو دم سادھ لیتے ہیں۔ یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حفظ مراتب کا پورا پورا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اتنے صاف اور خوبصورت شعر کے معنی لوگوں نے خدا جانے کیا کیا نکالے ہیں۔ (شمس الرحمن فاروقی، ص ۵۱۳-۵۱۲)

(۵۳) پھر ریشم انوار کا ملبوس پہن کر ظاہر ہوا اک پیکر صد رنگ بصد ناز دوسرے مصرع میں ”مقصد تخلیق کائنات“ کی تخلیق کے لیے شاعر نے لکھا ہے۔ ”ظاہر ہوا اک پیکر صد رنگ بہ صد ناز“ مجھے ”بہ صد ناز“ پر اعتراض ہے۔ اس قسم کی باتیں شعر اپنی معشوقاؤں کے لیے لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم عزیز صاحب مجھے معاف کریں۔ میں ان کے اس فتوے سے بھی متفق نہیں کہ حسن نقوی عصر حاضر کا ایک ”بڑا“ شاعر تھا۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۸۹۴/۲۵)

(۵۴) صفحہ نمبر ۲۶۲ پر بھارت کے جناب محمد علی شیدائستوی کی نعت ہے۔ اس میں آٹھویں شعر کا پہلا مصرع ہے ”بیان یوں کیا رب نے رسول کی عظمت“۔ یہاں ”کیا“ کی جگہ ”کی“ ہونا چاہیے مگر موصوف وزن پورا کرنے کے لیے مونث کو مذکر باندھ گئے۔ (حافظ عبدالغفار حافظ، ص ۶۵۸)

(۵۵) درج ذیل اشعار کی واقعیت، حقیقت اور تعلیٰ پر کیا کہا جاسکتا ہے:

لیل و نہار آپ کے در کے طواف میں لوح و قلم ہے آپ کی مدحت کا آئینہ

”ہے“ اگر کتابت کی خامی نہیں ہے تو اسے ”ہیں“ ہونا چاہئے۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۳۳/۲۶)

(۵۶) بے زبانی کو جو دیتا ہے وہ نطق نغمہ و نغمہ گری دیتا ہے یہاں ”جو“ کی بجائے ”جب“ کی ضرورت ہے ہاں اگر شعر میں ”وہ“ نہ ہوتا تو جو درست ہوتا۔ اسد ثانی کی نظم تشنگی کا مصرع ”مشتیوں کے کواڑ سر کے“ پڑھ کر ہنسی آگئی۔ شاید اسد صاحب سمجھتے ہیں کہ مشیت کوئی کمرہ ہے یا کسی کمرے میں رکھی ہوئی ہے اور کواڑ سر کے پر اس کا نزول ہوتا ہے۔ انھیں شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ کواڑ کھلتے ہیں سرکتے نہیں اور Sliding Doors میں کواڑ نہیں ہوتے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۴)

(۵۷) ناز مانک پوری کا شعر:

کوئی کسی کی پرسش احوال کو آتا نہ تھا
تھے آدمی کی شکل میں لیکن سبھی خون خوار تھے

”آدمی کی شکل میں خونخوار؟“ عجیب بات ہے یہاں آدمی کی شکل میں شیطان یا درندے جیسے لفظ کی ضرورت تھی۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۸)

(۵۸) مٹ رہے ہیں در رسول پہ ہم زندگی کیسی کام آئی ہے
شعر میں دو اسقام ہیں اول تو زمانے کا فرق ”مٹ رہے ہیں“، ”کام آئی ہے“، یہاں ”مٹ گئے“ کی ضرورت تھی۔ دوم مٹ جانا کے معنی ہیں تباہ ہو جانا، برباد ہو جانا!! اگر مٹ کی جگہ ”سو“ رکھ دیں تو دونوں اسقام دُور ہو جاتے ہیں۔

بات اس کی اتر گئی دل میں تیر گویا کمان پر آیا
ثانی مصرع ”تیر گویا کمان سے نکلا“ کا متقاضی ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۰)

(۵۹) دل کی خواہش ہے کہ گل گشت جہاں سے نکلے
دشتِ طیبہ کے کسی خار پہ ٹھہرے جا کر
’نکلے‘ نہیں ”چھوٹے“ چاہئے اور ”خار“ پہ کیوں ٹھہرے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۱)

(۶۰) عارف عبد المتین کے دو شعر دیکھیے:

ترے جلو میں حدیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں ازل ابد سے ادھر بھی حرام کرتا ہوں
حدیں ٹوٹی ہیں ”پھوٹی“ نہیں! (ع۔م۔ مسلم، ص ۵۱۲)

(۶۱) مدحتوں کو پڑھنے کے بعد جو عیوب نظر آئے ہیں اُن کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ شاید آپ کی گرفت اس شعبے میں کچھ ڈھیلی پڑ گئی ہے بہر حال ذیل میں چند خامیوں

کی نشان دہی کر رہا ہوں:

بنی انساں کی تہذیب کا طیبہ مرکز باقی دنیا ہے فقط قرب و جوارِ طیبہ
کوثر علی پانچویں شعر کے مصرع اولیٰ میں ”بنی انساں“ کی جگہ اگر شاعر ”بنی انسان کی تہذیب کا طیبہ مرکز“ لکھتے تو دونوں مصرعوں میں ”ہے“ کے استعمال سے بچ جاتے۔

پھر بھی علم بلند رہا تیرے نام کا گو تھی کمان کفر مسلسل تناؤ میں
صفحہ ۴۹۳ پر سہیل اختر کے آٹھویں شعر کے مصرع ثانی میں ”گو تھی“ حسنِ سماعت پر بارگزر تا ہے۔ (غالب عرفان، ص ۷۰۳)

(۶۲) کام صدیوں پر محیط اور عمر اتنی مختصر آپ کے نقش کف پا کے اُجالے دیکھ کر
محو حیرت ہیں سبھی، کیا فکر، کیا قلب و نظر میں ناشائستگی کی لکھوں یا ثنائے شیشہ گر
کیا کروں یہ نوک خامہ سوچتی ہی رہ گئی
مرحبا! صل علی اے آئینہ! اے روشنی!

اس مسدس میں کچھ مقامات پر تذکیر و تانیث کی غلطیاں ہیں مثلاً صفحہ نمبر ۹۱ پر ”مخلوق“ اور صفحہ نمبر ۱۴۳ پر ”گود“ کو بطور مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ صفحہ نمبر ۱۷۰ پر ”محمد ۷ کے سپاہ“ کی جگہ ”محمد ۷ کی سپاہ“ ہونا چاہئے اور ”منفرد ہیں“ کی جگہ ”منفرد ہے“ درست ہوگا۔ اسی طرح صفحہ نمبر ۲۵۲ پر ایک شعر ہے:

یہ سلامِ بندگی ہے خانماں برباد کی مرحبا صل علی اے آئینہ! اے روشنی!
پہلا مصرع آخر میں ”کی“ نہیں بلکہ ”کا“ کا تقاضا کر رہا ہے۔

واحد اور جمع کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ صفحہ نمبر ۱۸۷ پر ایک مصرع ہے: لرزہ بر اندام
تھے اک اک پر ستار بتاں: ”اک اک“ کے ساتھ ”تھے“ درست نہیں۔ صفحہ نمبر ۱۴۰ پر ”احکام“ کو
واحد باندھا گیا ہے جبکہ یہ ”حکم“ کی جمع ہے اسی طرح صفحہ نمبر ۲۲۳ پر ”سلاسل“ کو واحد باندھا گیا
ہے: جس کی نسبت ظلم سے ہو، اُس سلاسل سے جہاد: (تویر پھول، ص ۵۲۰/۲۷)

(۶۳) فضل خدا سے اس کے مقدر سنور گئے قسمت سے جس نے اوڑھ لیا اسوہ نبی
شعر میں واحد جمع کا عیب ہے ”اس کے“ نہیں ”ان کے“ چاہیے نیز ”جس“ کی بنا پر اولیٰ مصرع
یوں ہونا چاہیے تھا: ”فضل خدا سے اس کا مقدر سنور گیا“ اور اسوہ نبی کوئی چادر نہیں ہے جسے اوڑھ
لیا جائے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۶-۱۳۵)

(۶۲) واحد اور جمع کی غلطیاں بھی موجود ہیں۔ صفحہ نمبر ۱۸۷ پر ایک مصرع ہے: لرزہ بر اندام تھے اک اک پرستار بتاں: ”اک اک“ کے ساتھ ”تھے“ درست نہیں۔ صفحہ نمبر ۱۴۰ پر ”احکام“ کو واحد باندھا گیا ہے جبکہ یہ ”حکم“ کی جمع ہے اسی طرح صفحہ نمبر ۲۲۳ پر ”سلاسل“ کو واحد باندھا گیا ہے: جس کی نسبت ظلم سے ہو، اُس سلاسل سے جہاد: (تنویر پھول ص، ۵۲۰/۲۷)

(۶۳) اک تراحم سنا اور ترے حب داروں نے خرقہء زیست اتار ہے قضا پہنی ہے صفحہ ۲۹۸ پر محمد ثناء اللہ ظہیر کی نعت کے چوتھے شعر کے مصرع اولیٰ میں ”حب داروں“ غلط زبان استعمال کی گئی ہے۔

کی دعا ختم، تو پھر صل علی پڑھتے ہوئے ہاتھوں یوں جسم پہ پھیرے کہ ذرہ پہنی ہے پانچویں شعر کے مصرع ثانی میں ”ہاتھوں“ غلط زبان ہے وہ صرف ”ہاتھ یوں پھیرے“ لکھتے تو کافی تھا۔

رہ ہجر سے ہجرت کو دو طرفہ نکلتی ہے گھر چھوڑ کے چل پڑنا در چھوڑ کے آنا بھی صفحہ ۲۹۹ پر احسان اکبر کی نعت کے دوسرے شعر کے مصرع اولیٰ میں ”رہ ہجر“ سوئی تناظر ابھر رہا ہے۔ (غالب عرفان، ص ۷۰۳)

(۶۵) صفحہ نمبر ۲۶۲ پر بھارت کے جناب محمد علی شیدا بستوی کی نعت ہے۔ اس میں آٹھویں شعر کا پہلا مصرع ہے ”بیان یوں کیا رب نے رسول کی عظمت“۔ یہاں ”کیا“ کی جگہ ”کی“ ہونا چاہیے مگر موصوف وزن پورا کرنے کے لیے مؤنث کو مذکر باندھ گئے۔ (عبدالغفار حافظ، ص ۶۵۸)

(۶۶) جلوہء روئے محمد کا ہے واصف طارق اس کی تربت میں اجالے ہی اجالے ہوں گے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ ”جلوہء روئے محمد“ کے وصف سے قبر میں اُجالا ہوگا یا نہیں! شعر میں ”اُجالے ہی اُجالے ہوں گے“ غیر فصیح ہے۔ فصحاء زبان نے ہمیشہ ایسے مواقع پر ”اُجالا ہی اُجالا ہوگا“ استعمال کیا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۳۱/۲۶-۶۳۰)

(۶۷) روح کو نین کا ترجمان چاہئے مدح احمد کو وہ زباں چاہئے ”وہ“ کی بجائے ”ایسی“ چاہئے۔ نیز زبان کی مناسبت سے ”کا ترجمان“ کی بجائے ”کی

ترجمان“ چاہئے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۳۷/۲۶-۶۳۷)

(۶۸) ”تمہارے بزرگ اول کا یہ ارفع کرشمہ تھا“

کلمیم حاذق صاحب نے ”بُزرگ“ کو ”بُزرگ“ نظم کیا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۰۹/۲۷)

(۶۹) شوق دیدار میں ہوتی ہیں جو سطرین تخلیق سننے والا انہیں اعجاز بیاں جانتا ہے سطرین سنی نہیں پڑھی جاتی ہیں۔

میں بھی ہوتا کہ انہیں دیکھتا رہتا ہر دم عکس جلوہ مری بینائی میں اترا ہوتا نور کا عکس نہیں ہوتا!! عکس کو ”ان کا“ کر دیں تو! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۱۱/۲۷-۵۱۰)

ہے فہم و فراست ترے افکار پہ شیدا تاریخ تری سیرت و کردار پہ شیدا ”ہے“ کی بجائے ”میں“ کا محل ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۶-۱۲۵)

(۷۰) میرا قلم حضور کے در پر پڑا رہے تصویر احترام کی بن کر کھڑا رہے اسی بند کے آخری مطلع نما شعر میں قلم کے لیے کہا گیا کہ ”پڑا رہے“ اور ”کھڑا رہے“ یہ

ترکیب بھی عجیب ہے خصوصاً ایک ہی وقت میں۔ اسی طرح نظم کے بند نمبر ۲۱ کا دسواں مصرع ”اشکوں نے جھک کے نقش کف پا اٹھائے ہیں“ توجہ طلب ہے۔ اگر اشکوں کے بجائے پلکوں ہوتا تو زیادہ صحیح ہوتا۔ (ماجد خلیل، ص ۷۸-۷۷)

(۷۱) ٹھنڈا کر ڈالا صدیوں کی آتش کو بادل سے کوندا اترا تھا، دیکھا تھا ”کوندا اترا“ غلط زبان ہے ”کوندا لپکتا ہے“ اور یہ بجلی کی ایک باریک سی لکیر ہوتی ہے جو جس شے پر پڑتی ہے جلا ڈالتی ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۱۰/۲۷)

(۷۲) واحد طویل تر ہے عطاؤں کا سلسلہ

”ہر ذرے میں حضور کے خاور کی بات ہے“

خاور کے معنی صرف مشرق کے ہیں نہ آفتاب مشرق کے۔ Middle East کو اسی لیے خاور میاں کہتے ہیں۔ (طلحہ رضوی رق، ص ۵۶۸)

(۷۳) دل کی خواہش ہے کہ گل گشت جہاں سے نکلے

دشت طیبہ کے کسی خار پہ ٹھہرے جا کر

اس کے ساتھ ہی ”نکلے“ نہیں ”چھوٹے“ چاہئے اور ”خار“ پہ کیوں ٹھہرے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۱)

(۷۴) اور نگ نبوت پہ وہی صدر نشین ہیں جو لمحے سر عرش گزارے ہیں ہزاروں

”اورنگ“ کے معنی ہیں ”تخت شاہی“ جس پر سوائے بادشاہ کے کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا اس لئے اورنگ نبوت پر صدر نشین، کہنا غلط ہے کیوں کہ اس صورت میں کچھ اور لوگوں کو بھی اورنگ پر بٹھانا ہوگا تب ”صدر نشین“ کی نوبت آئے گی!!

پیکر نور ازل، تکملہ علم و عمل نقش بت مثل و بدل، سارے جہاں میں یکتا میں سخت حیران ہوں سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے کہ ”پیکر نور ازل صلی اللہ علیہ وسلم“ کو ”نقش بت“ کس رعایت سے کہا گیا ہے!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۹)

(۷۵) نور کیا نور خدا ہے آپ کا مرتبہ سب سے جدا ہے آپ کا ”نور کیا“ استعجابیہ یا استفہامیہ لکڑا ہے اور دونوں اعتبار سے غلط ہے۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۲)

(۷۶) تلفظ کی غلطیاں بھی کھکتی ہیں۔ صفحات ۱۳۷، ۱۴۴، ۱۶۳ اور مزید تین مقامات پر لفظ ”جی“ کا تلفظ غلط ہے، اس میں حائے حلیٰ مکسور نہیں بلکہ ساکن ہے۔ صفحہ نمبر ۱۵۶ پر لفظ ”نئی“ میں ”ف“ کو مشدّد دباندا گیا ہے، یہی غلطی صفحہ نمبر ۲۲۱ پر دہرائی گئی ہے۔ ”ہم سے نفی ہو رہی ہے سورہ قرآن کی“۔ صفحہ نمبر ۱۸۳ پر ”معرکہ“ کی جمع ”معرکاؤں“ غلط ہے۔ صفحہ نمبر ۱۵۹ پر ”نسل وٹی“ کی ترکیب غلط ہے۔ پاک ہے یہ نسل وٹی جیسے احساسات سے۔ ”وٹی“ ہندی زبان کا لفظ ہے اس لیے ”نسل اور وٹی“ کہا جائے گا۔ اسی طرح صفحہ نمبر ۷۷ پر ”چاہت بدوش“ اور صفحہ نمبر ۱۸۵ پر ”سگ پیاسا“ کی تراکیب بھی غلط ہیں۔ صفحہ نمبر ۲۲۲ پر ”قتل عدو“ کی جگہ ”قتال عدو“ استعمال کیا گیا ہے اور ”قتال“ میں ”ت“ مشدّد دباندا گیا ہے جو غلط ہے۔ (تنویر پھول، ص ۵۲۱/۲۷-۵۲۰)

ہے فہم و فراست ترے افکار پہ شیدا تاریخ تری سیرت و کردار پہ شیدا ”ہے“ کی بجائے ”ہیں“ کا کل ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۷)

۲۔ تعقید:

(تعقید: شعر میں لفظی یا معنوی طور پر پیچیدگی یا دشواری کا پیدا ہونا تعقید کہلاتا ہے۔ تعقید اس وقت عیب بن جاتی ہے جب الفاظ معنی پر واضح دلالت نہ کریں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ تعقید لفظی: کلام میں فاعل سے پہلے فعل یا مفعول کا آنا۔ تعقید لفظی میں الفاظ اپنی نحوی ترتیب و ترکیب سے ہٹ کر آگے پیچھے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے بسا اوقات معنی کی تفہیم میں دشواری یا

پریشانی پیدا ہو جاتی ہے۔ شوق نیوی نے لفظ کے اپنی اصل جگہ پر نہ ہونے کو تعقید لفظی کہا ہے۔ تعقید لفظی اکثر اوقات بات میں زور پیدا کرنے یا مفہوم کو خوبصورت بنانے کا سبب بھی بنتی ہے۔ اس لیے ہر تعقید لفظی عیب میں شمار نہیں ہوتی۔

۲۔ تعقید معنوی: ایسی تعقید کو کہا جاتا ہے جس میں شعر میں استعمال ہونے والا استعارہ، تشبیہ، کنایہ، مجاز یا خیال شعر کے مفہوم کو واضح طور پر پیش نہیں کرتا۔ جس کی وجہ سے شعر کی مکمل تفہیم میں دشواری اور خلل واقع ہو جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ عیب ہے اور بعض کے نزدیک مستحسن۔ البتہ تعقید اس وقت عیب بن جاتی ہے جب معمولی بات کو کھما پھرا کر کہا گیا ہو لیکن جہاں پیچیدگی میں کوئی اہم بات مضمر ہو وہاں تعقید معنوی عیب شمار نہیں ہوتی۔

(۱) اکرم رضا صاحب نے درجنوں شعرائے کرام کے نعتیہ کلام سے اشعار نقل کیے ہیں، اس پر توجہ نہیں دی کہ کلام کس پائے کا ہے۔ مثلاً راغب مراد آبادی صاحب کا شعر دیکھیں:

نعت گوئی کی حدیں مجھ کو ہیں راغب معلوم

کہ نگاہوں میں ہیں احکام شریعت میری

دوسرے مصرعے میں تعقید کا عیب کتنا واضح ہے، دیکھ لیں، کہ نگاہوں کا ”میری“ کہاں جا کے اٹکا ہے کہ شریعت خود راغب صاحب کی بن گئی ہے۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۵۱)

(۲) صاحب زادہ ابوالحسن واحد رضوی کی نعت کا دوسرا شعر ہے:

ہاں ہاں وہی جو رحمت عالم ہے سر بہ سر

ہاں ہاں اسی تو شافع محشر کی بات ہے

اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں تعقید کا عیب نمایاں ہے۔ (طلحہ رضوی رقص، ص ۵۶۸)

(۳) ساری بد زبیاں ماحول کی زیا کر دیں حسن نیت نے پیہر کے بجائے شب و روز

ثانی مصرع کے ٹکڑے ”پیہر کے“ میں تعقید ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ”حسن نیت نے پیہر کے شب و روز سجائے!“ کے ”کی“ چاہئے تھا۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۴۱/۲۶)

(۴) انتخاب میں فن کی نزاکتوں اور باریکیوں کا لحاظ و پاس رکھا جانا چاہیے اس قسم کے اشعار

کے انتخاب سے دامن بچانا چاہیے جن میں لفظی و معنوی عیب ہو۔ موصوف کے منتخب اشعار میں غلام رسول عدیم کے ایک شعر میں تعقید لفظی کا عیب ہے:

آفتاب رسالت ہوا جلوہ گر شب کی تاریکیوں نے دیا توڑ دم
(ملک الظفر سہرامی ص، ۸۴۷-۸۴۶)

(۵) عزیز احسن صاحب نے صبا کبر آبادی کے یہ اشعار مثال میں دیے ہیں:

جس کو چاہا اسے قدموں میں ترے ڈال رہا

خود مشیت بھی سمجھتی تھی ارادہ تیرا

اولیٰ مصرع میں ”جس کو چاہا“ میں تعقید ہے کس نے چاہا؟ نبی نے یا اللہ نے!! (ڈاکٹر

اشفاق انجم ص ۱۳۹)

(۶) ہے زیارت کدہ روضہ محبوب خدا طیبہ اچھا نہ لگے بارغ جناب سے کیسے
شعر میں زبردست تعقید لفظی و معنوی ہے یعنی شاعر کہنا چاہتا ہے کہ ”روضہ زیارت کدہ ہے“، لیکن
شعر کی بندش سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”طیبہ محبوب خدا کا زیارت کدہ ہے! یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم خود اپنے روضے کی زیارت فرما رہے ہیں۔“ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۲۶/۶۴۰)

(۷) رسول سب خطائیں اپنی رب سے بخشوائیں گے

اسی لئے ہے انتظار عرصہ نشور کا

شعر میں زبردست تعقید معنوی ہے۔ مفہوم تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ”رسول اپنی خطائیں
بخشوائیں گے“ شاعر یا امت کا تصور نہیں ابھرتا۔ اگر ”اپنی“ کی جگہ ”میری“ رکھ دیں تو یہ عیب دور
ہو جائے گا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۱۳۰)

(۸) مجھے مئے طہور شاکر آپ خود پلائیں گے

گواہ ہوگا رب دو جہاں مرے سرور کا

مقطع میں بھی تعقید ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ”شاکر خود پلائیں گے“۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۱۳۰)

(۹) سبطین کو جہاں میں دونوں عزیز ہیں

وہ اسوۂ رسول ہو یا اسوۂ نبی

مقطع میں زبردست تعقید معنوی ہے۔ ثانی مصرع سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اور نبی دو الگ
الگ شخصیتیں ہیں اور دونوں کا اسوہ شاہ صاحب کو عزیز ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۱۳۶)

(۱۰) حنیف اسعدی مرحوم کی نعت کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

کوئی ایسی ذات ہمہ صفت، کوئی ایسا نور ہمہ جہت کوئی مصطفیٰ، کوئی مجتبیٰ، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں

یہ سوال تھا کوئی اور بھی ہے گناہگاروں کا آسرا تو رواں رواں یہ پکار اٹھا نہیں ان کے بعد کوئی نہیں
وہ قدم اٹھے تو بیک قدم ہمہ کائنات تھی زیر پا یہ بلندیاں کوئی چھوہ کا، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں
ردیف ”نہیں ان کے بعد کوئی نہیں“ سے تعقید یہ پیدا ہو رہی ہے کہ:

”ان سے پہلے یہ سب تھا!! بعد میں کوئی نہیں ہوا؟“ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۲۶/۶۴۳-۶۴۳)

(۱۱) اورنگ نبوت پہ وہی صدر نشین ہیں جو لمحے سرعرش گزارے ہیں ہزاروں

ثانی مصرع بھی تعقید کا شکار ہو گیا ہے یعنی شعر سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ:

”جو ہزاروں لمحے سرعرش گزارے ہیں، وہی لمحے صدر نشین ہیں!“

(ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۲۶/۶۴۴)

(۱۲) ص ۱۵۵ پر نظیر رضوی الہ آبادی کا شعر ہے:

دشمن ہوئے اخلاقِ شہ دیں سے مسلمان یہ معجزہ خلق ہے یہ شانِ نبی ہے

مصرع اولیٰ میں زبردست تعقید معنوی ہے یعنی مصرع کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ

”اخلاقِ شہ دیں سے مسلمان دشمن ہوئے“ جبکہ شاعر کی مراد ہے کہ اخلاقِ شہ دیں سے

دشمن (بھی) مسلمان ہو گئے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۲۷/۵۰۷)

(۱۳) رہ عرفان دکھائی آپ نے پرواز بندوں کو بشر جس راستے سے ماورا تھا آپ سے پہلے

شعر میں زبردست تعقید معنوی ہے، اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے:

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بشر جس راستے سے ماورا تھا (اسے)

پرواز نے رہ عرفان دکھائی“ اللہ کی پناہ!! ”ماورا“ پہلی بار ”نامعلوم/اجنبی“

کے معنی میں استعمال ہوتے دیکھا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۲۷/۵۱۰)

(۱۴) مجھے مئے طہور شاکر آپ خود پلائیں گے گواہ ہوگا رب دو جہاں مرے سرور کا

مقطع میں بھی تعقید ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ”شاکر خود پلائیں گے“ یہاں بھی رب

دو جہاں کو گواہی میں گھید لائے ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۱۳۰)

(۱۵) توڑ کر جس نے دوبارہ مہ کامل باندھا میں نے اس ہاتھ سے یہ ٹوٹا ہوا دل باندھا

شعر میں زبردست تعقید ہے، ”جس ہاتھ سے میں نے مہ کامل توڑ کر دوبارہ باندھا اسی ہاتھ سے یہ

ٹوٹا ہوا دل باندھا!!؟“ اور اگر معجزہ شق القمر کا ذکر ہے تو حضور نے مہ کامل کو توڑا نہیں تھا اور نہ ہی

باندھا تھا!! ٹوٹنے اور شق ہونے کے عمل سے شاید عاصم صاحب آگاہ نہیں ہیں اور ٹوٹی ہوئی چیز

جوڑی جاتی ہے، باندھی نہیں جاتی۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۸)

(۱۶) رہتا ہے انتظار میں مشغول رات دن بے روزگار آپ کا بیکار آپ کا
”بیکار آپ کا“ میں تعقید معنوی بھی ہے بلکہ اس میں ایک طرح ذم کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ (ڈاکٹر
اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۹)

(۱۷) ردیف ”میں مواجہہ پہ ہم“ کے لیے دل میں تردد سا پیدا ہوا کہ اگر ”ہم مواجہہ پہ ہیں“
ہوتا تو شاید بہتر ہوتا کہ ”ہم“ کا تقدم اپنی بے چارگی، در ماندگی کے اظہار اور اس سے متصل ”مواجہہ“
کی تکرار شاید زیادہ اثر انگیز ہوتی کہ ”ہم“ اپنی ساری بے سروسامانیوں کے باوجود اس مقام رفیع پر
پورے عجز و الحاح کے ساتھ کھڑے ہیں جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ نفس گم کردہ آتے ہیں، جب بھی اس
ردیف کو دہرایا تو بے اختیار ”ہم مواجہہ پہ ہیں“ کے الفاظ زباں سے ادا ہوئے کہ میرا ذوق ان الفاظ
کو اسی طرح سے ادا کرنے پر راضی تھا، تاہم مُصر نہ تھا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷/۵۱۶)

۳۔ حشو:

(حشو: لغوی معنی بھرتی کے ہیں۔ اصطلاح میں شعر کے وزن کو پورا کرنے کے لیے
زائد، بے ضرورت الفاظ لانا حشو کہلاتا ہے۔ اس کی تین اقسام ہیں۔

حشو تلح: ایسا زائد لفظ جس کے شعر سے نکال دینے سے شعر کے معنی پورے رہیں مگر اس کی شعر
میں موجودگی شعر کی خوبصورتی کا باعث بنتی ہے۔

حشو متوسط: ایسا زائد لفظ جس کے نکال دینے سے مفہوم میں خلل تو نہ آئے لیکن شعر میں اس کی
موجودگی ناگواری کا باعث ہو۔

حشو قبیح: ایسا زائد لفظ یا الفاظ جن کے شعر سے نکال دینے سے شعر کے معنی میں فرق نہ آئے بلکہ
حسن پیدا ہو جائے۔ یہ زائد لفظ کلام میں فصاحت پیدا کرنے میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔)

(۱) جا کے پل میں خدا سے مل آئے کیا ہی براق کی سواری ہے
براق کے معنی ہیں درخشندہ، چمک دار اور جس سواری پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر
تشریف لے گئے تھے اس کا نام ”براق“ ہے (غیر مشدد) اور اگر شاعر نے براق دانستہ استعمال کیا
ہے درخشاں کے معنی ہیں تو پھر ”کی“ حشو قبیح ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۰)

(۲) احمد صغیر صدیقی صاحب کی حمد کا مطلع ہے:

پتھروں کو بھی نمی دیتا ہے ساری توفیق وہی دیتا ہے
شعر میں ”بھی“ حشو قبیح ہے۔ بھی کے معنی ہیں ”نیز۔ علاوہ“ اس لیے پتھر کے ساتھ کسی
اور نم ناک شے کا ذکر ضروری تھا۔ اس کے علاوہ نمی کی بجائے نموکا محل ہے اور ایک توفیق کے لیے
”ساری“ کا استعمال بھی غلط ہے یہاں ”ایسی یا اس کی“ کہنا تھا: (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۴)

(۳) ہے مثال ایسی کوئی وقت کے دامن میں تو لاؤ

ایک انگلی سے کہیں چاند بھی شق ہوتا ہے
”ایک انگلی سے“ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حضور نے چھری کی طرح انگلی چاند پر پھیری
اور وہ سالگرہ کے کیک کی طرح شق ہو گیا!! ایک انگلی کی بجائے ”اک اشارے“ کا محل ہے نیز
”بھی“ حشو ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۶)

(۴) مرے نصیب کا کیا پوچھتے ہو ہم سفر مرے نصیب میں موسم ثنا گری کا ہے
حمد و ثنا کا کوئی موسم نہیں ہوتا۔ شعر میں ”ہم سفر“ بھی حشو ہے۔ ہاں اگر موسم کی
بجائے ”توشہ“ رکھ دیں تو ہم سفر و بھی نبھ جائے گا اور موسم کی قید بھی ختم ہو جائے گی۔ (ڈاکٹر
اشفاق انجم، ص ۱۴۷)

(۵) کاش یہ میری جبین اور نقش پائے مصطفیٰ صرف روزِ حشر تک ہو جائیں ساکن ساتھ ساتھ
مطلب نقش پائے مصطفیٰ پر سجدہ!! وہ بھی صرف روزِ حشر تک، اس کے بعد؟ ”صرف“ حشو بھی
ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۰)

(۶) نخل صحرا کی طرح خشک ہوں، وہ ابر کرم مجھ پہ برسے تو مجھے برگ و ثمر جائے
کیا صحرا میں ”نخل خشک“ آگتے ہیں؟ شعر میں ”صحرا کی طرح“ حشو ہے اس کے بغیر بھی معنی مکمل
ہیں۔ ”نخل خشک“ ہوں وہ ابر کرم نیز اس میں واحد جمع کا نقص بھی ہے ”برگ و ثمر ل جائیں“ کہیں
گے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۱)

(۷) ساری بدنیاں ماحول کی زیبا کر دیں حسن نیت نے پیمبر کے بجائے شب و روز
ثانی مصرع کے ٹکڑے ”پیمبر کے“ میں تعقید ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ”حسن نیت
نے پیمبر کے شب و روز سجائے!“ ”کے“ کی بجائے ”کی“ چاہئے تھا۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۱)

- (۸) یہ مشیت تھی کہ اک شب عبد اور معبود میں دو کمانوں سے بھی کم کا فاصلہ رہ جائے گا
اولیٰ مصرعے میں ایک حشو ہے ”اُس“ کی ضرورت تھی۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۸)
- (۹) احمد صغیر صدیقی صاحب کی حمد کا مطلع ہے:
پتھروں کو بھی نمی دیتا ہے ساری توفیق وہی دیتا ہے
شعر میں ”بھی“ حشو قبیح ہے۔ بھی کے معنی ہیں ”نیز۔ علاوہ“ اس لیے پتھر کے ساتھ کسی اور غم ناک شے کا ذکر ضروری تھا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۴)
- (۱۰) شب سیاہ میں جب کچھ نظر نہیں آتا وہ کوئی راہ دکھاتے ہیں نور سے اپنے کوئی حشو ہے یہاں ”وہ کوئی“ کی بجائے ”حضور“ صاحب کی نظم کا شعر ہے:
رواں تو وقت کی نہر فرات رہتی ہے سحر ہوشام ہودن ہو کہ رات رہتی ہے
”فرات“ حشو ہے۔ وقت کی نہر رواں رہتی ہے کافی تھا۔ وقت کے ساتھ فرات، راوی، گنگا، جمنہ کہنا غیر ضروری ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۹)
- (۱۱) محو طواف کون و مکاں آپ کے لئے پیدا کیا گیا ہے جہاں آپ کے لئے اولیٰ مصرع میں ”لئے“ حشو قبیح ہے۔ ”محو طواف کون و مکاں آپ کے“ پر بات مکمل ہو جاتی ہے اور اگر ”لئے“ کو شامل کریں تو سوال اٹھتا ہے کہ:
”کون و مکاں آپ کے لئے کس کے طواف میں محو ہیں؟“
ثانی مصرع میں ”جہاں“ بھی حشو قبیح ہے کیوں کہ ”کون و مکاں“ میں یہ بھی شامل ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۰)
- (۱۲) وہی ہے عشق نبی میں کامل ہے، وہی ہے حب نبی کا وارث
رہ محبت میں چلتے چلتے، فنا جو انسان ہو گیا ہے
”چلتے چلتے“ حشو ہے اس کے بغیر بھی معنی مکمل ہیں۔ ”چلتے چلتے، ہنتے ہنتے، آتے جاتے“ جیسا کوئی بھی ٹکڑا رکھیں یہ صرف بحر پوری کرنے کے لئے ہوگا۔
(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۶)
- (۱۳) ”مجید امجد کی ایک نایاب نعت“ ڈاکٹر محمد افتخار شفیق صاحب کی امجد سے عقیدت کا اظہار ہے ورنہ نعت میں کئی جگہ جھول ہے، مثلاً مجید امجد کا یہ شعر:

- ہے جبرئیل موشائے رسول آج ہے عاشق رسول، فدائے رسول آج
ثانی مصرعے میں ”آج“ حشو ہے!! آج سے عموماً ”دن“ مراد لیا جاتا ہے جبکہ یہاں بات ”رات“ کی ہو رہی ہے۔ وہ بھی واضح نہیں کہ یہ رات کونسی ہے؟!
(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷/۵۰۳)
- (۱۴) ڈاکٹر شہزاد احمد کا مضمون ”نعتیہ کلیات کی روایت، ایک مطالعاتی جائزہ“ معلومات افزا مضمون ہے لیکن ان کے انتخاب کردہ اشعار میں سے بعض میں فنی نقائص موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو:
اٹھا کے آنکھ کو میں نے جہاں جدھر دیکھا تو جلوہ تیرا ہی رب العلا ادھر دیکھا
”کو“ حشو ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۵-۶۳۶)
- (۱۵) رکھتا ہے شوق شربت دیدار آپ کا یہ رند آپ کا، یہ گنہگار آپ کا
شعر میں ”رند“ حشو قبیح ہے۔ رند، شراب کے ساتھ استعمال ہوتا ہے ”شربت“ کے ساتھ نہیں۔ یہاں رند کی بجائے ”تشنہ“ کر دیں تو یہ نقص دور ہو جاتا ہے۔
(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۹)
- (۱۶) خواب میں کاش کبھی ایسی بھی ساعت پاؤں آپ کو نعت سنانے کی سعادت پاؤں
”خواب میں“ حشو ہے اس کے بغیر بھی مصرع مکمل معنی دیتا ہے۔ یہ مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا:
”خواب ہی میں سہی ایسی کبھی ساعت پاؤں“ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۲)
- (۱۷) پیکر نور اے سراج منیر ہے یہ خورشید میں تری تنویر
اثر صہبائی کے اس شعر میں ”یہ“ حشو قبیح ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷/۵۰۳)
- ۴۔ شتر گربہ:
(شتر گربہ: اصطلاح شعر میں ضمیر متخاطب اور اس کے صیغوں میں اختلاف یا ایک شخص کے لیے دو مختلف ضمیروں کے استعمال کو شتر گربہ کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک ہی شعر میں ایک ہی شخص یا چیز کے لیے صیغہ واحد اور جمع دونوں لائے جائیں۔ مثلاً تو کے ساتھ تم، میں کے ساتھ ہم، آپ کے ساتھ تو یا تم، میرا کے ساتھ ہمارا، میں کے ساتھ ہمارے، تم کے ساتھ تمہارے یا تیرے، آپ کے ساتھ تمہارے، وغیرہ کا ایک ہی شعر میں لانا درست نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی دو اقسام ہیں۔
۱۔ شتر گربہ صیغی: ایک شخص یا چیز کے لیے دو مختلف صیغوں کا استعمال کرنا۔ مثلاً تو کے ساتھ تم، میں

کے ساتھ ہم کا صیغہ استعمال کرنا۔

۲۔ شترگر بہ فعلی: ایک ہی شعر میں دو مختلف زمانوں کا استعمال۔ ایک جگہ ماضی اور دوسری جگہ حال یا مستقبل کا صیغہ استعمال کرنا۔

(۱) ضیا احمد ضیا کا شعر ہے:

سید الکونین ہے جس کا لقب رحمت دارین ہے جن کا خطاب
”جس“ اور ”جن“ میں شترگر بہ کا عیب ہے۔ (ریاض حسین چودھری ص، ۵۰۷/۲۷)

(۲) صہبا اختر کا شعر ہے:

خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والا ہے تو

سن اسے شیشوں کے میس! دل شکستہ میں بھی ہوں

تیکھے تیور کے علاوہ اس میں شترگر بہ بھی ہے۔ (طلحہ رضوی برق ص، ۵۶۴)

(۳) کفش بردار نبی میں ہوں اے شائق مشہور رتبہ شاہوں سے بھی ہے افضل و برتر اپنا
”میں“ اور ”اپنا“ میں شترگر بہ ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۶۳۶/۲۶-۶۳۵)

(د) تخلیقی اظہار کی معذوریات:

(اہمال، عدم مطابقت مصرعین، عجز بیان، نقص ابلاغ)

(اہمال: شعر میں ایسے الفاظ کی موجودگی جن کا مطلب سمجھ سے باہر ہو۔ اہمال میں شعر موزوں تو ہوتا ہے لیکن معنی سے عاری ہوتا ہے۔ شعر بظاہر تو الفاظ کے استعمال، موزونیت اور بحر کے لحاظ سے درست ہو مگر معنوی طور پر اس سے کوئی مطلب حاصل نہ ہو سکے یا اس کے الفاظ شعر کے کسی مفہوم کو صحیح طور پر پورا نہ کر سکیں۔

عدم مطابقت مصرعین: ایک مصرع کے مفہوم کا دوسرے مصرع کے مفہوم سے غیر متعلق ہونا عدم مطابقت مصرعین کہلاتا ہے۔ اس نقص میں شعر کے دونوں مصرعے علیحدہ علیحدہ دولخت ہو کر الگ الگ مفہوم کے حامل بن جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے شعر کا کوئی ایک خاص مفہوم باقی نہیں رہتا۔ عجز بیان اور نقص ابلاغ: تخلیق کار کا ایسا بیان یا خیال جو قاری تک مکمل انداز میں پہنچنے سے ناکام رہا ہو۔)

(۱) نعتیہ کلام میں جناب عاصی کرنالی کی نعت اول مقام پر ہے۔ اس کا ایک شعر ہے:

صدیوں سے اسیر شب ظلمات تھی دُنیا

وہ مہر جہاں تاب جو نکلے تو سحر ہو

اگر شعر کے construction پر نظر ڈالیں تو دوسرا مصرع عجیب سا لگتا ہے۔ یہاں ایسے مصرع کی ضرورت تھی جس میں کہا جاتا کہ وہ مہر جہاں تاب جب نکلا تو سحر ہوئی... اگر یہ سوچا جائے کہ وہ دنیا جو صدیوں سے اسیر ظلمات تھی، منتظر تھی کہ وہ مہر جہاں تاب نکلے تاکہ سحر ہو تو اس میں لفظوں کا ایسا گیپ آ جاتا ہے جسے پہلا مصرع موجودہ صورت میں پر نہیں کر رہا ہے۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۵۲)

(۲) یہ مشیت تھی کہ اک شب عبد اور معبود میں

دو کمانوں سے بھی کم کا فاصلہ رہ جائے گا

(عبدالغفار حافظ کا) شعر زمانے کے اعتبار سے درست نہیں ہے اگر ردیف میں ”گا“ نہیں ہوتا تو شعر درست ہوتا یا پھر ردیف ”رہ گیا تھا“ ہونی چاہئے تھی۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۱۲۸)

(۳) طائر روح کا مسکن ہے ریاض احمد کیسے اغیار کے اشجار پہ ٹھہرے جا کر
ریاض یہاں بہ حیثیت تخلص استعمال ہوا ہے جو بے محل ہے۔ یہاں ”ریاض“ باغ کے معنی نہیں دیتا اور اگر ریاض احمد پڑھیں تو سکتہ در آتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۱۳۱)

(۴) نبی کا نور میری زندگی پر اجالوں کی طرح پھیلا ہوا ہے
یہاں بھی ”نور“ بطور تخلص غلط استعمال ہوا ہے۔ نور اور اجالا میں کیا فرق ہے؟ نور اجالوں کی طرح نہیں تو کیا اندھیروں کی طرح پھیلے گا؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۱۳۲)

(۵) ریاض خوشنوا کو بھی رعایا میں رکھیں شامل محمد کی غلامی کی خدا سے انتہا مانگوں
پہلا مسئلہ تو ”غلامی کی انتہا“ ہے، یہ کیسی ہوتی ہے؟ دوسرے ردیف ”مانگوں“ غلط ہے یعنی ریاض اور مانگنے والا یہاں دو الگ الگ شخصیتیں ہو جاتی ہیں مطلب مانگنے والا ”ریاض خوشنوا“ کیلئے مانگ رہا ہے جب کہ ریاض خود اپنے لئے مانگ رہا ہے۔ اس صورت میں ردیف ”مانگے“ ہونی چاہئے۔ نیز ”جب خدا سے مانگا جا رہا ہے تو ”رکھیں“ صیغہ جمع قطعی غلط ہے اسے ”رکھے“ ہونا چاہئے تھا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۶۳۵/۲۶)

(۶) ٹھکرا رہا ہے قیصر و کسریٰ کی سلطنت یہ امجد حزیں یہ گدائے رسول آج کیا کسی نے امجد صاحب کو قیصر و کسریٰ کی حکومت آفری تھی جسے وہ ٹھکرا رہے ہیں!؟ جو چیز ہماری ملکیت نہ ہو اسے ٹھکرا کرنا کونسا کمال ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۰۴/۲۷)

(۷) عرفان زندگی بھی میسر ہوا تو کیا تحریر کر نہ پاؤں گا مدحت رسول کی (غالب عرفان کے) ”عرفان“، تخلص کی بجائے اسکے اصل لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اگر مصرع کو ”عرفان - زندگی“ پڑھیں تو بحر میں سکتہ پیدا ہوتا ہے اور مذکر مونث کا بھی عیب پیدا ہو جاتا ہے۔

اکثر شعرا تخلص کی اہمیت و حیثیت کو سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ تخلص شاعر کا دوست ہوتا ہے۔ ہمزاد ہوتا ہے۔ دشمن و رقیب ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ شعرا نے اپنے تخلص سے بڑے بڑے کام لیے ہیں۔ مثلاً غالب کا مشہور مقطع

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے اس مقطع پر کیا ہنگامہ ہوا۔ ذوق کی شکایت، غالب کی دربار ظفر میں طلبی اور غالب کی معذرت طلبی و تاویل سے اہل علم و ادب واقف ہی ہیں۔ تخلص کو اسی وقت اسکے لغوی معنی کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں جبکہ اسکی حیثیت بطور تخلص قائم رہے ورنہ وہ مقطع کی بجائے شعر شمار کیا جائے گا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۷)

(۸) اترن ہے جن کے چہرہء انور کی کہکشاں

نظم کے بند نمبر ۹ کے تیسرے مصرعے میں ”چہرے کی اُترن“ کی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی وہ بھی حضور پر نور کی ذات گرامی قدر کی مناسبت سے۔۔۔ نظم کے ۲۳ ویں بند کا ۱۱واں مصرعہ ”قندیل آرزو کی بدن میں جلی رہی“ کے بجائے ”قندیل آرزو مرے دل میں جلی رہی“ ہونا چاہیے تھا کیوں کہ شعر کے دوسرے مصرعے ”روشن حریم ذہن میں ان کی گلی رہی“ میں لفظ ”ذہن“ سے ”دل“ کی مناسبت قائم ہو جاتی۔ ویسے بھی ”بدن“ کہنے کے بعد ذہن کے لیے الگ گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ (ماجد خلیل، ص ۷۸-۷۹)

(۹) اک مٹھی ستو ہوں، روٹی خشک ادھوری ہو

مولا! مجھ سے آپ کی سنت کیسے پوری ہو روٹی، تازہ، خشک، کچی، جلی، آدھی، پاؤ تو ہوتی ہے لیکن ”ادھوری روٹی“ تو آج تک نہ

دیکھی نہ سنی!! اور پھر ستو اور خشک روٹی کھانا ہی حضور کی سنت ہے؟ ارے بھائی اس تعلق سے فکر مند نہ ہوں اگر یہ سنت ادا نہ ہو سکی تو کوئی قابل گرفت بات نہیں ہے بس نماز، روزہ، تلاوت اور اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے رہئے ان شاء اللہ بیڑہ پار ہو جائے گا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۵۰/۲۶)

(۱۰) اورنگ نبوت پہ وہی صدر نشیں ہیں جو لمحے سر عرش گزارے ہیں ہزاروں ”اورنگ“ کے معنی ہیں ”تخت شاہی“ جس پر سوائے بادشاہ کے کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا اس لئے اورنگ نبوت پر صدر نشیں، کہنا غلط ہے کیوں کہ اس صورت میں کچھ اور لوگوں کو بھی اورنگ پر بٹھانا ہوگا تب ”صدر نشینی“ کی نوبت آئے گی!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۴۴/۲۶)

(۱۱) بولنا واجب نہیں سرکار کے دربار میں آپ سن لیتے ہیں اشکوں کی زباں آہستہ بول جب ”بولنا واجب نہیں“ کہہ دیا تو پھر ردیف ”آہستہ بول“ بے معنی ہو گئی نیز اشکوں کی زباں سننا بھی محل نظر ہے، ”بات اور بیان“ سنا جاتا ہے، ”زبان“ نہیں!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۴۶/۲۶)

(۱۲) ہادی و رہبر پائے مصطفیٰ، راہنما سے جادہء اولیٰ

رحل شرف، زانوئے محمد، صلی اللہ علیہ وسلم

ص ۲۸۷ پر سیماب اکبر آبادی کے اشعار ”صلی اللہ علیہ وسلم“ کی ردیف میں آئے ہیں۔ چوتھا شعر خبر نہیں کیا سے کیا ہو گیا ہے؟ (محمد شہزاد مجددی، ص ۵۳۳)

(۱۳) تری کہکشاں کے نظام میں ہے جو انتشار کی کیفیت

یہی وجہ ارض و قمر بھی ہے یہی وجہ شان ربوبیت

یہ شعاع برق یہ حرکتیں یہ نظام گردش و انتشار

تری حکمتوں کی مناسبت سے زمیں کو آنے لگا قرار

تو نے آب و باد کی چھاؤنی جودی اس فضائے محیط میں

تو مہک اٹھی ہے حیات نو کی کلی ہوئے بسط میں

ایسا لگتا ہے کہ جناب مصنف (بدیع الزماں سحر) اپنے مافی الضمیر کی ٹھیک ٹھیک وضاحت نہیں کر پائے یا اس کے اظہار پر گرفت نہیں رکھ سکے۔ ہر دو مصرعوں کا آپس کا تعلق بھی عجیب غیر منطقی تاثر دیتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ان اشعار کو پھر ایک نظر دیکھ لیں۔

(خضر حیات، ص ۳۲۳)

(۱۴) فیاض جس سے شوکتِ اسلام ہو عیاں روئے حیات کو تو وہی خدو خال دے
(فیاض ٹانڈوی کے شعر میں) ’روئے حیات‘ کی ترکیب آفاقی مفہوم رکھتی ہے۔ میری
دانست میں اپنی حیات یا اپنے کلام کے الفاظ زیادہ مناسب لگتے۔ (خضر حیات، ص ۳۲۳)
(۱۵) یہ کرم شاید پہ ہے اے رحمت للعالمین کر دیے روشن مرے دل میں محبت کے چراغ
صفحہ نمبر ۳۹۲ پر شاہد نعیم صاحب کے مقطع میں ایک سقم ہے۔ دوسرے مصرع میں
”مرے دل میں“ کی جگہ ”اس کے دل میں“ ہونا چاہیے۔ یہ مصرع یوں ہو سکتا ہے۔ ”اس کے دل
میں کر دیے روشن محبت کے چراغ“۔ (حافظ عبدالغفار حافظ، ص ۶۵۴)
(۱۶) ہر ایک پیڑ پہ اترے بہار کا موسم حجاز عشق پیہر میں یہ دعا کی ہے
”حجاز عشق پیہر“ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا؟! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۹)
(۱۷) نہیں ہے کچھ تو ایک کھجور دیجے روزہ دار کو
مرے نبی کے پاس کیا ہے مرتبہ کھجور کا
جب ”کچھ نہیں“ تو پھر کھجور کہاں سے آئے گی؟ ”کچھ نہیں تو اک“ کہنا تھا، اسکے علاوہ
شاکر صاحب نے حدیث کا مفہوم ہی الٹ دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ”کھجور کا نہیں
روزہ دار کا مرتبہ ہے اور وہ بھی ثواب کی خاطر“ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۰)
(۱۸) صفحہ ۷۷ پر صرف ایک شعر درج ہے:
جادہ حق نہ ملے، اس کے وسیلے کے بغیر جو ملاتی ہے احد سے، ہے وہ سرحد، احمد
معاف کیجئے گا، ”سرحد“ ملاتی نہیں ”جدا“ کرتی ہے۔ دو ملکوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی
درمیانی لکیر (علامت) یا حد یا حد فاصل، کو سرحد کہتے ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۲۳۱)
(۱۹) ملی ہے اس لئے خلعت کہ میں نے زیر عبا چلا تھا گھر سے تو شمشیر بھی پہن لی تھی
شمشیر اگر کسی قسم کا لباس ہے تو ٹھیک ہے ورنہ یہ تو کمر سے باندھی جاتی ہے۔ ستم تو یہ
ہے کہ شاعر نے شمشیر ”زیر عبا پہن لی تھی! شاید زیر جامے کی طرح!! ایک بات اور کیا صرف
شمشیر پہن لینے سے خلعت مل جاتی ہے؟ درج ذیل اشعار کی واقعیت، حقیقت اور تعلیٰ پر کیا کہا جا
سکتا ہے: (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۳۳)
(۲۰) لیل و نہار آپ کے در کے طواف میں لوح و قلم ہے آپ کی مدحت کا آئینہ
”ہے“ اگر کتابت کی خامی نہیں ہے تو اسے ”ہیں“ ہونا چاہئے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۳۳)

(۲۱) ظہور کرتی ہے جس دم سحر مدینے میں اذانیں دیتے ہیں دیوار و در مدینے میں
خلاف واقعہ شعر ہے ”اذانیں“ دینے کی بجائے ”چمک سے اٹھتے“ جیسا کوئی نکلنا چاہتے تھا۔ ویسے
بھی یہ نعت کا شعر نہیں ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۸)
(۲۲) ہمارے قلب میں فاران سے ہوئی روشن کلیم لائے تھے جو آگ طور سے اپنے
کیا شاعر فاران پر موجود تھا؟؟ یا پھر اب بھی فاران پر وہ آگ موجود ہے؟؟
حضور نے ”دلوں کو نور“ عطا کیا تھا یا آگ؟! ”رذیف“ اپنے، بھی ضائع ہو گئی یعنی اس
کے بغیر بھی شعر مکمل ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۰)
(۲۳) کہاں شعور سا کج گج بیاں و ہیچ مداں کہاں حبیب خدا کی فضیلتوں کا بیاں
ہوئے ہیں نعت میں اعجاز شعری و ادبی..... محمد عربی
محمد عربی اے محمد عربی
جب مخاطب محمد عربی سے ہے تو پھر یہاں ”حبیب خدا“ کہنا درست نہیں ہے کیوں کہ اس سے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ حبیب خدا اور محمد عربی دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ شاعر کے ”دعویٰ اعجاز شعری و
ادبی“ پر کیا کہا جائے؟
ہو کر بتوں سے خالی وہ بن گئے مثالی ممنون ہیں نہایت بت خانے، مصطفیٰ کے
منادر ”بتوں“ سے خالی ہو گئے تو پھر وہ بت خانے کہاں رہ گئے؟ اور اگر بت خانے ہیں تو ان میں
بت بھی لازماً ہوں گے!! اور اگر قاری روانی میں بت خانے اور مصطفیٰ میں وقفہ نہ دے سکا تو کیا
مطلب ہوگا؟
تہجد میں کھڑے ہوتے تھے جب رب کی عبادت کو
تو اک سیل رواں اشکوں کا آنکھوں سے برستا تھا
”سیل رواں“ کا مطلب ہے ”بہتا ہوا سیلاب“ اور سیل برستا نہیں، بادل برستا ہے!! (ڈاکٹر
اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۰)
(۲۴) اُجالا آپ ہی کی ذات سے ہوا ورنہ شعاع نور نہ تھی روشنی کے دامن میں
عجیب سا شعر ہے، اجالا اللہ کی قدرت سے ہوا یا آپ کی ذات اقدس سے؟ نیز کیا حضور سے پہلے
روشنی کے مظاہر چاند، سورج، ستارے نہیں تھے؟! پھر ”شعاع نور“ اور ”روشنی“ میں کیا فرق
ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۵)

(۲۵) بولنا واجب نہیں سرکار کے دربار میں آپ سن لیتے ہیں اشکوں کی زباں آہستہ بول جب ”بولنا واجب نہیں“ کہہ دیا تو پھر ردیف ”آہستہ بول“ بے معنی ہوگئی نیز اشکوں کی زباں سننا بھی محل نظر ہے، ”بات اور بیان“ سنا جاتا ہے، ”زبان“ نہیں!!
(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴)

(۲۶) ہم اُمتی ہیں رعایت یہ خاص ہے ہم سے خوشا کہ حشر کے دن بھی ہے یہ رعایت خاص ”کون سی رعایت خاص؟“ اس کی کچھ توضاحت ہونی تھی۔ ”حشر کے دن بھی“ ہے، نہیں ”ہوگی!!“

قلم نے حرفِ ثنا جیسے ہی شروع کیا فلک نے وجد میں قرطاس پہ رکوع کیا قرطاس پر قلم کا سجدہ تو ہو سکتا ہے لیکن رکوع فلک کس طرح ہوگا؟
ہوئی جو فکر لکھوں نعت شان کے شایاں حسین شعر نے مطلع معاً طلوع کیا
”حسین شعر“ یہ کون صاحب ہیں جنہوں نے مطلع طلوع کیا! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴)
(۲۷) چراغِ نعت جلتے ہیں مرے چھوٹے سے کمرے میں
مرے آنگن کی چڑیاں بھی درودِ پاک پڑھتی ہیں
چھوٹے سے کمرے میں صرف ایک ہی چراغ کافی ہے، ”جلتے“ کی بجائے ”جلتا“
بہتر ہوتا اس کے علاوہ شجر و حجر، طیور و وحوش کے تعلق سے تو روایات صحیحہ موجود ہیں کہ یہ سب تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے ہیں لیکن یہ روایت کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آئی کہ چڑیاں درود شریف پڑھتی ہیں!! اور اگر ”چڑیاں“ سے مراد ”گھر کی بچیاں“ ہیں تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ گھر کی بجائے آنگن میں کیوں پڑھتی ہیں؟ نیز چراغِ نعت صرف آپ کے کمرے میں جلتا ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۵)

(۲۸) احمد جاوید (بھارت) کے مضمون ”وسیم بریلوی: نئی نعت کا پیشرو شاعر“ میں وسیم بریلوی کے صرف ۹ اشعار پیش کیے گئے ہیں جن میں ایک بھی ”نعت“ کا شعر نہیں ہے۔ احمد جاوید صاحب نے زبردستی غزل کے اشعار کو نئی نعت کے عنوان سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون کا پہلا ہی شعر عیب دار ہے۔

کھڑی ہیں دست بستہ خوشبوئیں پھولوں کی پلکوں پر
کسی کا جیسے نعت پاک کہنے کا ارادہ ہے

اول تو پھولوں کی پلکیں نہیں ہوتیں، اساتذہ نے برگ گل، دامن گل، کف گل، تبسم گل وغیرہ اور چشمِ نرگس جیسی تراکیب نظم کی ہیں۔ ”پھولوں کی پلکیں“ تو قیاس میں بھی نہیں آتیں۔ یہاں کچھ رعایت کریں تو ”نرگس کی پلکوں“ کہہ سکتے ہیں کہ نرگس کو آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں ”کسی کا“ قطعی مہمل ٹکڑا ہے اس کی بجائے ”ہمارا جب سے“ کہا گیا ہوتا تو شعر مزہ دے جاتا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷/۵۰)

(۲۹) میں بھی ہوتا کہ انہیں دیکھتا رہتا ہر دم عکس جلوہ مری بینائی میں اترا ہوتا نور کا عکس نہیں ہوتا!! عکس کو ”ان کا“ کر دیں تو! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷/۵۱)

(۳۰) کاشف ابھی آلودہ ہے خواہش سے مرادل پتھر ہوں مگر کانِ گہر میں ہوں ابھی تک ”گہر“ کان میں نہیں ”سیپ“ میں ہوتا ہے۔ ثانی مصرع یوں ہوتا تو،
ع ”گوہر ہوں مگر“ کانِ حجر“ میں ہوں ابھی تک“
کاشف صاحب سے ”کانِ حجر“ کی ترکیب کی داد چاہوں گا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷/۵۱)

(۳۱) شدت یاس میں پڑھتا ہوں میں جب حرف درود

کاسہ سرتے قدموں میں جھکا لگتا ہے (ایضاً)

یہ ”حرف درود“ کیا ہے؟ کیا درود سے الگ کوئی چیز ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷/۵۱)

(۳۲) لوسانس بھی آہستہ کٹوٹے نہ مرا خواب سرکار دو عالم مرے پاس آنے لگے ہیں کسی اور کے سانس لینے سے شاعر کا خواب کیسے ٹوٹے گا؟ یہاں بھی ردیف کا وہی حال ہے یعنی ”آنے لگے ہیں“ بجائے ”آ رہے ہیں“ کی ضرورت ہے۔ صفوت صاحب کس اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کی آنکھوں میں دربار محمد لگتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بیٹھے نظر آتے ہیں اور آپ ان کے پاس وقت بے وقت آنے بھی لگے ہیں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے حقیقت سے بعید یا منافی شعر کہنا بھی باعث عذاب ہے۔

بالآخر ڈھونڈ لیں گے محور نور خدا صفوت بالآخر نور احمد گرد اس محور کے دیکھیں گے صفوت صاحب نے ”نور خدا“ اور ”نور احمد“ کو اس طرح ایک دوسرے کے گرد گھما دیا ہے کہ میری عقل چکا گئی کہ اس پر کیا اور کس طرح لکھا جائے؟ مجھے یحییٰ خلیفہ صاحب کے انتخاب پر حیرت ہو رہی ہے۔ (تنویر پھول، ص ۲۷/۵۲)

(۳۳) یہی حال اس مصرع کا ہے: ع اے وفور شوق! اے جذب رواں آہستہ بول

”جذبِ رواں“ کا مطلب بھی میری سمجھ میں نہیں آیا؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۲۷) (۳۴) ڈاکٹر اسلم عزیز نے سید حسن نقوی کی نعت نگاری پر قلم اٹھایا ہے! مضمون تو اچھا ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے یہ لکھنے کے بعد کہ ”وہ نعت کے لیے وہ یوں الفاظ تلاشتا اور تراشتا ہے جیسے جوہری جواہرات کا انتخاب کرتا ہے“۔ متعدد ایسے اشعار بہ طور انتخاب لکھے ہیں جن سے ان کے تحسینی لفظوں کی نفی ہوتی ہے۔ دیکھیے یہ اشعار:

- (۱) جبریل تیرے در کے نگہ بان کا ہم مزاج باقی ملائکہ تری گلیوں کے کوزہ گر
- (۲) موج صبا کو ہے تیری خوشبو کی جستجو جیسے کسی کے در کی بھکارن ہو در بدر
- (۳) زلفوں سے نخل شب کی ستارہ بدنی ہے
- (۴) میں سایہ طوبیٰ کی خنک رت سے ہوں واقف
- مولا تری گلیوں کی مگر چھاؤں گھنی ہے
- (۵) گلنار گھٹاؤں سے یہ چھلتی ہوئی چھاؤں
- (۶) ظاہر ہوا اک پیکر صد رنگ بصد ناز

اب کیا میں تفصیل بھی بتاؤں کہ اشعار اور مصرعے کس طرح ظاہر کر رہے ہیں کہ شاعر کو عہدگی سے الفاظ کے چناؤ کا طریقہ نہیں آتا؟ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ملائکہ کو گلیوں کے ”کوزہ گر“ کہا گیا ہے شاعر شاید یہ کہنا چاہتا تھا کہ باقی ملائکہ گلی کے بھکاری ہیں مگر اسے معلوم نہیں کہ ”کوزہ گر“ برتن بنانے والے کو کہتے ہیں۔ اسے ”دریوزہ گر“ کے معنی میں نہیں استعمال کیا جاسکتا۔ اب دوسرا شعر دیکھیں۔ موج صبا کو حضور کی خوشبو کی جستجو ہے۔ اور وہ در بدر بھکارن کی طرح پھر رہی ہے۔ ”گویا اُسے یہ خوشبو مل ہی نہیں رہی ہے حالانکہ اس خوشبو سے تو ساری دنیا مہک رہی ہے۔ جناب ہمارے شاعر کی صبا کا جواب نہیں اور اسی طرح اس کی جستجو کا بھی۔ اب تیسرے مصرع کو دیکھیے۔ شاعر کہتا ہے کہ حضور کی زلفوں کے سامنے شب کی ستارہ بدنی نخل ہے۔ اگر بالوں کی سیاہی کی تحسین پیش نظر تھی تو پھر شب کی تیرگی کا تذکرہ ہونا چاہئے تھا۔ ”ستارہ بدنی“ کا یہاں کوئی محل نہ تھا۔ مگر شاعر کو اس کی سمجھ ہوتی تو پھر بات بھی بن جاتی۔ اسی طرح بعد کے شعر میں شاعر نے کہا ہے ”گلیوں کی چھاؤں گھنی ہے“ ہے نامکمال کی بات چھاؤں درختوں کے چھت وغیرہ تلے ہوتی ہے گلیوں میں نہیں۔ اور یہ گلیوں کا چھاؤں والا مصرع اس طرح اور بھی خراب ہو جاتا ہے۔ جب ہم پہلے مصرع میں ”طوبیٰ کے سائے کی بات پڑھتے ہیں جو ایک درخت ہے۔“ آگے

آئیے شاعر صاحب نے فرمایا ہے۔ ”گلنار گھٹائیں“۔ ہو سکتا ہوں شاعر نے دیکھی ہوں، میں نے نہیں دیکھی اور ممکن ہے شاعر کے مداح ڈاکٹر صاحب نے بھی دیکھی ہوں تو اور بات۔ اور آخری مصرع میں ”مقصود تخلیق کائنات“ کی تخلیق کے لیے شاعر نے لکھا ہے۔ ”ظاہر ہوا اک پیکر صد رنگ بہ صد ناز“۔ مجھے ”بہ صد ناز“ پر اعتراض ہے۔ اس قسم کی باتیں شعر اپنی معشوقاؤں کے لیے لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اسلم عزیز صاحب مجھے معاف کریں۔ میں ان کے اس فتوے سے بھی متفق نہیں کہ حسن نقوی عصر حاضر کا ایک ”بڑا“ شاعر تھا۔ (احمد صغیر صدیقی، ص ۲۵/۸۹۳-۸۹۴)

(۳۵) میری بینائیاں عرش سے جا ملیں دیدہ ور آئینہ دیکھتے رہ گئے
شعر کی بے معنویت سے الگ ”میری“ کے ساتھ ”بینائیاں“ کا استعمال غلط ہے صرف بینائی استعمال ہوتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۳-۱۴۴)

(۳۶) شبِ سیاہ میں جب کچھ نظر نہیں آتا وہ کوئی راہ دکھاتے ہیں نور سے اپنے
اگر نعت کے عنوان سے یہ شعر درج نہ ہوتا تو کسی صورت اسے نعت کا شعر نہیں کہا جاسکتا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۹-۶۴۰)

(۳۷) چلنا خدا کے حکم پہ انساں کے بس میں ہے اپنے عمل عمل سے جتایا حضور نے
یہاں پہلے ”عمل“ کو ”ہر اک“ کر دیں تو!!

وہ عفو ان کا وہ ان کی شفقت وہ فتح کے دن بھی یہ عنایت
کہ جائے ہر شخص امان پائے صلوٰۃ ان پر سلام ان پر
یہاں ”کہ جائے ہر شخص امان پائے“ محل نظر ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ”جاؤ ہر شخص کو امان دی گئی“ اس معنی کے مطابق یہ بیان غیر فصیح ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ ”جائے امان پائے“ تو جائے اور امان کے بیچ ”ہر شخص“ کی موجودگی غلط ہے جب کہ ”جائے، ہر شخص کو امان دی گئی“ یا ”ہر شخص کو امان دی گئی!!“

انھوں نے تزکیہ فرمایا اہل ایمان کا نکال لے گئے ظلمت سے روشنی کی طرف
عجیب سا شعر ہے ”انھوں نے اہل ایمان کا تزکیہ فرمایا اور انھیں ظلمت سے روشنی کی طرف نکال لے گئے!“ کیا اہل ایمان ظلمت میں تھے؟ یہاں ”اہل ایمان“ کی بجائے ”اہل عصیاں“ ہونا چاہئے!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۱-۶۴۲)

(۳۸) جز ایک اشکِ ندامت، جز ایک حرفِ دعا نہیں ہے کچھ مری تر دامن کے دامن میں

”تردامنی کے دامن میں“ سمجھ میں نہیں آیا!! ”کچھ“ کے بعد ”بھی“ کی ضرورت ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۶۴۵)

(۳۹) ہزار شکر غلامانِ شاہِ بطحا میں شروع دن سے مری حاضری لگی ہوئی ہے ”غلامانِ شبہ بطحا میں حاضری“ یہ کون حضرات ہیں کہ جن کے یہاں حاضری پر شاعر ہزار شکر ادا کر رہا ہے؟ ”شروع دن“ سے کیا مراد ہے؟ روز ازل یا شاعر کی ولادت؟! اولیٰ مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا: ”ہزار شکر کہ دربارِ شاہِ بطحا میں“

بہم تھے دامنِ رحمت سے جب تو چین سے تھے

جدا ہوئے ہیں تو اب جان پر بنی ہوئی ہے

”دامن سے بہم ہونا“ یہ تو زبان نہیں ہے۔ بہم ہونا کا مطلب ”ساتھ، باہم، یکجا“ کے ہیں۔ ایسے مواقع پر ”دامن سے جڑنا، وابستہ ہونا“ کہا جاتا ہے۔

چاہئے خیر کے ایوان کی تعمیر اگر کام اس کام میں دیتا ہے سراپا تیرا ”سراپا“ ایوانِ خیر کی تعمیر میں کس طرح کام آئے گا؟ یہاں ”اسوہ“ کی ضرورت تھی۔

”کام اس کام میں آتا ہے بس اسوہ تیرا“ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۶۴۶-۶۴۵)

(۴۰) اے وفورِ شوق! اے جذبِ رواں آہستہ بول

”جذبِ رواں“ کا مطلب بھی میری سمجھ میں نہیں آیا؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۶۴۶)

(۴۱) مسرورِ بدایونی کا یہ شعر:

رہتی ہے درودوں کی حسیں آس مرے پاس آئے نہیں اس واسطے وسواس مرے پاس

شعر میں ”درودوں کی حسیں آس“ کا مطلب میری تو سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی آس ہے؟ علاوہ ازیں رہتی کی مناسبت سے ”آئے“ کی بجائے ”آتے“ کا محل ہے اور درود کی جمع ”درودوں“ کس قاعدے سے بنائی گئی ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷، ۵۰۳-۵۰۲)

(۴۲) ”مجید امجد کی ایک نایاب نعت“ ڈاکٹر محمد افتخار شفیق صاحب کی امجد سے عقیدت کا اظہار ہے ورنہ نعت میں کئی جگہ جھول ہے، مثلاً مجید امجد کا یہ شعر:

ہے جبرئیل موحثائے رسول آج ہے عاشقِ رسول، فدائے رسول آج

ثانی مصرعے میں ”آج“ حشو ہے!! آج سے عموماً ”دن“ مراد لیا جاتا ہے جبکہ یہاں بات ”رات“ کی ”ہو رہی ہے“ وہ بھی واضح نہیں کہ یہ رات کونسی ہے؟! علاوہ ازیں ”عاشقِ رسول اور فدائے

رسول“ کون ہے؟ اللہ تعالیٰ یا جبرئیل!!؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷، ۵۰۳)

(۴۳) محمد مصطفیٰ نے کس قدر اعجاز فرمایا شتر بانوں کو شاہوں کی طرح ممتاز فرمایا

”اعجاز فرمایا“ یہ کونسی زبان ہے؟ (سلیم شہزاد، ص ۱۶، ۵۱۶)

(۴۴) ایک ذرہ سے آسمانوں تک نقش ہے جا بجا محمد کا

ایک ذرہ!! کونسا؟ ذرے ذرے سے آسمانوں تک ہونا چاہیے تھا۔ نیز ”نقش ہے“ کی بجائے ”نقش میں“ چاہئے۔ طلعتِ سلیم کا مصرع ہے:

”ہوائیں جس کی بوجھل آپ کی خوشبو سے رہتی ہیں“ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷، ۵۰۹)

(۴۵) یہ جواہرات یہ سیم و زر، نہ اٹھے گی ان کی طرف نظر

میں ہوں بادشاہ نصیب کا مرے پاس عشقِ رسول ہے

”میرے پاس عشقِ رسول ہے“ کیا عشقِ رسول کوئی مادی شے ہے جسے اپنے پاس رکھا

جاسکے؟ ”مرے پاس“ کی بجائے ”مرے دل میں“ کہتے تو بہتر ہوتا۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۲)

(۴۶) شاہ محمد سبطین کے یہ مصرعے بھی محلِ نظر ہیں:

(۱) کر کے وضو جو میں نے پڑھا اسوہ نبی

(۲) اے دوست پڑھ کے دیکھ ذرا اسوہ نبی

(۳) جس شخص نے ادب سے پڑھا اسوہ نبی

اسوہ نبی کون سی کتاب ہے؟ یہ قرآن سے کنایہ ہے تو عرض ہے کہ قرآن کو ”قرآن حکیم“، ”فرقان

مجید“، ”ام الکتاب“ تو کہا جاتا ہے۔ لیکن اسے ”اسوہ نبی“ آج تک کسی نے نہیں کہا۔ قرآن شریعت

الہی اور قانونِ حیات ہے اور اسوہ نبی اسی شریعت اور قانون کی کامل پیروی کا نام ہے۔ شاید شاہ

صاحب نے حضرت عائشہ صدیقہ کی مشہور روایت ”کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا“ کی بنا پر قرآن کو

اسوہ نبی کہہ دیا ہے جو مناسب نہیں ہے کیوں کہ خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور پیش تر اولیائے

امت کی زندگیاں بھی قرآن و سنت کی پیروی کا بہترین نمونہ ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۷)

(۴۷) نخل ہو قوم عمل پر تو مہربان ہو رب ہر آنکھ فرطِ ندامت سے خوں میں تر ہو جائے

عمل نیک بھی ہوتا ہے اور بد بھی!! اس لیے یہاں عمل کی تخصیص ضروری معلوم ہوتی

ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۷)

(۲۸) کس نے زخموں پر شبنم سے ہاتھ رکھے کوئی ہمارے بیچ آیا تھا، دیکھا تھا شعریوں ہونا تھا،

کس نے زخموں پر شبنم سا ہاتھ رکھا کوئی ہمارے بیچ آیا تھا، دیکھا تھا عیادت کے لیے آنے والے زخموں پر دونوں ہاتھ نہیں رکھتے!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۱۰/۲۷) کب بامِ افق پر کچھ دھیرا ہے سورج تو حرا سے پھوٹتا ہے ”سورج کا پھوٹنا“ عجیب بات ہے لوگ جدت کے زعم میں زبان و حقائق سے روگردانی کرنے لگے ہیں۔ کل کوئی صاحب یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ”گنگا جمن، راوی چناب، ہمالیہ سے اُگتے ہیں۔ اسکے علاوہ یہاں ردیف ”ہے“ کی بجائے ”تھا“ کا محل ہے ویسے سورج تو آج بھی افق ہی سے طلوع ہوتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۰۶/۲۷)

(۲۹) شوق دیدار میں ہوتی ہیں جو سطریں تخلیق سننے والا انہیں اعجاز بیاں جانتا ہے سطریں سنی نہیں پڑھی جاتی ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۱۱/۲۷)

(۵۰) نخل صحرا کی طرح خشک ہوں، وہ ابرکرم مجھ پہ برسے تو مجھے برگ و ثمر جائے کیا صحرا میں ”نخل خشک“ اگتے ہیں؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۳۱/۲۶)

(۵۱) آیا ہوں ذوق و شوق سے کہنے سلام دلربا جرأت کہاں سے لاؤں میں یا صاحب خیر الوری یہ سلام دل ربا کیا ہوتا ہے؟ سلام کہنے میں جرأت کا سوال کہاں اٹھتا ہے؟ (ڈاکٹر

اشفاق انجم، ص ۱۲۰)

(۵۲) مرزا صاحب کے پیش کردہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کون سوچ پہن کر گیا ہے سوئے فلک کہ جس کا چاند پہ نقش قدم سا لگتا ہے یہ ”سوچ“ کیسا اور کس قسم کا لباس ہے میرے تو پلے نہیں پڑا؟ نیز سوچ پہن کر جانے سے ”چاند پر نقش قدم سا لگنے“ میں کیا علاقہ ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۲۹/۲۶)

(۵۳) خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والا ہے تو

سن اسے شیشوں کے مسیحا! دل شکستہ میں بھی ہوں صہبا اختر

اساتذہ فن و سخن نے حرفِ ندا اے کی تخفیف یعنی اس سے حرف یا کا گرا نا غلط اور بحر

بیان بتایا ہے۔ (طلحہ رضوی برق، ص ۵۶۴)

(۵۴) شوق دیدار میں ہوتی ہیں جو سطریں تخلیق سننے والا انہیں اعجاز بیاں جانتا ہے سطریں سنی نہیں پڑھی جاتی ہیں۔

میں بھی ہوتا کہ انہیں دیکھتا رہتا ہر دم عکس جلوہ مری بینائی میں اترا ہوتا نور کا عکس نہیں ہوتا!! عکس کو ”ان کا“ کر دیں تو! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۱۱/۲۷-۵۱۰)

(۵۵) بالآخر ڈھونڈ لیں گے ثور نور خدا صفت بالآخر نور احمد گرد اس محور کے دیکھیں گے صفت صاحب نے ”نور خدا“ اور ”نور احمد“ کو اس طرح ایک دوسرے کے گرد گھمادیا ہے کہ میری عقل چکر اُگئی کہ اس پر کیا اور کس طرح لکھا جائے؟ مجھے کبھی شیط صاحب کے انتخاب پر حیرت ہو رہی ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۶)

یہ احسان شعیب ہے مجھ پر کالی کملی والے کا یہ سوغات مدینے سے مجھ کو بھجوائی جاتی ہے (ایضاً) کوئی سوغات؟ اس قسم کے دعوے کا شاعر کے پاس کوئی جواز بھی ہے؟

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۵۱۱-۵۱۲/۲۷) جس نے آپ کو دیکھا اس نے دیکھنا پایا پر تو الہی کا اصل پر تو پایا صفحہ ۴۹۴ پر شاہ حسین نہری کی نعت کے مطلع کا مصرع اولیٰ ”جس نے آپ کو دیکھا اس نے دیکھنا پایا“ ابلاغ سے محروم ہے۔ (غالب عرفان، ص ۷۰۳)

(۵۷) حضور میں بھی تو سوکھے شجر کی صورت ہوں مجھے بھی خوف ہے لوگوں سے پائمالی کا ”شجر کاٹا جاتا ہے“ پائمال نہیں کیا جاتا، گھاس پھوس پودے وغیرہ پائمال کئے جاتے ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۶۲۸/۲۶)

(۵۸) ازاں ہوئی ہے جب ہمیں نبی قریب جاں ملے

تصور اپنے ذہن میں کہاں ہے ان سے دور کا

”تعب ہے یہ کیسا عشق نبی ہے جو صرف اذان کے وقت ہی جاگتا ہے؟“ ”دور“ کی

بجائے ”دوری“ کا نخل ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۰)

(۵) فکری تناظر: (شعرِ نعت کے معائب)

۱۔ غیر ادبی رویے، مقام رسالت کا بیان اور تخلیقی اظہار کی ناکامی:

(۱) جو دنیا میں تراکھا کرتے شکوے کریں یا رب تعجب ہے کہ ان پر بھی رہے لطف و کرم تیرا لفظ ”تعجب“ نے شاعر کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کسی فعل پر تعجب کا اظہار کرنا اس کی قدرت کاملہ پر شک کرنے کے مترادف ہے۔ شعر میں اللہ کی شان ربوبیت پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ اس کا کھا کر بھی اس کا شکوہ کرنے والوں پر لطف و کرم فرماتا ہے۔ شاعر نے یہ نہیں سوچا کہ وہ کفار و مشرکین تک کو رزق دیتا ہے!!

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۲۷)

(۲) ناصر کاظمی کے اس شعر پر نظر ٹھہر گئی:

صبح ازل کو جس نے دیا حسنِ لازوال وہ موجِ نور زینتِ دیوار و در ہے آج شاعر نے ”اول ما خلق اللہ نوری“ والی حدیث سے تسبیحِ رشتہ قائم کیا ہے۔ لیکن یہ مصرع اس طرح درست اور رواقار پائے گا؟ کیا حضور ﷺ نے صبحِ ازل کو حسنِ لازوال عطا فرمایا؟ صبحِ ازل کو حسنِ لازوال تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور ﷺ کی تخلیق فرما کر عطا کیا۔ لہذا یہ کہا جائے تو بات بہتر ہو جائے: صبحِ ازل کو جس سے ملا حسنِ لازوال

(ملک الظفر سہسرامی، ص ۸۲۷-۸۲۸)

(۳) انھوں نے شمشیرِ ضیاء کی کسی نظم میں عشقِ نبی ﷺ کے دعوے داروں سے کیا آپ نے؟ کا جو سوال کیا ہے وہ سوال ملک کے سیاست دانوں سے کیوں نہیں؟ انھیں کا یہ شعر ہے:

ذلت و خواری کا باعث مجملًا کہتا چلوں ترکِ قرآن اور شرعِ سیدِ الابرار ہے دوسرے مصرع میں قرآن اور شرع میں اگر واو عطف رہتا تو ترک کا انطباق دونوں پر ہوتا مگر ترکِ قرآن کے بعد اور لکھنے سے شرعِ سیدِ الابرار پر بھی (نعوذ باللہ) ذلت و خواری کے باعث کا اطلاع ہوتا ہے۔ ان نازک باتوں پر بھی نگاہ ضروری ہے۔ (طلحہ رضوی برق، ص ۵۶۶)

(۴) ہمہ عالم کی رعنائی، ہمہ عالم کی زیبائی

خدا نے نور کا صدقہ، خدا کے یار کا صدقہ

شعر میں ”خدا کے یار“ کا استعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے استعمال کرنا میری نگاہ

میں معیوب ہے کیوں کہ ”یار“، دوست، آشنا، معشوق اور یارِ باز، آوارہ، بدچلن کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ (لغات دیکھ لیجئے) اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ”حبیب“ کا استعمال ہی ہونا چاہئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے کوئی لفظ ایسا استعمال نہیں کرنا چاہیے جو آپ کی شان کے منافی ہو۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۹)

(۵) اذ اں ہوئی ہے جب ہمیں نبی قریب جاں ملے

تصور اپنے ذہن میں کہاں ہے ان سے دور کا

”تعجب ہے یہ کیسا عشقِ نبی ہے جو صرف اذان کے وقت ہی جاگتا ہے؟“ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۰)

(۶) مجھے مئے طہور شاکر آپ خود پلائیں گے

گواہ ہوگا رب دو جہاں مرے سرور کا

یہاں بھی رب دو جہاں کو گواہی میں گھسیٹ لائے ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۰)

(۷) مدحت احمد کہاں اور بے ہنر اسل کہاں

نعت خود سرکار نے اس طرح لکھوائی کہ بس

ارسل صاحب کیا واقعی یہ ”مدحت“ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے لکھوائی ہے؟ یا پھر ”جذبہ حبِ نبی“ نے؟؟ یہاں ردیف بھی نہیں سکی۔ ”لکھوائی کہ بس“ سے معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی لکھوائی ہے۔ ”کہ بس“ کہاں کہاں اور کن کن معنوں میں مستعمل ہے اس کا علم ہونا ضروری ہے۔

جسے دھتکار دے سارا زمانہ محبت اس سے شیوہ آپ کا ہے

بھکاریوں، مجرموں اور گناہ گاروں کو دھتکارا جاتا ہے ایسے لوگوں سے محبت آپ کا شیوہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۱)

(۸) اس لیے پڑھتے ہیں ہم سنی کھڑے ہو کر سلام

ہے یہی سرکارِ طیبہ سے محبت کی سند

سرکارِ طیبہ سے محبت کی سند خلوصِ قلب اور تمام آداب کی رعایت کے ساتھ درود و سلام پڑھنا ہے۔ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر پڑھنا محبت کی سند نہیں ہے۔

پیکرِ نورِ ازل، تکملہ علم و عمل نقشِ بتِ مثل و بدل، سارے جہاں میں یکتا میں سخت حیران ہوں سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے کہ ”پیکرِ نورِ ازل صلی اللہ علیہ وسلم“ کو

”نقشِ بت“ کس رعایت سے کہا گیا ہے!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۹)

(۹) امان خان دل کے اشعار:

آپ کا شہر بھی کیا غلد سے کم ہے ہم کو دشت طیبہ بھی بہ اندازِ ارم ہے ہم کو جس طرح طیبہ کے لیے یثرب کا استعمال غلط ہے اسی طرح میری نگاہ میں جنت کے لیے ”ارم“ کا استعمال بھی غلط ہے کیوں کہ ”جنتِ ارم“ نمرود نے بنائی تھی۔ (جس کی حیثیت وحشر اظہر من الشمس ہے) (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۰)

(۱۰) مرے ہر نفس میں ہے مصطفیٰ، مرے دل پہ ان کا نزول ہے

مری زندگی بھی رسول ہے مرے بندگی بھی رسول ہے

کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی جگہ، مقام پر نازل ہونا ثابت ہے؟ چاہے وہ دل میں کیوں نہ ہو!! ثانی مصرع میں ”مری زندگی بھی رسول ہے“ تو ٹھیک ہے لیکن ”مری بندگی بھی رسول ہے“ سے کیا مراد ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۲)

(۱۱) جانِ بہار، جانِ جہاں، جانِ انجمن جن کے ورودِ پاک سے عالم چمن چمن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسے القاب استعمال کرنا درست نہیں جو ”معشوقِ ارضی“ کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مصرعہ اولیٰ میں ”جان“ کی بجائے ”روح“ استعمال کرنے میں کیا قباحت تھی؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۳)

(۱۲) یہ اس معمارِ اعظم ہی کی سب تعمیر لگتے ہیں

جنہیں خیر البشر کے نام سے ہم یاد کرتے ہیں

”تعمیر لگتے ہیں“ شکلیہ صیغہ ہے شاید شاعر کو یقین نہیں ہے کہ یہ سب واقعی ”خیر البشر“

کی تعمیر ہیں؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۴)

(۱۳) شاہِ محمدِ بسطین کے یہ مصرعے بھی محلِ نظر ہیں:

(۱) کر کے وضو جو میں نے پڑھا اُسوہِ نبی

(۲) اے دوست پڑھ کے دیکھ ذرا اُسوہِ نبی

(۳) جس شخص نے ادب سے پڑھا اُسوہِ نبی

اُسوہِ نبی کون سی کتاب ہے؟ یہ قرآن سے کنایہ ہے تو عرض ہے کہ قرآن کو ”قرآنِ حکیم“، ”قرآنِ مجید“، ”ام الکتاب“ تو کہا جاتا ہے۔ لیکن اسے ”اُسوہِ نبی“ آج تک کسی نے نہیں کہا۔ قرآن شریعت

الہی اور قانونِ حیات ہے اور اُسوہِ نبی اسی شریعت اور قانون کی کامل پیروی کا نام ہے۔ شاید شاہ صاحب نے حضرت عائشہ صدیقہ کی مشہور روایت ”کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا“ کی بنا پر قرآن کو اُسوہِ نبی کہہ دیا ہے جو مناسب نہیں ہے کیوں کہ خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور پیش تر اولیائے امت کی زندگیاں بھی قرآن و سنت کی پیروی کا بہترین نمونہ ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۵)

(۱۴) وجاہت اس قدر جیسے کسی سردار سر کا ہو

لینق تاجدار و شان و شوکت ہے سرِ اقدس

اس شعر میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر اقدس کو ”کسی سردار کے سر سے تشبیہ دی گئی ہے“ جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیا اور انس و جاں کے سردار ہیں۔ ”لینق تاجدار“ کی ترکیب بھی بے محل ہے۔ ”لینق تاج“ چاہیے تھا۔

یہاں بالیدگی ہوتی رہی موئے مبارک کی

زمانے بھر میں کیتا کشتِ قدرت ہے سرِ اقدس

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر اقدس کو ”کشتِ قدرت“ کہنا کہاں تک مناسب ہے؟ کیا سر اقدس بالوں کی کھیتی ہے؟ بال تو ہر ایک سر پر قدرتِ اتاگتے اور بالیدگی پاتے ہیں۔ تو کیا یہ کشتِ قدرت کی بجائے کشتِ آدم ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطہر و اقدس کی بنا پر آپ کے گیسوؤں کو موئے مبارک کہا جاتا ہے۔ ہم جیسے انسانوں کے بال صرف بال کہے جاتے ہیں۔

نمازِ عصر واروں کا ادب ملحوظِ خاطر ہے

مری آغوش میں مائل بہ شفقت ہے سرِ اقدس

”تلمیح کے بیان کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے۔ تبسم صاحب نے ”میری آغوش میں“ کہہ کر حضرت علی کے واقعہ کو خود سے منسوب کر لیا ہے۔ حضرت علیؑ کے دل میں یہ خیال تک نہ تھا کہ وہ نمازِ عصر وادیں گے۔“ بلکہ نماز قضا ہو جانے کے خوف سے آپؑ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے جو رخسارِ اقدس پر ٹپکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔

عوام الناس کہتے ہیں احد میں ایک پتھر پر

زیارت کے لیے نقشِ محبت ہے سرِ اقدس

نعوذ باللہ! اس شعر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”اُحد میں ایک پتھر پر سرِ اقدس بطور نقشِ محبت زیارت کے لیے رکھا ہوا ہے۔“

جو سرسرداری کے شایان ہے ابراہیم بيجوری

وہ ذہنی تقویت کی بھی علامت ہے سراقس

یہ ابراہیم بيجوری کون صاحب ہیں؟ سرسرداری کے شایان کون ہے ”جوسر“ یا ”سراقس“؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۷-۱۴۶)

(۱۵) صفحہ ۳۸ پر جناب عرش صدیقی صاحب کے ایک شعر سے متعلق گزارش کروں گا۔

جس میں انھوں نے لفظ ”بد نصیب“ نظم کیا ہے۔ ”بد“ کا لفظ باندھنا مناسب نہیں نعت کے ادب کے خلاف ہے۔ عرش صاحب کا شعر:

کیا خوش نصیب تھے کہ ترے در پہ آگئے

کیا بد نصیب ہیں کہ چلے ہیں یہاں سے ہم

خوش نصیب کے ساتھ غم نصیب ہونا چاہیے تھا۔ یہ ادب بھی ہے اور حسن شاعری بھی

مرے خیال میں شعر اس طرح ہونا چاہیے تھا:

کیا خوش نصیب تھے کہ ترے در پہ آگئے

کیا غم نصیب ہیں کہ چلے ہیں یہاں سے ہم

(پروفیسر سبطین شاہ جہانی، ص ۲۰۵)

(۱۶) ”نعت رنگ“ کے انیسویں شمارے پر جو بہت طویل مذاکرہ آپ نے شائع کیا ہے اس

میں بھی بعض باتیں اختلاف کے دروازے کھولتی ہیں اور بات کو صاف ہونے سے روکتی ہیں۔

عزیز احسن صاحب کے شعر:

زکات سیرت اطہر کی چاہتا ہے عزیز گدائے خلق ہے آقا، یہ زرنہیں رکھتا

میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرض کیا جا رہا ہے کہ

ان کے اوپر زکات فرض ہے اور انھیں چاہیے کہ اپنی سیرت پاک کو زکات میں دے دیں۔ ظاہر

ہے کہ یہ دونوں باتیں نہ صرف مہمل ہیں بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف جاتی ہیں۔

دوسری بات یہ کہ شعر دلچست ہے، کیوں کہ دوسرے مصرع کو پہلے مصرع کا لازمی نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ اگر

کوئی شخص گدا ہے تو وہ حضور پاک ﷺ سے ان کی سیرت کی زکات کیوں مانگے؟ علاوہ ازیں، سیرت

پاک سے کچھ زکات مانگنا اور شے ہے اور پوری سیرت پاک ہی کو زکات میں مانگ لینا اور چیز۔

”گدائے خلق“ کی ترکیب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ (شمس الرحمن فاروقی، ص ۵۱۲)

(۱۷) اسی طرح عزت بخاری سے منسوب شعر:

ادب گاہست زیر آسمان از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید این جا

کا مفہوم شرکائے مذاکرہ کے ذہن میں واضح نہیں ہوا۔ ”نفس گم کردن“ کے معنی ہیں، سانس روک لینا،

خاموش رہنا اور شعر کا مطلب یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے ایک ایسی جگہ ہے جس کی پاکیزگی اور

تقدس عرش سے بھی زیادہ نازک ہے (یعنی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار مبارک)۔ لہذا اس

خوف سے کہہیں اس کی نزاکت کو انھیں نہ پہنچے، جنید اور بایزید جیسے سرگشتہ اور مغلوب الحال اور بلند

مرتبہ خدا شناس شخص بھی جب پیغمبر کے روئے پر پہنچتے ہیں تو دم سادہ لیتے ہیں۔ یعنی پیغمبر صلی اللہ

علیہ وسلم کے سامنے حفظ مراتب کا پورا پورا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اتنے صاف اور خوبصورت شعر کے

معنی لوگوں نے خدا جانے کیا کیا نکالے ہیں۔ (شمس الرحمن فاروقی، ص ۵۱۲-۵۱۳)

(۱۸) ص ۴۳۵ کا آخری مصرع:

اک بحر بے کنار کی صورت اچھل کے آ

محل نظر اور خلاف احتیاط ہے، کیا رحمت تمام کو ایسے مخاطب کیا جاسکتا ہے؟

ص ۲۲ پر حمد باری تعالیٰ ہے، جس کے شعر نمبر ۳ کا دوسرا مصرع صحیح کچھ یوں نہیں ہوا،

درست یوں ہے: ع اور اس کو بناتا ہے وہی نخل ثمر بار (محمد شہزاد مجددی، ص ۵۳۲)

(۱۹) ص ۳۷۲ پر آفتاب کریمی کا شعر ہے:

میں نبی کا ادنیٰ غلام ہوں مری آل ابن غلام ہے

مری آل کی بھی جو آل ہے وہ غلام ہو یہ پیام ہے

”آل ابن غلام“ کچھ زیادہ درست نہیں لگتا بلکہ آل، آل غلام ہے، زیادہ مناسب ہے۔

ایسے ہی ”آل کی آل“ بھی سمجھ سے باہر ہے۔ ص ۴۵۳ پر ایک فقرہ ہے، ”کوئی زینہ اولاد نہیں ہے آپ

کی۔“ بات سمجھ نہیں آئی، زینہ اولاد نہ ہونا اور زینہ اولاد کا بلوغت سے پہلے ہی دنیا سے چلے جانا کیا اس

میں کچھ فرق ہے؟ اور یقیناً ہے تو پھر یہ کیسے سمجھ لیا گیا ہے؟ (محمد شہزاد مجددی، ص ۵۳۲-۵۳۳)

(۲۰) انھوں نے شمشیر ضیاء کی کسی نظم میں عشق نبی ﷺ کے دعوے داروں سے ”کیا آپ

نے؟“ کا جو سوال کیا ہے وہ سوال ملک کے سیاست دانوں سے کیوں نہیں؟ انھیں کا یہ شعر ہے:

ذلت و خواری کا باعث مجملًا کہتا چلوں

ترک قرآن اور شرع سید الابرار ہے

دوسرے مصرع میں قرآن اور شرع میں اگر واو عطف رہتا تو ترک کا انطباق دونوں پر ہوتا مگر ترک قرآن کے بعد اور لکھنے سے شرع سیدالابراہر پر بھی (نعوذ باللہ) ذلت و خواری کے باعث کا اطلاع ہوتا ہے۔ ان نازک باتوں پر بھی نگاہ ضروری ہے۔ (طلحہ رضوی رقص، ص ۵۶۶) (۲۱)

خدا سے جوئی ہے آپ نے سچ بتائی ہے

سچ بتائی ہے میں سوے ادب ہے۔ یوں کر سکتے تھے وہ سب بتائی ہے۔

(طلحہ رضوی برق ص ۵۶۶)

(۲۲) ہم بھی آپ کی امت ہیں، ہم بھی آپ سے بیعت ہیں

اس خوش اقبالی پر اتنا کم ہے جتنا ناز کریں

امت ہیں؟ یا امت میں ہیں یا امتی ہیں؟ پاکستان میں تو تصوف کی روایت بڑی مضبوط ہے۔ شاعر کو کسی سالک یا پیر طریقت سے معلوم کر لینا چاہئے تھا کہ ”بیعت“ کس سے اور کس طرح کی جاتی ہے! میرے علم کے مطابق بیعت صرف باحیات مرشدین سے ہی کی جاسکتی ہے۔

نعت محبوب خدا لب پہ مرے آئی ہے میں نے لکھی نہیں سرکار نے لکھوائی ہے کیا یہ واقعہ ہے؟ اول تو لب پہ آنے کو لکھنا نہیں کہتے، دوم کیا سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہ نفس نفیس تشریف لا کر شاعر صاحب سے نعت لکھنے کی درخواست کی تھی؟

(ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۶۳۰-۶۲۹)

(۲۳) ثنا خواں سب زمانہ ہے ثنا خواں محمد کا بشر تو کیا خدا خواہاں ہے خواہاں محمد کا اب تک تو شعر ”خدا“ کو حضور کے دیدار کا خواہاں و آرزو مند بتاتے تھے، یہاں شاعر دو قدم آگے بڑھ گیا ہے یعنی اب خدا ”خواہاں محمد“ کا بھی خواہاں و طلب گار ہو گیا ہے!!

مختار دو عالم کے ہو تم ظل اللہ پس خوبیاں ہم سے ہوں بھلا کیا محسوب ”مختار دو عالم“ یعنی اللہ تعالیٰ کے تم ظل اللہ ہو کیا مطلب؟ کیا مختار دو عالم اور اللہ دو الگ الگ وجود ہیں؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۶۳۶-۶۲۶)

(۲۴) مجھ ساعاصی بھی آغوش رحمت میں ہے یہ بھی بندہ نوازی کی حد ہو گئی ”بھی“ کی بجائے ”تو“ چاہئے۔ اس کے علاوہ شاعر کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کی قدرت و رحمت کی کوئی حد ہی نہیں ہے آپ نے ”حد ہو گئی“ کہہ کر اس کی رحمت و بندہ نوازی کو

محدود کر دیا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۶۳۷-۶۲۶)

آؤ اللہ کے دل دار کی کچھ بات کریں ہاں اسی حسن طرح دار کی کچھ بات کریں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا دلدار کہنا قطعی نامناسب ہے اور آپ کے حسن کو ”حسن طرحدار“ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ یہ غزل یا پھر عورتوں کے حسن کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ آپ اللہ کے حبیب ہیں دلدار نہیں!! (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۶۳۷-۶۲۶)

(۲۵) ہوں گے ضرور حاضر دربار ہم شعور ہر امتی کا حق ہے زیارت حضور کی ہر امتی کا ”حق“ نہیں ”خواہش، آرزو، تمنا“ ہے اور اگر حق ہے تو بے چارے جو بغیر زیارت دنیا سے رخصت ہو گئے وہ اپنی اس محرومی کا کس پر دعویٰ کریں گے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۶۳۹-۶۲۶)

(۲۶) رہتا ہے انتظار میں مشغول رات دن بے روزگار آپ کا بیکار آپ کا یہ تو خلاف واقعہ، غلو یا کذب بیانی ہے شاعر کے لیے رات دن کی ایسی مشغولی تو ممکن ہی نہیں ہے۔ ”بیکار آپ کا“ میں تعقید معنوی بھی ہے بلکہ اس میں ایک طرح ذم کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۶۳۹-۶۲۶)

(۲۷) فن کر کے جب مرے احباب آقا چل دیے

آکے جلوؤں سے لحد کو جگمگایا شکریہ

پیاس ابھی بڑھنے بھی پائی تھی نہ میری حشر میں

جام کوثر تم نے خود آکر پلایا شکریہ

”جام کوثر“ پلار ہے ہیں؟ یو تو روزِ محشر کا معاملہ ہے!! خود ڈاکٹر عزیز احسن لکھتے ہیں: ”حشر و نشر کے تخیلاتی بیان کو واقعاتی سطح پر بیان کرنے سے گریز لازم ہے۔ ورنہ شاعر خواہ مخواہ دروغ گو قرار پائے گا۔“ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۶۴۳-۶۲۶)

(۲۸) نعت لکھنے کو جو کاغذ پہ لکھا بسم اللہ آئی جبریل کی فوراً ہی صدا بسم اللہ اگر واقعی جبریل علیہ السلام نے بسم اللہ کہا تو مبارک ہو۔۔۔! ورنہ یہ دروغ گوئی ہے، یہی حال اس شعر کا بھی ہے:

میں نے اک نعت سنانے کی اجازت چاہی اور نکیرین نے خوش ہو کے کہا بسم اللہ دلچسپ شعر ہے، شاعر نے قبر میں مشاعرہ برپا کر دیا اور نکیرین سوال و جواب بھول کر دادِ سخن دینے لگے!! (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۶۴۹-۶۲۶)

(۲۹) اسی کو شان بڑھانی تھی آسمانوں پر تو اس نے آمد سرکار سے رجوع کیا آفتاب صاحب کو لاکھوں بار استغفار کرنا چاہئے، شعر کا مطلب تو یہ نکلتا ہے، ”اللہ کو آسمانوں پر خود اپنی شان بڑھانی تھی، اس لئے اس نے آمد سرکار سے رجوع کیا!“ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی شان بڑھانے کے لئے سرکار کا محتاج ہے! نعوذ باللہ!!
(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۶۴۹)

(۳۰) گو ہر ملیانی صاحب کا مضمون ”اردو نعت میں انوارِ قرآن“ اچھا مضمون ہے لیکن انھوں نے بعض سقیم اشعار بھی جمع کر دیے ہیں جو طبع پر گراں گزرتے ہیں، مثلاً سردار عبدالرب نشترا کا شعر:
شب و روز مشغول صلی علی ہوں میں وہ چاکرِ خاتم الانبیاء ہوں
اس شعر میں ”چاکر“ یعنی نوکر محل نظر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شب و روز درود بھیجنا چاکری یا نوکری ہرگز نہیں ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷، ۵۰۲)

(۳۱) درج ذیل (اشعار کے) مصرع بھی محل نظر ہیں:

اور ہے خدا فدائے لقائے رسول آج ہے آستانِ قدس پہ پائے رسول آج
کیا خدا تعالیٰ عاشقانہ جذبات رکھتا ہے جو وہ رسول کے حسن پر فدا ہو جائے اور آستانِ قدس پر پائے رسول سے کیا مراد ہے؟ کرسی الہی پر پائے رسول؟؟ یہاں ”آستان“ کی بجائے ”آسمان“ کہا جاتا تو اس بے حرمتی سے شاعر محفوظ ہو جاتا۔

حسنِ ازل کے چہرے سے پردے سرک گئے حسنِ ازل ہے مسرتِ اداۓ رسول آج
حسنِ ازل کے چہرے سے پردے سرکیں گے تو رسول مست ہو گئے یا حسنِ ازل؟ اور اگر پہلے مصرعے میں ”حسنِ ازل“ سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو یہ مفتیانِ شرع متین کے لیے مسئلہ پیدا کر سکتا ہے۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ ”حسنِ ازل“ کے چہرے پر ایسے کون سے دیز پردے پڑے ہوئے تھے کہ اللہ اسکے پار دیکھ نہیں سکتا تھا؟؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷، ۵۰۳-۵۰۴)

(۳۲) اختر ہوشیار پوری کا یہ شعر بھی محل نظر ہے:

زمانہ تو یہاں سے ہے وہاں تک محمد ہیں مکان و لامکان تک
”زمانہ“ تو خود ”اللہ“ ہے (والعصر) جو ساری کائنات کو محیط ہے تو پھر یہ ”مکان و لامکان“ اور ”یہاں سے وہاں تک“ کیا ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷، ۵۰۶)

(۳۳) وہ لمحہ جو کہ تری یاد سے تہی گزرے میں اپنے آپ پر اس کو حرام کرتا ہوں

شاعر کی زندگی میں یقیناً ایسے لاکھوں لمحات گزرے ہوں گے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد سے تہی ہو گئے یعنی شاعر کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ ”حرام“ ہو گیا!! ایسے بے تکدعوے نیکی و ثواب کی بجائے عذاب کا باعث بن جاتے ہیں۔ (ع۔م۔مسلم، ص ۵۱۲)

(۳۴) بھینی بھینی خوشبو سے گھر مہکا ہے شب کو خواب میں آنے والے کیسے ہونگے
اول تو کسی قرینے سے یہ نعت کا شعر لگتا نہیں دوسرے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے خواب میں آتے ہیں تو اپنے مکمل وجود اور واضح خدوخال کیساتھ تشریف لاتے ہیں اس صورت میں ”آنے والے کیسے ہونگے“ بے معنی سوال ہے۔ (افتخار عارف، ص ۵۱۴)

(۳۵) سبیل اور صراط ہے اور روشنی ہے اک عبد مولا صفات ہے اور روشنی ہے
شعر میں ”سبیل“ سے کیا مراد ہے کچھ بتائیں چلتا اور نہ ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نعت کا شعر ہے یا منقبت کا!! تیسرے یہ کہ کوئی عبد کسی حال میں ”مولا صفات“ نہیں ہو سکتا۔ ”خالق“ اللہ تعالیٰ کی وہ صفت ہے جو کسی بندے میں نہیں ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷، ۵۰۸)

(۳۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے کوئی ایسا لفظ نہیں استعمال کرنا چاہیے جس کے منفی معنی بھی نکلتے ہوں۔ ”بوجھل“ بادلوں اور ہواؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے، سوٹھیک لیکن بوجھل کے معنی ہیں کثیف، تکرر، گرانی، وزنی، بھاری، ظاہر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو نہ کثیف کہی جاسکتی ہے اور نہ ہی گراں!! مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا:

ع فضا جس کی معطر آپ کی خوشبو سے رہتی ہے

(۳۷) ٹھنڈا کر ڈالا صدیوں کی آتش کو بادل سے کوندا اترتا تھا، دیکھا تھا
”کوندا اترنا“ غلط زبان ہے ”کوندا لپکتا ہے“ اور یہ بجلی کی ایک باریک سی لکیر ہوتی ہے جو جس شے پر پڑتی ہے جلا ڈالتی ہے اور اگر ”کوندا“ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں تو شاعر کو ہزاروں استغفار کرنا چاہیے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷، ۵۱۰)

(۳۸) ص ۷ پر محترم جناب حفیظ تائب کی کہی ہوئی حمد باری تعالیٰ ہے اس کا آخری مصرع ہے:
”دل میں ہے ترا قیام یا عزیز یا سلام“

مجھے لفظ ”قیام“ اللہ کریم جل شانہ کے بارے میں محل نظر لگا۔ ص ۸ پر جناب امین راحت چغتائی کی کہی ہوئی حمد باری تعالیٰ ہے، یہ شعر ملاحظہ ہو:
”نفس والوں کو بھی یارب عطا ہو شرف انسانی کہ بے توقیر و بے ایقان ہوئی ہے قوت ایمان“

قوت کی اضافت، ایمان کے ساتھ ہے۔ ”قوتِ ایمانی“ کیا واقعی بے توقیر و بے ایتاق ہو سکتی ہے؟ (کوکب نورانی ص ۲۵۱/۳)

(۳۹) ص ۳۶۶ کے آخر میں ”فیاض ٹانڈوی کی نعتیہ شاعری“ سے ماخوذ حمدیہ اشعار میں دوسرے شعر کا مصرع نمبر ۲ یوں ہے: شام کی یہ ملگجی میلی ردا تیری عطا کیا یہی انداز حمد ہے؟ سبحان اللہ عما یصفون۔ (محمد شہزاد مجددی ص ۵۳۳)

(۴۰) لوسانس بھی آہستہ کہ ٹوٹے نہ مرا خواب سرکار دو عالم مرے پاس آنے لگے ہیں کسی اور کے سانس لینے سے شاعر کا خواب کیسے ٹوٹے گا؟ یہاں بھی ردیف کا وہی حال ہے یعنی ”آنے لگے ہیں“ بجائے ”آ رہے ہیں“ کی ضرورت ہے۔ صفوت صاحب کس اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کی آنکھوں میں دربار محمد لگتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بیٹھے نظر آتے ہیں اور آپ ان کے پاس وقت بے وقت آنے بھی لگے ہیں! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے حقیقت سے بعید یا منافی شعر کہنا بھی باعث عذاب ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۱۲۵)

(۴۱) بعض شعرا نئی نئی ردیفوں اور قوافی میں شعر کہنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اکثر ناکام رہتے ہیں۔ ضمیر کاظمی (بھارت) کی نعت کا بھی یہی حال ہے۔ مطلع تو بڑا عجیب و غریب ہے۔ وہ ایک امی لقب، کردگار کا لہجہ تلاوتوں میں اسی لالہ زار کا لہجہ اس شعر کا مطلب خود شاعر یا کوئی صاحب بتا سکیں تو ممنون ہوں گا۔

تلاش نقش کف پائے مصطفیٰ کی قسم

میں جب تلک رہا طیبہ میں سر خمیدہ رہا

مولانا (قمر سلطان پوری) کو شاید یاد نہیں رہا کہ غیر اللہ کی قسم کھانا منع ہے۔ بعض علما نے تو اسے شرک میں شمار کیا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۱۲۸)

(۴۲) صفحہ نمبر ۳۷۸ پر سید ریاض حسین زیدی صاحب کا کلام ہے۔ اس میں دوسرا شعر ہے: نگاہ دل سے دیکھو راہ ان کی قسم ہے یہ خدا کی رہ گزر ہے یہاں ”خدا کی رہ گزر“ والی بات سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس نعت کے چوتھے شعر کا دوسرا مصرع ہے، ”مری کعبوں کے کعبہ پر نظر ہے“ یہاں کعبہ کی جمع کا استعمال میرے خیال میں شعری طور پر نامناسب ہے۔ (حافظ عبدالغفار حافظ ص ۶۵۳)

(۴۳) وہ محمد ہیں احمد بھی محمود بھی، حسنِ مطلق کا شاہد بھی مشہود بھی

علم و حکمت میں وہ غیر محدود بھی ظاہراً اُمیوں میں اٹھایا گیا

(کرم حیدری کے) ثانی مصرعے میں ”اُمیوں میں اٹھایا گیا“ عجیب ٹکرا ہے۔ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اُمی نہیں تھے بلکہ اہل عرب اُمی تھے!! (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۵۰۲/۲۷)

(۴۴) ڈاکٹر عزیز احسن صاحب سے معافی چاہتا ہوں لیکن ان کا یہ لکھنا کہ جناب گوہر ملیانی ”صاحب اسلوب“ شاعر ہیں میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ مجھے وہ صاحب اسلوب نظر نہیں آتے ذرا ان کا یہ شعر دیکھیں:

حسن دلکش کا بیاں ہے اور اک صحرائیں اُم معبد کی زباں پر ہیں شائل آپ کے

کیا اس شعر میں انداز بیاں کچھ ایسا ہے جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ شاعر صاحب اسلوب ہے؟ ویسے میرے خیال میں صاحب اسلوب ہونا کوئی ایسی محسن صفت بھی نہیں کہ اس پر بہت خوش ہو جائے۔ عموماً صاحب اسلوب شاعر کے ہاں بیان کی یکسانی اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ اُس کا ایک شعر پڑھیں یا دس لگتا یہی ہے کہ ایک ہی چیز پڑھی ہے۔ یقین نہ آئے تو ایک واقعی صاحب اسلوب شاعر سراج الدین ظفر کا شعری مجموعہ غزال وغیرہ پڑھ لیجیے۔ ایک لطف کی بات اور ہے کہ اُم معبد نے حضور کا جو سراپا بتایا اُس میں اس کی ذہنی سطح بھی نظر آتی ہے کیونکہ وہ کوئی بہت پڑھی لکھی خاتون نہ تھی۔ اس کے بیان سے چند سطر میں ملاحظہ ہوں:

”نہ تو ندنگی ہوئی نہ چندیا کے بال گرے ہوئے.....“

ذرا دیکھیے کیا یہ بیان سراپے جانے کے لائق ہے۔ ہمارے گوہر ملیانی صاحب نے اسے بہ طور خاص کوٹ کیا ہے۔ اس جگہ میں واضح طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں تحریروں اور تخلیقات پر بات کرتا ہوں۔ لکھنے والوں کی شخصیت میرا ہدف نہیں ہوتی۔ گوہر ملیانی صاحب میرے لیے معزز اور محترم ہیں البتہ میں تمام اچھے لکھنے والوں سے زیادہ کڑے معیار کا تقاضا ضرور کرتا ہوں انھیں برا نہیں ماننا چاہیے۔ اس باب میں شعرا کی تازہ نعتیں ہیں۔ یہ حصہ برا نہیں ہے۔ خورشید رضوی صاحب سلیمان خمار اور رئیس احمد نعمانی کے چند اشعار متاثر کرتے ہیں۔

(احمد صغیر صدیقی ص ۲۵، ۸۹۷-۸۹۶)

(۴۵) ہم احتیاط سے رکھتے ہیں اس زمیں پہ قدم زمین نعت ہماری کلام ان کا ہے

سید صاحب! ”زمین نعت پہ میں تو کبھی نہ پاؤں رکھوں!!“ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۲۶، ۶۳۸)

۲۔ فکری و تاریخی تسامحات، خلاف واقعہ بیان:

(فکری و تاریخی تسامحات: تخلیق کار کے ایسے بیانات جو فکری، تاریخی یا مذہبی روایات کے حوالے سے درست نہ ہوں۔)

خلاف واقعہ بیان: ایسا خیال یا بیان جو حقیقت سے تعلق نہ رکھتا ہو۔

(۱) عزیز احسن صاحب نے صبا اکبر آبادی کے یہ اشعار مثال میں دیے ہیں:

جس کو چاہا اسے قدموں میں ترے ڈال رہا

خود مشیت بھی سمجھتی تھی ارادہ تیرا

میں انتہائی ادب سے کہنا چاہتا ہوں کہ نبی کا اپنا کوئی ذاتی ارادہ نہیں ہوتا اس کا ہر ارادہ ہر خواہش، زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ مشیت کی طرف سے وحی والقا ہوتا ہے۔

(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۸)

(۲) نہیں ہے کچھ تو ایک کھجور دیجے روزہ دار کو

مرے نبی کے پاس کیا ہے مرتبہ کھجور کا

جب ”کچھ نہیں“ تو پھر کھجور کہاں سے آئے گی؟ ”کچھ نہیں تو اک“ کہنا تھا، اسکے علاوہ

شا کر صاحب نے حدیث کا مفہوم ہی الٹ دیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ”کھجور کا نہیں روزہ دار کا مرتبہ ہے اور وہ بھی ثواب کی خاطر“ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۰)

(۳) راجا صاحب کا یہ شعر ان کے جذب دروں اور باطنی کیفیت کا غماز ہے اور خوب ہے اسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ پڑھیے اور محسوس کیجیے۔

میں چند دن جو آقا کے شہر میں رہوں ہوں

کچھ ماہ تک تو مجھ پر اس کا اثر رہے ہے

ماشاء اللہ۔ راجا صاحب کا یہ شعر بھی بہت اچھا ہے:

محمود شکوہ رب سے تو کرتے رہے ہیں سب

لیکن کسی کو اس کے نبی سے گلہ نہیں

اس شعر پر ڈاکٹر گوہر کا اعتراض درست نہیں۔ راجا صاحب نے جو وضاحت کی اس

میں یہ بات بھی شامل کر لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں قہاری و جباری بھی ہے جب کہ

سرکارِ دو عالم ۷ تمام عالم کے لیے سراپا رحمت ہیں اور ظاہر ہے کہ جو ذاتِ گرامی رحمت ہی رحمت ہے اس سے کسی کو گلہ ہو ہی نہیں سکتا خود آقائے نام دار کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک لمحہ اس بات کا گواہ ہے، کیا واقعہ طائف اس کا ثبوت نہیں؟ (قمر عینی، ص ۷۰)

(۴) اس میں شامل ہے رضا و کرم عزوجل ہر عبادت سے درود آپ کا اعلیٰ افضل نعوذ باللہ! ”نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ“ سب بیکار!! صرف درود پڑھو اور سیدھے جنت میں چلے جاؤ!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۶)

(۵) کفش بردار نبی میں ہوں اے شائق مشہور رتبہ شاہوں سے بھی ہے افضل و برتر اپنا کیا شاعر کے پاس کفش نبی ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۵-۶۳۵)

(۶) دل کی خواہش ہے کہ گل گشت جہاں سے نکلے

دشتِ طیبہ کے کسی خار پہ ٹھہرے جا کر

آج سے صدی ڈیڑھ صدی قبل تک تو نعتوں میں ”دشتِ طیبہ و خار مغیلاں“ کا ذکر مناسب تھا لیکن اب ”طیبہ۔ جنت ارضی“ بن چکا ہے۔ اسے جو لوگ دشت سے تعبیر کرتے ہیں اور وہاں خار و خس کی خواہش رکھتے ہیں، حماقت کرتے ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۱)

(۷) چاند ٹوٹا کبھی سورج پلٹا بات جو تو نے کہی ہو کے رہی چاند ”ٹوٹا“ نہیں تھا دو ”ٹکڑے“ ہو اتھانیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ”کہا نہیں تھا“ صرف ”اشارہ کیا تھا“۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۲)

(۸) مدینے کے جزیرے پر مری کشتی ہے آبپاشی خزانہ سامنے ہو تو بھلا نقشہ میں کیا مانگوں مدینہ، ”جزیرہ“ تو نہیں ہے!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۴)

وہی ہے عشق نبی میں کامل ہے، وہی ہے حب نبی کا وارث

رہ محبت میں چلتے چلتے، فنا جو انسان ہو گیا ہے

کیا ”حب نبی“ وراثت میں ملتی ہے؟ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۶-۶۴۶)

(۹) جہان کن سے ادھر کیا تھا کون جانتا ہے مگر وہ نور کہ جس سے یہ زندگی ہوئی ہے ”جہان کن“ یہ کون سا جہان ہے؟ ”یہ“ حشو ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۵)

(۱۰) ”حجتیں“ کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:

اس اک نگاہ کی وسعت پہ دو جہاں صدقے جسے خدا شب اسری دکھائی دیتا ہے

کیا اس دنیا نے فانی میں خدا کا دیدار ممکن ہے؟ اور وہ بھی ہر نگاہ کے لیے جو وسعت رکھتی ہے؟ شبِ اسرلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا دیدار ہوا تھا۔ اگرچہ اس میں بھی علماء کا کلام ہے؟ اگر یہ شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے تو اسکی ردیف غلط ہے۔ اسے ”دکھائی دیا تھا“ ہونا چاہئے تھا۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۲۷)

(۱۱) ڈاکٹر صاحب نے علامہ کے چار مصرعے اس جملے کے ساتھ درج کیے ہیں، ”ایک نعتِ پاک میں چار کے عدد سے کیا ہی مضمون آفرینی کی ہے کہ پڑھ کر دل وجد کرنے لگتا ہے۔“ (صفحہ ۳۱۷)

چار رسل فرشتے چار چار کتب ہیں دین چار
سلسلے دونوں چار چار لطف عجب ہے چار میں
آتش و آب و خاک و بادان ہی سے سب کا ہے ثبات
چار کا سارا ماجرا ختم ہے چار یا ر میں

اس قطعہ میں رسل انھیں انبیا کو کہا گیا ہے جن پر کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ جب کہ رسل میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے جن پر صحائف نازل ہوئے مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام، کیا فرشتے صرف چار ہیں؟ اس کے علاوہ دین بھی چار نہیں صرف ایک ہے ”اسلام“ جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور تکمیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر ہوئی، ”اکملت لکم دینکم“ اسی کا اعلان ہے۔ ”سلسلے دونوں چار چار“ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا! آتش و آب و خاک و باد سے تخلیق شدہ اشیاء تو فانی ہیں انھیں ثبات کہاں؟ یہاں ثبات کی جگہ وجود کا کل ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۳۸)

(۱۲) دل کو دنیا کے جھمیلوں میں الجھنے نہ دیا اس کو بس جستوئے باغِ ارم میں رکھا محترمہ نورین صاحبہ سے التماس ہے کہ ”ارم“ کا استعمال نہ کیا کریں کہ یہ ”شداد“ کی جنت تھی۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۶۴۸)

(۱۳) ماجد خلیل صاحب کا شعر:

تمثیلاً دیکھ خلد دوزخ تفصیلاً ہمیں بتانے والا

شاید ماجد صاحب ”معراجِ روحانی“ کے قائل ہیں جب کہ صحیح احادیث موجود ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جسمانی معراج ہوئی تھی۔ مقصود احمد تبسم صاحب نے زمین تو اچھی تلاش کی ہے مگر اسے نبھا نہیں سکے ان کے یہاں ایسے اشعار بھی موجود ہیں: (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۱۴۷-۱۴۶)

(۱۴) عاصی کرنا لی کی نعت فکر و نظر کے نئے نئے دروا کرتی ہے۔ احمد صغیر صدیقی کے حمد یہ و نعتیہ قطعات ان کی خدا اور رسول ۷ شناسی کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کا پہلا حمد یہ اور دوسرا نعتیہ قطعہ خوب ہے۔ دوسرے حمد یہ قطعے میں ”لفظ“ آذر“ کا استعمال مناسب نہیں ہے۔ ”آذر“ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے لغوی معنی ”شمسی نواں مہینہ“ یا ”آگ، چنگاری“ کے ہیں۔ اسی سے آذر پرست کی ترکیب وضع ہوئی ہے یعنی آگ کی پرستش کرنے والا یا مجوسی... ہمارے خیال میں صدیقی صاحب نے لغوی معنی کے تناظر میں لفظ آذر استعمال نہیں کیا ہے۔ شاید انھوں نے ایک تاریخی کردار آذر، جس کا پیشہ بت گری تھا، کو بطور مشبہ بہ استعمال کیا ہے۔ جب کہ مشبہ اپنے خالق کو ٹھہرایا۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ خالق کو مخلوق سے تشبیہ دینا صریحاً شرک ہے۔ اگر وہ آذر کی جگہ ”صانع“ کا لفظ استعمال کرتے، تو عیب بھی دور ہو جاتا اور قطعہ بھی اپنے اثر و تاثیر سے محروم نہ ہوتا:

میرا آذر ہے جو وہ کیا ہوگا میرا صانع ہے جو وہ کیا ہوگا
تسلیم الہی زلفی کی نعت کی نمایاں خوبی فکر و اسلوب کی تازہ کاری ہے۔
(قیصر مخفی، ص ۵۳، ۵۴)

(۱۵) جو تجلی منور مرے دل میں تھی وہ پس مرگ شمع لحد ہو گئی
غزل میں تو قبر اور مرنے کے بعد حشر کے حالات کا بیان کسی طرح قابل اعتراض نہیں ہے لیکن نعت میں مرنے کے بعد قبر کے حالات اور حشر میں شفاعت و کامیابی جیسی باتیں قطعی نامناسب ہیں۔ شاعر کے دل میں کون سی یا کیسی تجلی تھی جو پس مرگ شمع لحد ہو گئی؟ ”شمع لحد یا چراغِ مزار“ تو تعویذِ قبر کے ساتھ بنے ہوئے طاقے میں روشن کرتے ہیں جس کی روشنی قبر میں جانا تو ممکن نہیں ہے!! شعر سے یہ بھی نہیں کھلتا کہ ”شمع لحد“ اوپر روشن ہوئی ہے یا قبر کے اندر؟! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶، ۶۳۱)

(۱۶) ماہِ گیتی، آسماں کا پھول، رحمت کا نزول

جسم تھا صحرا کا لیکن روح صحرائی نہ تھی

(شبنم رومانی کے) مندرجہ بالا شعر کا یہ نکلنا ”جسم تھا صحرا کا“ میرے ذوق عقیدت کو بھلا نہیں لگا۔ میں شبنم رومانی صاحب کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ میری تفہیم کے لیے وہ اس نکلے کی وضاحت فرمادیں۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے غلط فہمی ہو رہی ہو۔ (ملک الظفر سہسرامی، ص ۸۷، ۸۷)

(۱۷) آخری شعر میں:

خاکِ درِ رسول پر سجدوں کا ہے یہ معجزہ لمحوں میں جگمگا اٹھی پیشانی سیاہ بھی
”سجدوں کا معجزہ“ شرعی اعتبار سے قابلِ اعتراض ہے۔ میر سید شریف جرجانی نے اپنی
کتاب میں معجزہ کی تعریف یہ تحریر کی ہے:

المعجزة : امر خارق للعادة داعية الى الخير والسعادة
مقرونة بدعوى النبوه قصد به اظهار صدق من ادعى انه منه
رسول من الله۔ (”التعريفات“، ص ۱۹۵)

وہ عجیب و غریب کام جو عادتاً ناممکن ہو جسے نبی اپنی نبوت کے ثبوت میں
پیش کرے لوگوں کو خیر و سعادت کی دعوت دینے کے لیے۔
اہل اصطلاح کی اس تعریف کی روشنی میں ”معجزے“ کا لفظ یہاں درست قرار نہیں
پائے گا۔ مقصود احمد تبسم کی نعت کا شعر:

تہائی کے ان رازوں پر ہے آج بھی پردہ محبوب و محبت ملتے رہے غارِ حرا میں
اس کی معنویت پر ذرا غور فرمالیا جائے۔ کیا یہ اعتراض کی زد میں نہیں:
(ملک الظفر سہرامی، ص ۸۴۹-۸۴۸)

(۱۸) تنویر صاحب کا اعتراض ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک غار ”غارِ حرا“ میں
مراقبہ فرمایا تھا اور شاعر نے ”غاروں“ استعمال کر کے مبالغہ آرائی کی ہے۔ تنویر صاحب! اہل علم
و ادب نے اسے ”شرعی ضرورت“ کے تحت جائز قرار دیا ہے لیکن آپ سائنس کے تحت
دو اور دو چار ہی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کے حمد یہ شعر پر ان کا یہ اعتراض بظاہر
درست لگتا ہے:

مگر جو سوچ لیا میں نے وہ ضرور ہوا

جب کہ حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ:

”میں نے ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے رب کو پہچانا۔“

تنویر پھول کا یہ کہنا بہر حال درست اور بجائے ہے کہ حمد ہو یا نعت یا منقبت ”انداز“ میں عاجزی
واکساری کی موجودگی ضروری ہے (بلکہ یہ ایمان کا حصہ ہے راقم) مشہور رہے کہ:

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

بہر کیف تنویر پھول کی کاوش قابلِ قدر ہے نعتیہ اشعار میں احتیاط لازم و لا بدی ہے کیونکہ قرآن
پاک میں فرمایا گیا ہے کہ: ”رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے اپنی آواز کو اچانہ کرو۔۔۔ کہیں
ایسا نہ ہو کہ تمہارے سارے اعمال ہی اکارت جائیں اور تمہیں اس کی خبر نہ ہو۔“
(سعید بدروس، ۲۵/۹۱۵-۹۱۴)

(۱۹) نعت محبوب داور سند ہو گئی فرد عصیاں مری مسترد ہو گئی
آج کل شعرا میں یہ عجیب سی غلط فہمی بلکہ کج فہمی پرورش پا رہی ہے کہ ”نعت“ ہی بخشش
کا ذریعہ ہے بقیہ تمام عبادات بے معنی ہیں یہاں تک کہ شاعر اپنے انجام کا خود فیصلہ کرنے لگا ہے،
اپنی فرد عصیاں کو خود ہی مسترد کر رہا ہے جب کہ نص صریح ہے کہ انبیاء کے سوا ہر شخص کا حساب
کتاب لازماً ہوگا کسی کو اس سے مفر نہیں۔ ”بخشش“ کے اس ”معیار“ پر قدغن لگنی ضروری
ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۷)

(۲۰) ہوا کے جھونکوں میں خوشبو بسی ہوئی ہے وہاں درود پڑھتا ہے اک اک شجر مدینے میں
شجر، حجر، طیور و وحوش کے تسبیح و تہلیل سے متعلق روایتیں موجود ہیں لیکن ان کے درود
پڑھنے کی روایت کہیں نظر نہیں آئی!! مدینے کے شجر ہیں تو درود پڑھیں گے اور مکہ شریف کے شجر ذکر
کریں گے؟! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۷)

(۲۱) یہ آرزو نہیں کہ دعائیں ہزار دو پڑھ کے نبی کی نعت لحد میں اُتار دو
ایسے وقت دعا کی آرزو نہ کرنا بد نصیبی کی بات ہے۔ لحد میں اتارنے کی دعا سنت ہے ا
س کے بجائے نعت پڑھنا خلاف سنت عمل ہے۔

مرتبہ سارے مراتب سے ہے اونچا تیرا کون لکھ سکتا ہے قرآن سا قصیدہ تیرا
(ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۸)

(۲۲) حمد تیری ہے یہاں اور شکریہ تیرا ادا ہے تو ہی معبود برحق جان تجھ پر ہے فدا
اللہ کا شکر ادا کیا جاتا ہے شکریہ نہیں! شکر کے معنی ہیں سپاس، تعریف!! شکریہ انسانوں کا ادا کیا جاتا
ہے۔ ”زبان“ سے تو یہ کسی مبتدی کا شعر معلوم ہوتا ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۳۷)

(۲۳) شب دنیا میں ضیا تیری ہے اے ماہِ عرب فرش سے عرشِ تلک طاری ہے ہالہ تیرا
حضور کیلئے ”اے“ کا اس طرح استعمال میرے نزدیک نامناسب ہے کیوں کہ یہ
ہماری غیر منقسم ہندوستانی تہذیب کی نشانی ہے جو ”اپنوں سے چھوٹے یا کمتر شخص“ کے لیے مستعمل

ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۶)

(۲۴) میرے محبوب! کہارب نے یہ معراج کی رات آ مرے پاس تجھے زینہ بہ زینہ دیکھوں کیا خالد صاحب نے رب کو ایسا کہتے ہوئے خود سنا ہے؟ نبی کریم ”زینہ چڑھ“ کر آسمان پر تشریف لے گئے تھے یا براق پر سوار ہو کر؟

اے شافع امم ہے تمنائے عاصیاں نوبت کبھی نہ آئے سوال و جواب کی قبر اور عرصہ محشر کے سوال و جواب تو لازمی و ناگزیر ہیں ان سے کسی حال مفر نہیں پھر ”عاصیوں کی تمنا“ کی اوقات ہی کیا ہے! عباد و زہاد تک اس مرحلے کو یاد کر کے لرز اٹھتے ہیں حضرت عثمان غنیؓ کے تعلق سے مشہور ہے کہ جب آپ کسی قبر سے گزرتے تو زار و قطار گریہ کرتے تھے۔ دریافت کرنے پر بتایا کہ:

”موت کے بعد پہلی کھن منزل قبر ہے، یہاں سے نکلے تو آگے خیر ہی خیر ہے ورنہ۔۔۔!!“

”شافع امم“ پر بحث کی گنجائش ہے۔ کچھ حضرات اسے ”رحمۃ اللعالمین“ کی طرح درست مانتے ہیں لیکن میری نگاہ میں ”شافع امم“ درست نہیں ہے کیوں کہ امم، امت کی جمع ہے اس میں یہودی، نصرانی، سکھ، ہندو سبھی شامل ہو جائیں گے۔ ان کی شفاعت کے لئے سرکار کس طرح اور کیوں سفارش فرمائیں گے؟ شفاعت کی اولین شرط تو اقرار ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ ہے جو امت مسلمہ کے کو کسی کی زبان پر نہیں ہے۔ پھر۔۔۔!!

کھلا یہ منزل ہستی کا مجھ پہ راز نہاں نجات کا کوئی رستہ نہیں سوائے درود سلیم کوثر جیسا شاعر بھی اگر درود کو عبادات پر ترجیح دے تو جائے ماتم ہے۔ (ڈاکٹر

اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۷)

(۲۵) سایہ سرکار پر دنیا کا ہر سایہ نثار قامت اطہر پہ ہر سرو من صدقے کروں بے شمار روایتیں ہیں کہ ”سرکار دو عالم“ کا سایہ نہیں تھا پھر عاصم صاحب کس سائے پر دنیا کا ہر سایہ نثار کر رہے ہیں؟ اس کے علاوہ ”سرو من“ سمجھ میں نہیں آیا کہیں یہ کمپوزنگ کی نذر نہ ہو گیا ہو یعنی ”سرو چمن“! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۸)

(۲۶) کیا میسر ہے، میسر جس کو یہ جگنو نہیں نعت کیا لکھے گا جس کی آنکھ میں آنسو نہیں کیا جس کی آنکھ میں آنسو نہیں وہ نعت نہیں لکھ سکتا؟ نعت لکھنے کے لئے تو ”حب صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم“ کی ضرورت ہے آنسو کی نہیں!! (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۶/۶۴۴)

(۲۷) وہ دلبر حق سرور کونین کہ جس کے جبرئیل امین در پہ کریں ناصیہ سائی جبرئیل کی در نبی پر ناصیہ سائی کی کوئی سند ہے؟ یا پھر شعرائے کرام اپنی کرامتوں سے جبرئیل کو در نبی پر سجدے پر سجدے کروائے جارہے ہیں؟! (ع۔م۔مسلم، ص ۵۱۲) عارف عبد المتین کا شعر دیکھیے:

(۲۸) ترے جلو میں حدیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں ازل ابد سے ادھر بھی خرام کرتا ہوں حدیں ٹوٹی ہیں ”پھوٹی“ نہیں! عارف صاحب بتائیں گے کہ ازل ابد سے ادھر کون سی جگہ ہے جہاں وہ خرام کرتے ہیں؟! (ع۔م۔مسلم، ص ۵۱۲)

(۲۹) یہ وہ صنف ہے جس کو فرشتے ہاتھوں ہاتھ سمیٹتے ہیں

یہ وہ چیز ہے جو سرکار کو جاکر دکھائی جاتی ہے (ڈاکٹر شعیب) درود شریف کے تعلق سے تو سند موجود ہے کہ فرشتے درود شریف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پہنچاتے ہیں لیکن ”صنف“ کے تعلق سے ایسی کوئی روایت یا سند!! شعرا کو کم از کم نعت میں بداحتیاطی سے بچنا چاہیے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم، ص ۲۷/۵۱۱-۵۱۲)

(۳۰) صفحہ نمبر ۶۴ پر عزیز احسن صاحب کی نعت کے اس شعر پر اعتراض کیا گیا ہے:

اے شافع امم ۷! ہے تمنائے عاصیاں نوبت کبھی نہ آئے سوال و جواب کی اعتراض ہے کہ سوال و جواب تو لازمی و ناگزیر ہیں، ان سے کسی حال مفر نہیں۔ ”شافع امم“ ۷ پر بھی اشفاق صاحب کو اشکال ہے۔ اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ صحیح بخاری، حدیث نمبر ۴۷۱۳ میں ہے کہ حضور ۷ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میں سب لوگوں کا سردار ہوں گا..... اُس دن دنیا کے شروع سے قیامت کے دن تک کی ساری خلقت ایک چٹیل میدان میں جمع ہوگی..... سورج بالکل قریب ہو جائے گا اور لوگوں کی پریشانی اور بے قراری کی کوئی حد نہ رہے گی جو برداشت سے باہر ہو جائے گی۔ لوگ آپس میں کہیں گے، دیکھتے نہیں کہ ہماری کیا حالت ہوگئی ہے۔ کیا ایسا کوئی مقبول بندہ نہیں ہے جو اللہ پاک کی بارگاہ میں ہماری شفاعت کرے؟..... حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیاء نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ کسی اور کے پاس جاؤ۔ حضرت عیسیٰؑ کہیں گے کہ محمد ۷ کے پاس جاؤ۔ سب لوگ آنحضرت ۷ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ ۷ اُن کی شفاعت فرمائیں گے۔ (اس حدیث کے آخر میں بغیر حساب کے جنت میں جانے والوں کا ذکر بھی ہے)۔ درود تاج میں بھی آپ ۷

کو ”شفیع الام“ ۷ کہا گیا ہے۔ ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ جب تمام انبیاء شفاعت کرنے سے انکار کر دیں گے تو حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار ہونے والوں، حضرت عیسیٰؑ کے حواریین اور اصحاب کھف وغیرہ کی شفاعت کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ انبیائے سابقین پر ان کے دور میں جو لوگ ایمان لائے ہوں گے وہ بھی مومن ہوں گے اور آپ ۷ کی شفاعت سے بہرہ مند ہوں گے۔ صفحہ نمبر ۶۴۹ پر اجمل سراج صاحب کے مصرع ”کہ دے کے آپ ۷ کو بھیجا گیا ہدایت خاص“ پر اعتراض درست نہیں کیوں کہ ”بھیجا گیا“ ہدایت کے لیے نہیں بلکہ ”آپ“ ۷ کے لیے استعمال ہوا ہے، اس کی نثر اس طرح ہوگی: کہ آپ ۷ کو خاص ہدایت دے کے بھیجا گیا۔ (تنویر پھول ص، ۵۲۴/۲۷)

(۳۱) جناب ریاض چودھری نے اپنے خط میں ڈاکٹر شعیب نگرامی کے مقالے کے بارے میں لکھا ہے کہ انھیں اس پر آڑے ہاتھوں لیا گیا میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی سوچ مناسب نہیں۔ ہم کو کھلے دل و دماغ کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ ڈاکٹر نگرامی بہر حال کوئی جاہل آدمی نہیں۔ ان کی باتوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ برا بھلا مت کہیں۔ ریاض صاحب نے خدا جانے کن لوگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے خوشامد کی ڈگڈگی بجاتے ہیں۔ شاید ان کا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جنہوں نے ڈاکٹر نگرامی کی حمایت کی تھی۔ ایسی گفتگو موثر نہیں ہوتی۔ ریاض چودھری صاحب نے ایک شعر لکھا ہے:

بعد مرنے کے چلے جائیں گے سب سے چھپ کر ایک گھر ہم نے مدینے میں بنا رکھا ہے
اس شعر سے تو یوں لگتا ہے جیسے مدینے میں جو گھر بنایا گیا ہے وہ کوئی چرچ وغیرہ ہے
اس میں شاعر چھپ کر جانے کی بات کر رہا ہے۔ عجیب سا شعر ہے۔ ایسے شعر بظاہر بھلے لگتے ہیں
لیکن جب ان میں اترا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ شعر ہے کیسا۔ اور یہ کام ہما شاکا نہیں ہوتا۔ تنقید کی
اہمیت بھی اسی لیے ہے۔ نعت کے اشعار غور و فکر چاہتے ہیں۔ (احمد صغیر صدیقی
ص، ۸۹۷-۸۹۶)

(۳۲) ڈاکٹر محمد طاہر قریشی کا مقالہ ”نعت اور نعتیہ عناصر“ ایک وسیع تحریر ہے جس پر موصوف
مبارک باد کے مستحق ہیں۔ صفحہ نمبر ۴۷ پر نعت کا ایک شعر ہے:

رحمۃ للعالمین ! ، خیر الامم آپ ہی کا سب سے اونچا ہے علم
اس شعر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ”خیر الامم“ کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے جو درست نہیں

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا شاہ ام صلی اللہ علیہ وسلم کہنا چاہئے۔ ”خیر الامم“ سے مراد آپ صلی
اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک نہیں بلکہ آپ کی امت کو ”خیر الامم“ کہا گیا ہے۔ (سورہ آل عمران،
آیت نمبر ۱۱۰) علامہ اقبالؒ کی نظم ”بلا و اسلامیہ“ میں ایک شعر ہے:

سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار نظم عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

(تنویر پھول ص، ۹۲۱/۲۵)

(۳۳) محمد عرش پر بیٹھے ہیں چپ خالق یہ کہتا ہے تمہارا گھر ہے اپنے گھر میں شرمایا نہیں کرتے
صفحہ نمبر ۱۱۷ پر استاد قمر جلالوی کے جس شعر کا حوالہ ہے اُس میں چپ بیٹھے اور اپنے گھر
میں شرمانے کا ذکر نعتیہ ہرگز نہیں بلکہ غزلیہ ہے۔ (تنویر پھول ص، ۶۶۰/۲۶)

(۳۴) شاہ عرب کے پیٹ پہ پتھر بندھے ہوئے دیکھے تو کوئی طرزِ معیشت حضور کی
پیٹ پر پتھر بندھے ہونے سے کون سا طرزِ معیشت ظاہر ہوتا ہے؟ اور کیا حضور ہمیشہ
پیٹ پر پتھر باندھے رہا کرتے تھے!! یہ تو صرف ایک بار ”خندق“ کے موقع پر ہوا تھا اور بس!!
(ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۶۳۹-۶۳۸)

(۳۵) کچھ تاریخی غلطیاں بھی ہیں۔ صفحہ نمبر ۹۷ پر غزوہ خندق کا تذکرہ اس طرح کیا گیا
ہے: ”آپ کی نسبت سے ٹھہرا ہے یہ غزوہ آخری“۔ حالانکہ اس کے بعد اور بھی غزوات ہوئے
ہیں مثلاً غزوہ جُنین اور غزوہ تبوک وغیرہ۔ خلفائے راشدینؓ کے دورِ حکومت کے تذکرے کے
بعد پھر حیاتِ طیبہ کے مختلف ادوار کا ذکر ہے، اگر ترتیب درست کر لی جاتی تو بہتر ہوتا۔ صفحہ ۱۹۱ پر
حضرت عثمان غنیؓ کی شان میں راز صاحب کا مصرع ہے: ”گھر میں جو کچھ تھا میسر، نذر کر بیٹھے غنی“
لیکن یہ واقعہ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے منسوب ہے، حضرت عثمان غنیؓ سے نہیں۔
علامہ اقبالؒ نے اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں کہا ہے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

صفحہ نمبر ۲۳۳ پر حضرت خالد بن ولید سے پہلے ”ابن قاسم“ (محمد بن قاسم) کی سپہ
سالاری کا ذکر ہے جبکہ محمد بن قاسم کا زمانہ دور رسالت اور خلفائے راشدینؓ کے بعد ولید بن
عبدالملک کے دور کا ہے۔ صفحہ نمبر ۲۵۲ پر آخری بند کا مصرع ہے: ”ہو قبول افتد مرے آقا ۷!
سلام بندگی“۔ ”ہو“ کے ساتھ ”افتد“ کا استعمال محلِ نظر ہے۔ اس کا صحیح استعمال اس فارسی مصرع
میں موجود ہے: ”گر قبول افتد زہے عز و شرف“۔ (تنویر پھول ص، ۵۲۱/۲۷)

(۳۶) مظہر صدیقی صاحب کی نظم میں بھی کئی خامیاں ہیں۔

عرب کی سرزمین تپتے ہوئے پیتل کی صورت تھی
وہ دن کی روشنی میں ہول ناک آتش کی صورت تھی

میرے علم کے مطابق دورِ جہالت میں ”پیتل“ کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ البتہ ”تانے“ کا ذکر روایات میں موجود ہے کہ قیامت میں جب سورج سوانیزے پر آئے گا تو زمین تپ کر تانے کی طرح سرخ ہو جائے گی۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۱۴۴-۱۴۳)

(۳۷) ہم بھی آپ کی امت ہیں، ہم بھی آپ سے بیعت ہیں

اس خوش اقبالی پر اتنا کم ہے جتنا ناز کریں

اُمت ہیں؟ یا اُمت میں ہیں یا اُمتی ہیں؟ پاکستان میں تو تصوف کی روایت بڑی مضبوط ہے۔ شاعر کو کسی سالک یا پیڑ طریق سے معلوم کر لینا چاہئے تھا کہ ”بیعت“ کس سے اور کس طرح کی جاتی ہے! میرے علم کے مطابق بیعت صرف باحیات مرشدین سے ہی کی جاسکتی ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۲۶/۶۳۰)

(۳۸) رہتا ہے انتظار میں مشغول رات دن بے روزگار آپ کا بیکار آپ کا
یہ تو خلاف واقعہ، غلو یا کذب بیانی ہے شاعر کے لیے رات دن کی ایسی مشغولی تو ممکن ہی نہیں ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۲۶/۶۳۹)

(۳۹) دم اخیر جو ٹوٹی ہے ڈور سانسوں کی شفیق حشر کا لب پر مرے قصیدہ رہا
کیا مولانا قمر نے یہ شعر مرتے وقت کہا ہے؟ غزل میں تو عاشق مرنے کے بعد بھی غزلیں کہتا ہے لیکن نعت میں خلاف واقعہ مضمون نظم کرنا کسی صورت مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شعر ایسا ہوتا تو اعتراض کی گنجائش نہیں ہوتی۔

دم اخیر اگر ٹوٹے ڈور سانسوں کی شفیق حشر کا لب پر مرے قصیدہ رہے
(ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۱۲۸)

(۴۰) ظہور کرتی ہے جس دم سحر مدینے میں اذانیں دیتے ہیں دیوار و در مدینے میں
خلاف واقعہ شعر ہے ”اذانیں“ دینے کی بجائے ”چمک سے اٹھتے“ جیسا کوئی ٹکڑا چاہئے تھا۔ ویسے بھی یہ نعت کا شعر نہیں ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۲۶/۶۳۷)

☆☆☆

کتابیات

(۱) ”اردو شاعری میں نعت“ سے ماخوذ کتب:

”اردو شاعری میں نعت“ ہر دو جلد میں کتابت کے اغلاط مالک مطبع کی لاپرواہیوں کی وجہ سے بہ کثرت در آئے ہیں۔ کتاب ”نعتیہ شاعری کا ارتقاء“ میں نے خود طبع کروائی تھی، اس لیے اس میں اغلاط کتابت کم ہیں۔ یہاں پر اس امر کا اکتشاف بھی کرتا چلوں کہ پاکستان میں ”اردو شاعری میں نعت“ بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔ کیوں کہ نسیم بک ڈپلکھنؤ میں آتش زدگی کی وجہ سے کتاب مذکور کے سارے نسخے بجز ان پچاس کے جو راقم کے پاس تھے، جل کر خاکستر ہو گئے۔ (ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد ص ۱۰۲)

”نعتیہ شاعری کا ارتقاء“ پر متعدد جرائد و رسائل نے تبصرے شائع کیے تھے۔ ”معارف“ کے مئی ۱۹۹۰ء کے شمارے میں بھی اس کتاب پر نقد و تبصرہ شائع ہوا تھا۔ ”نعتیہ شاعری کا ارتقاء“ میں اس بات کا ذکر ہے کہ راقم نے ”اردو شاعری میں نعت“ پر کتب سے کام کرنا شروع کیا تھا اور یہ کہ راقم کو اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی نے ۱۹۸۴ء میں تفویض کی تھی۔ پروفیسر شفقت رضوی نے ”نعت رنگ“ کے دسویں شمارے کے صفحہ ۴۰ پر خود ہی رقم فرمایا ہے کہ ”تحقیقی نقطہ نظر سے غیر مطبوعہ تحریر بھی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔“ محترمی و مکرمی ڈاکٹر ریاض مجید اور مشفق و مخلصی ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی صاحبان کی گراں قدر کتابوں کے منظر عام پر آنے سے پیش تر راقم کی نئیوں کتابیں یعنی ”نعتیہ شاعری کا ارتقاء“، ”اردو شاعری میں نعت“ جلد اول اور ”اردو شاعری میں نعت“ جلد دوم حیطہ تحریر میں لائی جا چکی تھیں، ان تینوں کتابوں کا خرچ تحقیقی مقالہ ”اردو شاعری میں نعت“ ہے۔ راقم کا یہ مقالہ ۱۹۸۱ء میں پایہ تکمیل کو پہنچ کر ۱۹۸۲ء میں یونیورسٹی میں داخل کیا جا چکا تھا۔ جب کہ ڈاکٹر ریاض مجید کے مقالہ کی تکمیل بہ قول پروفیسر شفقت رضوی ۱۹۸۳ء میں ہوئی۔ (ملاحظہ ہو ”نعت رنگ“ شمارہ ۱۰ صفحہ ۹۵) اور ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری رانچی یونیورسٹی سے ۱۹۸۷ء میں تفویض کی گئی تھی۔ (ملاحظہ ہو، ماہنامہ ”کتاب نما“ دسمبر ۱۹۸۷ء جلد ۲، شمارہ ۱۲، ص ۸۵، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی) ۱۹۹۲ء تک راقم کو ان دونوں

مقالوں کی طباعت و اشاعت کی بات معلوم نہ تھی، صرف ان مقالوں پر ڈگریاں تفویض کیے جانے کی اطلاع تھی۔ (ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد ص ۱۰۰)

راقم کے مقالے سے ماخوذ دوسری اور تیسری کتاب یعنی ”اردو شاعری میں نعت“ جلد اول و جلد دوم کی طباعت و اشاعت کی تکمیل کی نوبت ۱۹۹۲ء میں آئی تھی۔ راقم نے اپنے مقالے سے ماخوذ ”اردو شاعری میں نعت“ جلد اول کے دیباچے میں صفحہ ۱۴ پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ راقم کو محولہ بالا دونوں مقالوں کی آگاہی ہے، لیکن اس کو یہ دونوں مقالے تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل پائے۔ تقدیم زمانی کتابت سے طے ہو گا کہ اشاعت سے۔ راقم نے معرض بحث کتاب کے اسی صفحہ پر یہ اعذار بھی رقم کر دیا تھا کہ اس مقالے یعنی کتاب ”اردو شاعری میں نعت“ جلد اول میں عربی و فارسی کی نعت گوئی پر بہ طور پس منظر کچھ نہیں لکھا گیا۔ نعت کی لغوی و اصطلاحی تفریح اور اس کی تحقیق و تنقید اور اس کا تعارف بھی نہیں پیش کیا گیا، کیوں کہ ان موضوعات پر راقم کا مبسوط مقالہ ”نعتیہ شاعری کا ارتقا“ (عربی و فارسی کے خصوصی مطالعہ کے ساتھ) دسمبر ۱۹۸۸ء میں فائن آفسٹ ورکس الہ آباد سے طبع ہو چکا ہے۔

یہ بات پر از واقعیت و حقیقت ہے کہ راقم کی کتاب ”اردو شاعری میں نعت“ پر لکھا گیا ہر وہ تجزیہ یا تبصرہ جو نعتیہ شاعری کا ارتقاء“ سے اغماض کر کے لکھا گیا ہو ناقص، ادھورا اور نامکمل ہوگا۔ راقم کے تحقیقی مقالہ ”اردو شاعری میں نعت“ مدخلہ لکھنؤ یونیورسٹی میں نواب اب ہیں، جن میں کے تین حسب الحکم مرحوم ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ”نعتیہ شاعری کا ارتقاء“ میں، تین ”اردو شاعری میں نعت“ جلد اول میں اور بقیہ تین ابواب ”اردو شاعری میں نعت“ جلد دوم میں مشمول ہیں۔ نعت سے متعلق ساری عمومی بحث ”نعتیہ شاعری کا ارتقاء“ میں دس ضمنی عنوانات کے ساتھ مشمول ہیں۔ لفظ ”نعت“ بنی ختمی مرتبت V کی زبان اقدس سے اسی متعارف مفہوم میں مستعمل ہوا ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف راقم نے اسی کتاب کے اسی بات میں کیا ہے اور مکمل حدیث بہ روایت حضرت انس بن مالک مع حوالہ نقل کی ہے۔ راقم نے اس باب کا عنوان ”نعت: تحقیق و تنقید“ رکھا تھا۔ (یہ عنوان ”نعتیہ شاعری کا ارتقاء“ کے پہلے باب کے نیچے صفحہ ۱۷ پر مندرج ہے) کتاب کی اشاعت ۱۹۸۸ء میں ہو چکی ہے۔ (ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد ص ۱۰۱)

(۲) ”اردو کی نعتیہ شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ“

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ میری شریک حیات کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی نعت کے

مقدس موضوع سے متعلق ہے اور اس کا موضوع ہے ”اردو کی نعتیہ شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ“ اس مقالہ کے علاوہ نعت کے موضوع پر کانپور یونیورسٹی سے اب تک تین مقالوں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی جا چکی ہے یہ تینوں مقالے میری نگرانی میں لکھے گئے ہیں، جن کی تفصیل مرقومہ ذیل ہے۔

(۱) ڈاکٹر نگار سلطانہ، بیسویں صدی میں اردو کے غیر مسلم نعت گو شعرا کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، تعداد صفحات ۴۶۵۔

(۲) ڈاکٹر شکیلہ خاتون، اردو نعت کا صنفی و بیتی مطالعہ، تعداد صفحات ۵۲۶۔

(۳) قریشہ بانو، ہندوستان اور پاکستان کی اردو نعت کا تقابلی مطالعہ، تعداد صفحات ۵۲۸۔

محترمی محمد اظہار نے اردو کے حمدیہ سرمایہ پر ”اردو میں حمد نگاری کی روایت“ کے موضوع پر اسی یونیورسٹی سے میری زیر نگرانی اپنا تحقیقی کام مکمل کر لیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ کتابت کی منزل عبور کر کے جلد ہو چکا ہے اور داخلہ کا منتظر ہے۔ ”اردو نعت کے موضوعات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ“ موضوع پر میری نگرانی میں محترمہ شمیم اختر خاتون اپنا تحقیقی کام تیزی سے مکمل کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ (ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد ص ۱۰۴-۱۰۳)

(۳) ’اردو میں نعت گوئی: روایت اور ارتقا‘:

راقم الحروف اردو نعت کے ساتھ والہانہ شیفتنگی رکھتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ راقم نے پی ایچ ڈی کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ ’اردو میں نعت گوئی: روایت اور ارتقا‘ کے موضوع پر ہی تحریر کیا ہے، جس پر راقم کو ۱۹۹۷ء میں کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ اب تک راقم کی ایک کتاب (اردو کے ۲۵ نعت گو شعرا: ولی دکنی سے صلاح الدین پرویز تک، صفحات ۳۲۰، سال اشاعت ۲۰۰۲ء) اور ۱۵ سے زائد مقالے نعتیہ موضوعات پر شائع ہو چکے ہیں۔ ایسے میں راقم جیسے نعتیہ ادب کے طالب علم کے لیے ’نعت رنگ‘ کی اہمیت و افادیت اور اس کے ساتھ والہانہ وابستگی کا اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں۔ (جو ہر قدوسی ص ۲۷۰)

(۴) ”مفتی اعظم ہند نوری بریلوی کی نعتیہ شاعری“

آپ کو اطلاع دیتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے ”مفتی اعظم ہند نوری بریلوی کی نعتیہ شاعری“ پر ڈاکٹر امبیڈکر مرٹھا واڈا یونیورسٹی اورنگ آباد دکن سے پی ایچ ڈی مکمل کر لیا

ہے۔ میری ۱۶ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ایک نعتیہ دیوان لمعات بخشش اور صنعت تظہیر پر ایک شعری مجموعہ تظہیرات بخشش منظر عام پر آچکا ہے۔ انشاء اللہ PDF فائلز اور مضامین بھیجوں گا۔ (محمد مشاہد حسین ص ۷۹۸)

(۵) 'نعت کے جگنوؤں کے تعاقب':

'نعت کے جگنوؤں کے تعاقب' میں کشفی صاحب کا سفر جاری ہے اور یہ ایک ایسا سفر ہے جو تا ابد جاری رہے گا۔ یہ ہندوستان میں نقش بند یوں، چشتیوں، سہروردیوں اور قادری خاںقاہوں کی روایت ہے جو سینہ بہ سینہ ظاہر اور باطن میں نور فشاں ہے اور اہل ایمان کے خون میں گردش کر رہی ہے۔

کشفی صاحب نے جس ماحول کا نقشہ کھینچا ہے، یہ صرف اُن کے گھرانے اور شہر کا نقشہ نہیں ہے، یہ ہندوستان میں مسلمان گھرانوں کی تہذیب کا نقشہ ہے، مجھے یاد ہے میں نے بدایوں کے ایک قصبے شیخوپور میں آنکھ کھولی، یہ بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی اولادوں کی بستی ہے۔ یہاں فرید یہ پٹاری ہے اس کی عمارت پاک پتن میں بابا فریدؒ کے مزار سے مشابہ ہے اور اس میں خوب صورت شیشے لگی چوبی الماری ہے جس میں بابا فریدؒ کے تبرکات محفوظ ہیں اور محرم کی ۵ تاریخ کو ان تبرکات کی زیارت اس خاندان کا بزرگ ترین اور اہل علم شخص کراتا ہے۔

جب ربیع الاول کا چاند نظر آتا، ننھے میاں کے چھتے میں نعت خوانی کی محفل آراستہ کی جاتی، ذکرِ رسول ﷺ ہوتا، مولود شریف کی ایک کتاب ”کل البصر فی ولادت خیر البشر“ سے اقتباس ہر روز پڑھ کر سناتے، اُس کے وہ شعر جو مجھے یاد رہ گئے ہیں، وہ بھی اس لیے کہ میری والدہ بواجی صاحبہ مسیت النساء بیگم یہ شعرا کثیر یہاں پاکستان آکر بھی سناتی رہتی تھیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں: جس نے اصحاب باصفا کو دیکھا اُس نے گویا کہ مصطفیٰ کو دیکھا اور جس کی نظر پڑے نبی پر باللہ اُس نے تو بعینہ خدا کو دیکھا شعرِ فہمی کا تعلق براہِ راست شعری حیثیت سے ہوتا ہے اور یہ ہر سخن فہم کی الگ ہوتی ہے، کم تر سطح سے کچھ اور نظر آتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ قطرے میں قطرہ بھی نظر نہیں آتا، لیکن شعری حساسیت کا ایک وہ مقام ہے کہ قطرہ گہر نظر آنے لگتا ہے یا پھر قطرے میں سمندر موجیں مارتا نظر آتا ہے، ۱۲ ربیع الاول کے دن بڑی دھوم دھام ہوتی۔ کھانے کھلائے جاتے، شیرینی تقسیم ہوتی، کچھ یہی کیفیت زمانی محافل کی ہوتی اُن دنوں پوری بستی لوہان اور اگر بیویوں کی خوش بو سے معطر ہوتی۔

میں کشفی صاحب کے حوالوں اور یادوں کے سہارے ماضی میں چلا گیا اللہ تعالیٰ منشی محمد عاشق علی صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جنھوں نے مولود شریف کی ایسی کتاب لکھی کہ عشقِ رسول ﷺ اہل ایمان کے دلوں میں بسا گئی۔ یہ ۱۲۹۶ھ میں ۱۳۰ سال قبل مطبع گلزار محمدی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی اور میری والدہ بواجی صاحبہ کو لفظاً لفظاً یاد تھی جو شمع میرے والد حضرت شاہ محمد اسماعیل میاں فاروقی چشتی اور میری والدہ بواجی صاحبہ نے میرے ننھے سے دل میں روشن کی تھی، وہ میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ رسول ﷺ سے محبت کا جو بیج میرے دل میں بویا گیا تھا، وہ تناور درخت بن گیا ہے جس کی بدولت میں نے سیرتِ رسول ﷺ پر چار کتابیں لکھنے کی سعادت حاصل کی۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ پاک پر چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب ہے، اس کتاب کو حکومت پاکستان نے سیرتِ ایوارڈ سے نوازا، راسخ زنگلڈ ایوارڈ عطا ہوا، ساکنانِ کراچی کی ایک تنظیم نے نشانِ فضیلت دیا اور اب تک اس کے گیارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دوسری کتاب ’شفیق و مہربان نبی ﷺ‘ ہے جو روزنامہ ’جنگ‘ کے مذہبی صفحے پر شائع شدہ میرے مضامین کا مجموعہ ہے۔ تیسری کتاب ’شانِ نبی ﷺ‘ ہے جو نبی پاک ﷺ کی فضیلت اور آپ ﷺ کے مقامِ رسالت کا بیان ہے اور یہ اُن تقاریر کا انتخاب ہے جو مختلف محافل میں احقر نے حضور ﷺ کی خدمت میں نذرانہ عقیدت کے طور پر پیش کی تھیں۔ چوتھی کتاب ”نبی پاک حضرت محمد ﷺ“ ہے یہ اُن نوجوان لڑکے لڑکیوں کے لیے ہے جو انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ یہ اہم تاریخی واقعات کے تناظر میں تحریر کی گئی ہے۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ ماحول اور تربیت ہوتی ہے جو دلوں میں منظروں کو جنم دیتی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے محبت اور ان کے ذکر سے جو روشنی دل و دماغ میں فروزاں ہوتی ہے وہی فقیر راہِ کاسرا مسلمان کا خوگر بناتی ہے اور یہی وہ سر نہاں ہے جو ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی سے کہلاتا ہے:

”جس ذاتِ گرامی کی تشریف آوری مومنوں کے لیے نعمت ہے، جس کی نبوت انسانوں کے لیے نعمت ہے، اُس کا ذکر بھی نعمت ہے اور نعمت کے اعتراف کی ایک شکل ہے واما بنعمتِ ربک فحدث۔ (سورۃ الضحیٰ) اور ذکرِ رسالت مآب ﷺ کی عظمت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس سورہ سے سورۃ الناس یعنی اختتامِ قرآن تک سورہ کی تلاوت کے ساتھ تکبیر کہنا سنت ہے۔ حضور ﷺ کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ کے اعترافِ کبریائی کی ایک صورت ہے۔ یہ وہی بات ہے

جو اس شعر میں کہی گئی ہے:

اور جس کی نظر پڑے نبی پر باللہ اُس نے بعینہ خدا کو دیکھا
اللہ سبحانہ تعالیٰ کے بعد حضور ﷺ کی ذاتِ کاملہ و اکملہ ہمہ جہت و ہمہ صفات ہے جس
نے آپ ﷺ کو دیکھا تو اُسے باور آیا کہ اللہ ایک ہے۔ میلاد النبی کے جلسے اور نعت کی محفلیں مسلم
تہذیب کی شان دار روایت ہے۔ اس سے حضور ﷺ کی محبت آپ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ،
آپ ﷺ کی حیاتِ پاک دلوں و دماغ پر نقش ہوتی ہے اور اللہ کا وہ تصور جو حضور ﷺ نے پیش کیا،
بندہ اُس کے قریب تر ہو جاتا ہے اور اللہ کی ذات و صفاتِ عظیم تر ہو جاتی ہے۔ اگر رسول ﷺ کو
راضی کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں، مصطفیٰ ﷺ کے غلاموں سے خود راضی ہو جائے گا۔

کشفی صاحب کی یادوں کی چاندنی دلوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی ہے، حقیقت کا
اعتراف ہے، تہذیب کا بہاؤ ہے، حبِ رسول ﷺ کا رچاؤ ہے، یہ ایک دعوت ہے، مصلحتوں سے
پاک ہے، بلند یوں اور رفعتوں کو چھونے کے لیے ہمارے پاس ایک ہی نسخہ کیا ہے
...نگاہے یا رسول اللہ نگاہے...

بچپن اور بچپن کے احساساتِ سچ کا مظہر ہوتے ہیں، جھوٹ اور فریب سے کوسوں دور۔ میں نے
شیخوپور میں ننھے میاں کے چھتے میں جس محفلِ میلاد کا ذکر کیا ہے وہاں تہجد کی نماز کے بعد درود
شریف کا بلند آواز میں ذکر ہوتا تھا اور اختتام، سلام پر ہوتا تھا:

السلام اے حضرت خیر الانام السلام اے سرورِ عالی مقام
السلام اے مہرِ ایمان السلام السلام اے ماہِ عرفاں السلام

یا نبی سلام علیک یا رسول سلام علیک

یا حبیب سلام علیک صلوة اللہ علیک

کشفی صاحب کی یادیں ایک بھرپور اظہار ہے اُس تہذیب اور تہذیبی رویوں کا جن کو
جب مسلمانوں نے چھوڑا، دامنِ مصطفیٰ ﷺ چھوٹا اور جب دامنِ مصطفیٰ ﷺ چھوٹا تو رب روٹھا۔
کشفی صاحب کے دل میں اس اُمت کا جو درد ہے، کاش اللہ تعالیٰ اُس کا سوواں حصہ بھی اُمت کو
دے دے تو ہر طرف دین محمدی کا پرچم لہرانے لگے:

ہر مرض کی دوا درود شریف دافعِ ہر بلا درود شریف
ورد جس نے کیا درود شریف اور دل سے پڑھا درود شریف

جس لیے جو پڑھے وہ حاصل ہو ہے یہ عقدہ کشا درود شریف
حضرت ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی ایک ولی صفت انسان ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ولی ہیں۔
صاحبِ علم و عرفان ہیں۔ ساری زندگی علم کی دولت بانٹتے گزری ہے، عاجزی و انکساری اُن کا طرہ
امتیاز ہے، زمانے میں ایسے صاحبِ علم اور صاحبِ فکر کم ہوتے ہیں، حق کہنے سے چوکتے نہیں وہ
ایک صاحبِ طرزِ نثر نگار ہیں۔ خانقاہی سلسلے کی کڑیوں میں پروئی ہوئی شخصیت ہیں وہ خانقاہیں آج
کی خانقاہیں نہ تھیں یہ تو سجدہ گاہیں ہیں انسانوں کو انسانوں کے غلام بنانے کا نظام ہے وہ خانقاہیں
علم کا مرکز تھے انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلانے اور مومن سازی کے ادارے جیسا
کشفی صاحب کے اس مضمون سے پتا چل ہی گیا ہوا۔ (سلیم یزدانی ص، ۴۳۵-۴۳۴)

(۶) ”نعت میں کیسے کہوں!“:

”نعت میں کیسے کہوں!“ ایک سوال مع جواب ہے ہم تو پروفیسر محمد اقبال جاوید کی
عبارت آرائی بلکہ طرزِ مرصع کے پرانے قلیل ہیں بار بار اس طرزِ خاص کو اپنانے کی کوشش کی مگر
کامیاب نہ ہوئے میرا خیال ہے عطا حسین خان تحسین بھی نو طرزِ مرصع کا جدید ایڈیشن تیار کرنا
چاہیں اور محمد حسین آزاد ”آبِ حیات“ کی سبیل لگانے پر اصرار کریں یا خلیل جبران نثری شاعری
میں الہامی شاعری دہرانا چاہیں تو بھی پروفیسر صاحب موصوف کی اس تصنیف کے آگے سپر ڈال
دیں یہ ہم جیسے اردو سکھنے والوں کے لیے مفید بلکہ مجرب ہے۔ لیکن یہ احساس ہوتا ہے کہ
مندرجات اور عنوان کے درمیان کچھ فاصلہ زیادہ ہے۔ (شفقت رضوی ص، ۴۹۴)

(۷) ”نعت کی تخلیقی سچائیاں“:

جناب عزیز احسن صاحب کی تصنیف ”نعت کی تخلیقی سچائیاں“ کا مطالعہ کرنے بیٹھا تو
موصوف کے دیباچے ہی میں الجھ کر رہ گیا اور محض اسی دیباچے ہی پر اعتراض نام بھی ترتیب پا گیا
۔ ایسے نقطہ نظر اور ادبی اسلوب کی اصلاح ضروری ہے بعض حضرات نے ان کے اس تحریری
مقاصد پر اثباتی فیصلے کا اظہار کیا جبکہ میں قطعی متفق نہیں مطالعہ کرنے کے بعد آپ خود ہی اپنی رائے
قائم کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کے نزدیک کوئی وجہ مانع نہ ہو تو ادارتی فریضے کے تحت شائع کر کے ممنون
فرمائیں۔ انشاء اللہ دوسرا تازہ مضمون بھی جلد ہی ارسال کر دوں گا۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(سید شمیم احمد گوہر ص، ۵۱۸)

(۸) ”نعت رنگ اہل علم کی نظر میں“:

”نعت رنگ اہل علم کی نظر میں“ یہ ”نعت رنگ“ کے لیے ایک توصیف نامہ ہے اس میں اہل علم کی آرا و قیام اور ”نعت رنگ“ کی اہمیت کو اجاگر کرنے والی ہیں البتہ اہل علم کے درمیان ”نااہل علم“ بھی ہیں۔ مثلاً شفقت رضوی! کیا اچھا ہوتا اگر صراحت کی جاتی ”اہل علم اور نااہل علم کی نظر میں“ کتاب کو مرتب کرنے میں بڑی محنت کی گئی ہے اور مطبوعہ تحریروں سے زیادہ غیر مطبوعہ تحریروں کا وزن ہے۔ (شفقت رضوی ص ۴۹۴)

(۹) ”اشاریہ نعت رنگ“

”اشاریہ نعت رنگ“ کئی کوششوں کے بعد ایک جامع اشاریہ ہے غالباً ”نعت رنگ“ کے اولین اشاریہ لکھنے کی بدعت میرے قلم سے ہوئی تھی جس کا مکملہ سہیل شفیق نے کر دیا ہے اور ہم سے زیادہ محنت سے کیا ہے اور سابقہ تمام کاوشوں پر سبقت لے گیا ہے۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے لکھا ہے حسبِ عادت اس کی ابتدا مولانا ابوالکلام آزاد سے ہوئی ہے اور اختتام بھی مولانا ابوالکلام آزاد ہی پر ہوا ہے انھوں نے اشاریہ نویسی کے سلسلہ میں اہم کاوشوں کا ذکر کیا ہے لیکن غالباً مقدمہ غلت میں لکھا گیا ہے جس کی وجہ سے بعض اہم کڑیاں ذکر سے محروم رہیں، مثلاً ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا اشاریہ حسرت موہانی کے رسالہ ”اردو معنی“ جو رسالہ ”برہان“ دہلی میں سولہ اقساط میں شائع ہوا ان کے علم میں ہے مگر اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

”غالب اور ثنائے خواجہ“

صبحِ رحمانی کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اپنی کہی ہوئی نعتوں کی وجہ سے مقبول ہیں یا ”نعت رنگ“ کے شائع کرنے کی وجہ سے مشہور ہیں اب انھوں نے ادارت کا قلمدان بند کر کے ترتیب و تدوین کا کام بھی شروع کر دیا ہے اب نئے نئے شعبوں کی تلاش میں ہیں کہ اپنے جوہر دکھلائیں۔ مؤلف نو کی حیثیت سے انھوں نے ”غالب اور ثنائے خواجہ“ پیش کر دی ہے ”نعت رنگ“ میں شائع ہونے والے ان مضامین کا مجموعہ جن میں غالب کی نعت گوئی کو موضوع بنایا گیا ہے مضامین و قیام اور جان دار ہیں مگر موضوع اتنا وسیع ہے کہ ابھی تشنگی باقی ہے اردو میں چیدہ چیدہ اشعار نعتیہ ہیں مگر فارسی میں بھرپور نعتیں ہیں ان کی فارسی نعتوں کا جس قدر ذکر اس کتاب میں ہونا چاہیے تھا نہیں ہے ہمارے محبِ محترم ڈاکٹر سید تقی عابدی مقیم ٹورانٹو نے مذہبی لٹریچر کی اشاعت نو

کے سلسلہ میں جو عظیم کام شروع کیا ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے انھوں نے ایک ضخیم دیوانِ غالب نعت و منقبت مرتب کیا ہے جو ۸۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اس میں غالب کی تمام فارسی نعتیں شامل ہیں۔ مجموعی طور پر نعتیہ اشعار کی تعداد ڈھائی سو سے زائد ہے اکثر اشعار کا مفہوم اردو میں دے دیا ہے مگر بہت سے اشعار کو اس عمل سے محروم رکھا گیا ہے اب جب کہ فارسی داں طبقہ برائے نام رہ گیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ فارسی کلام کو سمجھنے کے لیے اردو مفہوم سے کام لیا جائے ڈاکٹر صاحب موصوف اسے بخیر و خوبی کر سکتے تھے کہ وہ فارسی کو اہل زبان کی طرح بولتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ”نعت رنگ“ غالب کی فارسی نعتوں کا اردو منظوم ترجمہ کروا کر اسے اہتمام سے شائع کرے غالب کی فارسی مثنوی ”ابر گوہر بار“ کا ایک طویل حصہ نعتیہ اشعار پر مشتمل ہے یاد پڑتا ہے اس کا اردو منظوم ترجمہ مرحوم رفیق خاور نے کیا تھا اور انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔ (شفقت رضوی ص ۴۹۵)

(۱۰) ”فہرست کتب نعت لائبریری“

”فہرست کتب نعت لائبریری“ ایک اہم جدت ہے اول تو نعت لائبریری خود ایک جدت ہے قابلِ تحسین ہیں وہ حضرات جنھوں نے بے سرو سامانی میں ذوق کی تکمیل کی کوشش کی یہ عمل ان کی ہمت و حوصلہ، لگن اور خلوص کی نشان دہی کرتا ہے اور صاحبِ وسیلہ، ظاہر پرست نمود و نمائش کے خواہاں صاحبانِ ثروت کے منہ پر طمانچہ ہے جو شخص لائبریری اپنی دولت مندی کی نمائش کے ساتھ بے جا صاحبِ ذوق علم و ادب ہونے کی شباهت کے طور پر رکھتے ہیں حالاں کہ ان لائبریریوں کی کتابیں کبھی کھول کر دیکھی بھی نہیں گئی ہوتیں۔ نعت لائبریری کا تصور اعلیٰ ذہنی اور روحانی خلوص کا نتیجہ ہے۔

اس سلسلے میں پہلے راجا شید محمود اور غوث میاں کے نام سننے میں آئے ہیں یہ میری بد نصیبی ہے کہ کبھی ان سے استفادہ کا موقع نہیں ملا اب نعت ریسرچ سینٹر نے بھی اس نوع کی لائبریری قائم کی ہے ان تمام لائبریریوں کی فہارس کتب تیار ہو جائیں تو محقق حضرات کی رہنمائی کے لیے ادبی ماخذ بن جائیں گی ہم محمد یوسف ورک صاحب قادری کی خدمت میں سپاس گزار ہیں کہ ان کی محنت اور کاوش سے شاہدِ نعت لائبریری کا قیام عمل آیا ہے اور اس بات کے لیے بھی سپاس گزار ہیں کہ انھوں نے فہرست بھی مرتب کر دی۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ موجود کتب کی نسبت سے مطلوبہ کتب کی تعداد کم نہیں ہے یہ صاحبانِ تصنیف اور ناشرین کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ (شفقت رضوی ص ۴۹۶)

(۱۱) "Reverence Unto His Feet"

اور آخر میں سب سے اہم کتاب ہے صبیح رحمانی کی نعتوں کا انگریزی ترجمہ "Reverence Unto His Feet" ہم پہلے ہی صبیح رحمانی کی نعتوں کی سحر کے اسیر تھے اب سارہ کاظمی کے انگریزی ترجمے نے اس دام کو مزید مضبوط کر دیا ہے اردو شاعری کے ترجمے تو ہماری نظر سے گزرے ہیں لیکن نعتوں کا کوئی ترجمہ اب تک دیکھنے کو نہیں ملا۔ سارہ کاظمی کو اس سلسلہ میں تقدم کا شرف حاصل ہے۔ یہ ترجمہ انھوں نے اصل مفہوم میں ڈوب کر کیا ہے۔ اس میں تخلیقی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اندازہ ہوا کہ انھیں انگریزی زبان پر کامل عبور حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے مضامین کو اس زبان میں ادا کرنے کی قدرت رکھتی ہے ایک بات اس میں ہمیں یہ بھی نظر آئی کہ جہاں عربی یا مذہبی الفاظ و اصطلاحات استعمال کی ہیں تو ان کا صحیح تلفظ من و عن لکھا ہے۔ دوسرے لکھنے والوں کی طرح الفاظ کا حلیہ نہیں بگاڑا ہے اب ہم حیران ہیں اس کتاب کے لیے صبیح رحمانی کو تحسین کے لائق سمجھیں یا محترمہ کی خدمت میں کلمات تحسین گزاریں یہ ایک اہم کاوش ہے شاعر کو غیر اردو دنیا میں متعارف کروانے کی لاجواب کوشش ہے۔ (شفقت رضوی ص، ۴۹۶)

(۱۲) ”بلغ العلیٰ بکمالہ“:

میرا نام ڈاکٹر منور غازی ہے۔ ایک مدت سے سعودی عرب میں مقیم ہوں۔ ”نعت رنگ“ کا قاری ہوں۔ چند روز کے لیے پاکستان میں آیا ہوا ہوں۔ سیرت پاک، تاریخ، ادب خصوصاً شاعری میرے پسندیدہ موضوع ہیں۔ تفہیم کا شعور رکھتا ہوں۔ سیرت، تاریخ شاعری اور فن شاعری کی ایک بہت بڑی تعداد میرے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ تسلسل اور دیانت داری سے مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ ”نعت رنگ“ میں جناب عارف منصور کا بلغ العلیٰ بکمالہ پر تبصرہ پڑھا۔ میں نے یہ عمدہ کتاب بار بار پڑھی ہے۔ تبصرہ پڑھ کر حیرت زدہ ہوں۔

محترم تبصرہ نگار نے اپنی بات کا آغاز مولانا صفی الرحمن مبارک پوری کی کتاب ”الرحیق المختوم“ سے کیا۔ انھوں نے چند جملوں میں الرحیق المختوم کا پروفیسر عبد الجبار شاہر سے تعلق واضح کرتے ہوئے فتویٰ صادر فرمایا کہ بلغ العلیٰ بکمالہ کے شاعر جناب خورشید ناظر نے اپنی کتاب شاہر صاحب کی فرمائش پر لکھی جس کے لیے انھوں نے کتاب میں ”پہلی بات“ کے عنوان سے لکھی گئی تحریر کو اپنی مذکورہ رائے کا ذریعہ بنایا ہے۔ لگتا ہے کہ تبصرہ نگار محترم نے اس تحریر کو نہ تو

توجہ اور نہ ہی صدق دلی سے پڑھا ہے ورنہ وہ جن بحر انوں کا شکار ہوئے، صدق دلی اور توجہ سے پڑھ لینے کی صورت میں وہ ان بحر انوں سے محفوظ رہتے۔ میں نے خورشید ناظر صاحب کی اس تحریر کو بار بار پڑھا ہے مجھے اس تحریر کے ایک لفظ سے بھی ثابت نہیں ہوا کہ شاعر نے اس قدر اہم اور عمدہ کتاب مولانا شاہر صاحب کی فرمائش پر تحریر کی بلکہ وہ تو لکھتے ہیں کہ روضہ رسول ۷ پر حاضری کے وقت انھوں نے دعا مانگی کہ ان سے کوئی ایسا کام لیا جائے جو آپ کو پسند ہو اور جس کے باعث وہ آپ کی شفاعت کے حق دار بن جائیں۔ اسی تحریر کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ جب یہ کتاب مکمل ہو گئی اور شاہر صاحب کو اس کے مکمل ہونے کا علم ہوا تو انھوں نے شاعر سے رابطہ قائم کر کے اس کتاب کی اشاعت کی خواہش کا اظہار کیا۔ محسوس ہوتا ہے کہ فاضل تبصرہ نگار پروفیسر عبد الجبار شاہر صاحب کے لیے دل میں کوئی ”خصوصی جذبات“ رکھتے ہیں جن کے زیر اثر انھوں نے ان کا نام آتے ہی غیر حقیقت پسندانہ الفاظ کی تلوار سونت لی اور اپنے تئیں جناب شاعر، پروفیسر شاہر صاحب، ”الرحیق المختوم“ اور زیر تبصرہ کتاب میں شامل مواد کو زخم زخم کرنے کے درپے ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سوائے ہوا میں تیغ زنی کرنے کچھ بھی نہ کر سکے بلکہ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ اس کا رروائی میں بحیثیت تبصرہ نگار اپنی شخصیت اور غیر جانب داری ہی کو مجروح کر سکے۔

فاضل تبصرہ نگار نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ شاعر نے اپنی کتاب کا نوے فیصد مواد ”الرحیق المختوم“ سے لیا۔ اگر ایک لمحے کے لیے یہ فرض کر لیا جائے کہ فاضل تبصرہ نگار نے بجا فرمایا تو ان سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ خود صاحب الرحیق المختوم یا کسی بھی سیرت نگار نے اپنی کتاب کا مواد کہاں سے لیا؟ جب سیرت پاک کی سبھی کتب اپنا چراغ روشن کرنے کے لیے اس سے پہلے روشن ہونے والے چراغوں سے استفادہ کرتے ہیں تو ایسے میں خورشید ناظر نے کون سا گناہ کر لیا۔ سیرت کی کسی بھی کتاب کو اٹھا لیجیے، آپ دیکھیں گے کہ وہ مواد جو اس کتاب میں شامل ہے وہ تقریباً سبھی دوسری کتب میں موجود ہے۔ سیرت پاک کی کون سی کتاب ہے جس میں زمانہ جہالت، عرب کی تاریخ، آپ کا خاندان، دنیا میں آپ کی تشریف آوری، آپ کا بچپن، آپ کی جوانی، آپ کی مصروفیات، آپ کا کردار، آپ کی عبادات، آپ کو نبوت کی عطا، تبلیغ، مشکلات، ہجرت، مدنی زندگی، غزوات، فتوحات، ازواج مطہرات و صحابہ کرام، دین حق کو پھیلانے میں آپ کی کوششوں، ان کی کامیابی، آپ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے وغیرہ جیسے موضوعات شامل

نہیں۔ آپ زیر تبصرہ کتاب کا صدق دلی سے مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ محترم شاعر نے گو سیرت کی بہت سی کتابوں سے بجا طور پر استفادہ کیا ہے لیکن قدم قدم پر اپنے منفرد انداز، قابل ستائش تحقیق اور قابل رشک تبصروں سے کتاب کو منفرد بنا دیا ہے لیکن اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے ”خصوصی جذبات“ کی بجائے صدق دلی اور غیر جانب داری اولین شرط ہے۔

جناب خورشید ناظر نے اپنی تحریر پہلی بات میں حضرت حفیظ جالندھری کے ’شاہ نامہ اسلام‘ میں حضرت انسؓ کے نام کے سلسلے میں حضرت حفیظ کو عظیم شاعر قرار دینے کے بعد صرف اتنی بات کی کہ انھوں نے حضرت انسؓ کے نام کو اصل حرکات و سکنات کے مطابق نظم نہیں کیا۔ فاضل تبصرہ نگار نے اس پر بات کرنے کی بجائے فوراً انھیں جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ کے جواب میں یہ لکھ کر بوجھوں مارنے کی ناکام کوشش کی کہ خورشید ناظر صاحب نے الفاظ ”نہ“ اور ”کہ“ کو دو حرفی الفاظ کے طور پر نظم کر کے اپنے کہے ہوئے سیکڑوں اشعار کو بے وزن کر دیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عارف منصور صاحب کی فن شاعری سے سرسری واقفیت پایہ ثبوت کو پہنچی۔ ان حیرت انگیز خیالات کا اظہار کرنے سے پہلے انھیں یہ یاد نہیں رہا کہ کوئی شعر یا مصرع صرف اس وقت بے وزن ہوتا ہے جب اس میں استعمال ہونے والے کسی لفظ کے حروف کو اس کی اصل تعداد اور حرکات و سکنات کے مطابق استعمال نہ کیا جائے سوائے ان حروف کے جنہیں فن شاعری کے تحت متحرک یا غیر متحرک کرنے یا غیر محسوب کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ فن شاعری کے تحت حروف علت اور کبھی کبھی حرف ”ہ“ کو غیر محسوب کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ عروض کی کتب میں مذکورہ رعایت تو واضح طور پر موجود ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ اگر ان حروف کو محسوب کر لیا جائے تو شعر بے وزن ہو جائے گا۔ یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ شاعر کو لفظ ”وہ“ کو ”و“ باندھنے کی اجازت ہے لیکن وہ اسے اگر ”وہ“ باندھے تو شعر بے وزن ہو جائے۔ یہی صورت حال الفاظ نہ اور کہ کے ساتھ ساتھ یہ، جو، تو، اس اور کئی دیگر الفاظ پر بھی صادق آتی ہے۔ الفاظ ”نہ“ اور ”کہ“ کے دو حرفی الفاظ کے طور پر استعمال ہونے اور محسوب ہونے کے سلسلے میں قدیم اور جدید عہد کے نامور شعرا کے کئی اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن زوائد سے بچتے ہوئے خدائے سخن میر تقی میر کا صرف ایک شعر تفتیح کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

تشہ لب مر گئے ترے عاشق
نہ ملی ایک بوند پانی کی

تش لب مر گئے ترے عاشق نہ ملی اے کبود پانی کی
فاعلن فاعلن مفاعلی لن فاعلن فاعلن مفاعلی لن
میری اس گزارش سے فن کا شعور رکھنے والے سبھی لوگ اتفاق کریں گے کہ وہ لفظ جو کسی شعر میں اپنے حقیقی وزن کے عین مطابق استعمال ہوا ہو اور جسے میر تقی میر نے اس کے حقیقی وزن پر باندھا ہو اسے کون ناروا قرار دے سکتا ہے۔ یہاں مجھے حفیظ جالندھری صاحب کا ایک مصرع یاد آ رہا ہے:

تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمہیں بھلا سکے
تم نے ہمے بھلا دیا ہم نہ تمے بھلا سکے
مس تفعلن، مفاعلن مس تفعلن مفاعلن

صاحب بحر الفصاحت مولوی نجم الغنی صاحب رام پوری نے ہرج مسدس اخرب مقبوض مخ کے ذیل میں ایک شعر تفتیح کے ساتھ درج کیا ہے جسے عارف منصور صاحب کے لیے ہو بہو درج کر رہا ہوں۔ شعر صہبائی کا ہے:

بیٹھا وہ رقیب کے جو پہلو میں اٹھایہ درد دل کہ کھینچی آہ

تفتیح، بیٹا، ”مفعول“ رقیب کے ”مفاعلن“ ج پہلو میں ”مفاعیلان“ اٹ ٹاہیہ ”مفعولن“ درد دل ”فاعلن“ کہ کچی آہ ”مفاعیلان“۔

حوالہ: بحر الفصاحب، حصہ دوم علم عروض، مصنف مولوی نجم الغنی رام پوری۔ مرتب سید قدرت نقوی، مجلس ترقی اردو، لاہور ص ۱۱۹

جناب عارف منصور کی عروض دانی اور علمی کمال پر اس وقت تو عیش عیش کرنے کو جی چاہا جب انھوں نے جناب خورشید ناظر کے بارے میں لکھا کہ انھوں نے ”نہ“ اور ”کہ“ کو دو حرفی یعنی بروزن ”منع“ نظم کیا ہے۔ انھیں ایسا لکھتے وقت شاید یہ معمولی سی بات بھی یاد نہیں رہی کہ ”منع“ نہ حرفی لفظ ہے جب کہ ”نہ“ اور ”کہ“ دو حرفی الفاظ ہیں۔ انھوں نے دو حرفی کے لیے نہ حرفی لفظ کی مثال دے کر اپنے علم کو جو چار چاند لگائے ہیں وہ ان جیسے منصب کے لوگوں کا ہی حصہ ہے۔ میں فن شاعری کے ایک طالب علم کے طور پر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ”بلغ العالمیہ بکمالہ“ میں شاعر نے ایک جگہ بھی مذکورہ دو الفاظ کے استعمال سے شعر کو بے وزن نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے ان دو الفاظ کو اہل فن کی جانب سے دی گئی رعایت کے زیر اثر یا تو یک حرفی یا پھر

بجا طور پر دو حرفی الفاظ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تمام قدیم اور جدید شعراء نے فن شاعری کی جانب سے دی گئی رعایت کے زیر اثر کیوں کہ ”نہ“ اور ”کہ“ اور دیگر کئی الفاظ کو بکثرت یک حرفی لفظ کے طور پر استعمال کیا ہے اس لیے جناب عارف منصور صاحب جیسے ”علما“ یہ سمجھ بیٹھے کہ انھیں صرف یک حرفی کے طور پر ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جو درست بات نہیں۔ وزن ہی کے ذیل میں آگے چل کر جناب عارف منصور نے لفظ ”وہی“ کے بارے میں لکھا ہے کہ شاعر نے اس کے حرف ”ح“ کو متحرک کر کے اس لفظ سے اپنے اشعار کو بے وزن کر دیا ہے۔

کسی لفظ کے تلفظ کے تعین کے لیے سب سے مستند ذریعہ لغت ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ فاضل تبصرہ نگار نے اگر خورشید ناظر صاحب کی تحریر ”پہلی بات“ کو توجہ سے پڑھا ہوتا تو انھیں تبصرہ لکھتے وقت یاد رہتا کہ انھوں نے ایک سے زیادہ تلفظ کے حاصل الفاظ کے استعمال کے لیے کسی ایک لغت سے اجازت کی صورت میں بھی اس تلفظ سے استفادہ کیا ہے اور یہ استفادہ بالکل بجا بھی ہے۔ لفظ وحی کے ذیل میں اگر فیروز اللغات کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں لفظ وحی کے وسطی حرف ”ح“ کو متحرک لکھ کر باقاعدہ نوٹ دیا گیا ہے کہ یہ لفظ اردو میں اس تلفظ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور کیوں کہ خورشید ناظر صاحب اردو ہی میں شعر کہہ رہے تھے اس لیے انھوں نے اپنے جن اشعار میں اسے متحرک ”ح“ کے ساتھ استعمال کیا ہے، ان اشعار کو بے وزن نہیں کہا جاسکتا۔ علاوہ ازیں یہ گزارش بھی عارف منصور صاحب کے علم میں اضافے کا باعث بنے گی کہ فیروز اللغات کے علاوہ نور اللغات، جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رافع اللغات، سید شہاب الدین دسنوی اور فہمیدہ بیگم ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو دہلی کی جامع اردو لغات اور وارث سرہندی کی علمی اردو لغت میں بھی لفظ وحی کے حرف ”ح“ کو متحرک لکھا گیا ہے۔

جناب عارف منصور صاحب نے اپنے تبصرے کو ”فنی“ بنانے کے لیے ہزاروں اشعار میں سے چند اشعار لکھ کر ان میں سے کچھ الفاظ کے نیچے خط کھینچ دیا ہے اور انھیں تعقید لفظی کا شکار ہونے والے اشعار قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میں نے فاضل تبصرہ نگار کی طرف سے نشان دہی کے بعد ان اشعار کو سیاق و سباق کے ساتھ ایک بار پھر پڑھا تو مجھے ان کے ساتھ اتفاق کرنے کے لیے بے حد کوشش کے بعد بھی کوئی معقول وجہ ہاتھ نہ آسکی۔

فاضل تبصرہ نگار نے مندرجہ بالا خیالات کے اظہار کے بعد کچھ واقعات میں پائے جانے والے تسامحات کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے حضرت عمارؓ کی شہادت کی طرف اشارہ کیا ہے، جو

بجا ہے۔ اس موقع پر حضرت یاسرؓ کا نام نظم ہونا چاہیے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سلسلے میں شاعر کی معلومات کمزور نہیں۔ اگر وہ سمجھتے کہ حضرت عمارؓ شہید ہو گئے تو وہ آگے چل کر صفحہ نمبر ۳۸۵ پر ان کا ذکر دوبارہ نہ کرتے۔ ایسے ہی معاملات کے لیے انھوں نے اپنی تحریر ”پہلی بات“ میں واضح طور پر تحریر کیا ہے کہ قارئین نشان دہی کر کے انھیں ممنون کریں۔ اتنے بڑے کام میں اس طرح کی بات کوئی بڑی بات نہیں۔ اس کے لیے اس قدر جذباتی ہونے اور جارحانہ انداز اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

جناب عارف منصور نے حضرت حارثؓ بن ابی مالہ کی شہادت کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ میرے مطالعے کے مطابق رومانیہ کے سابق وزیر خارجہ کونستین ورجل جورجیو نے ”محمد ایسے پیغمبر ہیں جنہیں پہچاننے کی از سر نو کوشش کرنی چاہیے“ کے نام سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا جسے فروری ۱۹۹۳ء میں سیارہ ڈائجسٹ نے ترجمہ کر کے عکس سیرت نمبر کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس وقت مدیر اعلیٰ امجد رؤف خان تھے۔ اس کتاب کی عمر کی اور اس کے اعلیٰ معیار کے حاصل ہونے کی بابت ڈاکٹر ظہور احمد اطہر، ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ اور ڈاکٹر ایم۔ اے فاروقی کی تحریریں بھی کتاب کی ابتداء میں موجود ہیں۔ عکس سیرت نمبر میں حضرت حارثؓ کی شہادت کا واقعہ بالکل اسی طرح درج ہے جیسے حضرت خورشید ناظر نے نظم کیا ہے۔ یہ واقعہ اس کتاب کے صفحہ نمبر ۲۳ پر موجود ہے۔ علاوہ ازیں اس غلام جس نے سفر طائف کے دوران آپ کی خدمت میں انگور پیش کیے تھے، اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۸۵ پر اس کا نام عدس لکھا گیا ہے۔ اس نام کو کئی کتابوں میں مختلف انداز میں لکھا گیا ہے، شاعر کو ان میں سے صرف ایک ہی نام نظم کرنا تھا اور انھوں نے اس نام کے سلسلے میں عکس سیرت کی تحقیق پر اعتماد کیا ہے فاضل تبصرہ نگار میری ان گزارشات کی اگر تصدیق کر لیں تو مجھے خوشی ہوگی۔

کسی کتاب کو تحریر کرتے ہوئے مصنف واقعات کی ترتیب اور بیان میں اپنا ہی خاکہ مرتب کرتا ہے۔ سیرت پاک کے سلسلے میں ان گنت کتب منظر عام پر آچکی ہیں اور یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے گا۔ اب تک لکھی جانے والی کتب میں کیا ہم کسی ایک کتاب کے بارے میں بھی یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب بہر طور مکمل ہے اور اس کتاب میں آپ کی ذات مبارک سے متعلق ہر واقعہ، ہر لمحہ اور ہر پہلو کا احاطہ ہو گیا ہے۔ اس صورت حال میں اگر کوئی واقعہ رہ جائے یا پھر اس قدر تفصیل کا حامل نہ ہو کہ ہر سطح کے قاری کی توقع پر پورا اترے تو یہ کوئی ایسی بات

نہیں جس کے باعث مصنف کی لاتعداد قابل تحسین کوششوں کو سراہنے سے بھی گریز کیا جائے۔ فاضل تبصرہ نگار کے رویے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب کے ایک ایک لفظ اور ترتیب کے ہر عمل کو صرف اپنی منشا کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی اس منشا کی سرمقدم تکمیل کتاب کو عجب درجے پر لے آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی علمی، ادبی اور دیانتدارانہ رویہ نہیں۔ علاوہ ازیں کسی واقعے کے اسی طرح بیان کرنے پر جیسا کہ وہ کئی مستند کتب میں مذکور ہوا ان کے جذبات میں ناقابل فہم تموج پیدا ہو جاتا ہے اور وہ لفظوں کا پھونچال برپا کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ ان کے لیے تو یہ بات بھی ناقابل برداشت ہے کہ کوئی کسی کے فن، محنت اور محبت کی حقیقت کے آئینے میں تحسین کرے۔ ان سے گزارش کی جاسکتی ہے کہ وہ سیرت پاک کی کسی ایسی کتاب کا نام بتائیں جس کے سبھی ابواب اور عنوانات مصرعوں کی شکل میں ہوں، یہ سبھی مصرعے تاحے، تی ہے، تے ہیں وغیرہ پر ختم ہوتے ہوں، جس میں اسما کو صرف کنیت نہیں، انھیں مکمل طور پر درج کرنے کی کوشش کی گئی ہو، جس میں نعت کا ایک دریا موجزن ہو، جس کا اسلوب اتنا سادہ، دل نشیں اور ہر سطح کے قاری کے لیے اتنا آسان ہو کہ سیرت پاک کو سمجھنے کے لیے اسے کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں نے اس کتاب کو کئی بار پڑھا ہے، میری محترم تبصرہ نگار سے گزارش ہے کہ غزوہ احد کے تحت، اُحد کا کون فاتح تھا، کچھ اس پر بات ہوئی ہے، کے عنوان سے صفحہ نمبر ۳۰۶ پر نظم ہونے والے حصے کو پڑھیں اور بتائیں کہ کیا سیرت پاک کی کسی کتاب میں اس طرح کا تبصرہ موجود ہے۔ وہ صفحہ نمبر ۳۳۹ پر موجود آخری عنوان کی تفصیل پڑھیں اور بتائیں کہ بنو قریظہ کو سزا کے لیے جو جواز خورشید ناظر صاحب نے مہیا کیا ہے، اس سے پہلے کہیں مذکور ہوا ہے؟ یہ اور اسی طرح کی ان گنت باتیں ایسی ہیں جو اس کتاب کو نا صرف منفرد بلکہ یقیناً شاہ کار کے درجے پر لے جاتی ہیں۔ وہ اس کتاب کو صرف اس لیے ناپسند نہ فرمائیں کہ اس کے ناشر پروفیسر عبد الجبار شاہ صاحب کے صاحبزادے ہیں جنھیں وہ مخصوص وجوہ کے باعث ناپسند کرتے ہیں۔ یہ کتاب دنیا داری کی سبھی آلائشوں سے پاک ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جس کا نہ تو کسی گروپ سے تعلق ہے اور نہ وہ کسی شہرت کا بھوکا نظر آتا ہے بلکہ وہ صرف اور صرف محبت رسول کو اپنی زندگی اور آخرت کے لیے بہترین اثاثہ سمجھتا ہے۔ میں جناب عارف منصور صاحب سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے رویے پر نا صرف نظر ثانی فرمائیں بلکہ کتب پر تبصرہ کرتے وقت اس ”غیر معمولی کیفیت“ کا شکار نہ ہوا کریں جسے خورشید ناظر صاحب کی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنے لیے مناسب

سمجھا اور جس کے زیر اثر وہ کتاب کے ظاہری حسن تک کی تعریف کرنا بھول گئے۔ میں ان کی اس صلاحیت کا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ خوشبوؤں بھرے طویل رستے کو طے کر لیتے ہیں اور انھیں خوشبو کا کوئی جھوٹا متاثر نہیں کرتا۔ میں ایک بزرگ کی حیثیت سے انھیں یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ انھیں بہت سے مطالعے کی ضرورت ہے، انھیں کچھ وقت اچھی کتب پڑھنے پر صرف کرنا چاہیے۔ انھیں کسی فن کو مفروضوں کی بجائے، اس کے اصولوں کے مطابق پرکھنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے اور علمی معاملات پر بات کرنے کے لیے ”خصوصی جذبات“ سے گریز کرتے ہوئے انھیں غیر جانب داری سے دیکھنا چاہیے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ بلاوجہ عیب جوئی عیب جو کے لیے باعث رسوائی بن جاتی ہے۔ اچھے لوگ اچھے کاموں کی تحسین میں بخل سے کام نہیں لیتے کیوں کہ قاری ایسے بھی بے علم نہیں ہوتے کہ جو مکمل طور پر غلط تبصروں کے پس پردہ پائے جانے والے منفی رویے کو پہچان نہ سکیں۔

جناب صلیح الدین صاحب! میں اپنی گزارشات اس موقع کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ آپ کتب کے تبصروں کے لیے ایسے حضرات کا انتخاب فرمایا کریں جو علم کی اس جہت سے واقف ہوں جس پر کتاب لکھی گئی اور سب سے زیادہ یہ ضروری ہے کہ وہ غیر جانبدار ہوں۔ اگر آپ نے یہ احتیاط کر لی تو یہ ہم سب کے لیے بہتر ہوگا کیوں کہ آپ نے محبت رسول کا جو چراغ روشن کر رکھا ہے اُسے دنیا داری کے ہر پہلو سے اپنی لوگوں کو بہر حال محفوظ رکھنا ہے۔ (ڈاکٹر منور غازی ص، ۸۵۹-۸۵۳)

(۱۳) ”اردو کے نعتیہ ادب کے انتقادی سرمایے کا تحقیقی مطالعہ“:

اس تناظر میں صاحب نظر نقاد و محقق اور عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ڈاکٹر عزیز احسن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ”اردو کے نعتیہ ادب کے انتقادی سرمایے کا تحقیقی مطالعہ“ ایک روشن سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نعت شناسی کے حوالے سے تاریخ ادب میں یہ کتاب ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ڈاکٹر عزیز احسن نے اس کتاب کے ’پیش گفتار‘ میں لکھا ہے کہ ’سید صلیح الدین صلیح رحمانی‘ میرے شکریے کے اس لیے مستحق ہیں کہ انہی کی تحریک پر میں نے تنقیدی مضامین لکھے اور انہی کے اصرار پر (ریٹائرمنٹ کے بعد) پی ایچ ڈی کی سطح کا مقالہ لکھنے کا ڈول ڈالا۔ علاوہ ازیں نعتیہ ادب سے متعلق کتب کی فراہمی کی جان لیوا محنت سے بھی انھوں نے بہت حد تک بے نیاز کر دیا۔“ گویا آپ ہی اردو کے نعتیہ ادب پر لکھے گئے اس واقع تحقیقی مقالے کے محرک اور بنیاد گزار ہیں۔ سرسید

نے ۱۸۷۹ء میں حالی سے مدرسہ مدو جزر اسلام لکھوائی تھی اور، آپ نے ڈاکٹر عزیز احسن سے اردو کے نعتیہ ادب پر ایسی شاندار اور تحقیقی کتاب لکھوائی۔ میری نگاہ میں یہ مقالہ ”نعت رنگ“ کے شجر ہی کی ایک علمی شاخ ہے۔ بلاشبہ یہ مراتب کاوش سے نہیں فیضانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے عطا ہوتے ہیں۔ (ڈاکٹر فراست رضوی ص، ۹۰۳/۲۵)

(۱۴) ”کلام محسن کا کوروی: ادبی و فکری جہات“ اور

”اقبال کی نعت، فکری و اسلوبیاتی مطالعہ“ مرتبہ صبیح رحمانی:

آپ کی مرتب کردہ دونوں کتابیں ”کلام محسن کا کوروی: ادبی و فکری جہات“ اور ”اقبال کی نعت، فکری و اسلوبیاتی مطالعہ“ ملیں۔ بھیجنے والے تو اور ناشر تو مبین مرزا ہیں لیکن گمان ہے کہ آپ کی ہدایت پر یہ کتابیں انھوں نے مجھے بھیجی ہوں گی۔ میں آپ دونوں حضرات اور خاص کر آپ کا ممنون ہوں۔ آنکھوں میں تکلیف کے باعث کتابوں کو جگہ جگہ سے دیکھا۔ انشاء اللہ جب آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی تو بلا استعیاب پڑھوں گا۔ افضال احمد انور کے مضمون ”اقبال کی نظم ذوق و شوق حمد ہے یا نعت؟“ نے خاص طور پر متوجہ کیا۔ لیکن افسوس کہ اردو کے عام نقادوں کی طرح موصوف نے بھی ادھر ادھر کی باتیں بہت کی ہیں اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے گریز کرتے رہے ہیں۔ بہر حال یہ بہت اچھی بات ہے کہ اقبال کی نعتیہ شاعری پر بھی ایک اچھی کتاب منظر عام پر آگئی۔ یہ ضرور ہے کہ شاعر کے تین عقیدت بلکہ مذہبی عقیدت کا رنگ جگہ جگہ زیادہ ہی نمایاں ہو گیا ہے۔ ”کلام محسن کا کوروی“ میں کئی مضمون تو خیر بھرتی کے ہیں۔ مثلاً ”محسن کا کوروی کی مثنویاں“، ”محسن کا کوروی، منفرد نعت گو“۔ ابواللیث صدیقی نے تیس صفحے صرف کیے لیکن کام کی باتیں بہت کم کہیں۔ سب سے اچھا مضمون ظاہر ہے کہ عسکری صاحب کا ہے۔ دونوں کتابوں کی اشاعت پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ یقین ہے کہ آپ کی یہ کوشش بارگاہ رسالت میں اور ہم جیسے عام پڑھنے والوں میں بھی مقبول ہوں گی۔ (شمس الرحمن فاروقی، غیر مطبوعہ)

شخصیات

(۱) اس باب میں نعت سے متعلق ادبی شخصیات کے حالات زندگی اور کلام پر تنقیدی مطالعات پیش کیے گئے ہیں۔ ہر اقتباس کے ساتھ متعلقہ شخصیت کا نام اور آخذ کا صفحہ نمبر درج ہے۔ جس صفحہ نمبر کے ساتھ مصنف تحریر ہے وہ مصنف کی اپنی تحریر ہے۔

اعلیٰ حضرت احمد رضا خان

تعارف: مولانا علیہ الرحمہ دورِ آخرین کے علماء اسلام میں اپنے تجربہ علمی اور کثرتِ تصانیف کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی ذات ہمہ صفات بے نظیر و منفرد ہے اور ان کے علمی کمالات سے انکار ممکن نہیں ہے۔ (کوکب نورانی ۳/۳۴۰)

اردو نعت گو شعرا میں حضرت احمد رضا فاضل بریلویؒ جس طرح ممتاز و ممتاز ہیں، اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ دراصل وہ ایک نیکو کار اور ایک عابد شب زندہ دار تھے۔ اصول و فروع دین پر کاربند رہنے کے ساتھ ساتھ شارع دین متین کی مدح و ثنا کو بھی عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ حضرت فاضل بریلویؒ کی نعت گوئی معرفتِ رسول خدا ﷺ کا ایک دستاویز ثبوت ہے۔ یہ معرفت انھیں محبوب حق کے عشق میں فنا ہو جانے کے بعد نصیب ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتوں میں ایمان و عقیدہ کی للک کے ساتھ ساتھ عشقِ محمد ﷺ کا سوز اور کسک بھی ہے۔ ڈاکٹر صابر سنبھلی (بھارت) حضرت رضا بریلویؒ کے فن و شخصیت کے عارف ہیں۔ انھوں نے حضرت بریلویؒ کی نعت میں مضمون آفرینی کے متنوع ابعاد کی نشان دہی کی ہے۔ البتہ ان کی تمہیدی سطور میں ایسی گفتگو کا اعادہ کیا گیا ہے، جسے سامعین سن کر اور قارئین پڑھ کر اکتا چکے ہیں۔ (قصر نجفی ص، ۷۵۲)

ادھر اردو کے صفِ اوّل کے نعت گو شاعر حضرت امام احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمہ کو بھی ہمارے بعض علماء کرام نے ”فاضل بریلوی“ سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ حالاں کہ ان علما میں بھی بعض شاعری کرتے ہیں۔ ایک شاعر دوسرے شاعر کی عظمت اور اہمیت کو بہتر جانتا ہے۔ اب مولانا احمد رضا خان کی شاعرانہ حیثیت اور مقام و مرتبہ پر کھل کر بات کرنا ہوگی۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ (۱) جب تنقید کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کلام رضا پر کام کیا جائے۔

(۲) تحقیقی اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بے لاگ تحقیق کی جائے۔ اس کے لیے ہم عقیدت مند ان رضا کو حوصلے اور برداشت سے کام لینا ہوگا۔ اور دلائل کی روشنی میں بات کو آگے بڑھانا ہوگا۔ آپ نے 'جام نور' (نئی دہلی) کو دیے گئے انٹرویو (مئی ۲۰۰۵ء) میں ایک سوال کے جواب میں درست کہا ہے کہ: (۴۷۴)

مولانا احمد رضا خان صاحب پر کام کرنے والوں پر ایک خوف کا سایہ ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری کو اگر ہم تنقیدی رویوں سے گزاریں گے تو ہمارے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن جائے گا جب کہ میرا خیال یہ ہے کہ اس تاثر کو ختم کرنا چاہیے۔ دیکھیے! غالب اردو کا ایک عظیم شاعر ہے اگر اس کے حق میں دو سو کتاہیں وجود میں آئی ہیں تو اس کے فن کے خلاف بھی دو سو کتاہیں وجود میں آئی ہیں مگر شاعر ہونے کی حیثیت سے اس کے قدر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ تنقیدی کسوٹی سے گزر کر اس کی شاعری دن بدن فن کے نئے پہلوؤں سے ہمیں آشنا کر رہی ہے۔ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کی شاعری اتنی بڑی، اتنی وقیع اور مقبول ہے کہ ان کے سر سے کلام کی مقبولیت اور عظمت کا تاج اب کوئی چھین نہیں سکتا۔ لیکن مولانا کی شاعری پر کھل کر گفتگو نہ کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ اب تک ان کا کوئی ادبی مقام متعین نہ ہو سکا۔ (صفحہ نمبر ۳۷) (ڈاکٹر شبیر احمد قادری ص، ۴۷۵)

اعلیٰ حضرت کی شاعری میں حسن طلب کی صورتیں:

ص ۳۷۱ پر ملک شیر محمد آف کالا باغ کی بارگاہ رسالت میں حاضری اور اقبال کا درج ذیل شعر پڑھ کر گریہ و زاری کرنے کا ذکر ہے:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

واقعی یہ شعر حسن طلب کی بہترین مثال ہے۔ رحمانی صاحب! یہ ایک حقیقت ہے کہ بارگاہ رسالت میں حاضری کے وقت زائر فکر مند ہوتا ہے کہ اتنے بڑے دربار میں اپنی درخواست کو کن الفاظ میں پیش کرے۔ یوں کہیے کہ عقل حیران اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی جب گزشتہ برس حاضری ہوئی۔ ایسے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل

بریلوی کے اشعار جو حسن طلب کا بہترین مرقع ہیں، زائر کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے ہمت بندھاتے ہیں۔ بطور تبرک 'نعت رنگ' کے قارئین اور مدینہ منورہ کے زائرین کے لیے چند اشعار حاضر ہیں: واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا 'نہیں' سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا تیرے قدموں میں جو ہیں، غیر کا منہ کیا دیکھیں کون نظروں پہ چڑھے دیکھ کے تلوا تیرا ایک میں کیا مرے عصیاں کی حقیقت کتنی مجھ سے سوا لاکھ کو کافی ہے اشارہ تیرا تیرے ٹکڑوں سے پلے، غیر کی ٹھوکر پہ نہ ڈال جھڑکیاں کھائیں کہاں چھوڑ کے صدقہ تیرا دیگر

اُف بے حیا یاں یہ منہ اور تیرے حضور ہاں تو کریم ہے، تری خُو درگزر کی ہے تجھ سے چھپائیں منہ تو کریں کس کے سامنے کیا اور بھی کسی سے توقع نظر کی ہے مومن ہوں مومنوں پہ رُف 'رجیم' ہو سائل ہوں سائلوں کو خوشی لانہر کی ہے دیگر

جنہیں مرقد میں تاحشر امتی کہہ کر پکارو گے ہمیں بھی یاد کر لو ان میں صدقہ اپنی رحمت کا دیگر

بد ہیں تو آپ کے ہیں بھلے ہیں تو آپ کے ٹکڑوں سے تو یہاں کے پلے رُخ کدھر کریں سرکار ہم کمینوں کے اطوار پر نہ جائیں آقا حضور! اپنے کرم پر نظر کریں جالوں پہ جال پڑ گئے للہ وقت ہے مشکل کشائی آپ کے ناخن اگر کریں دیگر

دم قدم کی خیر اے جان مسیح در پہ لائے ہیں دل بیمار ہم اپنی رحمت کی طرف دیکھیں حضور جانتے ہیں جیسے ہیں بدکار ہم میں غار، ایسا مسلمان کیجیے توڑ ڈالیں نفس کا زغار ہم ہاتھ اٹھا کر ایک ٹکڑا اے کریم ہیں سخی کے مال میں حق دار ہم دیگر

اب تو آقا منہ دکھانے کا نہیں کس طرح رفع ندامت کیجیے اپنی اک میٹھی نظر کے شہد سے چارہ زہر مصیبت کیجیے دے خدا ہمت کہ یہ جان حزیں آپ پر واریں وہ صورت کیجیے

آپ درگاہِ خدا میں ہیں وجہ ہاں شفاعت بالوجہت کیجیے
حق تمہیں فرما چکا اپنا حبیب اب شفاعت بالمحبت کیجیے
اذن کب کا مل چکا اب تو حضور ہم غریبوں کی شفاعت کیجیے

حضرت رضا بریلوی کے کلام میں حسنِ طلب پر مشتمل ایسے چند نہیں کئی اشعار ملتے ہیں۔ زائرینِ مدینہ سے گزارش ہے کہ آپ کے اردو نعتیہ کلام کا مجموعہ 'حدائقِ بخشش' ہمراہ رکھیں۔ عربی زائرین اعلیٰ حضرت بریلوی کے عربی کلام کا مجموعہ 'بساتین الغفران' کا منظوم عربی ترجمہ 'صفوة الممدوح' اپنے مطالعے میں لائیں۔

حسنِ طلب کی بات چلی تو ضمناً چند اشعار بطور تبرک پیش کر دیے۔ دراصل میں 'نعت رنگ' شمارہ ۱۷ کے حوالے سے چند گزارشات کر رہا تھا۔ (حافظ عطاء الرحمن قادری ص ۷۹۱-۷۹۰)

حدائقِ بخشش: ایک مطالعہ:

راقم الحروف نے مولانا کے مجموعہ نعت و منقبت 'حدائقِ بخشش' کا جائزہ اسی تناظر میں لیا ہے۔ فاضل بریلوی کا یہ مجموعہ سب سے پہلے ۱۳۲۵ھ میں طبع ہوا۔ اس وقت میرے سامنے اس کا جو نسخہ ہے اسے مدینہ پبلشنگ کمپنی میکلوڈ روڈ (موجودہ چندریگر روڈ) کراچی نے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ مشہور آفسٹ پریس کراچی میں چھپا ہے جب کہ سن اشاعت درج نہیں۔ ۱۰۴ صفحات کے اس مجموعے کا ہدیہ صرف نو (۹) روپے ہے جس سے اس کی قدامت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پہلے ہی صفحہ پر سب سے اوپر حدیث نبویؐ درج ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ 'بے شک شعر میں حکمت ہے اور بے شک بیان میں سحر ہے۔' مجموعے کی ابتدا اس مشہور نعت سے ہے جس کا مطلع یہ ہے:

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بلحا تیرا نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا
یہ نعت ۲۵ اشعار پر مشتمل ہے اسی سے متصل اسی زمین میں حضرت غوث الاعظم کی منقبت ہے اور اس میں بھی اشعار کی تعداد ۲۵ ہے، دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کیا دے جس پہ حمایت کا ہو پنچہ تیرا شیر کو خطرے میں لاتا نہیں گنتا تیرا
میری قسمت کی قسم کھائیں سگانِ بغداد ہند میں بھی ہوں تو دیتا رہوں پہرا تیرا
اس منقبت کے بعد دو مناقب اور ہیں جن میں سے ہر ایک ۲۵ اشعار پر مشتمل ہے، یہ

دونوں مناقب بھی حضرت غوث الاعظمؒ کی مدحت میں ہیں اس طرح نعت اور تینوں مناقب ملا کر فاضل بریلوی نے ایک ہی زمین میں مسلسل سواشعار کہے ہیں۔ جو ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے تاہم کہیں کہیں شدتِ جذبات میں ایسے اشعار کہے ہیں جن میں مخالفین کو زبردستی کا عنصر نہایت نمایاں ہے مثال کے طور پر غوث الاعظمؒ کو نہ ماننے والوں کو اس طرح مخاطب کیا ہے:

باز اشہب کی غلامی سے یہ آنکھیں پھرنی
دیکھ اڑ جائے گا ایمان کا طوطا تیرا!
شاخ پر بیٹھ کے جڑ کاٹنے کی فکر میں ہے
کہیں نیچا نہ دکھائے تجھے شجرِ تیرا!
حق سے بد ہو کے زمانہ کا بھلا بنتا ہے
ارے میں خوب سمجھتا ہوں معما تیرا

بعض اشعار میں فنی تسامحات بھی مل جاتے ہیں کیوں کہ یہ بشر کا کلام ہے، اللہ کا کلام تو ہے نہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:

اس گل کے سوا ہر پھول باگوشِ گراں آیا
دیکھے ہی گی اے بلبل جب وقتِ فغاں آیا!
طیبہ کے سوا سب باغِ پامال فنا ہوں گے
دیکھو گے چمن والو جب عہدِ خزاں آیا!
کچھ نعت کے طبقے کا عالم ہی نرالا ہے!!
سکتہ میں پڑی ہے عقل چکر میں گماں آیا!

تقطیع کرتے وقت پہلے، دوسرے اور تیسرے شعر میں بالترتیب پھول، باغ اور عقل کے آخری حروف بحر سے خارج ہو جائیں گے، اسی طرح یہ شعر دیکھیے:

تجھ سے اور جنت سے کیا مطلب وہابی دُور ہو
ہم رسول اللہ کے، جنت رسول اللہ کی!

لفظ 'وہابی' میں ہائے ہوز مشدود ہے کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسم 'وہاب' سے مشتق ہے جب کہ یہاں بغیر تشدید باندھا گیا ہے۔ یہ اشعار بھی دیکھیے:

سر سونے روضہ جھکا پھر تجھ کو کیا!!

دل تھا ساجد، نجدیا پھر تجھ کو کیا!
 دیوں کے بندوں سے کب ہے یہ خطاب
 تو نہ اُن کا ہے نہ تھا پھر تجھ کو کیا!
 مگر حقیقت یہ ہے کہ قرآن فرقہ بندی کے سخت خلاف ہے۔ اُمتِ مسلمہ کو ایک اللہ،
 ایک رسول ۷ ایک آخری کتاب یعنی قرآن اور ایک قبلے کی بنیاد پر متحد ہو جانا چاہیے اسی تناظر
 میں راقم الحروف کے یہ دو اشعار ملاحظہ فرمائیے:

مسلمان بھائی بھائی ہیں، خدا نے ہے یہ فرمایا!
 مگر یہ مولوی صاحب نہ جانے کیوں لڑاتے ہیں!
 ہمیں فرقہ پرستی سے بڑی نفرت ہے اے یارو!
 نہ ہم ہیں دیو کے بندے، نہ ہم حلوہ اُڑاتے ہیں
 فاضل بریلوی کے اس مجموعے میں خاک کے موضوع پر آٹھ اشعار مسلسل ہیں جن میں
 سے دو ملاحظہ فرمائیں:

ہم خاک ہیں اور خاک ہی ماوا ہے ہمارا
 خاکی تو وہ آدمِ جدِ اعلیٰ ہے ہمارا
 ہے خاک سے تعمیر مزارِ شہ کونین!
 معمور اسی خاک سے قبلہ ہے ہمارا
 بحرِ بزمِ شمنِ سالم میں فاضل بریلوی کے یہ نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

گنہ مغفور، دل روشن، خنک آنکھیں، جگر ٹھنڈا
 تعالیٰ اللہ ماہِ طیبہ عالمِ تیری طلعت کا!
 یہاں چھڑکا نمک، واں مرہم کافور ہاتھ آیا!
 دلِ زخمی نمک پروردہ ہے کس کی ملاحیت کا
 سرہانے اُن کے کُمل کے یہ بے تاب کی کا ماتم ہے!
 شہ کوثر! ترحم تشنہ جاتا ہے زیارت کا!

مندرجہ بالا اشعار میں طیبہ، پروردہ اور تشنہ تینوں الفاظ میں ہائے ہوز تقطیع میں شامل نہیں ہے جو
 حسنِ کلام سمجھا جاتا ہے لیکن ناواقف حضرات اس پر اعتراض کرتے ہیں جو ان کی کم فہمی ہے۔ علامہ

اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار میں ”دیدہ“ اور ”سجدہ“ کی بھی یہی کیفیت ہے جو کلام کا حسن ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے!
 بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!
 وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!
 ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!
 فاضل بریلوی کے اس شعر میں کتنا سوز پنہاں ہے اسے اہل دل ہی محسوس کر سکتے ہیں:

سویا کیے نابکار بندے! رویا کیے زار زار آقا!
 خلفائے راشدین کی منقبت میں یہ خوب صورت شعر دیکھیے:

صدق و عدل و کرم و ہمت میں چارو شہرے ہیں ان چاروں کے!
 اس مجموعے کے صفحہ نمبر ۱۴ پر یہ اشعار دیکھیے:

مفلسو! اُن کی گلی میں جا پڑو! باغِ خلدِ اکرام ہو ہی جائے گا!
 بادہ خواری کا سماں بندھنے تو دو! شیخِ دردِ آشام ہو ہی جائے گا!
 ”خلدِ اکرام“ اور ”دردِ آشام“ میں الف کا وصل ہے یعنی تقطیع کرتے وقت الف شمار نہیں
 ہوگا اور الف پر مدہ کی صورت میں نہ صرف ایک الف لیا جائے گا جو لوگ یہ بات نہیں جانتے وہ خواہ
 نخواہ ایسے اشعار پر اعتراض کرتے ہیں جو ان کی کم علمی ہے۔ غالب اور اقبال کے اشعار دیکھیے:

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
 یہ سوءِ ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
 تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے!

غالب کے پہلے مصرعے میں ”آج“ کا ایک الف جب کہ اقبال کے دونوں مصرعوں
 میں ”ایسا“ کا الف تقطیع میں شمار نہیں ہوگا۔ اقبال کے اس شعر کے مصرعہ ثانی میں الف کا وصل دو
 مرتبہ ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
 نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا!

فاضل بریلوی کا یہ شعر کافی مشہور ہے:

حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو! کعبہ تو دیکھ چکے، کعبے کا کعبہ دیکھو!

اب ذرا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیں:

کعبہ دلہن ہے، تربتِ اطہر نئی دلہن یہ رشکِ آفتاب وہ غیرتِ قمر کی ہے
اسی زمین میں حضور ۷ کا باعثِ تخلیق کائنات ہونا ایک نئے انداز سے ان اشعار

میں ملاحظہ فرمائیے:

اُن کی نبوت اُن کی لائت ہے سب کو عام
اُم البشر عروس انھیں کے پسر کی ہے!

ظاہر میں میرے پھول، حقیقت میں میرے نخل!

اُس گل کی یاد میں یہ صدا بوالشہر کی ہے!

اب ایک شعر دیکھیے جو ذومعنی ہے اور اس میں کسی قدر مزاح کا عنصر بھی ہے:

میں مجرم ہوں آقا! مجھے ساتھ لے لو

کہ رستے میں ہیں جا بجا تھانے والے!

مرزا غالب کی زمین میں یہ اشعار دیکھیے:

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں!

دل کو جو عقل دے خدا، تیری گلی سے جائے کیوں!

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفیٰ کہ یوں

کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں!!

غالب نے ”پاؤں“ کی ردیف میں غزل کہی ”ایڑیاں“ کی ردیف میں یہ خوب

صورتِ نعتیہ شعر دیکھیے:

ایک ٹھوکر میں اُحد کا زلزلہ جاتا رہا! رکھتی ہیں کتنا وقار اللہ اکبر ایڑیاں!

یہ دل نشیں اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں:

سر تا بقدم ہے تنِ سلطانِ زمنِ پھول لبِ پھول، دہنِ پھول، ذقنِ پھول بدنِ پھول

واللہ جو مل جائے مرے گل کا پسینہ مانگے نہ کبھی عطر نہ پھر چاہے دلہن پھول!

.....

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم! خدا چاہتا ہے رضائے محمد!

عجب کیا اگر رحم فرمائے ہم پر خدائے محمد، برائے محمد!

اس مجموعے میں شامل فاضل بریلوی کی دو خوب صورت رباعیات ملاحظہ فرمائیں،

ان کا عنوان ”رباعیاتِ نعتیہ“ ہے لیکن ان میں مضمون مناجات کا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

دنیا میں ہر آفت سے بچانا مولیٰ!! عقبیٰ میں نہ کچھ رنج دکھانا مولیٰ!

بیٹھوں جو درِ پاک پیمر کے حضور ایمان پر اُس وقت اٹھانا مولیٰ

نقصان نہ دے گا تجھے عصیاں میرا غفران میں کچھ خرچ نہ ہوگا تیرا

جس سے تجھے نقصان نہیں، کر دے معاف جس میں ترا کچھ خرچ نہیں، دے مولا!

فاضل بریلوی کا مشہور سلام ”مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام“ ان کے مجموعہ کلام

”حدائقِ بخشش“ میں شامل ہے۔ مسلمانوں کا کوئی محلہ اور کوئی آبادی ایسی نہیں جہاں اُن کا یہ سلام

سنائی نہ دیتا ہو۔ اس سلام سے پہلے اسی مجموعہ کلام میں ان کا ایک اور سلام بھی ہے جو نسبتاً کم

معروف ہے مگر اپنی اثر پذیری میں کم نہیں۔ اس سلام کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

کعبے کے بدرالدجی! تم پہ کروڑوں درود طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

سرزمینِ کعبہ سے اعلانِ نبوت ہوا اور ہجرت کے بعد مدینہ منور میں مستحکم بنیادوں پر

اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ بدرالدجی (چودھویں کا چاند) اور شمس الضحیٰ (دن چڑھے کا سورج) کے

الفاظ کے ذریعے اس لطیف حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جسے اہل دل ہی خوب سمجھ سکتے

ہیں۔ مطلع کے بعد اس سلام میں حسنِ مطلع اور زیبِ مطلع کا بھی اہتمام کیا گیا ہے یعنی اس میں تین

مطلع ہیں۔ ایک خاص بات اس سلام میں یہ ہے کہ اسے ”دیوان“ کی طرز پر تحریر کیا گیا ہے یعنی

پہلے وہ الفاظ ہیں جن کا مصرعہ اولیٰ ”الف“ پر ختم ہوتا ہے پھر ب، ت، ث وغیرہ اور آخر میں ”ے“

ہر حرف کے لیے کم سے کم ”ایک“ اور زیادہ سے زیادہ سات اشعار ہیں۔ پورا سلام ۵۹ اشعار پر

مشتمل ہے۔ الف کی ردیف کے یہ اشعار دیکھیے:

اور کوئی غیب کیا تم سے نہاں ہو بھلا! جب نہ خدا ہی چھپا، تم پہ کروڑوں درود

دل کرو ٹھنڈا مرا، وہ کفِ پا چاند سا سینہ پہ رکھ دو ذرا تم پہ کروڑوں درود

دونوں اشعار عام فہم اور جذبہ حب نبیؐ سے لبریز ہیں۔ اب اگلی یعنی ”ب“ کی ردیف کا یہ شعر دیکھیے:

ذات ہوئی انتخاب وصف ہوئے لا جواب نام ہوا مصطفیٰ تم پہ کروڑوں درود
”ت“ کی ردیف کا شعر:

تم سے جہاں کی حیات تم سے جہاں کائنات اصل سے ہے ظل بندھا تم پہ کروڑوں درود
”ث“ کی ردیف کا شعر:

تم ہو حفیظ و مغیث، کیا ہے وہ دشمن خبیث! تم ہو تو پھر خوف کیا، تم پہ کروڑوں درود
”ج“ کی ردیف کا شعر:

وہ شب معراج راج وہ صف محشر کا تاج! کوئی بھی ایسا ہوا، تم پہ کروڑوں درود!
”ح“ کی ردیف کا شعر:

جان و جہان مسیح داد کہ دل سے جرت نبض چھٹیں دم چلا تم پہ کروڑوں درود
اسی طرح ہر حرف کی ردیف کے اشعار ہیں، کچھ مزید خوب صورت اشعار ملاحظہ کیجیے:

تم سے کھلا باب جود، تم سے سب کا وجود! تم سے ہے سب کی بقاء، تم پہ کروڑوں درود!
مندرجہ بالا شعر میں آیہ رحمۃ للعالمین اور حدیث قدسی ”لولاک لما خلقت الافلاک“ کی ترجمانی کی گئی ہے۔ کچھ اور اشعار دیکھیے:

آس ہے کوئی نہ پاس ایک تمہاری ہے آس بس یہی ہے آسرا تم پہ کروڑوں درود
تم ہو شفاۓ مرض، خلق خدا خود غرض! خلق کی حاجت بھی کیا تم پہ کروڑوں درود

آہ وہ راہ صراط، بندوں کی کتنی بساط! المدد اے رہنما، تم پہ کروڑوں درود
سینہ کہ ہے داغ داغ، کہہ دو کرے باغ باغ طیبہ سے آکر صبا تم پہ کروڑوں درود

”ق“ کی ردیف کا یہ شعر دیکھیے:
تم نے برنگِ فلق حبیب جہاں کر کے شق نور کا تڑکا کیا تم پہ کروڑوں درود!

”ل“ کی ردیف کا شعر:
خلق تمہاری جمیل خلق تمہارا جلیل! خلق تمہاری گدا تم پہ کروڑوں درود

مندرجہ بالا شعر میں زیر اور پیش کے فرق سے تین یکساں الفاظ کا استعمال مہارت سے کیا گیا ہے۔ ”م“ کی ردیف کے اشعار نسبتاً زیادہ ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

طیبہ کے ماہ تمام جملہ رسل کے امام نوشہ ملک خدا تم پہ کروڑوں درود
تم سے جہاں کا نظام تم پہ کروڑوں درود تم پہ کروڑوں ثنا تم پہ کروڑوں درود

تم ہو جواد و کریم، تم ہو رؤف و رحیم بھیک ہو داتا عطا تم پہ کروڑوں درود
خلق کے حاکم ہو تم، رزق کے قاسم ہو تم تم سے ملا جو ملا تم پہ کروڑوں درود

نافع و دافع ہو تم، شافع و رافع ہو تم تم سے بس افزوں خدا تم پہ کروڑوں درود
اس شعر میں ”بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر“ کی ترجمانی نہایت احسن طریقے سے کی

گئی ہے تاہم کہیں کہیں فنی تسامح بھی موجود ہے ”م“ کی ردیف کا یہ شعر دیکھیے:

جانیں نہ جب تک غلام خلد ہے سب پر حرام!

ملک تو ہے آپ کا، تم پہ کروڑوں درود!

مصرع ثانی میں آپ اور تم دونوں کا استعمال ”شتر گربہ“ ہے یہی سقم آخری دو اشعار میں بھی ہے:

آنکھ عطا کیجیے اس میں ضیا دیجیے جلوہ قریب آگیا تم پہ کروڑوں درود

کام وہ لے لیجیے تم کو جو راضی کرے ٹھیک ہو نام رضا تم پہ کروڑوں درود

اب حاصل کلام شعر دیکھیے:

ہم نے خطا میں نہ کی، تم نے عطا میں نہ کی!

کوئی کمی سرور! تم پہ کروڑوں درود

راقم الحروف کی درد مندانہ گزارش ہے کہ امام احمد رضا اور ان جیسی دوسری قابل احترام
شخصیات کے نام پر پرفرتے نہ بنائیں۔ یہ المیہ ہے کہ مسلمان قرآن پاک کو سمجھنے کی کوشش نہیں

کرتے اور انھوں نے حضور ﷺ کے بعد دوسری شخصیات کو بھی ایمانیات میں شامل کر لیا ہے اور
فرقہ بندی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس طرح وہ شرک فی النبوت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اسی وجہ

سے قادیانیت کا بھی دروازہ کھلا۔ حضور اکرم ﷺ کے بعد کوئی بھی شخصیت خواہ وہ کتنی بھی محترم ہو
ایمانیات میں شامل نہیں ہے۔

محمدؐ شخصیت ہیں آخری ایمان کامل کی!

نہیں ہے بعد ان کے کوئی بھی ایمان میں شامل

بناؤ تم نہ فرقے کہہ رہا ہے آج بھی قرآن

نہ کاٹو گردنیں ہو جاؤ گے دوزخ میں تم داخل

”نعت رنگ“ شمارہ نمبر ۱۹ صفحہ نمبر ۶۰۵ پر سید ہاشم حسین صاحب نے سورہ یٰسین کی آیت ”و کل شیء احصینہ فی امام مبین“ [آیت: ۱۲] کے ترجمے پر اعتراض کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ”مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب قبلہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو: اور ہم نے ہر چیز کو ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے“ یہاں امام مبین کے معنی ”کھلی کتاب“ لیے گئے ہیں جو کہ صحیح نہیں ہیں۔ عرض ہے کہ ”مفتاح اللغات“ عربی کا صفحہ نمبر ۵۹ ملاحظہ فرمائیں جہاں امام کے معنی ”کتاب“ اور ”قرآن مجید“ بھی ہیں جب کہ ”امام مبین“ کے معنی لکھے ہیں: ”لوح محفوظ یا کھلا ہوا راستہ“۔ اس آیت کی وضاحت سورہ نبا کی آیت نمبر ۲۹ سے ہوتی ہے جو یہ ہے ”و کل شیء احصینہ کتباً“ الفاظ وہی ہیں جب کہ ”امام مبین“ کی جگہ ”کتباً“ کہہ کر وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہاں کتاب یا لکھی ہوئی چیز مراد ہے، بلاشبہ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ امام ہیں وہ صرف ولی نہیں بلکہ امام الاولیا ہیں لیکن مندرجہ بالا آیات میں کتاب یا لکھی ہوئی چیز کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ جناب احمد صغیر صدیقی نے راقم الحروف کا تنقیدی خط پسند فرمایا ان کا شکریہ۔ صفحہ نمبر ۵۳۹ پر جناب منصور ملتانی نے حمدیہ مجموعے ”رب خیر البشر“ پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراض کیا ہے، ”مجھے یہ بھی کچھ عجیب سا لگا کہ سجاد خن کے لیے تقریباً چالیس صفحات اور تنویر پھول کے لیے تقریباً پینتیس صفحات مخصوص کیے گئے۔ جب کہ ڈاکٹر شاہد الوری اور سحر وارثی کے کلام کے لیے صرف ایک ایک صفحہ۔ میرے خیال میں اتنا واضح امتیازی سلوک مناسب نہیں تھا۔“ اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جن شعرا نے زیادہ تعداد میں ردیفی حمدیں کہیں انھیں زیادہ صفحات ملے اور جنھوں نے کم کہیں انھیں کم صفحات ملے اس میں امتیازی سلوک کی کوئی بات نہیں ہے۔ (تنویر پھول ص، ۲۵۹)

احمد رضا خان:

ڈاکٹر صابر سنہلی کا مضمون ”حدائق بخشش کے صنائع بدائع پر ایک اور نظر“ اس سے قبل بھی ”دبستان نعت“ (عادل آباد، بھارت) کے پہلے شمارے کے صفحات ۵۷ تا ۶۱ پر شائع ہو چکا ہے۔ جو صابر سنہلی صاحب کے لیے حیرت انگیز ہیں اور اہل ادب جن کا آج تک نام طے نہیں کر سکے وہ صدیوں سے ادبی کتابوں میں اپنے ناموں کیساتھ موجود ہیں، مثلاً تجنیس تام، تجنیس ناقص، تجنیس مرکب وغیرہ اب یہ الگ بات ہے کہ صابر صاحب ان الفاظ میں صنعت بتا رہے جن میں صنعت ہے ہی نہیں مثلاً یہ شعر،

ہے تو رضا تراستم جرم پر گر جائیں ہم
کوئی بجائے سوزِ غم سازِ طرب بجائے کیوں
شعر پر صابر صاحب ”بجائے۔ بجائے“ میں صنعت بتاتے ہیں لیکن انہیں اگر صنعت کا نام معلوم نہیں، وہ تجنیس تام کہتے ہوئے جھجکتے ہیں کیوں کہ اس میں تجنیس تام ہے ہی نہیں۔ تجنیس دو الفاظ میں ہوتی ہے یہاں بجائے بجاتا ہے میں (ء) زائد ہے اور دوسرے بجائے کا املہ ”بہ جائے“ ہوتا اور ”بہ“ کوئی لفظ نہیں ہے کہ اسے صنعت مرکب ہی سمجھ لیا جائے۔ (۵۰۴/۲۷)
صابر صاحب مضمون پر بحث کرتے کرتے بحور و عروض میں الجھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد ”واسع الشفتین“ کی صنعت سے متعلق احمد رضا صاحب کے اشعار مثال میں پیش نہ کرنے پر مؤلف ”بحر الفصاحت“ مولانا نجم الغنی پر شدید برہمی کا اظہار کرتے ہیں جیسے نجم الغنی نے کوئی بہت بڑا گناہ کر دیا ہو!!
اسی قبیل سے حافظ عبدالغفار حافظ (کراچی) کا مضمون ”حدائق بخشش کے متن کا المیہ“ ہے۔ حضرت احمد رضا کا شعر ہے،

سونا جنگل رات اندھیری چھائی بدلی کالی ہے (ص ۲۵۰)

سونے والوں جاگتے رہو چوروں کی رکھوالی ہے

اس کے تعلق سے حافظ صاحب لکھتے ہیں،

”شرر مصباحی نے اس کا وزن ”فعل فعولن فعلن فعل فعل فعولن فعولن فع“ بتایا ہے جو غلط ہے۔ حافظ صاحب نے اسے غلط تو کہہ دیا لیکن صحیح وزن نہیں بتایا جو ضروری تھا۔ تنقید یہ نہیں کہ کسی چیز کو غلط کہہ دیا جائے بلکہ اس کی تصحیح بھی کی جانی چاہیے۔

”کرناٹک میں اردو کی نعتیہ شاعری“ شاہ رشاد عثمانی صاحب کا کافی معلوماتی مضمون ہے لیکن انہوں نے بھی بعض سقیم اشعار نقل کیے ہیں، مثلاً

وہی نظر ہے زمانے میں کامیاب نظر جو نقش پائے محمد کو ڈھونڈتی ہوگی
(منیر احمد حامی کے) شعر کی ردیف ضائع ہوگئی، یہاں ”ہوگی“ کی بجائے ”ہے“ کی ضرورت ہے۔

جو شخص مصطفیٰ کا مددگار ہو گیا اللہ پاک اس کا مددگار ہو گیا
(سورج کرناٹکی کے) شعر میں قافیہ نہیں ہے اور اگر ”مددگار“ کو قافیہ تسلیم کریں تو ”ایٹائے جلی“ کا

عیب ہے۔ اس میں تجنیس تام بھی نہیں ہے۔ (ڈاکٹر اشفاق انجم ص ۵۰۵/۲۷)

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور احمد رضا خان:

(۲) جناب ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی صاحب کا مقالہ بڑا جان دار ہے اور انھوں نے بڑی عمدگی کے ساتھ قارئین کو بھی سلام رضا کے دو باغوں کی سیر کرائی ہے۔ ایک جگہ انھوں نے فرمایا ہے:

دولھا، برات، نوشہ، شادی، نوشہ کے تلازمے نہ جانے حضرت احمد رضا خاں صاحب اور ان کے دبستان کے بہت سے شاعروں اور مقررین کو کیوں اس درجہ پسند تھے۔ نوشہ بزم جنت کو مرکز بزم جنت، شان بزم جنت، رونق بزم جنت، کعبہ بزم جنت کچھ بھی کہا جاسکتا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے اس تلازمے کی توجیہ کی ہے، تاہم اس سلسلے میں یہ ضرور عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ: نوشہ بزم جنت کی ترکیب سامنے آنے کے بعد سچی بات ہے کہ باقی جتنی ترکیبیں بیان کی ہیں کسی میں وہ حسن اور جاذبیت نہیں ہے جو اس ترکیب میں ہے، عربی کا ایک مقولہ ہے ”لا عطر بعد عروس“، دھن کے عطر کے بعد کسی عطر کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، مطلب یہ ہے کہ سرکارِ دو عالم ۷ بزم جنت کے دولہا ہیں باقی سب براتی ہیں۔ (یعنی طفیلی) ”دلائل الخیرات“ میں ہے (و عروس مملکتک) اے اللہ اپنی مملکت کے دولہا پر رحمتیں نازل فرما۔ اس کی شرح میں علامہ فاسی نے بڑی عمدہ گفتگو کی ہے اور ”مواہب لدنیہ“ کے حوالے سے بعض علما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ (ولقد رآی من آیات ربہ الکبریٰ) اس کا معنی یہ ہے کہ نبی اکرم ۷ نے ملکوت (عالم بالا) میں اپنی صورت دیکھی (فاذا هو عروس المملکۃ) تو آپ ہی مملکت الہیہ کے دولہا تھے۔

(دیکھیے مطالع المسرات عربی ص ۲۲۳) (عبدالحکیم شرف قادری ص ۶۳۳)

ڈاکٹر کشفی نے ص ۲۹ پر اعلیٰ حضرت کے اس شعر پر اعتراض کیا ہے:

شب اسرئی کے دولہا پہ دائم درود نوشہ بزم جنت پہ لاکھوں سلام

اور لکھا ہے: ”دولہا، برات، نوشہ، شادی، نوشہ کے تلازمے نہ جانے حضرت احمد رضا خاں صاحب اور ان کے دبستان کے بہت سے شاعروں اور مقررین کو اس درجہ کیوں پسند ہیں۔“ عرض یہ ہے کہ جیسے برات کا مرکز دولہا کی ذات ہوتی ہے اور اسی کے دم سے برات ہوتی

ہے ایسے ہی سرکارِ دو عالم ۷ کے باعث تخلیق کائنات اور فخرِ موجودات ہونے کے اوصاف کی جانب اشارہ کرنے کے لیے یہ لفظ فاضل بریلوی نے استعمال کیا ہے۔ یاد رہے نبی کریم ۷ کی شان میں ”دولہا“ کا لفظ شعرا نے نہیں بلکہ جلیل القدر محدثین نے بھی استعمال کیا ہے، مثلاً امام قسطلانی ”مواہب الدنیہ“ میں لکھتے ہیں: ”فاذا هو عروس المملکۃ“ یعنی نبی کریم ۷ نے شبِ معراج عالم ملکوت میں اپنی ذات مبارک کی تصویر ملاحظہ فرمائی تو دیکھا کہ حضور تمام سلطنت الہی کے دولہا ہیں۔ اسی طرح دلائل الخیرات میں امام محمد بن سلیمان جزولی رحمۃ اللہ علیہ جو درود لکھتے ہیں اس میں ہے: ”و عروس مملکتک“ ایسی ہی اور کئی مثالیں ہیں جو طوالت کے خوف سے یہاں تحریر نہیں کر رہا۔

یہاں ایک عجیب بات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ کشفی صاحب نے ص ۳۲ پر اپنے اعتراض کا جواب خود ہی لکھ دیا ہے کہ ”مولانا احمد رضا خاں کی علمیت، شاعرانہ تخیل، قرآن وحدیث سے ان کے تعلق نے بعض شاعرانہ علامات کے سیاق و سباق کو بدل دیا ہے اور وسیع منظر و پس منظر میں نئے معانی ہمارے ذہن میں طلوع ہوتے ہیں۔“ اب کشفی صاحب سے گزارش فقط اتنی ہے کہ وہ دولہا کے نئے معانی بھی فاضل بریلوی کے حوالے سے ذہن نشین کر لیں۔ (حافظ محمد عطاء الرحمن قادری رضوی ص ۶۹۳)

اس شمارے میں استاذ ادب محترم جناب سید ابوالخیر کشفی صاحب کا جو ایک مضمون بعنوان ”نعت کے موضوعات“ شائع ہوا ہے اس میں انھوں نے ایک واقعی قابلِ گرفت مصرع ”روز جزا کے مالک و آقا تھی تو ہو“ کے قبیل میں امام احمد رضا فاضل بریلوی کے اس مصرع ”میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب“ کو بھی قابلِ گرفت قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں نہ تو کوئی توضیح و تشریح کی ہے نہ ہی لغت و زبان اور قرآن و احادیث کی روشنی میں کوئی تجزیہ! مصرع ثانی جو مطلب صاف کر دیتا ہے اسے بھی لکھنے کی زحمت نہیں کی۔ راقم نے اس کے جواب میں ایک مضمون بعنوان ”مصرع رضا اور کشفی صاحب“ لکھا ہے جو برائے اشاعت روانہ ہے اور جس کا چھپنا ضروری ہے تاکہ کشفی صاحب کے الزام کی صفائی ہو سکے۔ (ڈاکٹر عبدالنعم عزیز ص ۶۷۱)

اعلیٰ حضرت کی شاعری: فکری و فنی مطالعہ:

(اعتراضات اور رد اعتراضات کی روشنی میں)

☆ شمارہ نمبر ۱۳، ہی میں شارق جمال صاحب کا مضمون ”نعت کے اشعار اور فنی سقم“ شائع ہوا

جس میں انھوں نے ۱۸۹۳ء کی ایک تحریر سے اقتباس درج کیا ہے۔ اس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:

اس قاعدے کے وجود میں آنے کے بعد خواہ غالب کے اشعار میں، ظہیر غازی پوری کے کلام میں یا فاضل بریلوی احمد رضا کے شعروں میں یہ سقوط حروف علت نظر آنے پر اس سے فنی بحث یقیناً کی جائے گی۔ اس سقم پر سابقہ شعرائے فارسی و عربی کے اشعار کا سنداً پیش کرنا بھی درست نہیں کہ ان کے اشعار اس قاعدے کے نافذ ہونے سے پہلے کے ہیں۔

شارق جمال صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ”قاعدہ بے فائدہ“ ہے۔ کیوں کہ بعد کے اساتذہ نے اسے تسلیم ہی نہیں کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرزا داغ دہلوی نے ”قصیدہ اردوئے معلیٰ“ میں جو کچھ فرما دیا اب تک اسی کو حرف آخر مانا جا رہا ہے۔ شارق صاحب نے خواجہ زحمت فرمائی کہ اعلیٰ حضرت کے مصرع ”یعنی محبوب و محبت میں نہیں میرا تیرا“ کی باقاعدہ تقطیع کر کے ثابت کیا کہ یعنی ”ی“ سا قسط ہے۔ حضور والا ایک عروض داں مصرع پڑھتے ہی سمجھ لیتا ہے کہ کون سا حرف تقطیع میں آ رہا ہے اور کون سا گرا رہا ہے۔ بحث یہ نہیں کہ یعنی ”ی“ گری ہے یا نہیں۔ بحث اس پر ہے کہ یعنی ”ی“ گرائی جاسکتی ہے یا نہیں اور کیا اساتذہ نے اس کی پابندی کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ”ی“ کسی بھی لفظ کی ہونہ گرائی جائے تو بہتر ہے لیکن اگر ضرورت شعری کی وجہ سے گرائی پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں۔ آئیے میں یعنی ”ی“ گرانے کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

یاد رکھو نون آئے حرف علت کے جو بعد چاہیے اعلان اس کو نون غنہ بھی روا
یعنی دیں کو دین بولو، آسمان کو آسمان ہاں مگر یہ فارسی ترکیب میں ہے ناروا
(داغ دہلوی از قصیدہ اردوئے معلیٰ)

یعنی وہ جس کی ہوئی ذات سراپا برکات باعث خلقِ زماں، موجب ایجادِ زمن
(محسن کا کوروی)

بھر کے ساقی ایک جام زہرے آلود لا یعنی خاکم در دہن آج آتش دل تیز ہے
(فانی بدایونی) (۶۴۳)

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے یعنی وہ صاحبِ اوصاف مجازی نہ رہے
(علامہ اقبال)

چاہتا ہے عشقِ رازِ حسنِ عریاں کیجیے یعنی خود کھو جائیے، ان کو نمایاں کیجیے
(جگر مراد آبادی)

وہ مرے اشک کو دامن پہ جگہ دیتے ہیں یعنی منظور ہے اس قطرے کو دریا کرنا
(بیدم وارثی)

بہتے رہتے ہیں مری آنکھ سے ہر دم آنسو یعنی ہر وقت تمہیں یاد کیا کرتا ہوں
(بہزاد بکھنوی)

وہ نگاہِ مست اٹھی گردش میں جامِ آہی گیا یعنی وقتِ امتیازِ خاص و عام آہی گیا
(شکیل بدایونی)

بات بگڑی ہوئی سرکار بنانے آئے یعنی مخلوق کو خالق سے ملانے آئے
(تابش صمدانی)

اگر دو اوین کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایسے اشعار اور بھی سامنے آسکتے ہیں۔ شارق جمال صاحب اگر اس ”قاعدہ بے فائدہ“ پر عمل کرنے والوں کے نام لکھ دیتے اور ان کے اشعار بھی درج کرتے تب تو کوئی بات تھی۔ میرے خیال میں اب اس باب کو بند ہو جانا چاہیے کیوں کہ ایک ہی لکیر کو پیٹتے رہنا کوئی دانش مندی نہیں۔ شارق صاحب اب فاضل بریلوی کے کلام میں کوئی اور ”سقم“ تلاش کریں۔ اس سلسلہ میں ظہیر غازی پوری صاحب اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب سے انھیں مدد مل سکتی ہے۔

میں نے شمارہ نمبر ۱۲ میں اعلیٰ حضرت کے مصرع ”بے کسوں کے آقا اب تیری دہائی ہے“ کے بارے میں لکھا تھا کہ ”بے کسوں کی واو گرا کر پڑھیں“، اس پر احمد صغیر صدیقی صاحب اپنے خط (مطبوعہ شمارہ نمبر ۱۳) میں فرماتے ہیں، ”ہم تو اس کی واو گرانے کے چکر میں خود ہی گر پڑے مگر واو نہیں گرا سکے“، جواباً عرض ہے کہ میں نے اس خط میں مشاہیر اساتذہ کے اشعار بھی بطور حوالہ پیش کیے تھے۔ اگر ان کو پڑھنے کا طریقہ بھی بتا دیتا تو شاید صدیقی صاحب بے ہوش ہو جاتے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ چند بزرگوں نے دانستہ ”ایٹنی فاضل بریلوی مومنٹ“ چلا رکھی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جو باتیں مشاہیر شعرا کے کلام میں موجود ہیں ان پر کوئی حرف نہیں

رکھتا لیکن اگر وہی چیز اعلیٰ حضرت کے کلام میں نظر آجائے تو صفحے کے صفحے کا لے کر دیے جاتے ہیں۔ احمد صغیر صاحب نے اعلیٰ حضرت کی ایک اور نعت کے چند اشعار پر اعتراض کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اجمالاً عرض ہے کہ مطلع کے دوسرے مصرع میں لفظ ”کیف“ حضرت جبریل امین کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ انھوں نے ایک اور شعر میں لفظ ”قدس“ پر بھی اعتراض کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس لفظ کا املا دونوں طرح صحیح ہے یعنی ”د“ پر پیش بھی جائز ہے اور سکون بھی۔ اس سلسلہ میں کسی بھی عربی نعت سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ صدیقی صاحب نے اسی نعت کا ایک مصرع غلط لکھا ہے۔ اصل مصرع یوں ہے۔ ”دل کو دے نور و داغ عشق پھر میں فدا دو نیم کر“۔ اعلیٰ حضرت کے مصرع ”اے میں فدا لگا کر ایک ٹھوکرا سے بتا کہ یوں“ پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”اس میں میٹر پر جو گزری ہے وہ ضرور دیکھیے“۔ صدیقی صاحب سے عرض ہے کہ میٹر پر کچھ نہیں گزری۔ مصرع کا ہر حرف اپنی جگہ موزوں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آپ کی قابلیت اپنی جگہ مگر ”عروض چیزے دیگر است“۔ فاضل بریلوی کی یہ نعت جس بحر میں ہے اس کے ارکان یہ ہیں:-
”مفتعلن مفتعلن مفتعلن“ اور مصرع میں دونوں جگہ (درمیان میں بھی اور آخر میں بھی) مفتعلن کی جگہ مفاعیلان استعمال ہو سکتا ہے اور اساتذہ نے کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اگر موصوف غالب کا مصرع ”دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں“ پیش نظر رکھتے تو انھیں اس اعتراض کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔

ڈاکٹر شمیم احمد گوہر صاحب اپنے خط میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مصرع ”اے بے کسوں کے آقا اب تیری دہائی ہے“ کے متعلق فرماتے ہیں:

یہ پورا مصرع ہی غلط نقل کیا گیا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ اس بے بحر مصرع کا وزن تک بتاتے ہوئے اس کی تقطیع بھی کر دی گئی۔ مفتعل مفتعلن مفتعل مفتعلن۔ حالاں کہ مصرع یوں ہونا چاہیے تھا۔ ”اے بے کسوں کے آقا اب ہے تری دہائی“۔ اس کی بحر مضارع مثنیٰ اخب کے تحت مفتعل فاعلاتن مفتعل فاعلاتن ہے اور اول مثنیٰ مشکول کے تحت فعات فاعلاتن فعات فاعلاتن ہے۔

سبحان اللہ، کیا کہنے، قربان جانیے اس عروض دانی کے۔ محترم گوہر صاحب نے جو دو بحریں رقم فرمائی ہیں، ان میں مؤخر الذکر بحر کا تو اعلیٰ حضرت کے مصرع سے کوئی تعلق بنتا ہی نہیں۔

رہی اول الذکر بحر تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ اعلیٰ حضرت کی یہ نعت مفتعل مفتعلن مفتعلن مفتعلن کے وزن پر ہی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ مذکورہ مصرع کا پہلا ٹکڑا ذوالبحرین ہونے کی وجہ سے مفتعل فاعلاتن کے وزن پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ مزید تسلی کے لیے ”نعت رنگ“ شمارہ نمبر ۱۲ میں صفحہ نمبر ۱۳ پر ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب کا مضمون ”اشعار نعت اعتراضات کی حقیقت“ اور راقم الحروف کے خط کے مندرجات کا مطالعہ فرمائیں۔ میں نے اپنے مذکورہ خط میں میر تقی میر اور فانی بدایونی کے اس قسم کے اشعار بطور حوالہ درج کیے ہیں۔ (حافظ عبدالغفار حافظ ص ۶۲۵-۶۲۳) آپ کا جریدہ ”نعت رنگ“ اگرچہ کئی خوبیوں کا حامل ہے لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس جریدہ کے ذریعے ایک باقاعدہ منصوبہ کے تحت اعلیٰ حضرت کے اشعار پر اعتراض ہو رہا ہے۔ پہلے کشفی صاحب معترض رہے اور اب جناب ظہیر غازی پوری سامنے آئے ہیں۔ ظہیر صاحب نے ”نعت رنگ“ کے شمارہ نمبر ۱۱ میں ”حداً بقبحخش“ سے ۱۳ اشعار چن کر نکالے اور کہہ دیا کہ ان کے مصرع بحر سے خارج ہیں۔ اگر ظہیر صاحب یہ ”کارنامہ“ انجام دینے سے پہلے کسی بھی عروض داں کے سامنے زانوائے تلمذ تہہ کر لیتے اور عروض کی باریکیاں سمجھ لیتے تو انھیں آج اس قسم کی شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی۔ اب آئیے میں ظہیر صاحب کے اعتراضات کا جواب دیتا ہوں۔

ظہیر صاحب نے اعلیٰ حضرت کے جن اشعار کو بحر سے خارج قرار دیا ہے وہ یہ ہیں:

سب نے صفِ محشر میں للکار دیا ہم کو
اے بے کسوں کے آقا اب تیری دہائی ہے
زائر گئے بھی کب کے دن ڈھلنے پہ ہے پیارے
اُٹھ میرے اکیلے چل کیا دہر لگائی ہے
ہم دل جلے ہیں کس کے، ہٹ فتنوں کے پرکالے
کیوں بھونک دوں اک اُف سے کیا آگ لگائی ہے

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ضرورتِ شعری کی بنا پر حرفِ علت گرایا جاسکتا ہے اور یہ قاعدہ اتنا عام ہے کہ ہر شاعر اس سے واقف ہے۔ مرزا داغ دہلوی مرحوم کا ”قصیدہ اردوئے معلیٰ“ بہت مشہور ہے۔ اپنے اس قصیدہ میں وہ فرماتے ہیں:

وزن سے ہرگز نہ کوئی حرف گرنا چاہیے ہاں مگر گرنا الف اور واؤ کا ہے روا

دوسری بات یہ کہ بعض مصرعے ذوالبحرین ہوتے ہیں اور انھیں دو بحر میں پڑھا جاسکتا ہے۔ مثلاً علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اقبال کا یہ شعر فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن کے وزن پر ہے، مگر اس کا پہلا مصرع ذوالبحرین ہے اور وہ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فعلن کے وزن پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص دونوں مصرعے مختلف اوزان پر پڑھ کر علامہ اقبال پر اعتراض کر دے تو کیا کوئی عقل مند شخص اسے تسلیم کرے گا؟ ہرگز نہیں۔ یہی صورت حال اعلیٰ حضرت کے مذکورہ تینوں اشعار میں ہے۔ ظہیر صاحب نے عروض کی باریکیوں سے نا بلد ہونے کی بنا پر جو اعتراض کیا ہے وہ لغو ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کی مذکورہ نعت مفاعیلن مفاعیلن کے وزن پر ہے لیکن پہلے شعر کے مصرع ثانی کا پہلا ٹکڑا ذوالبحرین ہے اور مفعول فاعلاتن کے وزن پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے اشعار میں مصرع ہائے اولیٰ کے پہلے ٹکڑے بھی ذوالبحرین ہونے کی وجہ سے مفعول فاعلاتن کے وزن پر بھی پڑھے جاسکتے ہیں۔ شاید یہ تفصیل ظہیر صاحب کے پلے نہ پڑی ہو اس لیے بطور وضاحت میں تینوں اشعار کے پڑھنے کا طریقہ بتا دیتا ہوں۔

پہلا شعر: ”اے بے کسوں کے آقا“ میں ”بے کسوں“ کا واؤ گرا کر پڑھیں۔

دوسرا شعر: زائر گئے بھی کب کے“ میں ”گئے“ کی ”ی“ گرا کر پڑھیں۔

تیسرا شعر: ”ہم دل جلے ہیں کس کے“ میں ”جلے“ کی ”ی“ گرا کر پڑھیں۔

اب میں اس قسم کی مثالیں اساتذہ کے کلام سے پیش کرتا ہوں۔

میری تقی میر کی ایک غزل کے ۲ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اب میر جی تو اچھے زندیق ہی بن بیٹھے

پیشانی پہ وہ قشقہ زنار پہن بیٹھے

آزردہ دل الفت ہم چپکے ہی بہتر ہیں

سب رو اٹھے گی مجلس جو کر کے سخن بیٹھے

میر نے یہ عمل مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن کے وزن پر بھی ہے مگر پہلے شعر میں مصرع اولیٰ کا پہلا ٹکڑا اور دوسرے شعر میں مصرع ثانی کا پہلا ٹکڑا ذوالبحرین ہیں اور مفعول فاعلاتن

کے وزن پر بھی پڑھے جاسکتے ہیں۔

اس قسم کا ایک شعر فانی بدایونی کا بھی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ کہتے ہیں ء

جو دل میں حسرتیں ہیں سب دل میں ہوں تو بہتر

اس گھر سے کوئی باہر مہمان رہ نہ جائے

فانی نے یہ غزل مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن کے وزن پر بھی ہے لیکن اس شعر میں دوسرے مصرع کا پہلا ٹکڑا ذوالبحرین ہونے کی وجہ سے مفعول مفاعیلن کے وزن پر بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ ظہیر صاحب خود بھی اگر چاہیں تو اس قسم کی سیکڑوں مثالیں اساتذہ کرام کے کلام سے نکال سکتے ہیں۔

ظہیر غازی پوری صاحب نے اعلیٰ حضرت کے ایک اور شعر میں ”یعنی“ کی ”ی“ گرانے پر اعتراض کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ”ی“ گرا نا کیوں ناجائز سمجھا لیا گیا جب کہ یہ عروض کے مسلمہ اصولوں کے عین مطابق ہے۔ اس ضمن میں فانی بدایونی کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

بھر کے ساقی ایک جام زہر مے آلود لا

یعنی حاکم در دہن آج آتش دل تیز ہے

اس شعر میں بھی ”یعنی“ کی ”ی“ ساقط ہے۔

مرزا داغ دہلوی کے ”قصیدہ اردوئے معلیٰ کے مندرجہ ذیل اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں:

یاد رکھو نون آئے حرفِ علت کے جو بعد

چاہیے اعلان اس کو، نون غنہ بھی روا

یعنی دیں کو دین بولو، آسمان کو آسمان

ہاں مگر یہ فارسی ترکیب میں ناروا

ملاحظہ کیجیے دوسرے شعر میں ”یعنی“ کی ”ی“ ساقط ہے۔ اب ظہیر صاحب بتائیں کہ کیا وہ داغ پر بھی اعتراض کریں گے۔

اب آئیے تقابل ردیفین کے موضوع پر، اس ضمن میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ شاعر کی جانب سے اپنے کلام پر نظر ثانی نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات اس قسم کا عیب باقی رہ جاتا ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جس پر بغلیں بجائی جائیں۔ اساتذہ کے کلام سے اس طرح کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر اختصار کے ساتھ مندرجہ ذیل اشعار حاضر ہیں:

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ و ازہاد و شیر نر مارا تو کیا مارا (ذوق)
تجھے نسبت جو دیتے ہیں شرار و برق و شعلہ سے
تسلی کرتے ہیں ناچار شاعر ان مثالوں سے (میر تقی میر)
لاکھوں جتن کیے ہیں، مرمر کے ہم جئیں ہیں
کیا کہیے کیسی کیسی کڑیاں اٹھائیاں ہیں
یہ کیا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہے
عزیزِ خاطرِ فطرت ہے، جانِ عبرت ہے
ہر ایک ذرہ جو اس عالمِ غبار میں ہے (فانی بدایونی)

اب رہا معنوی اعتبار سے اعلیٰ حضرت کے ان اشعار کے قابلِ گرفت ہونے اور حصارِ نعت میں آنے کا معاملہ تو میں یہ عرض کر دوں کہ میں عالمِ دین نہیں اس لیے اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ تاہم مجھے قویٰ امید ہے کہ حضرت مولانا کو کتبِ نورانی ادا کر دیں صاحب اس پر ضرور خامہ فرسائی کریں گے اور ظہیر غازی پوری صاحب کے افلاسِ علم کو ظاہر کر دیں گے۔

(حافظ عبدالغفار حافظ ص ۶۵۱-۶۴۸)

ظہیر غازی پوری (بھارت) کا مقالہ ”نعتیہ شاعری کے لوازمات“ بھی معلومات افزا اور چشم کشا ہے۔ انھوں نے بہت سے اشعار نعت پر صحیح گرفت کی ہے اور ہونی بھی چاہیے۔ انھوں نے امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ کے ایک شعر پر معنوی اور فکری اعتبار سے گرفت کی ہے وہ شعر یہ ہے:

میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب

یعنی محبوب و محبت میں نہیں میرا تیرا

ظہیر غازی پوری کہتے ہیں کہ:

اللہ رب العزت چون کہ بے جسم، بے پیکر اور بے بدن ہے، اس لیے دنیاوی محبوب و محبت کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔

(”نعت رنگ“، شمارہ ۱۱، مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۱)

یہ عبارت بالکل غیر واضح ہے، کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ بے جسم ہے اور اس

شعر (۶۳۴) میں اسے مجسم بنا کر پیش کیا گیا ہے، اگر یہ مطلب ہے تو یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں، کیوں کہ شعر کے کسی حصے اور کسی پہلو سے یہ مطلب نہیں نکلتا۔ پھر یہ بات بھی سمجھ سے بالا ہے کہ ”دنیاوی محبوب و محبت کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا، کیوں؟ کیا اس لیے کہ وہ آخری ہے، دنیاوی محبوب نہیں ہے؟ اللہ والے دنیا میں بھی اس سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں، آخرت میں بھی، اس سے زیادہ محبت کریں گے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ یحبہم و یحبونہ۔ (۵۴/۵)

ظہیر صاحب پھر لکھتے ہیں:

ویسے بھی محبوب کو مالک کا درجہ عطا کرنے کا سیدھا اور صاف مطلب ہوا
کہ رسول کو خدا کہا یا تسلیم کیا اور یہی وہ مقام ہے جہاں بقول حضرت احمد
رضا خاں صاحب، اگر بڑھتا ہے تو الوہیت تک پہنچ جاتا ہے۔

اس عبارت کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو مالک مان لینے سے شرک لازم آتا ہے۔ کس چیز کا مالک ماننے سے شرک لازم آتا ہے؟ اس کی کوئی تصریح نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۱۔ فان خفتهم الا تعدلوا فواحدة او ماملکت ایمانکم۔ (۳/۴)

اگر تمھیں خوف ہو کہ تم انصاف نہیں کر سکو گے تو ایک عورت سے نکاح کر دیا اپنی مملوکہ سے استفادہ کرو۔

۲۔ او ما ملکنم مفاتحہ۔ (۶۱/۲۳)

یا تم جس گھر کی چابیوں کے مالک ہو۔

۳۔ قل لا املک لنفسی نفعا و لا ضرا الا ما شاء اللہ۔ (۱۸۸/۷)

۴۔ لا یملکون الشفاعة الا من اتخذ عند الرحمن عہدا۔ (۸۷/۱۹)

بندے شفاعت کے مالک نہیں ہاں جس نے اللہ سے عہد لیا۔

۵۔ واتبعوا ماتتلوا الشیاطین علی ملک سلیم۔ (۱۰۲/۳)

انھوں نے اس جادو کی پیروی کی جس کی تلاوت شیطان کیا کرتے تھے، سلیمان کی حکومت کے زمانے میں۔

غور و فرمائیں ان آیات میں انسان کو غلاموں اور لونڈیوں کا مالک قرار دیا، گھر کی چابیوں کا مالک فرمایا، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق نفع و ضرر کا مالک قرار دیا، جس کے پاس عہد

ہے اسے (۶۳۵) شفاعت کا مالک قرار دیا، حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملک کا مالک قرار دیا اور کہیں شرک لازم نہ آیا، کیوں کہ قرآن پاک میں شرک کا سوال ہی نہیں ہے، نبی اکرم ﷺ کو مالک ماننے سے شرک کیسے لازم آگیا؟

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ تعالیٰ ”شرح عقائد“ میں فرماتے ہیں کہ شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو واجب بالذات مانا جائے یا مستحق عبادت مانا جائے۔ (شرح عقائد) مالک ماننے سے شرک تب لازم آئے گا جب نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ جیسا مالک مانا جائے، کیوں کہ اس وقت نبی اکرم ﷺ کو واجب بالذات ماننا پڑے گا۔ جب کہ امام احمد رضا فرماتے ہیں، ”میں تو مالک ہی کہوں گا“ یہ الفاظ خود پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہے چون کہ رب کریم نے آپ کو کائنات میں تصرف کا اختیار دے رکھا ہے، اس لیے میں تو یہی کہوں گا کہ آپ بھی مالک ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے اذن سے اور اس کی اجازت سے، دیکھیے قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

انہی اخلق لکم من الطین کھینۃ الطیر۔ (۱۹/۳)

میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی صورت پیدا کرتا ہوں۔

ہو سکتا ہے کوئی شخص یہ کہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خلق اور ایجاد کی نسبت اپنی طرف کرنا شرک ہے، لیکن اس کا یہ قول اس لیے صحیح نہیں کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے اذن کا صراحتاً ذکر ہے۔ (فیكون طيرا باذن الله)

آئیے! سرکارِ دو عالم ﷺ کے اختیار اور تصرف کی ایک جھلک دیکھیں:

۱۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے چاروزیروں سے تقویت دی ہے، دو آسمان والے جبریل اور میکائیل اور دو زمین والے ابوبکر اور عمر۔ اس حدیث کو امام طبرانی اور امام ابو نعیم نے ”حلیۃ الاولیاء“ میں روایت کیا۔ (الصواعق المحرقة، ابن حجر مکی، ص ۷۸)

ظاہر ہے کہ وزیر بادشاہ ہی کے ہوتے ہیں، نبی اکرم ﷺ کے دو وزیر آسمان میں اور دو زمین میں ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ زمین و آسمان کی بادشاہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی:

سورج اُٹنے پاؤں پلٹے، چاند اشاروں سے ہو چاک

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، ہم سوئے ہوئے تھے، ہمارے پاس زمین کے خزانوں کی چابیاں لائی گئیں اور ہمارے ہاں رکھ دی گئیں۔

(مسلم شریف، عربی ۱/۱۹۹)

بخاری شریف (ص ۵۸۵) میں ہے، اعطیت مفاتیح خزائن الارض۔ ہمیں زمین کے خزانوں کی چابیاں عطا کی گئیں۔

اس حدیث کے تحت علامہ محمد عبدالرؤف مناوی فرماتے ہیں:

یاد دنیا کے تمام خزانے مراد ہیں، بندے جس چیز کے مستحق ہیں وہ انھیں نکال کر دیتے ہیں، اس جہان میں جو کچھ ظاہر ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے وہی دے گا جس کے ہاتھ میں چابی ہوگی۔

(فیض القدر، شرح جامع صغیر، ۱/۵۶۴)

حضرت ربیعہ ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انھیں فرمایا، ”سَلْ رَبِیعَہُ!“ ماگو۔ اس حدیث کی شرح میں حضرت ملا علی قاری، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور غیر مقلدین کے نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کہتے ہیں:

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کی جو بھلائی چاہو ماگو۔ نبی اکرم ﷺ نے مطلقاً فرمایا کہ ماگو اور کسی خاص مطلب کی تخصیص نہیں کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام معاملہ حضور اقدس ﷺ کے دستِ ہمت و کرامت میں ہے، جسے چاہیں جو چاہیں اپنے رب کے اذن سے عطا فرمائیں۔ علامہ بوصیری فرماتے ہیں:

فان من جودک الدنیا و ضررتها

و من علومک علم اللوح والقلم

دنیا و آخرت آپ کے جود و کرم کا حصہ ہے اور لوح و قلم کا علم آپ کے علوم کا بعض ہے۔ (مسک الختام، طبع کان پور، ۱/۲۷۶)

نبی اکرم ﷺ نے یہودیوں کو ارشاد فرمایا:

اسلموا تسلموا و اعلموا ان الارض لله و رسوله.

اسلام لے آؤ، محفوظ ہو جاؤ گے اور جان لو کہ زمین اللہ کی اور اللہ کے

رسول کی ہے۔ (بخاری شریف، عربی، ج ۱، ص ۴۴۹)

در اصل بات یہ ہے کہ اگر بادشاہ اپنے وزیر کو اور آقا اپنے غلام کو اپنی تمام مملوکہ اشیا میں مختار عام بنادے تو اس سے لازم نہیں آتا کہ وزیر بادشاہ کے برابر ہو گیا ہے اور غلام اپنے آقا

کے برابر ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ مکرم ﷺ کو کائنات میں تصرف کا اختیار دیا ہے تو اس سے برابری اور شرک کہاں سے لازم آ گیا؟

امام احمد رضا نے پیش نظر شعر میں محبت کے لطیف ترین جذبے کے حوالے سے استدلال کیا ہے کہ ہمیں جس سے محبت ہو اور دل کی گہرائی سے محبت ہو، اس کے ساتھ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ یہ چیز میری ہے اور یہ تمہاری ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو محبت کے جذبہ لطیف سے عاری ہو اور یہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو اپنی کائنات میں تصرف کی اجازت دے رکھی ہے۔ علامہ اقبال اسی مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ معاذ اللہ بندے کا محتاج ہو جاتا ہے بلکہ مطلب یہ کہ بندہ اپنی رضا کو اللہ کی رضا میں اس طرح فنا کر دیتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی رضا ہے وہی بندے کی رضا ہے۔ ظہیر صاحب اس کے باوجود لکھتے

کشف اور کیف کے عالم میں محبت رسول اگر اس منزل تک پہنچ جاتا ہے تو ادل اور مذہبی نقطہ نظر سے یہ کیفیت قابلِ گرفت ہے، مگر اللہ بڑا مہربان ہے اور غفور الرحیم بھی تو ہے۔ (”نعت رنگ“، ص ۱۳۲)

جب ایک رویہ یا نظریہ حد شرک میں داخل ہو جائے تو وہ ناقابلِ معافی ہے، اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہونے کے باوجود اسے نہیں بخشتا۔ ارشادِ باری ہے:

ان الله لا يغفر ان يشرك به - (۴۸/۴)

بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے۔ ظہیر صاحب خود یہ لکھ گئے ہیں:

اپنے نور سے بھی اس نے ایک پیکر تراشا جو اس کے لیے محبوب ترین تھا، وہ نور پیشانی آدم میں محفوظ ہوا اور محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچا۔ (”نعت رنگ“، ص ۱۳۱)

اپنے نور سے ایک پیکر تراشنے کا تصور بڑا ہولناک ہے، کیوں کہ اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اجزا سے پاک ہے۔ مذکورہ بالا عبارت کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کے ایک ٹکڑے کا پیکر تراشا جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے اپنے پیدا کردہ اولین نور سے اپنے حبیب اکرم ﷺ کو پیدا کیا، یہ نہیں کہ ایک پیکر پیدا کیا وہ نبی اکرم ﷺ تک پہنچا۔ (محمد عبدالحکیم شرف قادری ص، ۶۳۸-۶۳۹)

نعت رنگ: احمد رضا خان نمبر:

”نعت رنگ“ ۱۸ (مولانا احمد رضا بریلوی خان نمبر) نظر نواز ہوا۔ یہ مولانا کے شایانِ شان نمبر ہے۔ کئی بہترین تحریروں سے مالا مال اور آپ کی محنت کا بولتا ثبوت۔ آپ نے ادارے میں صحیح لکھا ہے کہ مولانا کو بحیثیت شاعر موضوع گفتگو کو بنانے سے گریز کیا جاتا ہے کیوں کہ وہ ایک بڑی دینی شخصیت تھے۔ ورنہ یہ بھی حقیقت ہے کہ نعت کے میدان میں وہ ایک بلند بالا حیثیت رکھتے ہیں۔ (احمد صغیر صدیقی ص ۷۴)

”نعت رنگ“ کا خصوصی شمارہ احمد رضا خان بریلوی نمبر موصول ہوا۔ اس لطفِ خاص اور محبت و عنایت کا شکر گزار ہوں۔ بالا استعیاب دیکھا، پڑھا اور عیشِ غش کیا۔ آپ کی لگن، جستجو اور محنت و سلیقے پر حسنِ ذوق اور حسنِ اظہار ہر دو میں بے مثل و یادگار رہے گا۔ غالباً مولانا احمد رضا خاں اور ان کی نعت گوئی اور اثرات کو اس اہتمام سے اب تک کسی نے نہ موضوع بنایا ہوگا نہ کسی سے اس طرح حق ادا ہوا ہوگا۔

مبارک باد بھی قبول کیجیے۔ اس سعادت پر جو آپ ”نعت رنگ“ سے اور نعت کے میدان میں حاصل کر رہے ہیں۔ واجبات کے ساتھ (ڈاکٹر معین الدین عقیل ص، ۸۲۵)

دیگر شخصیات

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی:

عزیزم! بات بھائی حنیف اسعدی تک محدود نہیں۔ ان سے پرانی دوستی ہے، دوستی نہیں بلکہ نیاز مندی: ع ہم تو اسیر ہیں خم زلف کمال کے میں نے نعت اور نعت گو شعراء پر تسلسل سے لکھا ہے، بلکہ یوں کہوں کہ نعتیہ مجموعوں پر مقدمے اور تبصرے لکھتے ہوئے نعت گوئی کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارے کر دیے ہیں۔ اب تمھارے ”نعت رنگ“ نے اس جذبہ کو ابھارا ہے کہ نعت پر لکھوں اور مسلسل لکھوں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ صرف انھیں شعراء کی نعت گوئی پر لکھ سکا ہوں جن کے مجموعوں پر مقدمے لکھے ہیں اور کئی اچھے اور بڑے نعت گو شعراء کا مقروض ہوں۔ سچ پوچھو تو میں اپنا مقروض بنوں کیوں کہ سلسلہ اور معاملہ نعت کا ہے۔ حضرت شرقی مرحوم، محترم بھائی حفیظ تائب، برادر کرم عبدالعزیز خالد، جناب حافظ لدھیانوی اور مظفر وارثی صاحب جیسے شاعروں کا کلام مجھ سے اپنا حق مانگ رہا ہے۔

حفیظ تائب صاحب سے میرے رشتے کو کچھ کچھ تم جانتے ہو۔ ان کی آنکھوں میں شب بیداری کے شہد بھی تم ہو۔ ایک بار ٹیلی ویژن پر نعتیہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ میرے ساتھ میرے عزیز اور بہت خوش گوشا عمر محمد رئیس علوی بھی یہ مشاعرہ دیکھ اور سن رہے تھے۔ جب بہت سے داد طلب اور ادعا برب شعراء کلام پڑھ چکے تو حفیظ تائب صاحب نے نعت شروع کی۔ لہجہ محبت اور ادب کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور نگاہیں یوں جھکی ہوئی جیسے مولا جہ شریف میں کھڑے ہوں۔ پورا وجود دست بستہ آواز نرم، مودب اور رفعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احساس سے پست... ”اے اہل ایمان اپنی آوازوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند نہ کرو۔“ ہزاروں میل کے فاصلے پر حضوری کا یہ احساس اور یہ شرف۔ اللہ اکبر۔ مجھے ”لا ترفعوا“ کے مفہیم کی خبر ہے۔ اپنے رجحانات، رائے اور خواہشات کو نبی ﷺ کی آواز اور حکم پر ترجیح نہ دو، لیکن سامنے کے اس مفہوم کا اجر بھی کچھ کم نہ ہوگا۔

اہل قلم کے پاس جذبات و فکر اور الفاظ ہیں حفیظ تائب اپنے الفاظ کو فکر کے رنگ میں گوندھ کر جذبات کی خوش بو ملا کر نہایت ندامت کے ساتھ بارگاہ عالی میں حاضر ہو جاتے ہیں کہ

سرکار یہی کچھ ہے متاع فقیر... رہا معاملہ جان کا سو وہ آپ ﷺ کے سوا اور کس کی ہے۔ تائب صاحب طریقہ راسخہ کے شاعر ہیں۔ سچ پوچھیے تو نعت گوئی کا دوسرا کوئی راستہ ہے بھی نہیں۔ حضور شاہ ﷺ سانس لینا بھی ایک ذمہ داری ہے۔ کبھی مولا جہ شریف میں نفس گم کردہ ہو کر کھڑے رہیے اور جب زندگی اپنا حق مانگے تو سانس لیجیے کیا عجب یہی عمل آپ کی نعت بن جائے۔ حفیظ تائب کا معاملہ یہی ہے سالہا سال سے یوں ہوا ہے کہ ہم دونوں کے قیام طیبہ کا زمانہ ایک رہا ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے مسجد نبوی میں ملنے سے گریزاں رہے کیوں؟ میرے عزیز! کیا یہ بات تمہیں بھی بتاؤں ایک بار ہم لوگوں کا قیام ایک ہی جگہ تھا ایک دن بیوی نے مولا جہ شریف پر حاضری سے پہلے تائب صاحب سے کہا کہ مجھے کوئی دعا، کوئی عرض داشت عطا کر دیجئے جسے میں اپنے آقا، اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں پیش کر دوں یہ ۲۷ رمضان ۱۴۱۳ھ کی بات ہے اور پھر تائب صاحب نے ان کی کتاب یادداشت پروہ التجا لکھی جس کے چند مصرعے یہ ہیں۔

در پہ حاضر ہوئی ہے کوئی بے نوا اے حبیب خدا
حاضری میں حضوری بھی کیجیے عطا اے حبیب خدا
کچھ عجب وقت ہے میرے آنسو بھی اب ساتھ دیتے نہیں
پاس کچھ بھی نہیں عاجزی کے سوا اے حبیب خدا
میری نادانیوں، ظلم سامانیوں سے ہوں صرف نظر
ہر عمل آشنائے ادب ہو میرا اے حبیب خدا

”آشنائے ادب“... تائب صاحب کی نعت گوئی کے لیے کلیدی لفظ ہے (مسرور کیفی صاحب کے ہاں بھی یہ ادب سامانی مجھے نظر آتی ہے)

محبت اپنے اظہار کے پیرائے خود تراشتی ہے ذرا سوچئے کہ ہم میں سے کون ارض طیبہ ضیائے گنبد خضراء، فضائے مولا جہ شریف کے لیے دعا کر سکتا ہے۔ تم تو ان کے وسیلے سے دعائیں کرتے ہیں لیکن جب آدمی شہر طیبہ کی فضا کا حصہ بن جائے تو پھر ایسے شعراء کی زبان کو عطا ہوتے ہیں۔

سرچشمہ عطا در خیر لوری کی خیر گنبد سے جان و دل میں اترتی ضیا کی خیر
ہو منبر رسول سے بیت حضور لگ ہر یادگار خواجہ ارض و سما کی خیر
(مصنف ص، ۳۸-۳۷)

اور آخر میں سب سے اہم نام ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی سب سے اہم ہے۔ یقیناً مائے ان کی تحریریں ذہن میں پلچل چا دیتی ہیں۔ دل کے تاروں کو چھیڑنا خوب جانتے ہیں۔ ان کے دونوں مضامین میں جو ماضی قریب کی تہذیبی زندگی کے حوالے سے پڑھنے کو ملے ان کے وسیلے سے اپنے ۷۵ سالہ ماضی کو بار بار دہرانے اور لطف اندوز ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیب، ان کا تمدن، ان کا رکھ رکھاؤ کسی قدر جاں فزا اور روح کو بالیدہ کرنے والا تھا کہ آج ان کے ذکر سے تاریکی جاں میں اُجالے جاگ جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کے مضمون میں ظاہری انتشار پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں فکری ربط ضرور ہے۔ کیا خوب ہو اگر وہ ذہن میں محفوظ تہذیبی یادوں کے ذخیرے کو نئی نسل کی تربیت کی خاطر مفصل تحریر کر کے شائع کرنے کا اہتمام کر دیں۔

یوں تو مسلمانانِ عالم کا شعوری اور تہذیبی رویہ رو بہ انحطاط ہے۔ اس کی پست ترین سطح پر پاکستانی معاشرہ ہے کتنی بد نصیب قوم ہے جو گزشتہ نصف صدی میں ایک رہ نما قوت پیدا نہیں کر سکی۔ بیس ویں صدی کے نصف اوّل میں جو مسلمان رہ نما گزرے ہیں ان کے پست قامت بھی نصف آخر کے قد آور سے بلند تھے۔ مذہبی، سیاسی، سماجی، علمی میدانوں میں ہو کا عالم ہے۔ کوئی بے راہ روی کو روکنے والا نہیں کوئی درست راہ بھانے والا نہیں۔ ڈاکٹر کشفی اور وہ تمام بزرگ جو تہذیبی یادوں کے خزانے رکھتے ہیں اب اپنی تحریروں کے ذریعے زمانے کو لٹا دیں یہ بڑا احسان ہوگا اس عہد پر۔ (شفقت رضوی ص ۴۹۳-۴۹۲)

احمد فراز:

احمد فراز ہیں اردو غزل کی آبرو، ان کی نعت بھی بچی ہوئی ہے۔ دھیمے لہجے کی نعتوں میں جناب سحر انصاری، مہر وجدانی، ماجد خلیل، ریاض حسین چودھری، عباس رضوی کا کلام خوب ہے۔ ذکیہ غزل کی نعت بھی سادہ مگر پڑا کرتھی۔ (احمد صغیر صدیقی ص ۷۷)

افضل بیگ (افضل الفت):

میں اسے مناسب بھی سمجھتا ہوں اور ضروری بھی کہ آپ سے اپنا رسمی تعارف کرا دوں۔ میرا نام تو افضل بیگ ہے لیکن افضل الفت کے قلمی نام سے مشقِ سخن کرتا ہوں۔ آبائی وطن تو جموں (مقبوضہ کشمیر) شہر ہے جو تقسیم ہند تک (اور کچھ عرصہ بعد تک بھی) ڈوگرہ حکمرانوں کا پایہ تخت رہا۔

موجودہ دارالحکومت سری نگر کو ریاست کے گرمائی دارالحکومت کی حیثیت حاصل تھی۔ تقسیم ہند کے بعد اپنے آبائی شہر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ (شہر اقبال) میں سکونت اختیار کی۔ میں البتہ ۱۹۴۹ء میں اس شہر قائد (کراچی) میں آ بسا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

لکھنے لکھانے کا شوق زمانہ طالب علمی ہی سے تھا۔ نثر نگاری سے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ سیاست، دین، ثقافت، علم و ادب اور فلم و فن جیسے سبھی شعبہ جات پر لکھا اور اچھا خاصا لکھا۔ مفت روزہ ”نگار“ اور روزنامہ ”نوائے وقت“، کراچی میں راقم کے مضامین اور نگارشات (۱۶۰) اور شعری مواد بھی (غزلیات اور منظومات) اشاعت پزیر ہوتا رہا۔ خالصتاً ادبی (منظوم مجموعہ کلام) ”بادِ صبا کی بات“ زیر ترتیب ہے (غزلیں، نظمیں، بلتے، نغمے، رباعیات و قطعات وغیرہ)

براہِ محترم! پروردگارِ عالم نے خوش الحانی کی نعمت غیر مترقبہ سے بڑی فیاضی کے ساتھ نوازا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ تقسیم ہند سے چند سال قبل (غالباً ۱۹۴۲ء) سے قیام پاکستان (اگست ۱۹۴۷ء) تک جموں شہر میں نئی نسل کے تین مشہور و مقبول شاخوانان رسول V میں اس خاکسار (افضل) کا نام بھی شامل تھا۔ دیگر دو نعت خوانوں میں قاضی ذکاء الدین آج بھی بقیدِ حیات ہیں اور شہر اقبال (سیالکوٹ) میں سکونت پذیر ہیں۔ دوسرے نعت خوان اور میرے جگری دوست شمس الدین المعروف ششٹی، ہجرت کے دوران سانہہ کے قریب ”ماوا“ نامی اُس ویرانے میں شہید ہوئے۔ جہاں ۱۵ اور ۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو اسلامیانِ جموں کا اجتماعی قتل عام ہوا تھا اور سیکڑوں جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کی متاعِ حیات چھین لی گئی تھی اور عورتوں، معصوم اور کمسن بچیوں کو ہندو اور سکھ دندہ نما انسانوں نے اغوا کر لیا تھا اور اس پورے ”آپریشن“ میں ڈوگر فورس اور پولیس کے علاوہ راشٹریہ سیکھ سنگھ کے اسلام دشمن کارکن شامل تھے۔

کراچی میں بھی اگرچہ تسلسل سے نہیں لیکن اکثر و بیش تر محافل میلاد النبی اور اس قسم کی دیگر تقریباتِ سعید میں نعت خوانی کے ذوق کی تسکین کے لیے بھرپور حصہ لیتا رہا۔ ۱۹۹۵ء میں آواز میں دباؤ اور بھاری پن محسوس ہونے لگا اور نعت پڑھنے میں خاص طور پر اونچی سُر میں آواز اُٹھانے میں دقت بھی محسوس ہونے لگی۔ اپنے معالج سے مشورہ کیا تو اُس نے (پہلی دفعہ) مجھے ایک E.N.T. سرجن الطاف ذکر یا کے پاس بھیج دیا جس نے غالباً ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو میری بائی آپسی (Bi-opsy) کی اور اُس کی حتمی تجزیاتی رپورٹ کے موصول ہونے پر مجھے حلق کے سرطان

(Throat Cancer) کی نوید دل فگار سنائی گئی۔ میری چھٹی جس نے تو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ اُسی وقت ہی کر لیا تھا جب میرے فیملی ڈاکٹر نے زندگی میں پہلی بار مجھے کسی E.N.T. سرجن کو refer کیا تھا۔ بہر حال یہ تصدیق ایک بجلی کی مانند تھی جو میرے گلشنِ احساس پہ گری لیکن جانے کیوں اس پر میرا وہ ردِ عمل نہیں تھا جو اس قسم کی خبر سے کسی بھی حساس آدمی کی طرف سے ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ مشہور انکا لو جسٹ ڈاکٹر منظور ایچ زیدی سے رابطہ ہوا انھوں نے شعاعوں کے ذریعے علاج کا مشورہ دیا جسے طبی اصطلاح میں Radio-Therapy (ریڈیو تھراپی) کہا جاتا ہے۔ نومبر تا دسمبر ۱۹۹۵ء تک یہ سلسلہ پایہ تکمیل کو پہنچا اور جب ڈاکٹر منظور زیدی نے یہ نوید مسرت دی کہ اب یہ خاکسار خطرے سے باہر ہے اور پھر آواز میں بتدریج بہتری پیدا ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ آواز معمول کے مطابق (Normal) ہو گئی۔ (۱۶۱) گفتگو کی حد تک۔ خوش الحانی کی دولت سے محروم ہو چکا تھا) اپنی شدید خواہش اور تڑپ کے پیش نظر میں نے ڈاکٹر منظور ایچ زیدی سے کہا کہ حرمین الشریفین کی زیارت (عمرہ) کے لیے جانے کا ارادہ ہے کیا صحت کے نقطہ نظر سے ایسا ممکن ہے؟ تو انھوں نے برملا کہا:

"Yes do go & also pray for me over there."

(ضرور جائیں اور وہاں میرے لیے بھی دعائے خیر کریں)

یکم فروری ۱۹۹۶ء (۰۱/۲/۹۶) (غالباً ۱۲ رمضان المبارک) کو میں جدہ روانہ ہوا۔ جدہ میں میری بیٹی ہوتی ہے۔ (میرا داماد بینک آف ہالینڈ (ABN) میں اچھی پوزیشن پر فائز ہے) جدہ ایئر پورٹ سے گھر روانہ ہوا۔ افطار سے کوئی تین گھنٹے قبل بیٹی، داماد اور بچوں نے نوید دی کہ دو نفل ادا کریں اور احرام باندھ لیں ہم لوگ بغرض عمرہ حرم کعبہ جائیں گے۔ جدہ سے مکہ معظمہ ۴۵ منٹ کا سفر ہے۔ گاڑی اپنی تھی۔ خالقِ ارض و سما کے حضور پیش ہو کر جو دلی راحت اور سکون ملا وہ بیان سے باہر ہے۔ عمرہ سے فراغت کے بعد (نمازِ مغرب بھی وہیں مسجد الحرام ہی میں ادا ہوئی) وہاں سے روانہ ہو کر نمازِ عشاء سے بہت پہلے ہم جلدہ چلے آئے۔ یوں اپنے قیامِ جدہ کے دوران جو ۲۹ فروری (بعد از عید الفطر) تک رہا خاکسار نے ۹ بار حرم کعبہ کا طواف (عمرہ) کیا اور دو دفعہ سرکارِ دو عالم حضور پُر نور آقائے نامدار V کے در اقدس پہ حضوری کا شرف حاصل ہوا بلکہ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب میں حضور V ہی کے دربارِ اقدس (مسجد نبوی) میں گزاری۔ مورخہ ۲۹ فروری ۱۹۹۶ء کو میں سعودی ایئر لائنز ہی کی پرواز سے کراچی واپس آیا۔ ۱۹۹۷ء اگست تک کسی

قسم کی کوئی تکلیف یا آواز میں کوئی ناخوش گوار تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ اس دوران میں اپنا Periodical check-up کرواتا رہا (ہر دو یا اڑھائی ماہ بعد) اگست ۱۹۹۷ء میں البتہ آواز میں وہی کیفیت پیدا ہونے لگی جسے طبی اصطلاح میں "Voice hoarsness" کہتے ہیں۔ بس پھر میں مارا مارا کہاں کہاں نہیں گیا۔ لاہور، اسلام آباد تمام بڑے بڑے سرطان کے مراکز اور ماہرین سے طبی معائنہ کروایا اور اُن کے مشوروں سے مستفید ہوا۔ آخر کار ڈاؤمیڈیکل کالج کے ENT پروفیسر اور سول ہسپتال کے شعبہ حلق، ناک اور کان کے انچارج سرجن کے حتمی مشورے پر ذہن و قلب کو اس مرحلے کے لیے تیار کر لیا جس سے بچنے کے لیے میں نے کتنے ہی جتن کیے تھے اور حتیٰ المقدور کوشش کی تھی۔ مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۹۸ء کو سول ہسپتال کے ENT وارڈ کے آپریشن تھیٹر میں پروفیسر سرجن جاوید عالم نے اپنے معاونین کی ٹیم کے ساتھ وہ کارنامہ سرانجام دیا جسے طبی اصطلاح میں (Total laryngectomy) کہتے ہیں۔ مریض کا ساؤنڈ بکس (آلہ صوت فطری) نکال دیا جاتا ہے۔ سرطان اُسی ساؤنڈ بکس کی دو صوتی تاروں (Vocal Cords) کے درمیان برجمان تھا اور اب خوراک کی نالی کی طرف پیش قدمی کرنے والا تھا۔ پانچ گھنٹے تک جاری رہنے والے اُس میجر آپریشن (بلکہ اُسے میجر جنرل آپریشن کہنا زیادہ مناسب ہے) نے سرطان سے نجات کی نوید مسرت تو دی مگر ہمیشہ کے لیے قوتِ گویائی سے یکسر محرومی بھی مقدر بن گئی اور یوں یہ افضل خوش الحان، خوش ادا و خوش بیان ہمیشہ کے لیے بے نوا و بے زبان ہو کر رہ گیا۔ ابتدا میں تو عجیب قسم کی گھٹن بے چینی یا س و بے چارگی کے شدید احساس اور ذہنی دباؤ سے پریشان ہو کر کئی بار دل چاہا کہ موت کو گلے لگا لوں لیکن پھر اپنے سے بھی زیادہ بے کسی اور لاچارگی کے شکار کچھ لوگوں کو زندہ رہتے ہوئے ہی نہیں بلکہ زندگی کرتے ہوئے دیکھا تو اندر سے ایک ایسی لہر اٹھی جس نے ذہن و قلب کی اس پوری کیفیت کو یکسر بدل ڈالا جو مجھے "مایوسی" کے گھیر اور خوف ناک اندھیروں کی طرف لیے جا رہی تھی۔ ربِّ ذوالجلال کے حضور سجدہ شکر ادا کیا کہ اُس نے ایک نعمت (قوتِ گویائی) واپس لے لی ہے تو باقی تمام نعمتیں بدرجہ اتم موجود ہیں اور پھر سب کچھ اُس کی رضائی سے ہوتا ہے۔ وہ علیم و بصیر ہے اور قادرِ مطلق بھی۔

۲۹ مئی کو ہسپتال سے گھر واپس ہوئی تو ۲ جون کا برادرِ محترم! یہ قطعہ ہوا:

”یہ جو کچھ بھی ہوا ہے سب رضائے ذاتِ باری ہے
مگر ہاں! قوتِ گویائی چھین جانے کا غم تو ہے

میں پھر بھی مطمئن ہوں کہ بفضلِ رب عزوجل
متاع آگئی، فکر و نظر، لوح و قلم تو ہے“
اسی کیفیت پر ایک اور قطعہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

”اگرچہ مال و زر سے بے نیازی اپنی فطرت ہے
زمانے میں جیسے ہم خوش ادا و خوش بیاں ہو کر
ہوا اب جسم و جاں سے منقطع آواز کا رشتہ
تو جی لیں گے جہاں میں بے نوا و بے زباں ہو کر“

مشہور صنعتی ادارے ”الکوپ (ALCOP) سے راقم بسلسلہ روزگار (ملازمت)
منسلک رہا اور مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۹۸ء (آپریش سے پہلے) بحیثیت ”اسٹور منیجر“ مستعفی ہو گیا
تھا۔ اگرچہ عمرہ کی ادائیگی سے قبل ہی حمد و نعت کی طرف رجحان ہونے لگا تھا لیکن عمرہ کی ادائیگی اور
حجاز مقدس سے وطن واپسی کے بعد سخن گوئی کا رجحان حمد و نعت کی طرف زیادہ ہی ہوتا چلا گیا۔
معروف سخن ور جناب حمایت (۱۶۳) علی شاعر کے مخلصانہ مشورے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے
کلام پر نظر ثانی / اصلاح کے لیے عہد حاضر کے بزرگ اور قادر الکلام شاعر جناب راغب
مراد آبادی کے حضور حاضر ہوا تو انھوں نے یہ کہہ کر مجھے حیران و ششدر کر دیا کہ وہ تین چار روز
سے میرے منتظر تھے (جناب حمایت علی شاعر نے ٹیلی فون پر اُن سے میرا تفصیلی ذکر کر دیا تھا) میرا
مسودہ (کلام) دیکھ کر اُس کی سرسری سی ورق گردانی کرتے ہوئے فرمایا، ”اس میں اصلاح کی کوئی
اتنی زیادہ گنجائش تو نہیں بہر حال جہاں اور جتنا مناسب ہوا وہ کر دیا جائے گا۔ مگر دو تین ماہ کے بعد
میں نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہی اور جب ان کے در دولت سے واپس لوٹا تو
ایک ”عزم نو“ اور ولولہ تازہ ”محسوس ہوا کہ عہد حاضر کے اتنے نامور اور با عظمت بزرگ شعر و سخن
نے میرے کلام کے بارے میں یہ کہا کہ اس میں اصلاح کی کوئی اتنی زیادہ گنجائش نہیں ہے۔“
(مصنف ص ۱۶۲-۱۶۲)

(پروفیسر) محمد اکرم رضا:

پروفیسر محمد اکرم رضا ہمارا سرمایہ افتخار ہیں، آقائے مکرم V کی نعت کے حوالے سے
قلم اٹھاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کائنات کا سارا حسن ان کے قلم کے ہم رکاب بارگاہِ حضور V

میں دست بستہ کھڑا ہو، لفظ لفظ میں موذت کے چراغ جل اُٹھتے ہیں۔ ہر چند یہ تصویر ادب بن
جاتا ہے ورق ورق پر ہجومِ مہ و انجم اُمڈ پڑتا ہے۔ نقدِ نعت کے حوالے سے ان کی خدمات جلیلہ آب
زر سے لکھی جائیں گی۔ (ریاض حسین چودھری ص ۳۸۲)

انجم نیازی:

آپ کے حکم کے مطابق اپنی کچھ مطبوعات جن کی کچھ جلدیں موجود تھیں ارسال کر رہا
ہوں۔ فہرست حسب ذیل ہے: ۱۔ حیاتِ انس ۲۔ ترے جیسا کوئی سورج نہیں ہے (قصیدہ)
۳۔ مناجات ۴۔ حرا کے مکین ۵۔ حرا کے آفتاب ۶۔ حرا کی خوشبو ۷۔ سیدنا صدیق اکبر (پہلا صحابی)
۸۔ مراد مصطفیٰ ۹۔ ذوالنورین ۱۰۔ سیدنا علی ۱۱۔ سیدنا امیر معاویہ ۱۲۔ سیدنا ابو موسیٰ عشری
۱۳۔ اولیاء ۱۴۔ آخری لمحہ (غزلوں کا مجموعہ) ۱۵۔ ایک تنہا آدمی (خودنوشت سوانح عمری)
۱۶۔ روشن ہیں سب ستارے رسالتِ مآب کے صلی اللہ علیہ وسلم ۱۷۔ کرنیں ایک ہی مشعل کی۔
مندرجہ ذیل کتب مکتبہ الفقہ ۲۳ سنت بورہ فیصل آباد سے بھی دست یاب ہیں۔
۱۔ حسنین کریمین ۲۔ سیدنا حمزہ ۳۔ سیدنا ذوالنورین ۴۔ سیدنا علی المرتضیٰ ۵۔ سیدنا امیر
معاویہ ۶۔ مراد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (سیدنا عمر فاروق) ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں
دارالامین لاہور ۸۰۰-۵۶۸-۰۳۰ سے مل سکیں گی۔

۱۔ میری امی جان حصہ ۲۔ خدیجہ الکبریٰ ۳۔ سیدنا عمرو بن العاص (زیر طبع)

مندرجہ ذیل کتب کے مسعودہ جات طباعت کے لیے تیار ہیں۔

۱۔ سیدنا ابو عبیدہ بن جراح ۲۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص ۳۔ سیدنا طلحہ ۴۔ سیدنا
عبدالرحمن بن عوف ۵۔ سیدنا زبیر بن الصوام ۶۔ بناتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ۷۔ ام المؤمنین
سیدہ ام ۸۔ ام المؤمنین سیدہ زینب بنت جحش ۹۔ سیدہ ام المؤمنین زینب بنت خزیمہ ۱۰۔ صدیقہ
کائنات (سیدہ عائشہ صدیقہ) میں عمر کے آخری حصہ میں ۷۲ سال کر اس کر چکا ہوں۔ چاہتا ہوں
کہ مرنے سے پہلے صحابہ و صحابیات پر کم از کم پچاس کتابیں لکھ جاؤں اللہ تعالیٰ مہلت اور توفیق عطا
فرمائے۔ میں کتابوں کی رائیلی نہیں لیتا۔ ہر کسی کو چھاپنے کی اجازت دے دیتا ہوں۔

(مصنف ص ۹۲۸/۲۵-۹۲۷)

جگن ناتھ آزاد:

اس وقت اسلام اور اسلامیات کے تعلق سے میرے غیر مطبوعہ کلام کا مجموعہ زیر کتابت ہے۔ اس میں حمدیہ کلام بھی ہے نعتیہ بھی اور منقبت بھی۔ اسلامیات کے تعلق سے دوسری نظمیں بھی مثلاً ’دہلی کی جامع مسجد‘ اور ’بھارت اور بھارت کے مسلمان‘ وغیرہ اس میں سے نعتیہ کلام نکال کر آپ کو بھیجوں گا۔ (مصنف ص، ۲۶۸)

جو ہر قدسی:

راقم الحروف اردو نعت کے ساتھ والہانہ شیفتگی رکھتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ راقم نے پی ایچ ڈی کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ ’اردو میں نعت گوئی: روایت اور ارتقا‘ کے موضوع پر ہی تحریر کیا ہے، جس پر راقم کو ۱۹۹۷ء میں کشمیر یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے۔ اب تک راقم کی ایک کتاب (اردو کے ۲۵ نعت گو شعرا: ولی دکنی سے صلاح الدین پرویز تک، صفحات ۳۲۰، سال اشاعت ۲۰۰۲ء) اور ۱۵ سے زائد مقالے نعتیہ موضوعات پر شائع ہو چکے ہیں۔ ایسے میں راقم جیسے نعتیہ ادب کے طالب علم کے لیے ’نعت رنگ‘ کی اہمیت و افادیت اور اس کے ساتھ والہانہ وابستگی کا اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں۔ (۲۷۰)

راقم کی ادارت میں ایک خالصتاً دینی پرچہ ’الحیات‘ سرینگر (کشمیر) سے ۴ سال سے شائع ہو رہا ہے، جس کا مئی ۲۰۰۵ء میں مسلسل اشاعت کا ۳۸واں شمارہ منظر عام پر آ رہا ہے، الحمد للہ۔ اس جریدے میں راقم نے ’نعت اکادمی کشمیر‘ (جس کا میں سیکریٹری ہوں) کے لیے دو صفحے مختص کر دیے ہیں، جن میں حمدیہ و نعتیہ کلام وغیرہ کی اشاعت ہوتی ہے۔

الحمد للہ ’نعت اکادمی کشمیر‘ ریاست جموں و کشمیر کی واحد ایسی انجمن ہے، جو خالصتاً نعت گوئی کے فروغ و ارتقا کے لیے کوشاں ہے۔ اس انجمن کا میں بانی سیکریٹری ہوں اور پروفیسر مرغوب بانہالی صاحب اس کے صدر ہیں جب کہ ریڈیو کشمیر سرینگر کے ایک پروڈیوسر غلام حسن غم گین اس کے نائب صدر ہیں۔ اکادمی کے پہلے نائب صدر مشتاق کاشمیری تھے، جو کشمیر کے سب سے معروف نعت گو شاعر ہیں لیکن موصوف اب کشمیر میں نہیں بلکہ آزاد کشمیر میں قیام پزیر ہیں۔

نعت گوئی کے مختلف موضوعات پر میرے مطبوعہ مقالے / مضامین

نمبر شمار	نام اخبار / رسائل	تاریخ اشاعت	بہ عنوان
۱۔	ہفت روزہ ہماری زبان نئی دہلی	یکم اگست ۱۹۹۷ء	اردو کا اولین نعتیہ نمونہ نئے انکشاف کی روشنی میں
۲۔	ہفت روزہ جبروت، سری نگر	۲۴ اپریل ۱۹۹۸ء	اردو نعت کا ہینٹی تنوع
۳۔	ہفت روزہ ’خبر و نظر‘ سری نگر	۱۰ اگست ۱۹۹۷ء	اردو کے نعتیہ انتخاب اور ’شہنشاہ کوئین‘
۴۔	ماہ نامہ ’پیش رفت‘ دہلی	جنوری ۱۹۹۸ء	اردو میں نعت کا اصطلاحی مفہوم
۵۔	ہفت روزہ جبروت، سری نگر	۲۶ ستمبر ۱۹۹۷ء	رسمی نعت گوئی اور حقیقی نعت گوئی
۶۔	ہفت روزہ جبروت، سری نگر	۵ ستمبر ۱۹۹۷ء	لفظ نعت کا اولین استعمال
۷۔	ہفت روزہ ہماری زبان نئی دہلی	۱۵ فروری ۱۹۹۸ء	نعت گوئی کا فن اور اس کے تقاضے
۸۔	ہفت روزہ ’خبر و نظر‘ سری نگر	۱۶ نومبر ۱۹۹۷ء	اردو نعت میں موضوعات کی بولمونی
۹۔	ماہ نامہ ’پیش رفت‘ دہلی	مارچ ۱۹۹۷ء	احسان دانش کی نعتیہ شاعری
۱۰۔	ہفت روزہ جبروت، سری نگر	۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء	علامہ اقبال کا نعتیہ کلام
۱۱۔	’گلالہ‘ کشمیر یونیورسٹی سری نگر	سال ۱۹۹۸ء	مولانا ظفر علی خاں کا نعتیہ کلام
۱۲۔	ہفت روزہ ’اخبار نو‘ نئی دہلی	۷ ستمبر ۱۹۹۸ء	علیم صبا نویدی کی نعتیہ شاعری
۱۳۔	ہفت روزہ جبروت، سری نگر	۲۷ اگست ۱۹۹۷ء	اردو میں نعت کے مختلف انداز و اسالیب
۱۴۔	ماہ نامہ ’حریم ناز‘ جموں	دسمبر ۱۹۹۸ء	تادم بلخی کا نعتیہ کلام
۱۵۔	روز نامہ ’عقاب‘ سری نگر	۱۷ اپریل ۲۰۰۰ء	اردو کے نعتیہ گلدستے اور ’عقاب‘
۱۶۔	ہفت روزہ جبروت، سری نگر	۱۵ نومبر ۲۰۰۰ء	صلاح الدین پرویز کا نعتیہ کلام
۱۷۔	روز نامہ ’عوام‘ نئی دہلی	۱۳ مارچ ۲۰۰۱ء	مولانا حالی کا نعتیہ کلام
۱۸۔	ہفت روزہ جبروت، سری نگر	اگست ۲۰۰۲ء	اردو نعت میں ہینٹی تنوع
۱۹۔	ماہ نامہ ’پیش رفت‘ دہلی	اگست ۲۰۰۲ء	اردو نعت میں ہینٹی تنوع

اس کے علاوہ کئی اور مضامین میں مختلف نعتیہ موضوعات پر شائع ہوئے۔ افسوس کہ ان

کا ریکارڈ دست یاب نہیں۔ (مصنف ص، ۷۳-۷۴)

حفیظ الرحمن احسن:

حفیظ الرحمن احسن کی حمد (قصیدہ نما) ان کی قادر الکلامی کی مظہر ہے۔ شوکت لفظی، شکوہ بیاں اور اسلوب کی بلند آہنگی کے سبب بلاشبہ یہ ایک قصیدہ نما حمد ہے۔ غیر مانوس مفرس و معرب الفاظ کی کثرت کے باوجود نظم میں بلا کی روانی ہے۔ شاید مانوس موضوع کے طفیل پیرایہ اظہار میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوا ہے۔ استفہامیہ طرز سخن نے نظم کی جاذبیت کو دو چند کر دیا ہے۔ اس حمد میں بیک وقت قصیدے، استغاثے اور آشوب نگاری کا اسلوب ملتا ہے۔ (قیصر نجفی ص، ۷۵۰)

حفیظ تائب:

ملتان کے جناب گوہر ملیانی نے ”گلاب رتوں کا شاعر“ کے دلکش عنوان کے تحت جناب حافظ محمد افضل فقیر کے بارے میں معلومات افزا اور روح پر تحریر پیش کی ہے وہ درویش منش لیکن بلند پایہ انسان تھے۔ مشہور و شاعر اور نعت نگار حفیظ تائب کی معیت میں ان سے متعدد بار ملاقات کا شرف حاصل ہوا وہ پہلے تو اورینٹل کالج میں پروفیسر کے منصب پر فائز تھے جب نعت کی طرف آئے اور روحانیت کا سفر شروع کیا تو بس اللہ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے پاس اپنی کبھی ہوئی غزلوں کا کثیر ذخیرہ تھا لیکن ان کے عشق رسولؐ کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے کہ جب نعت کہنے لگے تو غزلیات کے پیش بہا ذخیرے کو ہم سب کے سامنے نذر آتش کر دیا۔ دوست احباب منع کرتے رہے لیکن وہ باز نہ آئے۔ (سعید بدص، ۲۵/۹۱)

پروفیسر حفیظ تائب تو میرے قلب و نظر ہیں، اللہ ان کی عمر دراز کرے، انھوں نے نعت کو انکسار و محبت کا نیا رنگ دیا ہے۔ نعت کی حدود کو جس قدر وہ سمجھتے ہیں اور دورِ جدید میں وہ فہم ہمارے حصے میں کم کم آیا ہے۔ ”نعت رنگ“ کھولتے ہی میری نظروں نے سب سے پہلے ان کی حمد کو چومنا اور پھر ورق گردانی کی۔ (امین راحت چغتائی ص، ۲۳۱)

حنیف اسعدی:

حنیف اسعدی بلاشبہ ہمارے عہد کے نہایت ممتاز نعت گو ہیں غزل میں انھوں نے قائم رہنے والے نقش بنائے ہیں مگر یہ نقش گری ان کی نعت کا دینا چاہیے۔ حنیف بھائی کی غزل میں بھی نعت کی کیفیت اکثر ابھرتی ہے اور یہ اس بات کی شہادت ہے کہ وہ دوئی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے

ہیں۔ قرآن حکیم نے اسلام کے بارے میں اہل ایمان سے کہا ہے کہ ”اسلام میں پورے“ داخل ہو جاؤ۔ حنیف بھائی کی نعت ان کی پوری ذات کا اظہار ہے۔ شاعری اور نعت گوئی سے قطع نظر ان کے نفس اور ذات کی خوشبو میں بھی نعت کے کتنے ہی پہلو ہیں اس سلسلہ میں (میں حفیظ تائب کا بھی نام لینا چاہتا ہوں) جب آدمی کی خاموشی ثنا اور مدحت بن جائے تو پھر اسے اور اسکے چاہنے والوں کو اور کیا چاہیے ان کے کتنے ہی شعر اور مصرعے بہت سے پڑھنے والوں کی طرح میرے ذہن کا حصہ بن چکے ہیں۔

اپنے ہر جرم پہ محسوس ہوا آپ نے دیکھ لیا ہو جیسے
اور بظاہر یہ سیدھا سادا مگر نہایت بلند مصرع: نام ایسا کہ ثنا ہو جیسے

جس آدمی نے اسم محمد ﷺ کو یوں جان لیا ہو، نعت کا کون سا مرحلہ ہے جو اس کے لیے مشکل ہوگا ان کی نعت گوئی تو معرفت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مسلسل سفر ہے اور میرے عزیز! تم تو جانتے ہو کہ یہ سفر کبھی نہ ختم ہونے والا ہے۔ دنیا کی ہر زبان کے سارے محترم لفظ، اظہار اور امکانات سرکار انسانیت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خلق کیے گئے ہیں۔ حنیف بھائی نے طبع موزوں، سلگتے ہوئے دل اور چشم نم کو وسیلہ نعت بنا دیا ہے اور ان کی ہر کاوش کے پیچھے وہ اشارہ موجود ہے جو ہر بڑی انسانی کاوش کی تحریک بنتا ہے۔

اس طرف کا اگر اشارہ نہ ہو طبع موزوں بہم نہیں ہوتی
کہنے والے نے سچ کہا ہے کہ لفظوں کے معانی لغت میں نہیں ملتے بلکہ اچھے اور بڑے اہل قلم کی نظر و نظر میں ملتے ہیں۔ یہاں طبع موزوں کو دیکھو اور پھر اس کا نظم ہونا۔
العظمت للہ۔ (ڈاکٹر ابوالخیر کشفی ص، ۳۷-۳۶)

رحمن کیانی:

رحمن کیانی کی نعتیں جدت فکر، لب و لہجہ کی توانائی، بلند آہنگی نیز عرب کے حسن طبیعت کا بہترین نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بجا طور پر انھیں ”اردو کا منفرد راجز“ کہا ہے۔ تعجب تو اس پر ہوا کہ گل چیدہ میں بھی ان کی کوئی نعت نہیں ہے۔ نعتوں کا یہ انتخاب بہت ہی معیاری اور آپ کی فکری سطح کی بلندی کا آئینہ دار ہے۔ غوث میاں کا ”پاکستان میں نعتیہ انتخاب“ کتب نعت کی ۱۹۴۹ء سے ۱۹۹۵ء تک کی اشاعتوں کی تفصیل زندہ رہنے والا کام ہے۔ (شاہ مصباح الدین شکیل ص، ۸۰۶)

رزاق افسر:

اطلاعا عرض ہے کہ میں بھی اردو شعر و ادب سے وابستہ ہوں اور اپنے شہر میں اردو ادب کے فروغ کے لیے مقدور بھر ممکنہ خدمات تقریباً پینتیس سالوں سے کرتا آیا ہوں اسی ناطے ارباب ادب سے رابطے بھی بحال ہوئے۔ پچھلے سترہ سالوں سے بینائی کی غیر معمولی خرابی میں مبتلا ہوں۔ طویل علاج سے کوئی افادہ نہ ہوا لیکن بفضل تعالیٰ فکر و قلم دونوں رواں دواں ہیں۔ تخلیقی عمل جاری ہے ملک اور بیرون ملک سے شائع ہونے والے چھاپیس ادبی رسائل اور 42 اخبارات میں اشاعت کے سلسلے بحال ہیں۔ رسائل و اخبارات میں تقریباً 1,600 تخلیقات شائع ہو چکے ہیں تین شعری مجموعے (۱) 'آبشار'، فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے 1981ء۔ (۲) حمد و نعت اور مناقب پر مشتمل دوسرا شعری مجموعہ 'اعتراف' سال 1990ء اور تیسرا (۳) غزلوں پر مشتمل 'شب چراغ'، دونوں کرناٹک اردو اکیڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئے ابھی آٹھ مسودے اشاعت کے منتظر میز پر دھرے ہوئے ہیں۔ اس خطک ساتھ چند غیر مطبوعہ حمد و نعت کی نقول اور دوسرا شعری مجموعہ 'اعتراف'، دونوں آپ کے نام میرے ایک عزیز کی معرفت جو دہلی میں مقیم ہیں آپ کے نام بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ ڈاک ملتے ہی جواب سے شاد کام فرمائیں گے۔

حمد، نعت، مناقب، غزل، پابند نظم، آزاد نظم، مختصر نظمیں، مکالماتی نظمیں، قطعات، ثلاثی، ماہیے، مرحومین کے نام نوے (جس میں تاریخ گوئی بھی شامل ہے) پر طبع آزمائی کا سلسلہ بحال ہے۔ ماہ نامہ 'نقوش' لاہور کے خصوصی مرحوم محمد طفیل نمبر کی دوسری جلد میں موصوف مرحوم کی رحلت پر لکھی ہوئی نظم آپ دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت بیوہ سلطان شہید کے ہر سالہ عرس میں دو تین منظومات عقیدت لکھتا رہا ہوں اور یہ سلسلہ تقریباً 28 سال سے جاری ہے۔ موصوف شہید کے نام لاہور اور کراچی سے شائع ہونے والی کتابوں میں تین چار نظمیں شامل ہیں۔ ادارہ بزم اردو میسور کا بانی رکن اور 33 سالوں سے اس ادارے کا مستقل سیکریٹری ہوں۔ اُمید ہے کہ فوری جواب سے شاد کام فرمائیں گے۔ آپ کے ادارے کے کاموں میں ممکنہ تعاون مجھ سے ہمیشہ ملے گا۔ ان شاء اللہ اس سلسلے میں چند ضروری باتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت امیر بیناگی اور علامہ منور بدایونی اور مولانا ضیاء القادری، احمد رضا خان بریلوی اور

احسن مارہروی کے نعتیہ دیوان ضرور حاصل کریں اور آزادی سے بہت پہلے نعت کے دو انتخاب شائع ہوئے تھے جن کا نام مدحیہ کلام حصہ اول اور حصہ دوم جن میں کئی نعت گو شعرا اکٹھے ملیں گے۔

- ۲۔ مرحوم امجد حیدر آبادی کی رباعیات کا دیوان۔
- ۳۔ شہر بنگلور کرناٹک کے متوطن مرحوم علامہ عبدالحی احقر کا نعتیہ دیوان اور سیرت پر لکھی ہوئی ضخیم کتاب جنان السیر جو 32000 شعروں پر مشتمل ہے اور پچھلی ایک صدی سے اس کے ایڈیشن ہر تین چار سال میں ایک شائع ہوتا رہتا ہے، موصوف مرحوم کی ڈیڑھ سو کتابیں شائع ہوئیں جن کا تعلق دین سے ہے۔
- ۴۔ عربی قصیدہ بردہ شریف مصنفہ حضرت سیدنا شرف الدین امام بوصری متوطن مصر کا اردو مقفّع ترجمہ مرحوم محمد حسین عارف جو کشمیر ہائی کورٹ کے جج نے بہت اچھا کیا ہے جو 1986ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ ضرور حاصل کریں۔ (مصنف ص، ۳۴۴-۳۴۳)

رشید اختر خاں:

عہد حاضر کی اردو نعتیہ شاعری پر ایک طویل و بسیط تنقیدی کام کر رہا ہوں (یہ کام ۱۹۸۸ء میں "جدید اردو نعت ایک مطالعہ" کے عنوان سے شروع ہوا لیکن کتابت و طباعت کے دشوار ترین مرحلے اور بعض ناگزیر حالات کی بنا پر ناقص مسودہ محفوظ رکھ دینا پڑا) اب اُسی مسودہ کو از سر نو نظر ثانی اور اضافہ کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش جاری ہے اور کاوش تو یہ ہے کہ اس طرح کے سابقہ کاموں کے کچھ منفرد انداز کی یہ چیز ہو۔ خاص طور سے عہد بہ عہد اردو نعت گوئی کی تاریخی و تخلیقی سفر میں زماں و مکاں کی تبدیلی عصری میلانات، اردو شاعری کے بدلتے مزاج و رجحان اور نئے تجربات و وسعت فکر کی ہمہ گیری کے ساتھ آج کی نعتیہ شاعری اس دور میں داخل ہو کر اسے عہد نعت قرار دیا جانے لگا ہے۔ مجوزہ کتاب میں اسباب و عوامل کے ساتھ تخلیقات کے حوالہ سے ایک اہم بحث شامل ہے۔ موضوع کے تنوع اور وسعت کے لحاظ سے کام پھیلتا جا رہا ہے اور اسے سمیٹنا مشکل ہے۔ (مصنف ص، ۵۰-۳۴۹)

ریاض حسین چودھری:

(صبح رحمانی صاحب!) گزشتہ دنوں جب آپ سیال کوٹ تشریف لائے تھے تو آپ

نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آج کل میری مصروفیات کیا ہیں؟ پھر اچانک گفتگو کا رخ دوسری جانب مڑ گیا، (۳۸۹) برادر عزیز! اللہ کے فضل و کرم اور آقائے کائنات V کی خصوصی توجہات سے نعت حضور V کے حوالے جو عمر بھر تھوڑا بہت کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے اس کام کو سمیٹ رہا ہوں، میرا بیٹا محمد حسین مدثر میری بھرپور معاونت کرتا ہے یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ زیرِ معتبر (۱۹۹۵ء) رزقِ ثناء (۱۹۹۹ء) تمنائے حضور (۲۰۰۰ء) متاعِ قلم (۲۰۰۱ء) کشکولِ آرزو (۲۰۰۲ء) سلامِ علیک (۲۰۰۴ء) اور غلڈن (۲۰۰۹ء) اب تک میرے سات نعتیہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ”رزقِ ثناء“ پر مجھے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ حکومت پنجاب نے بھی ”رزقِ ثناء“ کو سیرت ایوارڈ دیا تھا۔ اب ”غلڈن“ کو حکومت پاکستان کی طرف سے صدارتی ایوارڈ ملا ہے جب کہ ”غلڈن“ کو نعت ایوارڈ کا بھی مستحق گردانا گیا ہے۔

۲۰۰۲ء میں تحریک منہاج القرآن کے شعبہ ادبیات (لاہور) سے ریٹائرمنٹ لینے کے بعد واپس گھر (سیال کوٹ) آ گیا ہوں، جن مسودہ جات کو آخری شکل دے دی ہے، ان کی تفصیل یہ ہے ”طلوع فجر“ ۱۲ رجب الاول کے حوالے سے یہ پانچ سو بند پر مشتمل ایک طویل نعتیہ نظم ہے۔ ہر بند کی آخری دو سطروں کو باقاعدہ شعر کی صورت دے دی ہے اور سعی کی ہے کہ بند کے نفس مضمون کو اس شعر میں سمیٹا جاسکے۔ ”طلوع فجر“ کا دیباچہ ڈاکٹر پروفیسر محمد اسحاق قریشی نے تحریر کیا ہے۔ ”غزل کا سہ بکف“ کو بھی آخری شکل دے دی ہے۔ ”ہشت نعتیہ“ غزل کا سہ بکف کی پہلی نعت ہے جو ۲۰۰۰ء اشعار پر مشتمل ہے، غزل کا سہ بکف کا پیش لفظ بشیر حسین ناظم نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ نعتیہ نظموں پر مشتمل دو مجموعے، نعتیہ قطعات، نعت معریٰ اور مزید چار پانچ نعتیہ مجموعے بھی زیرِ ترتیب ہیں۔

حمید رب جلیل اور مناجات کے تین مجموعے مرتب ہوئے ہیں ”کتاب التجا“، ”لامحدود“ اور حمدیہ قطعات، غزلوں کے بعد دو مجموعے تیار ہیں، دعا کیجیے کہ عمرہ کے دنوں سفر ناموں کو بھی جیلہ تحریر میں لاسکوں۔

لیکن گنبد خضرا کا ہے کرم بے حد قلم پہ رحمت یزداں بھی انتہائی ہے جسمانی عوارض اپنی جگہ لیکن بڑھاپا ثنائے مصطفیٰ کی تخلیقات میں گم ہے، یہ میرے اللہ کا فضل ہے اور میرے حضور V کا کرم نہیں تو اور کیا ہے۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر لکھ رہا ہوں کہ قلم بڑھاپے کا شکار نہیں ہوا۔ (ریاض حسین چودھری ص ۳۹۰)

فضائے نعت میں اُڑتے ہوئے نہیں تھکتا مرا قلم بھی ہے جبریل کے پروں کی طرح ایک عرصے سے رابطے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکی شاید اس میں میرے ازلی تساہل ہی کا عمل دخل ہے پچھلے دو تین تین ماہ چیسٹ انفیکشن کی اذیت میں مبتلا رہا ہوں۔ کھانسی تو بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے لیکن بلغم ابھی باقی ہیں۔ خدا کا شکر ہے بلڈ پریشر اور شوگر کے جن قابو میں ہیں۔ اکھڑی ہوئی سانسیں بھی اعتدال کی راہ پر گامزن ہیں البتہ چلنے پھرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے آپ کو یاد ہے کہ ایک بار حاجی محمد رفیق الرفاعی کے ریٹائرمنٹ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے گر پڑا تھا اور آپ نے سہارا دے کر اٹھایا تھا صورتحال مزید بگڑ چکی ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ میرے لیے صحت کاملہ کی دعا فرمائیں۔ اس سوچ میں گم رہتا ہوں کہ اگر سرکارِ مدینہ نے طلب فرمایا تو چل کر حاضری دوں گا۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ بڑھاپا بڑی مشکل سے گزرتا ہے رب کائنات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جملہ جسمانی عوارض کے باوجود میرا بڑھاپا قابلِ رشک ہے، خضر حیات صاحب مجھے تنہا نہیں ہونے دیتے۔

کتنے دلکش ہیں بڑھاپے کے مرے شام و سحر ایک اک لمحہ گذرتا ہے درِ آقا پر تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ اس سال ”غزل کا سہ بکف“ کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے ”رزقِ ثناء“ اور ”غلڈن“ پر بھی صدارتی ایوارڈ مل چکا ہے۔ رزقِ ثناء پر صوبائی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ اب کے ”آبروئے ما“ پر صدارتی ایوارڈ (سند امتیاز) بھی عطا ہوا ہے۔ یہ سب تمھارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے (”زم زم عشق“ جس کا دیباچہ ڈاکٹر عزیز احسن نے تحریر فرمایا ہے پریس میں ہے ممکن ہے اس تحریر کی اشاعت سے قبل آپ کے ہاتھوں میں ”تحدیثِ نعمت“ اور ”دبستان نو“ کو آخری شکل دے چکا ہوں دس بارہ مسودے مزید ہیں وقت کم ہے اور کام بہت زیادہ، جو اللہ کو منظور۔

(ریاض حسین چودھری ص ۲۵/۹۰۶-۹۰۵)

سلیم کوثر:

اسی شمارے ۹ میں سلیم کوثر کی نعتیں خصوصی مطالعہ کے حصے میں ہیں اور خوب ہیں ان کی نعتوں میں ادبی حسن کاری کے جلوے بہتات سے نکھرے ہوئے ہیں اور ان کی نعتیں پڑھ کر دل دیر تک مسرور رہتا ہے۔ اچھی شاعری کی اہم ترین صفت یہی ہے کہ وہ خوشی بخشتے۔ خصوصی مطالعہ کا یہ حصہ ہر شمارے میں رکھیں مگر صرف اس شاعر کا جس کے پاس واقعی عمدہ نعتوں کا سرمایہ

ہو۔ (احمد صغیر صدیقی ص ۶۴)

شاہ حسین نہری:

اگر آپ کو میرے خطوط ملے ہوں گے اور کتاب بھی، تو آپ کے لیے میرا نام ناموس اور اجنبی نہ ہوگا اور اگر نہیں تو عرض ہے کہ مجھ بندہ اللہ کو شاہ حسین نہری کہتے ہیں۔ شاعری کے چار مجموعے ”شب آہنگ“ (غزل و نظم)، ”شب تاب“ (غزل)، ”سامانِ تسکین“ (حمد و مناجات، نعت و مقبت) اور ”رباعیات شاہ“ شائع ہو چکے ہیں۔ میرا پورا نام سید شاہ حسین نہری ہے۔ میں بل بھیم کالج بیڑ میں جولائی ۱۹۹۹ء تک لگ بھگ تیس برس اردو کا لکچرر رہا۔ جی ہاں! بیڑ یعنی وہ شہر جہاں آپ کے قریبی عزیز، میرے شاگرد رشید جناب سید سجاد اختر بھی رہتے ہیں۔ اب میں اپنے وطن اورنگ آباد، دکن میں مقیم ہوں، البتہ میرا بیٹا سید فرید احمد نہری مسلمہ، بیڑ کے ملیہ سینٹر کالج میں اردو ہی کا لکچرر ہے۔ ۱۹۹۲ء سے یہ کالج انجمن اشاعت تعلیم، بیڑ کے تحت قائم ہے اور اس انجمن کے صدر جناب سید سجاد اختر ہیں۔ عزیزم فرید احمد نے اطلاع دی کہ آج کل سجاد صاحب بیڑ کی ادبی وثافتی سرگرمیوں سے متعلق ایک مثنوی تخلیق کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس مثنوی میں آپ کا نام نامی اور تذکرہ بھی بطور خاص شامل ہے۔ (مصنف ص ۲۷۴)

ڈاکٹر صابر سنبھلی:

ہائی اسکول کے سٹوفکیٹ میں تاریخ ولادت ۱۵ جولائی ۱۹۴۱ء درج ہے۔ گھیا نے مزید بے کار کر دیا۔ کچھ نعتیں بھی ارسال کر رہا ہوں۔ اگر کوئی پسند ہو تو شامل اشاعت کر لیں۔ Four in one صنعت کو فروغ دینا چاہتا ہوں مگر اکیلا ہی گاڑی کھینچ رہا ہوں کسی طرف سے ہم نوائی نہیں ہوئی۔ (مصنف ص ۸۸۵/۲۵)

صابر وسیم:

صابر وسیم کی شاعری میں ندرت بیان کی خوبی پائی جاتی ہے۔ نعت گوئی میں بھی انھوں نے یہ خصوصیت قائم رکھی ہے۔ عرش ہاشمی کی غالب کی زمین میں نعت ایک اچھی کاوش ہے، تاہم اس مصرع پر نظر ثانی کر لیں تو بہتر ہے: فیض جاری ہے گر یقین نہ آئے

”نعت رنگ“ شمارہ ۱۴ کا آغاز بھی حمد باری تعالیٰ سے ہوا ہے۔ یہ حمد حفیظ تاب کی فکر کا نتیجہ ہے اور ان کی فکری و فنی پختگی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ (قیصر نجفی ص ۷۵۳)

مولانا عبدالعزیز شرقی:

شاید تمھیں علم ہوا ہو کہ حضرت مولانا عبدالعزیز شرقی [۲]، اس سال شوال میں ہم سے رخصت ہو گئے۔ مدینہ منورہ میں زندگی کے کم و بیش تیس سال گزارے اس کے علاوہ وہ مسلسل آتے جاتے رہے۔ حمد میں تسبیح و تحمید و تہلیل کو انھوں نے اپنی نوائے عاشقانہ کا حصہ بنایا۔ اور اب یہ رنگ عام ہو چلا ہے۔

یہ کیف کا عالم جذب دروں، سبحان اللہ سبحان اللہ
میری زباں پر تیری ثنا ہے الحمد للہ، الحمد للہ

کے کی عظمت، کعبے کی شوکت اللہ اکبر، اللہ اکبر

نعت خوانی کے ایک اسلوب خاص کے مالک تھے۔ پڑھتے تو لفظ تصویر اور رقص بن جاتے۔ مدینہ کی فضاؤں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان سے نعت سنتے اور خاک طیبہ میں اپنے آنسوؤں کی خم ریزی کرتے۔ (ڈاکٹر ابوالخیر کشفی ص ۳۹)

حافظ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی (بہار، انڈیا):

میرا نام تو اوپر مرقوم ہے۔ عمر تقریباً ۶۵ سال ہے۔ اردو ادب کی خدمت کرتے ہوئے (پروفیسر کے عہدے سے) ساڑھے تین سال قبل متقاعد ہو چکا ہوں۔ سبک دوشی ملازمت اور حج سے فراغت کے بعد ۳ برسوں میں پانچ منظوم کتابیں طبع ہو چکی ہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد پانچ ہزار ہے۔

۱۔ رفتگاں وقائعماں، درجہنگہ کے اہل علم و ادب کا منظوم تذکرہ، تقریباً ۲۴۰۰ اشعار ہیں۔

۲۔ مناظر نامہ مناظر عاشق ہر گانوی کے فکر و فن کا منظوم تنقیدی جائزہ، ۴۳۱ اشعار

۳۔ دستار طرح دار مظہر امام کے فکر و فن کا منظوم تنقیدی جائزہ، ۸۰۰ اشعار

۴۔ نارنگ زار پروفیسر گوپی چند نارنگ کے فکر و فن کا منظوم تنقیدی جائزہ، ۱۳۵۰ اشعار

۵۔ طلع البدر علینا حمد اور نعت کا مجموعہ

اگست ۲۰۰۳ء میں جب نعت کا مجموعہ ترتیب دے رہا تھا تو ایک اہم سوال کا جواب پانے کے لیے اپنے ملک کے مقتدر علما کے علاوہ آپ کو بھی خط لکھا تھا اور اپنی اہم تصنیف ”رفتگاں

و قاتماں“ ڈاک سے بھیجی تھی۔ یہ کتاب صوری و معنوی دونوں لحاظ سے اہم ہے۔ (مصنف ص ۷۰، ۶۶۹)

قمر گونڈ وی:

پیش خدمت مضمون (وسیم بریلوی: نئی نعت کا پیشرو شاعر) میرے کرم فرما شاعر و ادیب قمر گونڈ وی صاحب کے تقاضوں کا نتیجہ ہے جن کی کتاب ’وسیم بریلوی شخص و شاعر‘ زیر طبع ہے۔ موصوف بڑے جوان حوصلہ بزرگ ہیں ورنہ ستر اسی سال کی عمر میں ایک ایسے شخص کا اس شاعر کی شخصیت اور شاعری پر قلم اٹھانا جوان کو چچا کہہ کر مخاطب کرتا ہے، چہ معنی دارد؟ قمر صاحب اگلے وقتوں کی نشانی ہیں۔ حضرت جگر مراد آبادی کے خادم خاص رہے ہیں۔ جگر، حیرت اور مجروح کی یادوں کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ مجروح سلطانپوری پر ان کی کتاب یو پی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی تھی اور اس حوالہ سے کہ مجروح غزل کے بڑے شاعر ہیں یا فیض، بہت دنوں تک بحث میں رہی تھی۔ وسیم جن کو اردو کے عام نقاد مشاعرے کا شاعر باور کر کے زحمت توجہ نہیں اٹھاتے، ان کے تعلق سے موصوف کی رائے ہے کہ وہ کسی ادبی آستانہ کے در یوزہ گریا کسی گروہ کا حصہ ہوتے تو یہ بے اعتنائی ہرگز روانہ رکھی جاتی۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان سے صد فیصد متفق ہوں لیکن اس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ (احمد جاوید ص ۲۶، ۶۵۶)

قمر وارثی:

جناب قمر وارثی ایک مشہور و ممتاز اور صاحب دواوین شاعر اسلام ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام سے برابر محظوظ ہوتا رہتا ہوں۔ انھوں نے ایسے بہت سے روحانی و ایمانی اشعار کہے ہیں جو والہانہ عشق و محبت اور احساس معصیت کے چراغوں سے خوب خوب چمکتے دکتے رہتے ہیں۔ (سید شمیم احمد گوہر ص ۵۱۶)

قمر وارثی ایک مشاق شاعر ہیں اور فن شعر کی باریکیوں سے خوب واقف ہیں۔ بالخصوص لوازم نعت پر توان کی گہری نظر ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر طلحہ رضوی (بھارت) نے ان کے نعتیہ مجموعے ”کہف الوری“ پر تبصرہ رقم کرتے ہوئے چار مصرعوں کو فنی طور پر محل نظر گردانا ہے۔ ایک مصرعے میں ڈاکٹر صاحب نے لفظ ”قامت“ کو مؤنث قرار دیا ہے۔ جب کہ ”قامت“ مذکر ہے اور قمر وارثی نے درست باندھا ہے:

شاخ حیرت پر کھلا ہے میرے قامت کا گلاب
ایک دوسرے مصرعے میں کپوزنگ کی غلطی کو شاعر کی فنی کم زوری سمجھا گیا ہے۔
ہمارے خیال میں ”محو حیرت“ کی ترکیب لفظی اتنی عام ہے کہ قمر وارثی جیسا مشاق شاعر اس کے بجائے ”محو حیراں“ نہیں لکھ سکتا:

ع دم بخود ہیں ماہ و انجم، محو حیراں آفتاب
البتہ بقیہ دو مصرعوں پر گرفت بجا ہے۔ (قیصر نجفی ص ۷۵۲)

ولی اللہ ولی صدیقی عظیم آبادی:

میرا تعلق عظیم آباد (پٹنہ) سے ہے، عرصہ دراز سے بحمد اللہ مدینہ منورہ، زبردان کوہ
اُحد قیام پزیر ہوں۔ شعر و سخن سے تھوڑی بہت دلچسپی ہے۔ حمد و نعت میرا موضوع سخن ہے۔ ایک
مجموعہ حمد و نعت ”نوائے طیبہ“ [۲۰۰۲ء] کے نام سے آپ کے کراچی شہر میں مکتبہ الشیخ
۳/۴۳۵، بہادر آباد، کراچی، فون: ۴۹۳۸۹۹۸ سے طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند
شعر حاضر ہیں:

میں حسان و کعب اور ابن رواحہ ان اصحاب کی اقتدا کر رہا ہوں
قلم کا مرے فیض جاری ہو یارب بصد عجز میں التجا کر رہا ہوں
جھکا کر قلم سر کے بل تیرے آگے عقیدت کے سجدے ادا کر رہا ہوں
سخن کو میرے ناز و حسن ادا دے کہ وصفِ شہ انبیاء کر رہا ہوں
ڈنمارک کے شاتم رسول کی گستاخی پر خصوصاً اہل قلم کے حوالے سے رقم ہوئی ایک نظم پیش خدمت
ہے۔ ”نعت رنگ“ میں شامل ہو جائے تو زہے نصیب، ورنہ۔ (مصنف ص ۸۹۱)
کہاں میں کہاں بحرِ جود و سخا وہ جو دامن میں ہے، وہ فدا کر رہا ہوں

متفرقات

تخلیق کائنات اور باعث تخلیق کائنات:

آپ کی خواہش ہے کہ میں ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے کچھ لکھوں سو چند پہلو جن پر میں غور کرتا رہا ہوں پیش کیے دیتا ہوں۔ علم کائنات (cosmology) کی تاریخ ہیئت دانوں (astronomers) کے مطابق ۳۵۰۰ سال پرانی ہے ہماری کائنات کے وجود میں آنے کی کھوج اس کے مظاہر کے شاہدوں پر غور و خوض اور فکر و نظر کے ارتکاز کی ابتداء جن ممالک سے شروع ہوئی ان میں سیلون، چین، یونان، اٹلی، انڈیا اور مصر شامل ہیں یہ اعزاز ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق م) کو جاتا ہے کہ اس نے اپنی تصنیف (De caele on the Heavens) میں بیان کیا ہے کہ ہماری مقدس سرزمین چھوٹے چھوٹے ۵۵ مقدس کڑوں کے درمیان چکر لگا رہی ہے ہماری زمین سے قریب ترین اور سب سے چھوٹا کڑہ چاند ہے۔ حشو و زوائد سے قطع نظر یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ارسطو کا نقطہ نظر دو ہزار سال تک تسلیم کیا جاتا رہا اسے مورخین کی آراء میں کیتھولک فرقہ نے اپنے مفاد میں استعمال کیا اور علم کائنات کی فہمیت و فروغ کی راہ میں روڑا بنارہا۔ The Handyspace Answer Book TM

Visible Imfa press-1998, USA. P-12)

حیات و کائنات کی ایسی حقیقت مطلق جس جو فکری، نظری اور علمی، عملی تا سید حاصل ہو اب تک ممکن نہیں ہوا ہے پیش نظر موجودات و مظاہر کی حقیقت کو فلسفہ حتی الامکان پرکھتا اور برتا ہے اس کا ہدف اور دائرہ عمل اور ناموجود دونوں کی کنہ تک پہنچنا ہے تاہم فلسفہ حتمی اور فیصلہ کن نتائج یا یقین دہانیوں سے گریز برتا ہے۔ فسطے اسے علم و آگہی، کانٹ علم انتقادیات، اور نٹشے اسے تخیل و تصور (Conception) اور ادراک یا احساس (Preception) کی ثانویت میں تقسیم کر

کے اسے فلسفہ کی ذیل میں رکھتے ہیں۔ ایک اور جہت اخلاقی و مذہبی اقدار کا توارث اور تسلسل ہے جو تحقیق و تفتیش سے عبارت ہے یہ برٹریڈ رسل سے منسوب ہے المختصر فلسفہ کا ارتکاز سے عاری مد و جز را سے کہیں ٹھہرنے نہیں دیتا یہ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ میزان معاشرتی زندگی میں اپنی معنویت اور افادیت کھو بیٹھتا ہے اس کے برعکس سائنسی پیش رفت اور اس کے انکشافات بڑی حد تک معاشرہ کو سدھارنے میں راہ راست برادر چہ دور ہست کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں ہر چند کہ سرچشم کا اصرار ہے کہ سائنس جس مقام پر آکر سکوت و استقرار کا شکار ہو جاتی ہے فلسفہ وہاں سے اپنی پیش رفت کا آغاز کرتا ہے وٹھہر نے فلسفہ اور سائنس دونوں کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ سائنس ایک جسم ہے، بے روح جسم اور فلسفہ روح ہے، جسم کے بغیر گویا اس نے دونوں کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دے کر زندگی کے پہیہ کو پھر رواں دواں کر دیا۔

فلسفہ ہو یا سائنس یہ اجتماعی کامیابیوں سے صورت پذیر ہوتا ہے جب کہ فن کار تنہا پوری انسانیت کے لیے محبت، ہمدردی اور خیر کا پیغام لے کر طلوع ہوتا ہے۔ فن کار اپنی تخیلاتی اور تخلیقی سوچ کو رنگوں یا لفظوں کا جامہ پہناتا ہے تو گویا اپنے فن اور ہنرمندی کے توسط سے اپنی جذباتی، حیاتی، جمالیاتی اور تجربیاتی کیفیات کو قارئین، ناظرین یا سامعین تک منتقل کرتا ہے سامع، قاری یا ناظر اس سے جو کیف و سرور یا فکر و نظر کے جن نئے ابعاد سے متعارف ہوتا ہے اس صورت حال کو میور ہیڈ حساس سامع، قاری یا ناظر کی فطری محرومیوں اور نارسانیوں کی طمانیت و تسکین کا باعث گردانتا ہے فن کا حسن و جمال تخیل کی شادابی میں گھل کر ایک صاحب ادراک اور ایک نفس مطمئنہ کے حامل قاری سامع یا ناظر کو سکون و آسائش مہیا کرتا ہے اس راحت رساں فن کار کو میور ہیڈ ”آفاقی انسان“ کہتا ہے جو مافوق الانسان آفاقیت پر محیط ہونے کے سبب کائنات کا نگراں اور محرک ہونے کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس نکتہ پر آکر ہماری نظریں ان تقدیس یافتہ، قابل احترام بابرکت محسن انسانیت پر آکر پڑ جاتی ہے جو اپنے اپنے زمان و مکان میں بخشیت انبیاء اکرام تشریف لائے خالق و مخلوق کے درمیان حد ادب کے رابطے اور ضابطے پیش کیے۔ خالق و مخلوق کے درمیان عابد و معبود کی تفریق کو نمایاں کیا، جزا و سزا کا تصور دیا۔ آداب بندگی سکھائے رب العالمین کی آفاقیت اور حاکمیت کا درس دیا اور اس ابدال آبادی کی حقانیت کے حضور سجدہ ریزی اور تضرع کی تلقین کی اسی رشد و ہدایت کی آخری کڑی سرور کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت زیبا ہو یا سیرت منزہ ایثار ہو یا انکسار، فکر رسا ہو یا ذکر خدا، غفو

درگزر ہو یا برداشت و صبر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ہر پہلو خالق کائنات کی رضامندی اور خوشنودی سے مشروط ہے۔ کیٹس (Johan Keats, 1795-1821) نے سچ کہا ہے "Beauty is truth, truth is beauty" (حسن صداقت ہے اور صداقت حسن ہے) حسن و صداقت کے اس پیکر جمیل صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں تلے آنے والے خرف ریزے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں کے لیے کسی گہر نایاب سے کم نہیں۔ دین و دنیا کی سرخ روئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور نقوش قدم کی پیروی میں مضمر ہے۔

ہماری وجودیت (Existentialism) اور اس کی مظہریات (Phenomenology) کا بنیادی قضیہ یہ ہے کہ ان دونوں میں اولیت یا ترجیح کس کو حاصل ہے؟ فرد کے وجود کو یا اس کے اوصاف کو؟ جرمن مفکر ہیڈیگر (Martin Heidegger, 1889-1976) اپنی تصنیف "Time and Being" (ہستی و زمان) میں، فرد کی اس کائنات میں ہونیت کو (Dasein) سے تعبیر کرتا ہے "Field Theory of Dasein" کے مطابق یہ کہیں تک کر نہیں بیٹھتا۔ موجودات سے بھری پوری دنیا میں اپنی ذات کو کھوجتا اور اس کی قدر کا تعین کرتا ہے یہ وجود فی العالم بمعنی اور بامقصد ہے اگر انسان اپنے مختصر عرصہ حیات میں بروقت اپنے اہداف کی تکمیل کر لے تو فہما بصورت دیگر پچھتاؤں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ وجود فی العالم کی عارضیت کو ہیڈیگر 'Temporal Temporality' (زمانی عارضیت) کا نام دیتا ہے اس کی دانست میں مغربی فلسفہ وجودیت اور عدم وجودیت اپنی تفہیمیت، وسعت اور کارکردگی میں ادھورا، نامکمل اور غیر موثر ہے وہ پانچویں صدی (ق۔م) کے چینی فلسفی لازوئے اور سدھارتھ گوتم بدھ (۵۶۰ تا ۴۸۰ ق۔م) کی تعلیمات اور نگارشات کو جو مذہبی عجز و انکسار، پارسائی، خدا ترسی، تقویٰ و پرہیزگاری اور دنیاوی لہو لعب سے پاک شفاف ہیں ان کو افضلیت دیتا ہے۔ جرمن مفکر ہیڈیگر کے اس فلسفہ اور اس کی تعلیمات کو سارتر نے فرانس میں متعارف کرایا اور حتی الامکان فروغ دینے کی کوشش کی۔

دنیا کا کوئی فرد نہ تو عقل کل ہوتا ہے اور حرف آخر۔ خطا و نسیاں کا یہ پتلا حیات و کائنات کی پُر پیچ وادیوں میں دامن سمیٹے، گرتا پڑتا، ٹھوکریں کھاتا Zigzag Graph کی صورت اپنی مجوزہ منزل تک پہنچنے کی تگ و دو میں تن من دھن سب کچھ لٹا کر یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ عمومی بشریت کا یہی وتیرہ اور طور طریق ہے۔ یہ اعزاز نبیوں اور

رسولوں کے حصہ میں آیا ہے جنہیں خالق کائنات نے بشریت کی تخصیصیت کے ساتھ انسانیت کی فلاح اور بہبود کے لیے زندگی کے عمودی (up-right) گراف کے ساتھ اس طلسم حیات کی گوں ناگوئی میں بھیجا گویا اس سعادت بزور بازو نیست۔ اس بشریت کی تخصیصیت سے بڑھ کر ایک آخری مقام تکمیلیت کا ہے اس کی واحد اور اپنی مثال آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنی آخری الزماں رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جو بشریت کا ملکہ کے مقام پر فائز ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات لاثانی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر منظوم ہو یا منشور خیر اور اسے ماروا کی نامختتم کائنات تک پھیلا ہوا ہے جہاں تک منظوم کا تعلق ہے تو ممکن ہے بعض اذہان میں یہ ابہام پیدا ہو کہ خود قرآن "سورۃ الشعراء" جو کہی ہے دو سو ستائیس (۲۲۷) آیتوں اور گیارہ (۱۱) رکوع پر مشتمل ہے۔ اس میں آیت نمبر ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶ کا بالترتیب اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:

"شاعروں کی پیروی وہ کرتے ہیں کہ جو بہکے ہوئے ہیں....."

(آیت ۲۲۴) ص ۱۰۴۲

"کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ شاعر ایک بیاباں میں سر ٹکراتے پھرتے

ہیں....." (آیت ۲۲۵) ص ۱۰۴۲

"اور وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں....." (آیت ۲۲۶) ص ۱۰۴۲

آیت نمبر ۲۲۷ میں استثناء کی جو صورتیں ہیں وہ اس طرح ہیں:

سوائے ان کے جو ایمان لائے (۱) اور نیک عمل کیے اور بکثرت اللہ تعالیٰ

کا ذکر کیا اور اپنی مظلومی کے بعد انتقام لیا (۲) جنہوں نے ظلم کیا ہے وہ

بھی ابھی جان لیں گے کہ کس کروٹ الٹتے ہیں (۳)۔

[قرآن کریم مع اردو ترجمہ و تفسیر ص ۱۰۴۳، مطبوعہ شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس]

(۱) ان شاعروں کا مستثنیٰ قرار دیا ہے جو صداقت اور حقائق پر مبنی شاعری کرتے ہیں۔

ص ۱۰۴۳، قرآن کریم مع اردو ترجمہ و تفسیر ص ۱۰۴۳، مطبوعہ شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس

(۲) جو کافر شاعروں کو شاعری میں جواب دیتے ہیں۔ (مثلاً حضرت حسان بن ثابتؓ) ص

۱۰۴۳، ایضاً

(۳) حدیث مبارکہ ہے کہ "ان (کافروں) کی بھجی بیان کرو، جبریل علیہ السلام بھی تمہارے

ساتھ ہیں، ص ۱۰۴۳، ایضاً

وجودی وحدت (Ontological Unity) اور عددی وحدت (Numerical Unity) دو مختلف النوع وحدتیں ہیں کلیات اور جزیات دونوں بیک وقت کسی ایک معروض (Object) میں موجود نہیں ہو سکتیں اگر وجودی وحدت پر اصرار ہے تو عددی وحدت سے انکار لازمی ہے اگر وجودی وحدت پر اصرار ہے تو عددی وحدت سے انکار لازمی ہے اگر عددی وحدت کا اقرار ہے تو وجودی وحدت سے دست برداری لازمی ہوگی گویا کل اور اجزاء میں سے کسی ایک عنصر (Factor) اپنا اثبات کرانے کے لائق ہوگا دوسرے عنصر کی نفی لازمی قرار پائے گی ایمانیات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پہلے لات و منات کی نفی کی جائے اور پھر واحدہ لاشریک کی ذات والا صفات کا صدق دل سے اعتراف کیا جائے اور اس اثبات کے بعد پھر دست دعا کسی غیر اللہ کے سامنے دراز نہ ہو یہ اعلیٰ وارفع مقام واصل باللہ کا ہے۔

حاشہ للہ کوئی ذات ماسوا خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسی نہیں جو واصل باللہ ہونے کا اعزاز رکھتی ہو۔ ایسی تقدیس یافتہ رہبر و محسن انسانیت شخصیت کی جس قدر تعریف و توصیف کی جائے وہ کم ہے یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے آج تک ہر وہ شاعر جس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتوں، رفعتوں اور بشری بلند یوں کے بارے میں سوچا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ نہ کچھ نذرانہ بحقیقت پیش کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا کچھ شعرا کو بہت زیادہ کامیابی نصیب ہوئی اور انھوں نے شعر عقیدت ہی کہتے رہنا اپنا شعار بنا لیا۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شعرا کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ واجب الاحترام ڈاکٹر سید ابوالخیر کشتی نے آسمان رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت، افادیت، رفعت اور معنویت کو دو مصرعوں میں سمیٹ کر گویا کوزے میں دریا بند کر دیا ہے۔

آپ کے نام میں ہر لفظ کا مفہوم ملے میرے سرکار ہیں ہر دور کی زندہ فرہنگ شامل ترمذی سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حسان بن ثابتؓ کفار کے الزامات کا منظوم جواب دیا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں منبر کا اہتمام کرتے تھے تاکہ اس پر کھڑے ہو کر کفار کو لاکاریں حضرت جابر بن سمرہؓ بھی گواہی دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے ان اشعار سے لطف اندوز ہوتے تھے جو عہد جاہلیت کے بیانیہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح حضرت ثبیدؓ سے امیہ کے اشعار بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سماعت فرمائے۔ اس سے ثابت ہوگا کہ شاعری اسلام میں شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ مدحت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ

عربی کے شعرا سے فارسی گویان عجم میں منتقل ہوا اور وہاں بڑے بڑے شعرا جن میں جامی، قافی، فرید الدین عطار، سعدی وغیرہ ہم نے نعتیہ اشعار کہہ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ پھر اردو زبان کی ابتدا ہی سے نعتیہ اشعار اردو شعری روایت کا حصہ بنتے رہے۔ فخر دین نظامی نے مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (جس کا زمانہ تصنیف ۸۲۵ھ تا ۸۳۹ھ مطابق ۱۳۲۱ء تا ۱۳۳۵ء بتایا جاتا ہے) میں حمد کے بعد نعت ہی کہی۔ پھر تو یہ سلسلہ ایسا چلا کہ غیر مسلم شعرا بھی نعت کہنے لگے۔

پاکستان میں نعتیہ ادب کے فروغ کی تو ایک تاریخ ہے۔ یہاں نعتیہ شعری اقدار اس طور پھیلیں کہ نعتیہ صحافت کا ایک الگ میدان سچ گیا۔ شعراے اردو نے بڑی کامیاب نعتیں کہیں۔ حفیظ جالندھری، ماہر القادری، بہزاد لکھنوی وغیرہ ہم سے لے کر حفیظ تائب، عبدالعزیز خالد اور صبیح رحمائی تک بے شمار شعرا نے یہ سعادت حاصل کی۔ اب نعتیہ شعری سرمائے میں روز افزوں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اردو کی شائع ہونے والی شعری تخلیقات پڑنی ۶۰ کتب نعتیہ اشعار پر مشتمل ہوتی ہیں۔

میں نے جون کیٹس کا یہ قول نقل کیا تھا کہ ”حسن صداقت ہے اور صداقت حسن ہے“..... اس قول کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انسانی فطرت میں جو جمال پرستی رکھی گئی ہے وہ اپنی ارتقائی (Sublimity based) شکل میں ”صداقت“ پرستی بن کر ان شخصیات کو محبوب بنادیتی ہے جو سراپا صداقت ہوتی ہیں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ کائنات میں صرف اور صرف ایک ذات محمدی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایسی ہے کہ جو بشریت کے محاسن کی تکمیلی شکل میں عالم بشری کو میسر آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ذات ستودہ صفات ہر راست فکر انسان کی محبوب ہے۔ نعتیہ ادب کے فروغ کی اساس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی محبوبیت پر قائم ہے اور جوں جوں انسانی شعور ارتقائی منازل طے کرے گا انسان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی کی طرف متوجہ ہوگا۔ لیکن آپ کی شان بیان کرنا آسان نہیں ہے اسی لیے خورشید رضوی نے کہا تھا:

شان ان کی سوچئے اور سوچ میں کھو جائیے

نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جائیے

اس تناظر میں ”نعت رنگ“ کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ میں آپ کے اور مجلس مشاورت کے تمام اراکین کے لیے دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت انہیں اس کار خیر کا اجر عطا فرمائے۔ (آمین) (رؤف نیازی ص، ۸۸۴، ۸۷۸-۸۷۷)

حیات النبی اور متعلقات: چند غلط فہمیوں کے ازالے:

مشاہدہ ہے کہ کچھ لوگ بلا سمجھے بوجھے حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر بحث میں اپنی توانائیاں صرف کرتے ہیں، ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں اور فریق مخالف کو شیطان اور گمراہ قرار دیتے ہیں جبکہ سورۃ الحجرات میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں، ہو سکتا ہے وہ اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فتن میں مبتلا ہونا بہت بری بات ہے، جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔“

یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے، قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ ”شہیدوں کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں اور رزق پارہے ہیں لیکن تم یہ بات نہیں سمجھ سکتے“۔ ظاہر ہے کہ نبیؐ کا درجہ شہید سے بڑا ہے اس لئے ہمیں حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں تردد کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ ہم اسے سمجھ نہیں سکتے، یہ غیب کی باتیں ہیں اور ایمان کی پہلی شرط ہی غیب پر ایمان لانا ہے۔ (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۳) اس بحث کے نتیجے میں ایسا نہ ہو کہ شان رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی گستاخی سرزد ہو جائے اور سارے اعمال اکارت ہو جائیں (سورۃ الحجرات، آیات نمبر ۱ اور ۲) جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو عام لوگوں کی موت کی طرح سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ اس بات پر ہنسی آتی ہے کہ زمرہ علماء میں شامل ہونے کا دعویٰ کرنے والے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ذرا قرآن پر ہی غور کر لیتے کہ ازواج مطہراتؓ و قرآن نے امہات المؤمنین قرار دیا ہے۔ جب وہ مسلمانوں کی مائیں ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کم از کم باپ کے برابر تو ہوئے، بڑے بھائی کیسے ہو گئے؟ اب آئیے وفات اور حیات کے مسئلے کی طرف، قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کے لئے بھی وفات (انی متوفیک) کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے جبکہ وہ آسمان پر زندہ اٹھائے گئے (سورہ آل عمران، آیت نمبر ۵۵)۔ دنیا کی دائمی زندگی کسی کو نہیں ملی، ہاں شیطان کو قیامت تک کی زندگی اُس کی خواہش پر عطا کی گئی ہے۔ آخرت کی زندگی حسب مراتب عطا کی جاتی ہے جس کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ایک بات یہ

بھی غور کرنے کی ہے کہ شہیدوں کو زندہ کہا گیا لیکن ان کی بیوائیں دوسری شادی کر سکتی ہیں جب کہ ازواج مطہراتؓ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا کرنا یا کسی کو اُن کے بارے میں ایسا سوچنا بھی سختی سے ممنوع ہے (سورۃ الاحزاب، آیت نمبر ۵۳)۔ یہ بھی دیکھیں کہ لفظ ایک ہی استعمال ہوتا ہے لیکن دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ کس تناظر میں اور کس کے لیے استعمال ہوا ہے؟ قرآن میں فرمایا ”کل نفس ذائقۃ الموت“ (ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بھی لفظ ”نفس“ استعمال کیا ہے (سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۲)، نعوذ باللہ کسی کو غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے قرآن کو مکمل طور پر سمجھنا چاہئے نکلے نکلے کر کے نہیں۔ دونوں جگہ لفظ ”نفس“ ہے لیکن یہ دیکھا جائے گا کہ کس کے لئے ہے؟ اللہ تعالیٰ کی ذات الٰہی القیوم ہے اس لئے یہاں نفس کے معنی دوسرے ہوں گے، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو عام لوگوں کی طرح سمجھنا صریح غلطی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور وفات (دونوں کا دن پیر بتایا جاتا ہے) کی تاریخوں کے بارے میں اختلاف ہے، ولادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول، ۱۲ ربیع الاول اور اہل تشیع کی روایات میں ۷ ربیع الاول بتائی جاتی ہے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی تاریخ وہ ۱۲ ربیع الاول نہیں بلکہ ۲۸ صفر بتاتے ہیں۔ بارہ وفات کے مہینے کی ترکیب عوام الناس کی زبان ہے جس طرح وہ صفر امظفر کو تیرہ تیزی اور ذیقعد کو خالی کا مہینہ کہتے ہیں، اس کی کوئی مستند حیثیت نہیں ہے۔ شب معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے یا نہ دیکھنے کا معاملہ بھی نزاعی بنالیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ کوئی نظر اللہ تعالیٰ کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی، حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر جو روشنی دیکھی تھی اور جسے وہ آگ سمجھتے تھے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کا جلوہ ہی تھا، انھوں نے اسے دیکھا لیکن جب مزید کی خواہش کی تو تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے اپنی وسعت کے مطابق دیدار تو انھوں نے بھی کیا۔ اسی طرح شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر ہے حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں زیادہ ہی دیکھا لیکن کتنا دیکھا؟ یہ ہمیں نہیں معلوم، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ کہتے تھے کہ معراج کی شب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا (اور قیامت میں جنتی بھی کریں گے جو حدیث سے ثابت ہے) جبکہ حضرت عائشہؓ کی روایت اس کے خلاف ہے لیکن جب معراج کا واقعہ ہوا تھا اُس وقت وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں نہیں آئی تھیں اس لئے اس مسئلے میں جھگڑنا نہیں چاہیے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب ”فیوض الحرمین“ کے صفحہ نمبر ۳۳ پر کہہ کر مرہ میں جشن میلاد النبی ۷ اور اس موقع پر انوار کے ظہور کا تذکرہ کیا ہے جو انھوں نے مکہ معظمہ اور

مدینہ منورہ میں خود محسوس کیا۔ وہ رقم طراز ہیں: ”اس سے پہلے میں مکہ معظمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مولد مبارک میں تھا، میلاد شریف کے روز لوگ نبی ﷺ پر درود شریف پڑھتے تھے اور وہ معجزے بیان کرتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت ظاہر ہوئے تھے اور وہ مشاہدے جو اعلان نبوت سے پہلے ہوئے تھے تو میں نے دیکھا کہ یکبارگی انوار ظاہر ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ آیا ان آنکھوں سے دیکھا اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ فقط روح کی آنکھوں سے۔ خدا جانے کیا امر تھا ان آنکھوں سے دکھایا روح کی۔ پس میں نے تامل کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نور اُن ملائکہ کا ہے جو ایسی مجلسوں اور مشاہد پر موکل و مقرر ہیں اور میں نے دیکھا کہ انوار ملائکہ اور انوارِ رحمت ملے ہوئے ہیں۔“ صفحہ نمبر ۳۵ پر رقم طراز ہیں: ”میں نے دیکھا آں حضرت ﷺ کو اکثر امور میں اصلی صورت مقدس میں بار بار، باوجودیکہ مجھے بڑی آرزو تھی کہ روحانیت میں دیکھوں نہ جسمانی میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو، پس مجھ کو دریافت ہوا کہ آپ ﷺ کا خاصہ ہے روح کو صورت جسم میں کرنا اور یہ وہی بات ہے جس کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس قول سے اشارہ فرمایا ہے کہ انبیاء نہیں مرتے اور اپنی قبروں میں نماز پڑھا کرتے ہیں اور انبیاء حج کیا کرتے ہیں، اپنی قبروں میں وہ زندہ ہیں وغیرہ اور جب میں نے آپ ﷺ پر سلام بھیجا تو مجھ سے خوش ہوئے اور انشراح فرمایا اور ظاہر ہوئے اور یہ اس واسطے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین ہیں۔“ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب ”فیوض الحرمین“ اس لنک پر دیکھی جاسکتی ہے:

https://archive.org/stream/Fuyooz-ulHaramainarabicWithUrduTranslation/00357_FUYOOZ-UL-HARAMAIN-ur#page/n6/mode/2up

وہ بھی زندہ، شہادت ہے جس کو ملی جان لو، جاوداں کوئی اُن سانہیں پھول! بعد از خدا اُن کا ہے مرتبہ خلق میں بے گماں کوئی اُن سانہیں لاہور سے شائع ہونے والے ایک جریدے میں دارالعلوم اٹک سے تعلق رکھنے والے ایک حافظ صاحب نے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ اپنی آخری علالت میں حضور ﷺ نے اپنی دختر حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے اہل بیت میں سب سے پہلے تم مجھ سے ملوگی۔ میں نے جواباً لکھا کہ حدیث میں ”قیامت کے دن“ کے الفاظ میں نے نہیں پڑھے، یہ حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے اور یہ ایک پیش گوئی ہے کیونکہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد اہل بیتؓ میں سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ کی وفات ہوئی۔ حافظ صاحب موصوف حیات

النبی ﷺ کے بارے میں تردد کا شکار تھے اس لئے انھوں نے حدیث میں ”قیامت کے دن“ کے الفاظ بڑھا دیئے۔ دراصل ہم حیات النبی ﷺ کا صحیح ادراک نہیں کر سکتے جس طرح شہدا کی حیات کا، جو قرآن سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ نبی کا درجہ شہید سے بڑا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلویؒ نے اپنے ایک شعر میں حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس طرح کیا:

تو زندہ ہے واللہ، تو زندہ ہے واللہ! مری چشم ظاہر سے چھپ جانے والے صبیح رحمانی کا یہ خوب صورت نعتیہ شعر بھی اسی کیفیت کی عکاسی کر رہا ہے:

میں لب کشا نہیں ہوں کہ یہ جانتا ہوں میں سنتے ہیں وہ صدائیں سکوتِ نگاہ کی ایک صاحب نے راقم الحروف کے مجموعہ ”نعتِ حرا“ میں ایک نعت پڑھی جس کا مطلع یہ تھا: آپ جیسا یا نبی! باحوصلہ کوئی نہیں کھا کے پتھر دشمنوں کو دے دعا، کوئی نہیں فرمانے لگے، نعت تو اچھی ہے لیکن آپ نے ”یا نبی!“ کہہ کر اسے قابل اعتراض بنا دیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ قائد اعظم محمد علی جناح کو اُن کی وفات کے بعد ”اے قائد اعظم!“ کہنے پر تو اعتراض نہیں کرتے (میرا اشارہ اس مشہور شعر کی طرف تھا: یوں دی ہمیں آزادی کہ دنیا ہوئی حیران۔ اے قائد اعظم! ترا احسان ہے احسان) لیکن نعت میں ”یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم!“ کہنے پر اعتراض کر رہے ہیں! اس پر وہ لا جواب ہو کر خاموش ہو گئے۔

حضرت امام زین العابدینؑ کے یہ اشعار بھی سند کی حیثیت رکھتے ہیں:

یا مصطفیٰ! یا مجتبیٰ! ارحم علی عصیاننا مجبورة اعمالنا ذنب و طمع و الظلم یا رحمة للعالمین! ادرک لڑین العابدینؑ مجبوس ایدی الظالمین فی الموکب والمزجم ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ یہ اشعار حضرت امام زین العابدینؑ کے نہیں ہو سکتے کیونکہ ”زین العابدینؑ“ اُن کا تعریفی لقب تھا اور وہ خود اسے اپنے لئے استعمال نہیں کر سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنا تعریفی لقب ”صدیق“ اپنی مناجات میں بطور تخلص استعمال کیا ہے:

انت وانی انت کافی فی مہمات الامور انت حبیب انت ربی انت لی نعم الوکیل
این موسیٰ این عیسیٰ این یحییٰ این نوح انت یا صدیق عاص تب الی المولی الجلیل
جو لوگ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانے کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسلام میں صرف دو عیدیں ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ جو سال میں ایک ایک مرتبہ آتی ہیں لیکن وہ یہ بھول گئے کہ

حدیث میں جمعہ کو بھی عید المومنین کہا گیا ہے جو سال میں ہر ہفتے ہی ہے۔ عید اُس خوشی کے دن کو کہتے ہیں جو بار بار آئے۔ یہ لوگ ”بدعت بدعت“ کی تکرار کرتے ہیں لیکن ”بدعت سنیہ“ اور ”بدعت حسنہ“ کا فرق نہیں سمجھتے۔ بدعت کا مطلب ہے نئی چیز ایجاد کرنا، ”المبدع“ اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ میں شامل ہے جو اسم فاعل ہے۔ اچھی بات اچھی ہوتی ہے اور بُری بات بُری ہوتی ہے۔

اگر یہ لوگ ہر نئی بات کو بدعت کہہ کر ممنوع قرار دیتے ہیں تو قرآن کو کتابی شکل میں لانے اور نماز تراویح کی پابندی کرنے کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ مساجد میں برقی پکچے اور ایئر کنڈیشنر کیوں لگاتے ہیں؟ اونٹ پر سواری کی جگہ کاریں اور ہوائی جہاز کیوں استعمال کرتے ہیں؟ خصوصاً حج اور عمرے کے سفر کے لئے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک صاحب نے رکوع کے بعد سمع اللہ لمن حمدہ، ربنا لک الحمد کے بعد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ بھی کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا اور ان کی تحسین کی۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ سعودی عرب والے جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانے کے خلاف ہیں لیکن ہر سال اپنا قومی دن بڑے دھوم دھام سے مناتے ہیں! اُن کے فلسفے کے مطابق تو یہ بھی بدعت ہے اس لئے ممنوع ہونا چاہئے۔ (تنویر پھول ص، ۲۵، ۹۲۷-۹۲۸)

عید میلاد النبی V اور میلاد نامے:

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سرکار رسالت V کی ولادت باسعادت کا واقعہ کائنات میں رونما ہونے والے تمام ترینیک و سعد واقعات میں سے سب سے زیادہ مبارک اور مسعود ہے۔ میلادِ سیدِ کونین V صرف جن و ملک یا انسان و حیوان ہی کے لیے نہیں بلکہ جملہ موجوداتِ عالم کے لیے باعثِ مسرت و افتخار ہے۔ عید الفطر اور عید قرباں کی طرح عید میلاد النبی V بھی شعائرِ اسلام میں شامل ہے۔ ہمارے نزدیک فرائض و عبادات کی طرح اہم ہے۔ بنا بریں تاریخ ولادت میں اختلافِ رائے کے باوجود مسلم اُمہ نے میلاد کی خوشی منانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی ہے۔ حتیٰ کہ ربیع الاول کے پورے مہینہ کو ماہِ مسرت و انبساط قرار دیا ہے۔ تذکروں میں جہاں عید میلاد النبی کے پُر مسرت موقع پر پاپا ہونے والی محافلِ مولود و مجالسِ میلاد کی روداد مرقوم ہے، وہاں میلادِ منظوم تخلیقات کے عہد بہ عہد ارتقائی سفر کا احوال بھی مندرج ہے۔ راجا رشید محمود کا مضمون ”نعت میں ذکرِ میلادِ سرکار V“ بھی تذکرے کی ذیل میں آتا

ہے۔ جس میں حضور ختمی مرتبت V کی ولادت پاک کے ذکر سے معمور میلاد ناموں، مولود ناموں، میلادِ یہ قصیدوں، میلادِ یہ نظموں (ہر فارم اور ہیئت کی) اور میلادِ یہ اشعار کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ جائزہ میلادِ یہ ادب کا زمانی ترتیب سے احاطہ کرتا تو زیادہ دلچسپ اور مفید ہوتا۔ راجا صاحب نے بعض باتوں کو بعض جگہوں پر جوں کا توں دہرایا ہے۔ نتیجتاً تذکرہ غیر ضروری طور پر طویل ہو گیا ہے اور دلچسپی میں بھی خاصی کمی ہوئی ہے۔ اٹھارہ صفحات پر مشتمل حواشی کو پڑھنا بھی ایک اُکتا دینے والا عمل ہے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ چند لوگوں نے میر تقی میر سے شعر سنانے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے کہا، ”آپ لوگ کیا شعر سنیں گے، اگر میں آپ کو یہ شعر سناؤں: عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا دل کا جانا ٹھہر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا تو آپ کہیں گے اس شعر میں توفیقِ سقم ہے، یعنی ”خیال“ کی ”ی“ گر رہی ہے۔ مگر کیا کیا جائے محاورہ یہی ہے۔ یہ روایت ہمیں شارق جمال (بھارت) کا مضمون ”نعت کے اشعار اور فنی سقم“ پڑھ کر یاد آئی ہے۔ (قیصر نجفی ص، ۷۱)

ڈاکٹر یحییٰ صاحب تو میلاد ناموں کے تذکرے میں علمائے اسلام پر اسرائیلی اساطیر کے تتبع کا الزام بھی لگاتے ہیں اور عقیدت کا غلو اس بات کو فرما رہے ہیں کہ نبی کریم V کی والدہ محترمہ کو ایامِ حمل میں (خواب میں) انبیائے کرام نے بشارت دی، وہ بھی جنابِ شبلی نعمانی کو معتبر جانتے ہیں، وہ تو پروفیسر نجیب اشرف کی یہ ہرزہ سرائی لکھتے ہوئے نہیں جھجکے کہ: ”تولد نامہ“ میں نبی پاک V کی ولادت کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ بڑی حد تک کرشن جی کی ولادت کے حالات کا آئینہ معلوم ہوتے ہیں۔“ (کوکب نورانی ص، ۵۴۳)

ڈاکٹر یحییٰ اپنے مضمون ”اُردو نعت گوئی کے موضوعات“ میں ”میلاد نامے“ کے عنوان سے جو کچھ لکھ پائے ہیں وہ یہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ عید میلاد النبی V منانے کو دل سے قبول نہیں کرتے چنانچہ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”نفس ذکرِ میلاد النبی کو بعض علمائے اسلام صرف باعثِ خیر و ثواب ہی

نہیں بلکہ مستحب و سنت قرار دیتے ہیں۔“

اس حوالے سے عرض ہے کہ اس فقیر نے ایک کتاب ”اسلام کی پہلی عید“ کے نام سے

اب سے دس برس پہلے لکھی تھی جو اردو اور انگریزی میں، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، داتا گنج بخش روڈ، لاہور نے شائع کی، اسے ملاحظہ فرمایا جائے۔ ڈاکٹر یحییٰ صاحب سے عرض ہے کہ ترمذی شریف میں پورا باب ”میلاد النبی (۷)“ کے عنوان سے موجود ہے اور یحییٰ صاحب شاید نہیں جانتے کہ بعض علمائے اسلام نہیں، تمام علمائے حق، علمائے اسلام، نفس ذکر میلاد رسول ۷ اور محفل میلاد کو نہایت مبارک اور بڑی سعادت سمجھتے مانتے ہیں۔ جو نہیں مانتے وہ علمائے اسلام کہاں ہو سکتے ہیں؟ (کوکب نورانی ص ۳/۵۵)

اسلام سے دن منانے کے حکم اور ترغیب کے حوالے سے اتنے دلائل پیش کروں کہ شاہ جہان پوری صاحب حیران ہو جائیں۔ اس بارے میں انہیں اور ان تمام افراد سے، جو یوم میلاد کا جشن منانے کو روا نہیں جانتے، یہی کہنا چاہوں گا کہ یہ لوگ اس دن یا اس کے جشن منانے پر مجبور نہیں کیے جاتے نہ ہی ان سے تقاضا کیا جاتا ہے تو پھر ان لوگوں کو بھی عید میلاد النبی ۷ منانے والوں یا سلسلہ ہائے جشن میلاد شریف کے بارے میں مخالف و منفی باتیں لکھنے، کہنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے حیرت ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن منانے، دارالعلوم کراچی کے پچاس سالہ جشن منانے، ابوالکلام آزاد اور شورش کاشمیری کے دن منانے پر اسلام کے حکم یا ترغیب کا جنہیں خیال تک نہ آئے وہ لوگ کائنات کی سب سے بڑی اور اہم عید، عید میلاد النبی ۷ منانے کے ثبوت اور ترغیب کے باوجود انکار اور مخالفت کریں تو اسے عناد یا ضد ہی کہا جاسکتا ہے۔ عید میلاد النبی ۷ کے حوالے سے میں اپنی کتاب ”اسلام کی پہلی عید“ میں علمائے دیوبند ہی کی کتب سے دلائل پیش کر چکا ہوں بلکہ ہفت روزہ ”تکبیر“ نے جب عید میلاد النبی ۷ کے خلاف لکھا تھا تو انہیں اس فقیر نے اپنی یہی کتاب بھجوائی تھی لیکن انہوں نے راہ فرار اختیار کی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ (کوکب نورانی ص ۳/۹۰)

ڈاکٹر صاحب نے ہرنی کا مشہور واقعہ من گھڑت اور غیر مستند قرار دیا ہے، لیکن اس کے من گھڑت اور غیر مستند ہونے کی تحقیق بیان نہیں کی، ان سے گزارش ہے کہ وہ رسول کریم ۷ سے منسوب مشہور واقعات کو از خود من گھڑت اور غیر مستند قرار دینے کی بجائے پوری ذمہ داری سے تحقیق و براہین پیش کیا کریں اور ذکر میلاد شریف کرنے والوں کو ”میلاد خوانوں“ کہہ کر تحقیر و تضحیک سے اجتناب کریں کیوں کہ اکابر اہل علم بھی ذکر میلاد شریف کرتے آئے ہیں اور ترمذی شریف میں پورا باب میلاد النبی ۷ کے عنوان سے موجود ہے۔ (کوکب نورانی ص ۳/۹۷)

اردو لوک گیتوں میں ذکر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

ڈاکٹر یحییٰ فطیہ صاحب کے ”اردو لوک گیتوں میں ذکر رسول“ ایک خاصا تحقیقی مقالہ ہے اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے اچھا کیا لکھ دیا ہے۔ ان گیتوں کو فقہی میزان پر تولنے کی کوششیں کرنے اور شرک و کفر کے فتوے دینے سے سادہ لوح انسانوں کی خدا اور اس کے رسول کے تئیں رکھی جانے والی مخلصانہ محبت میں رخنہ پڑ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا دوسرا مضمون ”ثنائے رسول ۷ روایت سے درایت تک“ بہت عمدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرضی روایات نے اچھے اچھوں کے دماغوں میں جگہ بنا رکھی ہے۔ ضروری ہے کہ اس قسم کے مضامین مزید لکھے جائیں۔ اذہان کو دھندلکوں سے باہر نکالا جائے۔ شعراء حضرات میں ان کا اثر اچھا خاصا ہے۔ خصوصاً اس قسم کے شعرا کے ہاں جن کا علم مذہب کے بارے میں بہت کم ہے یا سنا سنا ہوا ہے۔ جناب محمد شہزاد مجددی کا مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے انھوں نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ آج کل واعظین اور قصہ گو قسم کے مقررین نے یہ عام وتیرہ بنالیا ہے کہ وہ بغیر علم کے احادیث بیان کرتے رہتے ہیں۔ ایک بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ صحیح احادیث پر مبنی کوئی مستند کتاب موجود نہیں اور جو ہیں وہ قدیم زمانے کی ہیں ان کی چھان پھنگ نہیں ہوئی ہے۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے ہمارے ہاں کہ ہم اپنی اہم علمی بزرگ شخصیات پر بھی اتفاق نہیں رکھتے۔ امام ابن تیمیہؒ جیسی اعلیٰ شخصیت کے بارے میں بھی میں نے متعدد دینی عالموں کے قلم سے نہایت نازیبا کلمات پڑھے ہیں۔ واقعی یہ طے کرنا بہت مشکل ہو چکا ہے کہ کیا صحیح ہے کیا غلط۔ ماہر القادری خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اپنے شعر میں وہ حضور کا سایہ نہ ہونے کا ذکر کر رہے ہیں۔ (احمد صغیر صدیقی ص ۷۸-۷۷)

جگر مراد آبادی اور نعت گوئی:

بھارت کے شہر پونہ میں آل انڈیا مجلس نعت کا اہتمام کیا گیا۔ جگر مراد آبادی کو بھی دعوت دی گئی... انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں شرابی کہانی اور رند قسم کا آدمی ہوں ایسی مقدس مجلس کے قابل کہاں ہوں؟ مگر دوست کے پُر زور اصرار پر آمادگی ظاہر کر دی... چھ دن گزر گئے۔ نعت نہ لکھ سکے۔ مگر اسی دھن میں رہے۔ ساتویں روز نعت گوئی میں کامیاب ہو گئے۔ یہ نعت جب محفل میں پڑھی تو دھوم مچ گئی۔ دوسرے دن شہر کے ہر شخص کی زبان پر یہ نعت تھی... اس کے بعد... جگر نے شراب سے توبہ کر لی۔ پھر عمر بھر اس کے قریب نہ گئے... نعت کے صدقے میں

لعنت سے چھٹکارا مل گیا... لاریب... رسول ۷ رحمت کی نعت ہر قسم کی لعنت سے نجات کی ضمانت ہے... اس بخت افزا نعت کے دو اشعار آپ بھی پڑھیے: (محمد فیروز شاہ ص، ۷۷)

اے خاک مدینہ! تیری گلیوں کے تصدق تو خلد ہے تو جنتِ سلطانِ مدینہ
کچھ ہم کو نہیں کام جگر اور کسی سے کافی ہے بس اک نسبتِ سلطانِ مدینہ

خواب، ستیہ پال آنند اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

پروفیسر قیصر نجفی نے ستیہ پال آنند کی نظم ”پیغام رساں“ پر عقیدت سے پُر مضمون قلم بند کیا ہے۔ اس نظم کی اساس شاعری وہ خواب ہے جس میں اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ نجفی صاحب لکھتے ہیں:

ہمارے خیال میں خواب ہو یا بیداری، جو انسان کے بطون ذات ہوتا ہے وہی مشکل ہو کر افکار و خیالات یا اعمال و افعال کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ستیہ پال آنند کا خواب ان کے اندر کی حقیقت و ماہیت اور درونی احوال کا کاشف ہے۔ (صفحہ ۳۶۴-۳۶۵) حال ہی میں بہ حالت خواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نزول وحی کے عالم میں دیکھنا (جس عالم میں غالباً آپ کو کسی نے نہیں دیکھا) ان (ستیہ پال آنند) کا ایک منفرد اختصاص ہے۔ (صفحہ ۳۶۵)

غیر مسلموں کا خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین اور تمام بنی آدم کے بادی اور رسول ہیں۔ اس لیے غیر مسلموں کے لیے ضروری ہے کہ وہ علمائے اسلام سے تصدیق کر لیں کہ جسے انھوں نے خواب میں دیکھا اس کا حلیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر ستیہ پال آنند نے ایسا کیا تھا تو ٹھیک ورنہ ان کا خواب مشتبہ سمجھا جائے گا۔ ”البدایۃ والنہایۃ“، ”ابن کثیر“ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

انٹرنیٹ پر ایک کتاب ہے ”اسلام سمونیل“۔ سمونیل ایک پادری تھے انھوں نے حضور ۷ کو خواب میں دیکھا۔ انھوں نے حدیث کی کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک تلاش کیا اور جب تمام نشانیوں کو خواب میں دیکھی ہوئی ہستی کے مطابق پایا تو وہ مسلمان ہو گئے۔ اس حوالے سے مجھے حیرت ہے کہ ”پیغام رساں“ کا شاعر اب تک ”ستیہ پال آنند“ ہی ہے!! (ڈاکٹر اشفاق انجم ص، ۱۴۱)

افسانہ کروٹ کا محرک:

ایک بات اور بتاؤں... کوئی پندرہ سولہ برس ہوئے یا شاید زیادہ... سوچا کہ شعرائے کرام کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ اپنے جذبات و کیفیات کے اظہار کے لیے نظم و غزل کے انداز کو اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی قصیدہ و مثنوی کا اسلوب اپنا لیتے ہیں، ہم افسانہ لکھنے والے اس سعادت سے کیوں محروم ہیں... یہ خیال اور احساس اتنا حاوی رہا کہ ۱۹۹۲ء میں ایک افسانہ ”کروٹ“ کے عنوان سے لکھا اور ”اردو ڈائجسٹ“ لاہور کے لیے بھیج دیا۔ انھوں نے ”سیرت نبوی کے پس منظر میں ایک دلکش افسانہ“ کی ذیلی سرخی کے ساتھ شائع کر دیا۔ ایک دو برس اس شش و پنج میں رہا کہ وہ لوگ ”اسلامی فکر“ رکھنے والے تھے شائع کر دیا۔ کیا ادب کی طرف بھی ”کروٹ“ کی گنجائش ہو سکتی ہے؟ صہبا لکھنوی ایک مذہبی انسان تھے مگر اپنے رسالے ”افکار“ کو انھوں نے ابتدا سے ہی ”ترقی پسند نظریات“ کے تابع کر رکھا تھا۔ چنانچہ میں نے ”کروٹ“ ”افکار“ کے لیے بھیج دیا اور مجھے خوشی ہے کہ وہ افسانہ اپریل ۱۹۹۴ء کے ”افکار“ میں شائع ہوا۔ میں آج بھی اسی فکر میں غطاں ہوں کہ حسن انسانیت ۷ کی تعلیمات کے بے حد بے شمار ایسے رخ ہیں جو عہدِ حاضر کے انسان کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ (سلطان جمیل نسیم ص، ۴۳۵)

نئے نعتیہ محلّے کے اجرا کی ایک کاوش:

گزشتہ روز لاہور کے ایک دوست لاہور سے نعت کے حوالے سے ایک سہ ماہی پرچے کے اجرا کی منصوبہ بندی کر رہے تھے، لیکن انھیں مشورہ دیا کہ ”نعت رنگ“ کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کرنا، انفرادی اور اجتماعی سطح پر احتساب کا عمل جاری رہنا چاہیے، انا کا مسئلہ کھڑا کیے بغیر اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ آج کے نعت گو اور نعت خواں دونوں کے لیے لمحہ فکر یہ ہے۔ قرآن و حدیث سے نعت گوئی سیکھنے کے شعور کی بیداری کرنے سے محض دیوارِ رزق چاٹنے کے عمل پر کاری ضرب پڑے گی۔ (ریاض حسین چودھری ص، ۳۸۳)

ریاض حسین چودھری اور اسلوب کی جلوہ گری:

علامہ کوکب نورانی صاحب میرے مضمون ”جدید اردو نعت میں صورت پذیری کا موسم“ کے بارے میں فرماتے ہیں ”معلوم ہوتا ہے ریاض صاحب کو عبارت آرائی سے خاصا شغف ہے“ ان کے جملے کی کاٹ نے مجھے پہروں سرشار رکھا۔ جی ہاں، آپ نے درست فرمایا۔

مجھے عبارت آرائی سے اس لیے شغف ہے کہ میں شعوری طور پر بھی کوشش کرتا ہوں کہ خوب صورت سے خوب صورت جملہ تخلیق کر کے تاج دارِ کائنات V کی بارگاہ بے کس پناہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں، میں نثر میں بھی نعت کہنے کا قائل ہوں۔ کیا شعر و سخن کے تمام تر سوتے اسی عبارت آرائی کے لطن سے نہیں پھوٹتے؟ میرے آقا V حسن کائنات بھی ہیں اور کائنات حسن بھی، ارض و سما کا سارا حسن و جمال محبوبِ خدا V کے حسن و جمال کا پرتو ہے، نبی مکرم V صنایعِ ازل کا شاہ کار ہیں، حسن و جمال کے تمام حوالے حضور V کے حسن و جمال کی رعنائیوں سے ابلاغ پاتے ہیں۔

علامہ کوکب نورانی صاحب! دعا کیجیے کہ اللہ رب العزت میرے قلم کو مزید روانی اور جولانی عطا فرمائے۔ میرے ذوق عبارت آرائی کو علم و فن کے نئے آفاق کی تسخیر کے تخلیقی شعور سے نوازے، شاید میرا کوئی جملہ یا شعر بارگاہِ خداوندی میں قبولیت کا شرف حاصل کر لے اور میرے آقا V اسے سندِ جواز عطا فرمادیں اور میری نجاتِ آخری کا سامان ہو جائے۔ اس لیے قدرتی طور پر میں خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہوں۔ آپ نے میرے بعض جملوں اور منتخب اشعار کی نشان دہی کی ہے، میں آپ کا ممنون ہوں، اختلافِ رائے کے جمہوری حق کو تسلیم کرتا ہوں۔ اتنا عرض کرتا چلوں کہ انسانی کاوش میں اصلاح و ترمیم کی گنجائش بہر حال موجود رہتی ہے۔ حرفِ آخر صرف اللہ اور اُس کے رسولِ عظیم V کا فرمان ہے۔

(ریاض حسین چودھری ص، ۳۸۵-۳۸۴)

ڈاکٹر عاصی کرناٹی کا ایک شعر:

جو نعت برائے اشاعت ارسال کر چکا ہوں (ہوں ادب سے عرض گستر) اُس کو نہ چھاپے بلکہ اُسے منسوخ کر دیجیے۔ اُس میں بہت زیادہ منفی ہو گیا ہوں اور میں نے امت مسلمہ کے دامن میں کچھ بھی نہیں رہنے دیا۔ یہ بات حقائق کے خلاف اور حضور رسالت مآب ص کی مسلسل و مدام رحمت اللعالمین کے برعکس ہے۔ میں نے اسے اپنے مجموعہ کلام سے خارج کر دیا ہے۔ آپ یہ ورق نعت چاک کر دیں یا مجھے ارسال کر دیں۔ (عاصی کرناٹی ص، ۵۹۴)

کراچی میں کوئی صاحب ”یا رسول اللہ“ کی ردیف کے تلازمے سے نعتوں کا مرتبہ شائع کر رہے ہیں۔ مجھ سے بھی انھوں نے نعت طلب کی تھی۔ جو میں نے بھیج دی تھی۔ (میں اُن

صاحب کا نام بھول گیا ہوں) اس فرستادہ نعت میں ایک شعر کے ایک لفظ میں ترمیم کرا دیجیے۔ شعر:

یہ ادنیٰ معجزہ ہے آپ کے نور تبسم کا ہوا بزمِ دو عالم میں چراغاں یا رسول اللہ ”ادنیٰ“ کی جگہ ”روشن“ کر دیجیے۔ اس کام میں عجلت فرمائیے اور فوراً ترمیم کرا دیجیے۔ (عاصی کرناٹی ص، ۵۹۶)

تخلیق نعت کی ایک خوبصورت مثال:

ان کی نسبت سے دعاؤں کا شجر سبز ہوا
ورنہ ٹلتا ہی نہ تھا بے ثمری کا موسم
(صبحِ رحمانی کے) اس شعر میں شعریت ہے، غنائیت ہے، فنِ کاری ہے، لفظوں کو برتنے کا ہنر ہے۔ ایسے ہی اشعار سے مرصع نعت پڑھنے کو ملتی ہے تو جی خوش ہوتا ہے۔
(احمد صغیر صدیقی ص، ۷۲)

ظریف نظام پوری کا ایک خوبصورت شعر:

اپنے ہم وطن شاعر مرحوم ظریف نظام پوری کا ایک شعر جو انھوں نے ”عید میلاد النبی“ کے موقع پر منعقدہ ایک مشاعرے میں بھیجوئی میں پڑھا تھا، یاد آ گیا۔ یہ شعر میں نے لڑکپن میں سنا تھا:
میں اور مجالِ شعر رسالت مآب پر
شبِ نیم دھری نہ جائے کفِ آفتاب پر
ہندو پاک کے کم معروف شعراء کے کلام میں بھی نعتیہ شاعری کے عمدہ نمونے مل سکتے ہیں بشرط یہ کہ مختلف علاقوں کے اہل قلم اس سلسلے میں چھان پھٹ کریں یا اپنی یادوں کو تازہ کریں۔

متضاد خیالات کی کارفرمائی:

۱۔ ڈاکٹر سید یحییٰ فیض اپنے مقالہ ”اردو نعت گوئی کے موضوعات“ شمارہ ۵، صفحہ ۵۷ میں لکھتے ہیں کہ مولانا سعید احمد کبر آبادی نے بھی لکھا تھا ”معراج سے متعلق احادیث صحیحہ میں بھی ضعف پایا جاتا ہے۔“ صحیح اور ضعیف حدیث کی دو متقابل قسمیں ہیں۔ صحیح ہوگی تو اس میں ضعف نہیں ہوگا اور ضعیف ہوگا تو وہ صحیح نہیں ہوگی ان دونوں کو جمع کرنا آگ اور پانی جمع کرنے کے مترادف ہے۔

۲۔ یہی ڈاکٹر صاحب صفحہ ۶۰ پر لکھتے ہیں ”اب ایک نعت گو توحید کے متوالے شاعر کی جرات رندانہ نہیں بلکہ مشرکانہ ملاحظہ ہو (چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں) اوتاروں کی شان میں لکھے گئے بھجن بھی اس کفریہ کلام کے مقابلے میں بیچ ہیں۔ (ایک سطر کے بعد لکھتے ہیں) ثنائے محمدی V کو ”حمد“ کی شکل میں پیش کرنے کا فن کس قدر مذموم اور ناروا ہے۔“ حالانکہ حمد اور ثنا دونوں کا معنی تعریف ہے، نبی اکرم V کی ثنا ہو سکتی ہے تو حمد کیوں نہیں ہو سکتی؟ (محمد عبدالحکیم شرف قادری ص ۶۳۰)

علامہ فیض الحسن سہارن پوری کی نعتیہ شاعری اور مسئلہ استعانت:

صفحہ نمبر ۱۹۴ پر بھارت کے ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی صاحب کا مضمون ”علامہ فیض الحسن سہارن پوری کی نعتیہ شاعری“ شائع ہوا ہے۔ یقیناً علامہ صاحب کی نعتیہ شاعری ایک عاشق رسول کے دل کی آواز ہے۔ بالخصوص صفحہ نمبر ۲۰۰ پر ایسے اشعار درج ہیں جن میں مختلف پیرایوں میں حضور اکرم V سے مدد طلب کی گئی ہے۔ شاعری میں اس قسم کے مضامین ہر دور میں باندھے گئے ہیں۔ بہر حال علامہ سہارن پوری کے ان اشعار کے بارے میں فاضل مضمون نگار رقم طراز ہیں:

”مسئلہ استعانت نازک مسئلہ ہے۔ اکثر شعرا یہاں دائرہ اسلام سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اللہ اور رسول اکرم V کے مابین فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ علامہ سہارن پوری نے مذکورہ اشعار میں قرآنی نقطہ نظر واضح کر دیا کہ آپ ”غوث المستغاث“ کے درجہ پر فائز ہیں لیکن یہ مرتبہ من جانب اللہ ہے۔“ مجھے فاضل مضمون نگار کی یہ سطور پر پڑھ کر سخت حیرت ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی مسلمان حضور اکرم V کے لیے کسی قسم کا علم یا کمال ذاتی تسلیم نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ مانتا ہے۔ یقین جانے اگر یہی اشعار فاضل بریلوی اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ یا ان کے کسی عقیدت مند سے منسوب ہوتے تو علمائے دیوبند کی زبانیں شرک، شرک کی رٹ لگاتے نہ تھکیں۔ دراصل مسلکی اجارہ داری اور فرقہ پرستی یہی ہے جس کا اظہار اصلاحی صاحب کی تحریر سے ہوتا ہے۔ (۶۵۷)

نعت میں ضما کر کا استعمال:

عزیز احسن نے ”نعت اور تصویر مقصود کائنات“ میں انھوں نے نعت میں ”تو“ یا ”آپ“ کے استعمال کا ذکر بھی چھیڑا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اردو میں ”آپ“ کا ضمیر بھی ہے اور ”تو“

کا بھی۔ تاہم بات وہی ”حسن نیت“ کی ہے اور اسے سبھی جانتے ہیں۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر صابر سنہجلی کا ہے جو اسی موضوع پر ہے یعنی آداب نعت پر۔ اس میں، ٹو، ترا اور آپ وغیرہ کے ضما کر پر بات کی گئی ہے۔

”اب روزہ مرہ گفتگو میں ”تو“ نے ”تم“ اور آپ کے لیے جگہ خالی کر دی ہے۔“ یہ جملہ اس لیے کھلتا ہے کہ زمانہ لاکھ بدل جائے کوئی اپنے سے بڑوں کو ”تو“ سے خطاب نہیں کرے گا، البتہ ہندوستانی ہندی ٹی وی سیریس میں ”تو“ اور ”تم“ کا فرق مٹ گیا ہے۔ پاکستانی ٹی وی سیریس کے متعلق راقم التحریر لائسنس کا اظہار کرتا ہے۔

”کہا جاتا ہے کہ کوئی دو لفظ ہم معنی نہیں ہوتے۔“ مقالہ نگار نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ کبھی سنی بات پر اعتماد ہوتی ہے۔ درحقیقت ہر زبان میں ہم معنی الفاظ کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ معینہ اور لغویہ کے لیے Lexeme فہمیہ کے لیے Sememe کی اصطلاحوں کی تجویز سے اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو کا استعمال اور آپ V کے سراپا کو منظور کرنے سے متعلق مقالہ نگار نے جو ٹھوس حوالے دیے ہیں وہ مقالے کو موقع بناتے ہیں۔ (۲۳۷)

القابات رسول V اور معترضین:

ص ۳۱۳ پر احمد صغیر صدیقی صاحب نے اپنے مکتوب میں ”مولائے کل، آقائے دو جہاں۔ سرکارِ دو عالم“ کے القاب رسول کریم V کے لئے تسلیم نہیں کیے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ: ”تمام القاب مجھے رب رحمان و رحیم کے محسوس ہوتے رہے ہیں۔“

احمد صغیر صاحب سے عرض ہے کہ زبان سے کہنا اور قلم سے لکھنا دونوں احتیاط سے مشروط ہیں اور قلم اٹھانے سے پہلے کچھ زیادہ احتیاط لازم ہے۔ علم کے مطابق فہم اور فہم و علم میں توازن و مطابقت نہ ہو تو اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ علم و فہم میں کسی ایک کی کمی ہی اعتراض و اختلاف کی بنیاد بنتی ہے یا پھر حقائق سے چشم پوشی پر اعتراض و اختلاف ہوتا ہے۔ احمد صغیر صاحب آیات قرآنی میں یہ القاب رسول کریم V کے لئے ملاحظہ فرما سکتے ہیں، وہ اعتراض کی بجائے استفسار کر لیتے۔ نبی پاک V کی تو شان بہت ہی بلند ہے۔ سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے ”وانا شیخ الكل“۔ احمد صغیر صاحب شاید یہاں بھی کچھ اور ہی محسوس کریں گے۔ انہیں چاہیے کہ وہ مولا، سرکار اور آقا کے معانی و مفاہیم کو جانیں اور سمجھیں اور لفظ ”کل“ کے بارے میں

محض اپنے فہم کو سب کچھ نہ سمجھیں۔ دیوبند کے علماء کے ساتھ ”مطاع العالم اور مطاع الکمل“ کے القاب لکھے گئے ہیں حالاں کہ ان کے لئے کسی طرح یہ القاب درست نہیں، خواہ وہ کتنی تاویلیں کیوں نہ کریں.....

احمد صغیر صاحب کی تسلی کے لئے آیات و احادیث پیش کر سکتا ہوں، ضرورت ہو تو وہ رابطہ فرمائیں۔ وہ لفظ ”مولانا“ پر بھی غور فرمائیں، قرآن کریم میں انت مولانا اور ہو مولانا کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، پھر ہر داڑھی والے کو مولانا کیوں کہہ دیا جاتا ہے؟ سورہ تحریم میں ہے: فان اللہ ہو مولاه و جبریل و صالح المومنین، قرآن میں ”کُل“ کا لفظ ۳۲۵ سے زائد مرتبہ آیا ہے۔ کلا ۱۵ مرتبہ۔ کلا ۷ مرتبہ۔ کلہا ۵ مرتبہ۔ کلہم ۴ مرتبہ..... وہ ذرا دیکھیں اور بتائیں ہر جگہ کیا معنی ہیں؟ انہیں شاید نہیں معلوم کہ ”العالین“ ماسوی اللہ کو کہتے ہیں، اس کے آقا و مولیٰ اور سردار و سرکار نبی پاک ﷺ ہی ہیں۔ (کوکب نورانی ص ۵۲۳، ۵۱)

’نعت رنگ‘ سے متعلق ایک نقطہ نظر:

نعت شاعری کا وہ رُخ ہے جس میں غزل یا نظم کی طرح موضوعات کے تنوع کی گنجائش نہیں ہے اور شاعر کو جولانی طبع کے اظہار کا موقع کم سے کم تر ملتا ہے، اس لیے کہ ایک مخصوص موضوع کا پابند رہتے ہوئے، احترام و عقیدت کا اظہار ایک نہایت ہی مشکل ترین مرحلہ ہے۔ محض اسلوب اور انداز بیان کے نئے نئے تجربات کے سہارے نعت گوئی میں جتنی گنجائش تھی وہ اساتذہ فن نے پوری طرح برت لی ہے، پھر یہ بھی ہے کہ اب تک کہی جانے والی نعتیہ شاعری پر کتنے اور کب تک مضامین لکھوائے جائیں گے۔ تنقید نویسوں کے متعلق میں بہت زیادہ خوش گمان نہیں ہوں۔ اول تو ناقد خال خال ہیں۔ آج کل تو کالج اور یونیورسٹی میں پڑھانے والے اساتذہ نے یہ منصب سنبھال رکھا ہے اور تعلیم کا حال بھی روز روشن کے مانند عیاں ہے تو اساتذہ کا کمال بھی پوشیدہ نہیں۔ کتابوں کی تقریبات و نمائیں سے ہی بے چاروں کو فرصت نہیں ملتی ہے۔ اب تو حال بہ ایں جارسید کہ مزاح نگار بھی کتابوں کی رونمائی میں مضامین پڑھنے لگے ہیں۔ ایسے عالم میں نعت گوئی جیسے سنجیدہ اور برگزیدہ موضوع پر مضامین کون لکھے گا۔ فرض کیجیے آپ نے چند اہم نقادان کرام سے مضامین لکھوا بھی لیے تو وہ کب تک لکھیں گے۔ غالباً ایسی ہی بات میں نے ”رثائی ادب“ کے مدبر عزیز مڈاکٹر ہلال سے بھی کہی تھی۔ مگر آپ دونوں ماشاء اللہ اب تک اپنا کام نہایت

استقلال سے کیے جا رہے ہیں۔ ”نعت رنگ“ کا تازہ شمارہ اور جناب شفقت رضوی کی کتاب دیکھ کر ہی آپ کے عزم صمیم، پختگی ایمان و ایقان و اعتقاد کے ساتھ میرا یقین بھی ایمان کی حد تک پہنچ گیا کہ وہ بھی امداد و اعانت فرماتے ہیں جن کا بیان ہے۔

شعراے کرام، اظہار محبت و عقیدت کے جتنے پیرائے اختیار کرتے ہیں مضامین تحریر کرنے والے بھی اسی حساب سے اپنی فکری تحریر میں تنوع اختیار کر رہے ہیں۔ (سلطان جمیل نسیم ص ۴۳۵، ۴۳۴)

نعت اور قناعت رسول کی پیش کش:

صفحہ نمبر ۳۹۸ پر ”چٹائی، غار حرا، جو کہ تذکار“ کے بارے میں جو مضمون ہے اسے پڑھ کر احساس ہوا کہ اس میں تنقید برائے تنقیص کی گئی ہے۔ نعت گو شعراء نے بویا اور چٹائی کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ سلطان مدینہ، سرورد و عالم اور بادشاہ عرب و عجم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سادگی اور قناعت پسندی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے ورنہ کرسی، مسند، چادر، بستر وغیرہ تو دنیوی بادشاہوں نے بھی استعمال کیا ہے۔

یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ آپ نے صرف چٹائی کو ہی پسند فرمایا اور باقی چیزوں سے بیزاری کا اظہار فرمایا۔ یہ مقالہ نگار کے اپنے ذہن کی اختراع ہے ورنہ شعراے نعت نے آپ کی سادگی کو ہی بیان کیا ہے۔ ماہر القادری کے دو اور تنویر پھول کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

سلام اُس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی، نہ سونا تھا
سلام اُس پر کہ ٹوٹا بویا جس کا بچھونا تھا
سلام اُس پر جو امت کے لئے راتوں کو روتا تھا
سلام اُس پر جو فرش خاک پر جاڑوں میں سوتا تھا
بویا، ٹوٹی چٹائی، زیر پا عرش علی
عیش کوشو! بادشاہ دو سرا، سرکار ہیں

کیا فاضل مقالہ نگار کی نظر سے وہ روایت نہیں گزری کہ حضرت عمر فاروقؓ جسم اطہر پر چٹائی یا بویا کے نشانات دیکھ کر ابدیدہ ہو گئے تھے اور جب انھوں نے قیصر و کسریٰ کے عیش و آرام کا ذکر کیا تو آپ نے جواب میں کیا ارشاد فرمایا؟ یاد رہے کہ آپ کی یہ سادگی اختیاری تھی ورنہ اگر

آپ چاہتے تو پورا کوہِ احد سونے کا بنا دیا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔
اسی طرح جو یعنی شعر کے ذکر کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کھانے
میں آپ کی سادگی کا ذکر ہے اور مکرر عرض ہے کہ یہ سادگی اختیاری تھی۔
(تنویر پھول ص ۲۶، ۲۷، ۲۸)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سایہ:

علاوہ ازیں انہوں نے نبی کریم ﷺ کے وجودِ اقدس کے ”بے سایہ“ نہ ہونے کے
بارے میں جناب سلیمان ندوی کی تحریر اور دلائل کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ یہی سمجھتے رہے کہ
ندوی صاحب کے دلائل درست ہیں۔ عرض ہے کہ جناب شبلی نعمانی اور ندوی صاحب کے بارے
میں خود ان کے ہم مسلک جناب اشرف علی تھانوی نے جابہ جات تنقید کی ہے بلکہ سخت اختلاف کیا ہے
جو احمد صغیر صاحب کے علم میں شاید نہیں۔ نبی پاک ﷺ کے وجودِ ندوی و مقدس کا سایہ نہ ہونے
کے بارے میں علمائے حق کی تحریریں یادگار ہیں جن کا مطالعہ کافی ہوگا، ان شاء اللہ۔
(کوکب نورانی ص ۵۴، ۵۵)

معراج سے متعلق احادیث:

مجھے افسوس ہے کہ ڈاکٹر سبکی صاحب نے انتہائی غیر محققانہ تحریر پیش کی ہے۔ ڈاکٹر
صاحب نے اپنی تحریر میں تمام حوالے صرف ایک مکتب فکر کے علماء کے پیش کئے ہیں۔ ص ۵۷ پر
ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”رسالہ برہانِ دہلی کے سابق ایڈیٹر جناب سعید اکبر آبادی نے بھی لکھا تھا: ”معراج
سے متعلق احادیث صحیحہ میں بھی ضعف پایا جاتا ہے۔“

یہی صاحب سے پوچھنا چاہوں گا کہ سعید اکبر آبادی صاحب کا محققین میں کیا درجہ
ہے، وہ کس درجہ کے محدث ہیں؟ کیا اس بارے میں کوئی متفقہ و اجماعی رائے اہل علم کی وہ پیش
کر سکتے ہیں؟ کچھ رواج ہو گیا ہے کہ قرآن و حدیث کے بارے میں اپنی رائے کو اہمیت دی
جاری ہے حالانکہ اس بارے میں سخت وعیدیں بیان ہوئی ہیں۔ محدثین و محققین نے جن
احادیث کو ضعیف کہا ہے ان کے ضعف کی وجہ بیان کی ہے اور مسائل و فضائل کے بارے میں
اصول و قواعد مختلف ہیں۔ اگر حدیث فی الواقع ضعیف ہو تو وجوب ثابت نہ ہوگا، استحباب تو ثابت

ہوگا اور فضائل میں تو سبھی ضعیف روایات کو بھی قبول کرتے ہیں۔
کسی حکم، عمل یا بات کے وجوب و استحباب کے اثبات میں محدثین جو حدیث پیش کرتے
ہیں، اس حدیث کا اصطلاحی درجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ حدیث سے ناواقف یا حدیث کو کم تر سمجھنے
والے جہلاء وغیرہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ ضعیف حدیث سے مراد غلط حدیث نبوی ہے جب کہ حدیث
ضعیف کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا۔ امام ابن ہمام فتح القدیر میں واضح فرماتے ہیں کہ ضعیف کا
مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ حدیث باطل ہوتی ہے، بلکہ حدیث ضعیف دراصل محدثین کی مقرر کردہ چند
شرائط میں سے کچھ پر پوری نہ اترنے والی حدیث کو کہتے ہیں۔ اسناد میں روایت کے ضعف کے
باوجود وہ احادیث صحیح ہی ہوتی ہیں۔ علمائے دیوبند میں مشہور جناب شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ:

حدیث جعلی نہ ہو ضعیف ہو تو بھی استحباب ثابت ہو جاتا ہے۔ والاستحباب یثبت
بالضعیف غیر الموضوع (مقدمہ فتح الملہم شرح مسلم) اور غیر مقلد اہل حدیث میں مشہور
جناب نذیر حسین محدث فرماتے ہیں: حدیث ضعیف سے جو موضوع نہ ہو، استحباب و جواز ثابت
ہوتا ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ بحوالہ فتاویٰ نذیریہ ج ۱، ص ۳۱۵)۔ نیل الاوطار میں جناب شوکانی بھی
فرماتے ہیں کہ ضعیف روایات مل کر بلند مرتبہ ہو جاتی ہیں اور مستحب اعمال میں کام دیتی ہیں۔ یہ
وضاحت یوں کی گئی ہے کہ وہ لوگ جو حدیث کو ضعیف قرار دے کر تضحیک و توہین کرتے ہیں وہ
حقائق سے واقف ہوں اور محتاط رہیں۔ (کوکب نورانی ص ۵۷، ۵۸)

موضوع احادیث:

اس نعت رنگ میں سبھی لکھنے والے ذکرِ رسول ﷺ کو سرمایہ ایمان، ذریعہ نجات،
عبادت، بہترین سعادت اور موجب خیر و فلاح لکھ رہے ہیں۔ اگر جام کوثر حاصل کرنے کا جتن
کوئی مسلمان ذکرِ رسول ﷺ لکھ کر کرتا ہے تو اسے منفی یا ناروا کہا یا سمجھا نہیں جاسکتا، البتہ اس کی
تحریر میں کوئی غیر معتبر یا تحقیق کے لحاظ سے غیر مستند بات ہو تو یہ واضح ضرور کیا جائے کہ کس شخصیت
نے کس کتاب میں اسے موضوع یا غلط روایت بتایا ہے تاکہ اہل علم و تحقیق اس معترض و ناقد کے
اعتراض و تنقید کی وقعت اور اصلیت جان سکیں۔ موضوع (لوگوں کی خود بنائی ہوئی) احادیث کے
حوالے سے محدثین نے جو مجموعے تیار کئے ہیں ان میں درج تمام روایات کو اہل علم نے موضوع
نہیں مانا۔ ابن جوزی نے بہت سی صحیح احادیث کو موضوع لکھا تو اہل علم بالخصوص امام جلال الدین

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا تعاقب کیا۔ میری ذاتی لائبریری میں موضوعات کے حوالے سے کئی کتابیں ہیں ان میں علمائے احادیث نے واضح لکھا ہے کہ ہم محدثین کا کسی حدیث کو کہنا کہ یہ صحیح نہیں اور کسی کو موضوع کہنا، ان دونوں میں بڑا اہل ہے کیوں کہ موضوع کہنا تو اسے کذب و افترا ثابت کرتا ہے اور غیر صحیح کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حدیث ہی نہیں بلکہ اس کا حاصل تو سلب ثبوت ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ (الآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ، ص ۱۸، جلد اول، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۷ھ) امام ملا علی قاری، علامہ طاہر فتنی، امام ابن حجر عسقلانی نے بھی واضح لکھا ہے کہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ حدیث کے صحیح نہ ہونے سے اس کا موضوع ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی طرح سند کا منقطع ہونا بھی موضوع ہونے کو لازم نہیں کرتا۔ اسی طرح ”التعقیبات علی الموضوعات“ میں ہے کہ حدیث ضعیف کی ایک قسم مضطرب اور ایک قسم منکر ہے اسے بھی موضوع کہا یا مانا نہیں جاتا اور فضائل میں اس سے استدلال کیا جاتا ہے۔ جہالت راوی، یا صرف راوی کا نام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بھی حدیث کو موضوع نہیں کہا جاسکتا۔ اس موضوع پر تمام تفصیل کیجا دیکھنی ہو تو اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مولانا شاہ احمد رضا خاں محدث و فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ ”منیر العین فی حکم تقبیل الالبھا میں“ یا ”فتاویٰ رضویہ“ کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے ذکر رسول ﷺ ایسا مبارک وظیفہ ہے جس پر دوسرے رشک کرتے ہیں، وہ لوگ جو ایمان و محبت سے اس ذکر کو سرمایہ آخرت بناتے ہیں وہ خیر ہی سے شغف رکھتے ہیں اور ذکر رسول اللہ ﷺ سے بلاؤں، آفتوں کا دور ہونا تو خود جناب اشرف علی تھانوی کی تحریروں میں مذکور ہے، چنانچہ طاعون کی وباء سے بچنے کے لئے وہ نبی کریم ﷺ کے روزانہ ذکر کو نافع و مفید لکھتے ہیں۔ کچھ برس پہلے بھارت کے ایک صوبے میں یہ وباء پھیلی تھی، ان دنوں روزنامہ جنگ کراچی میں میرا مضمون شائع ہوا تھا اس میں بھی تھانوی صاحب کا یہ اقتباس مبین نے لکھا تھا۔ جناب اسماعیل دہلوی کی تحریر میں بھی یہ ہے کہ: ”ہر دم نام محمد کا لے۔“ اسے میں نے اپنی کتاب سفید و سیاہ میں نقل کیا۔ ڈاکٹر کبھی نشیط صاحب نے اگر یہ سمجھا ہے کہ شامل رسول (۷) پڑھنے سے فائدہ نہیں ہوگا تو یہ ان کی غلط فہمی ہے البتہ فی الواقع موضوع یا غلط روایت کی اشاعت ہی غلط ہے، ان کے پڑھنے پر فائدہ و ثواب کا دعویٰ بھی غلط ٹھہرے گا۔ (کوکب نورانی ص ۹۷/۳)

محسن کا قصیدہ لامیہ اور ہندو صنمیت:

ڈاکٹر حبیب الرحمن رحیمی نے اپنے مضمون، محسن کا کوروی کے قصیدہ لامیہ پر ایک نظر میں، جو اتفاق و اختلاف کی بحث چھیڑی ہے وہ برسوں پہلے سرد ہو چکی ہے اب اس کے احیاء کا کوئی موقع ہے نہ مطلب!! ان کا یہ کہنا:

”جہاں تک اس کی تشبیہ میں ہندوانہ ماحول و فضا یا ہندو صنمیت کی تلمیحات کے استعمال کی بات ہے تو ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ قصیدہ اس وقت کہا گیا ہے جب برصغیر متحد تھا، اس کی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اس وقت اس متحد ملک میں ہندو اور مسلمان سب ایک ساتھ رہتے تھے اور اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں مذاہب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے ہیں اس وجہ سے مسلمان ہندوؤں کی مذہبی شخصیات اور مقامات سے بخوبی واقف تھے اور ہندو بھی مسلم معاشرے میں گھل مل گئے تھے یہی وجہ ہے کہ متعدد غیر مسلم شعراء نے بھی نعت گوئی کا شرف حاصل کیا، اس ماحول و معاشرے میں محسن نے یہ قصیدہ کہا۔“

نہایت بھونڈا جواز اور نہایت بودی دلیل ہے۔ ماحول و معاشرے کے اثرات اپنی جگہ مسلم لیکن مذاہب کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا قطعی ناقابل قبول ہے۔ محسن نے کبھی مندر میں ماتھا ٹیکا اور نہ کنور ہندو سنگھ بیدی سحر اور کرشن بہاری نور نے مسجد میں نماز پڑھی!! اب محسن کے اس قصیدے پر بحث لا حاصل ہے۔ (۶۴۳-۶۴۲-۶۴۱)

’نعت رنگ‘: خطوط کے آئینے میں

”نعت رنگ“

اک آئینہ ہے صبغة اللہ کا
بلاشبک، بہت خوب ہے نعت رنگ
بہ سعی صبیح، فدائے رسول
مسلمان کو محبوب ہے نعت رنگ
مرتب ہیں اس کے سزاوارِ قدر
بہت ہی خوش اسلوب ہے نعت رنگ
بخوبی ہیں اس سے بھی واقف صبیح
کہ راغب کو مرغوب ہے نعت رنگ

راغب مراد آبادی (۳۴۲)

’نعت رنگ‘ ایک تعارف:

غیر مشروط اور غیر متزلزل کو مٹ منٹ کا پہلا صلہ یہ عطا ہوتا ہے کہ تخلیقی سطح پر سوچ اور اظہار کے مقفل دروازے خود بخود کھلنے لگتے ہیں۔ تخیل کے پرندوں کو تازہ ہواؤں سے دائمی وابستگی کا ادراک ملتا ہے اور لفظ معانی کی فضائے بسیط میں اونچی پرواز کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ ”نعت رنگ“ نے اپنے جس تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس کے نقوش پائتے تابندہ اور روشن ہیں کہ بہت سے دوسرے ارباب وفا پر بھی سفر کے مراحل آسان ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ثنائے حضور ۷ کی خنک ہواؤں کے قافلے کے رواں دواں رہنے کا چرچا خوش بوئیں ہی نہیں، دھنک کے رنگ بھی کرتے رہے ہیں۔ ”نعت رنگ“ کا شمار نمبر ۲۲ پھولوں کی اپنی خوش بوؤں، دھنک کے انھی رنگوں اور آفتابِ ادب کی اسی روشنی کا عکس جمیل نظر آتا ہے۔

(ریاض حسین چودھری ص ۳۸۵)

’نعت رنگ‘ میں مستقل لکھنے والوں نے اپنے تئیں کوشش کی ہے کہ وہی مطالعہ اور مشاہدہ کہتا ہے۔ خطوط کا حصہ تو اچھا خاصا ہائیڈ پارک بن چکا ہے۔ اس میں کسی خاص موضوع کے حق اور مخالفت میں دونوں آراء موجود ہوتی ہیں، ایک عمل کا رد عمل اگلے شمارے میں سامنے آجاتا ہے۔ جواب آں غزل تو خیر کمال دلچسپی لیے ہوئے ہے۔ ’نعت رنگ‘ آپ کے باطنی اخلاص اور ذات سرور کائنات ۷ سے تعلق خاطر کا مظہر ہے۔ ایک طرف آپ نعت گوئی اور دوسری جانب نعت خوانی کے ذریعے جو سعادت دارین حاصل ہوتی ہے وہ عطاءے ربی ہے، ’نعت رنگ‘ عقیدتوں کے اظہار کی تیسری جہت ہے جس میں آپ کے ساتھ ہزاروں لاکھوں عقیدت مندوں کا قافلہ بھی ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ ’نعت رنگ‘ کے اجرا سے پہلے جب آپ محترم غوث میاں کے ہمراہ فیصل آباد آئے تھے تو آپ کا عجز آثار عزم بتا رہا تھا کہ آپ کوئی بہت بڑا منفرد کام کرنے جا رہے ہیں اور میرا یہ تاثر اب ایک زندہ حقیقت بن چکا ہے۔ ۵۱۲ صفحات کے شمارے کا حرف حرف اعلان کر رہا ہے کہ آنے والے دنوں میں اس سے بھی زیادہ کی توقع رکھی جائے۔ (ڈاکٹر شبیر احمد قادری ص ۴۷۶-۴۷۵)

جہاں تک ”نعت رنگ“ کا تعلق ہے وہ محبتوں کے دلاویز نغمات پر مشتمل مسکراتے آنسوؤں کی ایسی لڑی ہے کہ اس عقدِ لالی میں کیف و رنگ بھی ہے، نور و نکہت بھی، چاند تاروں کی جلوہ ریزیوں بھی ہیں اور گلہائے مدحت کی خوشبو میں بسی کرنوں کی سیڑھیوں سے اترنے والی الہامی کیفیتیں بھی ہیں۔ نعت رنگ دلوں میں فریفتگی و شیفگی کے بے پناہ سمندر اٹھانے والی منہ زور، متلاطم موجوں کا بیل تجاج اور رقعہ بر رقعہ دوختہ ”مرقع“ Anthology ہے جس میں عشاقی رسالت مآب ۷ کے لیے سامانِ اضطراب ہے۔ متاعِ طمانیت ہے خستہ حال بے قراروں کے لیے قراچان ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ اس دور میں نعت خواں و نعت شناس حضرات کی صفِ اوّل ہی میں نہیں امامت کے منصب پر کھڑے ہیں۔

جہاں تک آپ کی نعت گوئی اور نعت نگاری کا تعلق ہے وہ ”شعر برائے شعر گفتن“ کے قائل ہی نہیں۔ عشق رسول ۷ میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کیفیاتِ وارفتگی و سرمستی میں ڈوب ڈوب جانا آپ کا اختصاص و امتیاز ہے۔ آپ اس بحرِ محبت کے شناور ہیں جو ناقابلِ یافت Fathomless ہے، ناقابلِ رسائی Unaccessable ہے۔

(غلام رسول عیدیم ص ۵۱۶/۲۷)

’نعت رنگ‘ کی غرض و غایت:

بادی النظر میں ’نعت رنگ‘ کے اجرا کی غرض و غایت فروغِ نعت قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن اشاعتِ اول ہی نے اجرا و اشاعت کے پس منظر میں کارفرما مرتب و معاونین مرتب کی فکری تحریک و تشویق کا راز کھول دیا کہ ’نعت رنگ‘ کے طلوع کی اصل بلکہ غایت اولیٰ فضائے نعت میں تجدد و اجتہاد کی روشنی پھیلانا اور فن و موضوع کے تعلق سے ایسے مباحث کے دروا کرنا ہے، جو پہلے سوئے ادب متصور ہوتے تھے۔ (قیصر نجفی ص ۷۵۳)

جیسا کہ ’نعت رنگ‘ کے قارئین کو علم ہے اس جریدے کا واحد مقصد اردو کی اصنافِ سخن میں سے نعت کو فکری اوصاف اور فنی محاسن کے حوالے سے ایک ایسی بلوغِ صنف کے طور پر پیش کرنا ہے جس میں ادبیاتِ عالیہ کے سارے محاسن کا عہدگی سے اظہار ہوا ہو۔ اسے محض ایک مذہبی موضوع کا بیان نہ سمجھا جائے بلکہ اس کی تخلیق میں صرف کی جانے والی مساعی، مہارت، ریاضت اور تخلیقی اقدار کے شمول کو بھی زیرِ جائزہ لایا جائے۔ (ڈاکٹر ریاض مجید ص ۲۵/۸۷)

’نعت رنگ‘ کی اہمیت:

یہ مجلہ اب، بلکہ ایک آغاز ہی سے، اپنے مشمولات کے تنوع اور دل کشی کے باعث محض ایک رسالہ ہی نہیں ایک دنیا کے کیف و سرور اور عقیدت و مودت ہوتا ہے جس کا رشتہ راست ہم سب کی روح اور حواسِ دونوں سے قائم و برقرار ہے۔ اس کے تنوع میں یہ سب کچھ ہے اور ساتھ ہی افادیت بھی اپنی جگہ بے پناہ۔ مقالات جائزے و مطالعے ہر دو پر مشتمل ہوتے ہیں اور پھر ان میں اکثر معلومات بھی قاری کو اپنی دنیا میں سمیٹے رکھتی ہیں۔ (ڈاکٹر معین الدین عقیل ص ۸۲۶)

اردو زبان اور ’نعت رنگ‘:

’نعت رنگ‘ نے اردو زبان کے چٹکارے لینے کا مزہ دیا۔ ایک توسلونی زبان اس پر ذکرِ حبیبِ خدا ۷ کی نورفشانی دل کے سرور اور روح کے کیف کے سامنے ہو گئے۔ خیال ہوا اردو کو مٹانے کے لیے غیروں نے اور ان سے زیادہ اپنوں نے جو جہتیں اٹھائیں وہ سب بے کار ثابت ہوئیں۔ اگر اردو جنوبی ایشیا میں مٹ بھی جائے تو امریکا، کینیڈا، لندن، اٹلی، جاپان، وسطی ایشیا میں زندہ رہے گی اور اس کو مٹانے کا عزم رکھنے والے دوستوں کے سینے پر مونگ دلتی رہے

گی۔ ذکرِ حبیبِ خدا ۷ کے سلسلے میں بھی یہ رویہ صدیوں سے جاری ہے اور ذکر کی فراوانی ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔ لاکھ پابندی لگاؤ کہ ذکر نہ ہو، احترام نہ ہو، عقیدت میں سر نہ جھکے، ہاتھ کا اشارہ نہ ہو، زبان پر یا رسول اللہ نے آئے، لیکن نہ توفتوؤں کی ضرب اور نہ فقیوں کی ضرب دلوں کے جذباتوں پر قابو پا سکیں نہ محبتوں اور عقیدتوں کے سوتے سوکھ سکے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ذہنی خلششار، تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت، مصلحتوں کو نظر سے ہٹانے کے اس دور میں ’نعت رنگ‘ طوفانوں کے درمیان جگنو کی طرح روشن ایک چھوٹا سا دیا ہے۔ اسے ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہیے۔ غالباً میں نے اپنے کسی پچھلے خط میں لکھا تھا کہ ’نعت رنگ‘ ختم ہوا تو سمجھو تمھاری زندگی ختم ہوگئی۔ میرے خیال میں ’نعت رنگ‘ کے تمام لکھنے والے اور پڑھنے والے بھی اس سے متفق ہوں گے۔ (شفقت رضوی ص ۴۹۱-۴۹۰)

’نعت رنگ‘ اور تنقیدِ نعت:

’نعت رنگ‘ نے اشاعتِ اول میں جس انفرادیت کا پرچم اٹھایا تھا وہ آج تک اس کے شامل حال ہے۔ میری مراد تنقیدِ نعت سے ہے۔ شروع میں یار لوگ تنقیدِ نعت کے نام سے بدکنے لگے کہ ہمارا شاعرانہ وقار اس سے گر جائے گا مگر آہستہ آہستہ انھیں از خود احساس ہونے لگا کہ یہ تنقیص یا عیب جوئی نہیں بلکہ تنقید ہے اور اس تنقید کا ہر دور میں شعرا کو سامنا کرنا پڑا ہے۔ نعت بھی ایک صنفِ شاعری ہے جسے بڑے زوروں سے منوایا گیا ہے۔ ’نعت رنگ‘ بھی اس ادبی، صحافتی اور علمی و فکری جدوجہد میں شامل ہے جس کی بدولت آج کے اہلِ سخن اور اہلِ ادب اسے صنفِ سخن ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

بات ہو رہی تھی تنقیدِ نعت کی، ’نعت رنگ‘ کے کہنے مشق اور ادبی لحاظ سے قد آور لکھاریوں نے اس حسنِ ادا کے ساتھ تنقید کا پرچم لہرایا کہ تنقید کو اب تنقیص نہیں بلکہ فروغِ شاعری کا اہم حصہ تصور کیا جانے لگا ہے۔ جہاں ’نعت رنگ‘ بہت سے علمی اور شعری رویوں کا علم بردار نظر آتا ہے وہاں تنقیدِ نعت کے حوالے سے اس کی افادیت آج دنیائے نعت کے نعتیہ شماروں کی اولین ضرورت بن گئی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ آج ’نعت رنگ‘، فکر و فنِ نعت کے حوالے سے اہم علمی پلیٹ فارم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس نے انتہائی ممتاز لکھاریوں، ناقدینِ فن اور قلم کاروں کا

تعاون حاصل کیا ہے۔ بڑے قلم کار منّت سماجت سے نہیں بلکہ کسی کا ادبی مقام اور علمی مقام دیکھ کر اپنے بھرپور تعاون سے نوازتے ہیں۔

”نعت رنگ“ نے اتنے برس اس شمع نعت کو روشن کیا ہے کہ آج اس کی روشنی بے شمار پڑھنے والوں کے دلوں میں ضوئیں ہو چکی ہے اور اس روشنی کو مزید نکھار عطا کرنے کے لیے نام ور ناقدین اور محققین کا ایک بڑا گروہ آپ کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہے۔ ایک دو شمارے نکال لینا اور بات ہے لیکن مسلسل عہد آفرین کام کو سرانجام دیتے جانا کسی بھی عہد کا اعزاز بن جاتا ہے اور بلاشبہ یہ اعزاز آپ اور ”نعت رنگ“ کی برکاتِ فکری کا حصہ ہے۔

”نعت رنگ“ بلاشبہ نعتیہ صحافت کا ایک ایسا گل دستہ ہے جس کی رنگارنگی نے ہر صاحبِ نظر کو اپنی جانب متوجہ کر لیا ہے، اس تمام عرصہ میں نہ تو ”نعت رنگ“ کی محبوبیت میں کمی آئی ہے اور نہ ہی چاہنے والوں کی شدتِ خلوص میں کمی کا احساس ہوا ہے بلکہ یوں لگتا ہے کہ ہر آنے والا وقت اس کی عظمتوں کے چاند کو مزید جگمگا ہٹ عطا کرتا ہے۔ رب کریم سے دعا ہے کہ ”نعت رنگ“ کا جذبہٴ عمل یوں ہی فروزاں رہے۔ آپ کا حسن ترتیب و اشاعت اسی شان کے ساتھ اس نعتیہ شاہ کار کو بہتر سے بہتر اسلوب عطا کرے اور سرورِ کونین V کی عنایات مسلسل ان کے شامل حال رہیں کیوں کہ یہی تو ایک حقیقت ہے:

میں خود تو کچھ نہیں میری قیمت ہے آپ سے

(ڈاکٹر حافظ منور حسین سرور ص ۸۵۲-۸۵۱)

ناقدین نعت سے چند گز ایشیں:

”تنقید نعت“ تخلیق نعت سے بھی کہیں مشکل کام ہے، لہذا اس کام کو وسعت دینے والے احباب سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ نعت کا فنی محاسبہ جس طرح چاہیں کریں، لیکن اس کے فکری پہلوؤں پر قلم اٹھاتے ہوئے ہر نکتہٴ نظر و زاویہ فکر پر نگاہ رکھیں اور ہر پہلو کا بہ نظرِ عمیق جائزہ لے کر بات کریں۔ اختلافی معاملات میں احباب سے مشورہ کر لینے میں کچھ حرج نہیں ہوتا بلکہ باہمی تبادلہٴ خیال سے کوئی نہ کوئی اور رخ بھی سامنے آ سکتا ہے۔ یہ درد مند اندام التماس اس لیے کر رہا ہوں کہ نعت کا احترام بہر صورت قائم رہنا چاہیے اور اس سے مختلف دینی مسالک کو قریب لانے کی سعی بھی ہونا چاہیے۔ یہ بات اس لیے بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو بعد میں تنقید پر تنقید لکھنے

کی ضرورت محسوس نہ ہو اس ضمن میں آپ کو اپنا مدبرانہ استحقاق بھی بروئے کار لانا ہوگا۔ (حفیظ تائب ص ۲۸۱)

’نعت رنگ‘ کے ادبی و فکری رجحانات:

’نعت رنگ‘ شمارہ ۱۶ اپنے روایتی علمی وادبی رچاؤ، فکری و فنی حسن اور روحانی جلوہ سامانیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ ’نعت رنگ‘ کا ہر شمارہ آپ کے کڑے انتخاب کی چغلی کھاتا ہے۔ ایسے جریدے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، جو فی الواقع معیار کو مقدم سمجھتے ہیں اور ادب میں لابی ازم یا گروہ بندی کو تکفیر کی حد تک بُرا خیال کرتے ہیں۔ بحمد اللہ! ’نعت رنگ‘ اسی قبیل کے جریدہ میں سے ایک ہے۔ البتہ جہاں تک ’نعت رنگ‘ کے علمی وادبی میلانات اور فکری و فنی رجحانات کا تعلق ہے تو اس کتابی سلسلے کی اساس نعتیہ ادب پر رکھی ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نعتیہ ادب میں مذہبی فکری جوت جگائے بغیر بات نہیں بنتی۔ جب کہ مذہبی فکر ہمارے ہاں فرقہ واریت کے گہن سے مبرا نہیں ہے۔ لہذا ایک ایسے معاشرے میں جہاں ہر فرقے نے اپنی علاحدہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنارکھی ہو، وہاں نعت و نعتیہ ادب کے کسی نمائندہ جریدے کو عقیدہ و عقیدت مندی کے حوالے سے متوازن رکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ ’نعت رنگ‘ اس تناظر میں ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ’نعت رنگ‘ کے سولہ شمارے غیر جانب داری کا ایک ایسا معیار پیش کرتے ہیں، جس کے عشرِ عشر تک پہنچنا بھی متعجب کر دینے کے لیے کافی ہے۔ (قیصر نجفی ص ۷۲-۷۱)

’نعت رنگ‘ کی خدمات:

اس وقت میرے سامنے ’نعت رنگ‘ کے دو شمارے ہیں (۱۰ اور ۱۱)۔ واجب ہے کہ تمھاری تعریف کی جائے۔ تم نے جس کام کا آغاز کیا تھا وہ ایک بہت خطرناک سا کام تھا مگر نیت میں خلوص ہو تو پروددگار کی مدد ضرور ملتی ہے۔ آج ’نعت رنگ‘ کے پلیٹ فارم سے وہ کام ہو رہا ہے جس کی ہمیشہ سے اردو ادب کو ضرورت تھی۔ نعت رسول V خدا مذہبی دائرے سے نکل کر ادب کا ایک جز بن رہی ہے اور جو کام ہو رہا ہے اس سے بہت سی بدعتوں کا قلع قمع ہونے کے ساتھ ہی نعت نگاری کو اپنے درست خدو خال کے ساتھ ابھرنے کا موقع فراہم ہو رہا ہے۔ ایسے کم زور مذہبی عقائد کا بھی پردہ چاک ہو رہا ہے جنھوں نے معمولی پڑھے لکھے افراد پر گرفت قائم کر رکھی تھی۔ یقیناً ابھی کافی کام باقی ہے اور انشاء اللہ تمھارے جریدے کے توسط سے یہ بھی تکمیل کو پہنچے گا۔ بس

میری دعا یہ ہے کہ وہ لوگ ہر بات کو کھلے دماغ اور کشادہ دلی سے پڑھیں اور براہ تحقیق اپنے عقائد اور ایمان کی اصلاح کریں ”تقلید“ کا سحر بس اسی طرح ٹوٹے گا۔ (احمد صغیر صدیقی ص ۶۳)

’نعت رنگ‘ کا سترہواں شمارہ ضخامت کے اعتبار سے گزشتہ شماروں پر بازی لے گیا۔ ۵۱۲ صفحات پر مبنی یہ شمارہ بھی اپنے اندر رنگینیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان سترہ شماروں میں حمد و نعت کے بعض بنیادی نوعیت کے موضوعات پر اہل علم و فضل نے خوب جم کر لکھا ہے۔ آپ نے نعت کے ایسے مقدس موضوع کی معیار بندی کی خاطر تنقید کے جو درکھولے ہیں اس سے نعت نگار اور نعت خوان دونوں محتاط ہو گئے ہیں۔ معاصر شاعروں کی نئی نعتوں میں ان موضوعات سے دامن بچا کر چلنے کا شعور پیدا ہوا ہے جنہیں صنفِ نعت سے دُور کی بھی نسبت نہ تھی۔ نعت پر تنقید اس سے پہلے بھی ہو رہی تھی مگر ’نعت رنگ‘ کا تخصص یہ ہے کہ اس حوالے سے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کام شروع ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نعت پر تنقید کے بعض ایسے نمونے دیکھنے کو ملے جس کی اس سے پہلے مثال موجود نہ تھی۔ اس سے ردِ عمل بھی سامنے آیا جو فطری بات تھی اس لیے کہ نعت کو صرف عقیدتوں کے اظہار تک محدود رکھنے والے اس کے فنی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر رہے تھے۔ نعت کو اصنافِ سخن میں شمار نہ کیے جانے کے پیچھے یہی عمل کا فرما تھا مگر اب یونیورسٹیوں میں نعت کو ادبی صنف کے طور پر قبول کر کے اس پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کے تحقیقی مقالات لکھنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ (ڈاکٹر شبیر احمد قادری ص ۴۷۴)

ابتداءً یہ میں بیان کردہ آپ کے ان خیالات کی بصد مسرت توشیح کرتا ہوں:

”یہ سفر جو صرف عقیدت اور محبت کی ایک کیفیت میں شروع کیا گیا تھا، آج معنویت کی کئی منزلوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے جاری و ساری ہے۔۔۔۔۔“ ’نعت رنگ‘ اسی محبت اور معنویت کے سفر کا ایک تاب ناک رخ ہے۔“

”نعت رنگ“ کی طبعی عمر ابھی خاصی کم ہے، مگر معنوی زندگی کے اعتبار سے اس کے خط و خال سے بزرگی جھلکنے لگی ہے۔ ایک نہایت قلیل مدّت میں کسی ادبی جریدے کے مقام اعتبار پر فائز ہو جانا خواہش کی حد تک تو ممکن ہے، لیکن عملی صورت میں حد امکان سے بعید ہے۔

”نعت رنگ“ نے مختصر سے عرصے میں مدارج اعتبار و وقار طے کر کے ادبی جراند و مسائل کی ایک نئی توانائی سے روشناس کرایا ہے۔ بالخصوص نعتیہ ادب کے حوالے سے اس نے جو باب تھیر کھولا ہے، اس کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کتابی سلسلہ تائید ایزدی کی ایک روشن مثال

ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ اپنے محبوب کی مدح و ثنا کی توفیق صرف ایسے انسانوں کو عطا کرتا ہے، جو حبیبِ خدا کی ذات و صفات کا عرفان رکھتے ہوں۔ یہ منصب ہر کہ و مکہ کو نصیب نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی مدّاح رسول ﷺ ہونے کا دعویٰ کسی کو زیب دیتا ہے۔ غالب ایسا فدائے محمد ﷺ و آل محمد ﷺ علیہم السلام بھی اپنی تمام تر ذہانت، طباعی اور شعری فراست کے باوصف معرفت ختم الرسول ﷺ کا مدعی نہ ہوا۔ (قیصر نجفی ص ۷۵)

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم

کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

”نعت رنگ“ کا پہلا ہی شمارہ دیکھ کر طبیعت پھڑک اٹھی تھی اور آپ حضرات کے لیے بے اختیار دعائیں نکلی تھیں۔ بلاشبہ ظاہری و باطنی حسن سے آراستہ دستاویزی رسالہ آپ نکال رہے ہیں۔ اس شمارے کے تینوں حصے تحقیق نعت، تنقید نعت اور نعتیہ مجموعوں پر تبصرہ، وقیع و رفیع ہے اور وسیع مسائل و مباحث پر محیط ہے۔ اردو نعت کی باضابطہ تحقیق و تدوین کا کام تو گزشتہ دو تین دہائیوں سے جاری ہے اور اس موضوع پر بعض معرکہ کی چیزیں سامنے آ گئی ہیں، مگر تنقید نعت کا کوئی کام ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا، گویا آپ نے مطالعہ نعت کی ایک نئی طرح ڈالی ہے جو بے حد مفید و مستحسن ہے مگر اسے تنقید نعت کے بجائے نعت کا شرعی محاسبہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ آج اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ اردو نعت کا مطالعہ اسلامی فکر اور شریعت محمدی ﷺ کی روشنی میں کیا جائے اس لیے کہ نعت گوئی ایک مشکل اور نازک فن ہے، ذرا سی لغزش شاعر کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتی ہے، عقیدہ و ایمان اور عشق و محبت کی ہم آہنگی اور خلوص و وابستگی کے بغیر کوئی شاعر نعت کا ایک شعر نہیں کہہ سکتا اور نہ اس کے کلام میں تاثیر ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ عرفی جیسا خود پسند اور متکبر شاعر بھی جب اس میدان میں آتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے، اس کے نزدیک نعت کہنا تلوار کی دھار پر چلنا ہے:

عرفی مشابِ این رہ نعت است نہ صحرا است

آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

جدید ادب کی فکری بے راہ روی اور فنی بے اعتدالیوں کے درمیان نعت کی مقبولیت اور اس کی بے پناہ وسعت نہایت خوش کن جزیرہ ہے اور یہ عصری ادب کا ایک خوش آئند اور مستحسن پہلو ہے جو ادب و زندگی دونوں کی خیر و فلاح کا ضامن ہے۔ ارض پاک میں تو اب یہ ادبی رجحان ایک عوامی

تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ان حالات میں محتاط رویہ کی اب اور زیادہ ضرورت ہے۔ آپ قابل مبارک باد ہیں کہ دنیائے نعت میں اس جہت سے آپ نے پہلی آواز اٹھائی اور نعت میں احتیاط کے تقاضوں کو سامنے لایا۔ عاصی کرنا، رشید وارثی، اور عزیز احسن کے مقالات، ممنوعاتِ نعت، نعت نگاری میں ذم کے پہلو اور نعت نبی ۷ میں زبان و بیان کی بے احتیاطیاں۔ دراصل اردو نعت کا بہترین شرعی محاسبہ ہیں۔ اُمید ہے کہ اس سلسلے کو آپ مزید آگے بڑھائیں گے اور نئی نئی تحقیقی کاوشوں کو پیش کرتے رہیں گے۔ (شاہ رشاد عثمانی ص ۳۴۶)

نعت پر تنقید کا مطلب دراصل نعت کے فن کا علمی اور ادبی محاکمہ ہے۔ یہ بات ”نعت رنگ“ کے وسیلے سے مجھ تک پہنچی ہے۔ ورنہ شروع شروع میں ”نعت پر تنقید“ کا جملہ سن کر دل ڈر جاتا تھا کہ کہیں یہ سوائے ادب نہ ہو۔ رفتہ رفتہ ”نعت رنگ“ کے شماروں سے خیال کی یہ دھند چھٹ گئی اور ادب تو نعت نگاری کے فنی، لسانی اور ادبی اصول بہت ہی واضح ہو کر ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ یہ کام محمد حسن عسکری سے شروع ہوا، ابوالخیر کشفی کی تحریروں میں اس کا احیاء ہوا اور پھر نعت رنگ نے اسے نعت کے مکمل تنقیدی دبستان میں تبدیل کر دیا۔ آپ اور آپ کے رفقا کی کوششوں سے نعت پر تنقید ایک علاحدہ اور مخصوص مکتب فکر کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سرکارِ دو عالم ۷ کی نگاہِ رحمت ہی سے آپ کو یہ توفیق ملی ہے، کہ آپ پاکستان میں نعتیہ ادب کے فروغ اور اس کے تنقیدی دبستان کی تشکیل کا تاریخی کام انجام دے سکے۔ (فراست رضوی ص ۹۰۳/۲۵)

مقامِ اطمینان ہے کہ ”نعت رنگ“ سے وابستہ اہل قلم نے اس صنف کو ایک اعلیٰ ادبی معیار کی حامل صنف کے طور پر متعارف کروانے کی کوشش کی ہے یہاں میں متعارف کو لغوی مفہوم کی بجائے تلازماتی حوالوں میں لے رہا ہوں مقدار کے علاوہ معیار سازی کے لئے کوشاں ذہنوں نے اردو شعریات کے ساتھ اردو تنقیدات میں بھی اس صنف کو ایک عالمانہ جہت سے روشناس کیا یہ روشناسی اور تعارف گزشتہ دہائیوں میں اتنا جاندار اور شاندار نہیں تھا جتنا نعت رنگ کی سعیِ جمیلہ سے ہوا (جان دار اور شان دار کے الفاظ کثرت استعمال سے اپنی وہ تازگی کھو چکے ہیں جو ان الفاظ کے آغاز میں آج سے کئی صدیاں پہلے شامل تھی) میں قارئین کی توجہ پھر ان الفاظ سے وابستہ مفہیم کی قدیم تازگی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں ”نعت رنگ“ کی تنقیدی جہت نے اس صنف کے نہ صرف آفاق وسیع کئے بلکہ اس صنف کو معیار آشنا بھی کیا۔

جرائد کا تسلسل کئی حوالوں سے ادبی میلانات کو ایک واضح رخ دیتا ہے اردو رسائل میں نقوش، اوراق، فنون، سیپ ایک طرح کے ادب (افسانہ، نظم، غزل وغیرہ) کی اشاعت کے باوجود میلانات اور پیشکش میں ایک دوسرے سے ذرا مختلف رہے ہیں دراصل رسائل کا وقت کے ساتھ ایک اپنا مزاج بن جاتا ہے ”نعت رنگ“ کا تنقیدی حصہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ جس طرح معیار آشنا اور توازن رُو ہوا ہے یہ نعت۔۔۔ خصوصاً تنقیداتِ نعت کے لحاظ سے خاص انفرادیت کا حامل ہے اسے نہ صرف بحال رکھنے بلکہ علمی و تحقیقی انداز سے اور زیادہ متوازن رکھنے کی ضرورت ہے۔ (ڈاکٹر ریاض مجید ص ۸۷۳/۲۵)

اب ”نعت رنگ“ کی نیرنگیاں بیان سے باہر ہیں۔ موضوعات کے شمار کی دشواری، وسعتوں کی پیمائش ناممکن، جدت ترازیاں حیرت انگیز، اسکا لرز کے لیے تحقیق کے بے شمار موضوعات، تحقیق کے مآخذ اپنے چاہنے والوں کے صبح و شام منتظر۔۔۔۔۔ ملک کی حالت کچھ بھی ہو! وہ ترقی کرنے نہ کرے ”نعت رنگ“ نے نعت بندی میں اور اس کے حوالے سے دینی مسائل میں جو عظیم الشان تحریک پیدا کر دی ہے اس جیسا رنگ و روپ صدیوں پہلے تک نظر نہیں آتا میں اس کامیابی اور جدت طرازی کے لیے کہ صرف آپ ہی کو اس وجہ سے پہلے مبارک باد دینا نہیں چاہتا کہ آپ ”نعت رنگ“ کے مرتب ہیں بلکہ آپ کے معاونین، مجلس مشاورت کے اراکین اور نعت رنگ کے اہل قلم جو کسی پہلو سے بھی نعت کے فن اس کے تعلقات یا کسی اور پہلو سے سوسو صفحہ کا مضمون لکھیں یا کسی نے ایک صفحہ کا خط لکھا ہو چوں کہ علم و تحقیق یا دین و ادب اور ہیکل نعت کی تعمیر میں سب کا حصہ ثابت ہے اس لیے میں عزیزی آپ کے ساتھ ان تمام حضرات کو بھی مبارک باد کا پہلے مستحق قرار دیتا ہوں میرے نزدیک ”نعت رنگ“ کے صفحات میں جس نے بھی کم و بیش جگہ پائی ہے وہ قابلِ فخر ہے۔

یہ بھی اللہ کا فیضان ہے اس نے نعت رنگ کی برکات اور اس کے کاغذ، کتابت اور کمپوزنگ اور اس کی سجاوٹ کی رنگینیاں صرف اسی حد تک محدود نہیں رہی، بلکہ مطالعہ نعت کے عشق، اس کی زبان کی لطافت، اس کے اسلوب کے کمال حسن اور پیش کش کی دل ربائی کو قدرت نے چاند اور تاروں سے مزین زمین پر علم و فن کی ایک نئی دنیا آباد کر دی ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ پچھلے چند برسوں میں نعت کو جو اردو شاعری کی صنف سمجھی جاتی تھی ایک مستقل فلسفہ اور علم و فن تسلیم کر لیا گیا۔ (ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری ص ۸۷۷/۲۵)

چونکہ خاتم النبیین، شفیع المذنبین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ساری امت مسلمہ کے لیے ایک مرکز اتحاد یکجہتی ہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی نقطہ پرکار کائنات ہے، اگر آپ نہ ہوتے تو کائنات کا یہ دائرہ کبھی وجود میں نہ آتا۔ خاتم بدہن کون مسلمان ہے جو ختمی مرتبت رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی نہ مانتا ہو اور روز حشر سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت پر یقین نہ رکھتا ہو۔ ہر مسلمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اللہ اور قرآن مجید سے آشنا ہوا۔ سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات نقطہ وحدت امت ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ”نعت رنگ“ کا ہر شمارہ نعت شناسی کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ منافقوں کے خلاف اور اتحاد اسلامی کے لیے بھی خدمات انجام دے رہا ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ ”نعت رنگ“ اپنی تحریروں کے ذریعے سے نعت نگاری اور نعت شناسی کے جو علمی و ادبی معیارات قائم کر رہا ہے، ان معیارات کو برتے اور برقرار رکھنے کے لیے تفسیر قرآن، علم حدیث، کتب سیر، تصوف، تاریخ اسلام، صرف نحو، عروض، ادبیات عالم اور لسانیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ گویا بلا واسطہ نعتیہ ادب کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم کے فروغ و ترویج کا کام بھی ”نعت رنگ“ کے توسط سے ہو رہا ہے۔

میرے نزدیک ”نعت رنگ“ نعت کے موضوع پر فقط ایک رسالہ ہی نہیں یہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریر ہے۔ یہ ذکر مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک انجمن ہے۔ یہ اردو میں صنف نعت کے ادبی اصولوں کو علمی اور تنقیدی بنیادوں پر مرتب کرنے کی ایک خوبصورت کاوش ہے۔ نعت رنگ سارے مسلمانوں کو محبت سرکار و عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آفاقی مرکز پر جمع رکھنے کی ایک مخلصانہ سعی ہے۔ یہ جریدہ ہمیں سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سنہری اصول یاد دلاتا ہے اور ان پر چلنے کے ہمارے ارادے کو تقویت دیتا ہے۔

یہ جریدہ ہمیں نئی نئی علمی، ادبی اور اسلامی علوم کی کتابوں کے مطالعے پر مائل کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ نعت رنگ نے کم وقت میں نعت کی تاریخ، تنقید اور تحقیق پر کام کرنے والے منفرد اہل قلم کا اپنا ایک حلقہ پیدا کر لیا ہے۔ یہ جریدہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر اطہر سے مہکتا ایک چمن ہے جس میں تحسین و توصیف کے رنگ برنگ پھول مہک رہے ہیں۔ (فراست رضوی ص ۲۵، ۹۰۴-۹۰۳)

’نعت رنگ‘، چند تجاویز:

’نعت رنگ‘ عصر حاضر کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ اس کا نہج قابل تحسین ہے۔ میرے خیال میں دو، تین مزید شماروں میں نئی جہتوں کی تلاش لازم ہو جائے گی۔ کیوں نہ ابھی سے اس کی داغ بیل ڈالی جائے اور ”نعت رنگ“ کے scope کو وسیع کیا جائے۔ اچھا ہوا اگر آپ پاکستان میں مروج زبانوں سے اس صنف کی نمائندہ تخلیقات حاصل کر کے ان کے اردو تراجم شائع کریں۔ اس کے علاوہ مشرقی اور مغربی زبانوں کی نمائندہ تخلیقات کو بھی شامل کریں۔ دوسرے اس امر کی کوشش بھی کریں کہ سابق میں جن شعرا نے نعت گوئی کے معیاری نمونے تخلیق کیے لیکن وہ اب گوشہ گم نامی میں ہیں انھیں متعارف کروایا جائے۔ اگر آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے ان امور کی جانب توجہ کی تو مستقل میں ”نعت رنگ“ ”نعت انسائیکلو پیڈیا“ بن جائے۔

(شفقت رضوی ص ۸، ۴۷-۴۷)

جہاں ”نعت رنگ“ کا کام کر رہے ہو وہاں کسی سے نعت کی کتابیات مرتب کرواؤ۔ اردو میں نعتیہ مجموعے کتنے چھپے ہیں، کتنے مجموعوں میں نعتیں شامل ہیں۔ اچھی ضخیم کتابیات مرتب ہو سکتی ہے۔ مقتدرہ، مرتب کو معاوضہ دے کر اسے چھاپتا ہے۔ (شفقت رضوی ص ۸۳، ۴۸)

ص ۲۷ پر پروفیسر مظفر عالم جاوید صدیقی کا یہ کہنا درست نہیں کہ ”مولانا کفایت علی کافی اور کئی دیگر میلاد نگاروں نے اس کی تقلید میں سلام لکھے ہیں۔ کافی کے سلام میں بھی مولانا احمد رضا کے سلام کا رنگ شاعری جھلکتا ہے۔“ کافی تو سلام رضا کے وجود میں آنے سے بہت پہلے آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ ہاں یہ کہنا درست ہے ”مولانا احمد رضا خاں کا سلام فکری و فنی لحاظ سے زیادہ مؤثر ہے۔“ ص ۵۵ پر جگہ جگہ نبی کریم ﷺ کے نام اقدس کے ساتھ ”ص“ کا لفظ دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ مکمل درود شریف لکھ کر حدیث میں بیان کردہ فضیلت حاصل کرنی چاہیے۔ یہ حدیث پاک امام سخاوی نے ”القول البدیع“ کے ص ۶۰ پر نقل کی ہے، ”جس نے کتاب میں مجھ پر درود پاک لکھا تو جب تک میرا نام مبارک اُس میں رہے گا فرشتے اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے رہیں گے۔“

ص ۵۵ پر جناب عرش ہاشمی کے ان اشعار نے ایمان تازہ کر دیا:

”بے گانہ سنتوں سے جو ہے وہ میرا نہیں“

کیوں اس حدیث پاک سے صرف نظر کریں

کس طرح زندہ ہوں میرے آقا کی سنتیں

اس دُھن میں اپنی شام اسی میں سحر کریں

نعت گو شعرا سے التماس ہے کہ وہ ان موضوعات پر بھی خامہ فرسائی فرمائیں۔ (حافظ

محمد عطاء الرحمن قادری رضوی ص، ۶۹۵)

راجا صاحب نے جس ذاتِ گرامی کی مداحی کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے، اس ذاتِ اقدس کے صبر و تحمل کی مثال پوری تاریخِ انسانی میں نہیں ملتی، اس ذات والا صفات کا ہر قدم اربابِ بصیرت کے لیے راہِ نما و چشمِ نشا ہے۔ میرے خیال میں ادب کو خصوصاً نعتیہ ادب کو لسانی اور گروہی تعصبات سے ملوث نہ کیا جائے اور غلط فہمی کی بنا پر الزام تراشی سے گریز کیا جائے تو یہ خود صاحبِ تحریر کے لیے بہتر ہوگا۔ (قمر عینی ص، ۷۴۰)

”نعت رنگ“ شمارہ اول کے مطالعہ کے بعد ضروری لگا ہے کہ نعت میں تحقیق، تدوین، تنقید اور تخلیق کا کام کرنے والے صاحبِ نظر لوگوں کو یک جا کر کے ”مسائلِ نعت“ پر کوئی سمپوزیم ہو اور اُس کی کارروائی ”نعت رنگ“ کے کسی شمارے کا حصہ بنے۔ سمپوزیم کا ایجنڈا طے کر کے مختلف مسائل پر ناقدین سے اشاراتی بلکہ کلیدی مضامین لکھوائے جائیں اور اُن پر بحث کے بعد کچھ نتائج مرتب ہوں۔ اس منصوبے پر اپنے رفقاء کار اور دوسرے اسکالرز سے مشوروں کے بعد، اگر تجویز اچھی لگے تو اسے عملی جامہ پہنانے کی اپنی سی کرنا چاہیے۔ (حفیظ تائب ص، ۲۸۲)

بات درحقیقت یہ ہے کہ ہر شعر کہنے والا نعت نہیں کہہ سکتا ہے۔ اس کے لیے شعری سلیقہ، رسول اللہ ﷺ سے عشق، رسالت کے تقدس سے آگہی، مقامِ رسالت کا شعور اور لفظوں کو موتیوں کی طرح شعری مالا کاروپ دینا آنا ضروری ہے کہ کوئی لفظ مقامِ رسالت کے منافی نہ ہو اور کوئی شعر تقدسِ رسالت کے خلاف نہ ہو کہ کوئی لفظ مقامِ رسالت کے منافی نہ ہو اور کوئی شعر تقدسِ رسالت کے خلاف نہ ہو اور یہ سب اُس وقت آتا ہے جب وہ ایک تہذیبی روایت، ماحولِ فضاے ربانی سے گزر رہا ہو جس کی برتر مثال حضور ﷺ کے دور کی مدنی زندگی ہے کہ حضور ﷺ کا ہر صحابی حضور ﷺ کے عشق سے سرشار نظر آتا ہے۔ (سلیم یزدانی ص، ۴۴۱)

میری گزارش ہے کہ مستند و مقبول اور مشہور اولیاء اللہ عارفین کا ملین کے اقوال و افعال

اور احوال و اسرار پر تنقید یا تبصرہ کر کے عوام الناس سے داد و تحسین وصول کرنے کے بجائے ایسے مضامین سے ”نعت رنگ“ کو مزین کیا جائے۔ جنہیں پڑھ کر اولیاء اللہ کے عقائد و نظریات سے متنفر ہونے کے بجائے اُن سے عقیدت و محبت کے جذبات پروان چڑھیں۔ وہ علوم و معارف جنہیں اکابر اولیاء اللہ نے اسرارِ الہی کے زمرے میں رکھا ہے اور جن کے افشا کرنے کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری میں ”قطع هذا لبلعوم“ (یہ گلا کاٹ دیا جائے) یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت میں ”کلم الناس علی قدر عقولہم اتریدون ان یکذب اللہ و رسولہ“ (لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کرو، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے) کے الفاظ وارد ہیں انہیں عامیانا انداز میں عوام الناس تک نہ پہنچایا جائے تاکہ وہ انہیں غلط سمجھ کر گم راہ نہ ہوں یا ان کی تکفیر کر کے خود موجب عذاب نہ ہوں۔ قدیم کتب فقہ میں بعض مسائل کے بارے میں ظاہری علم شریعت کے باوجود یوں ممانعت ہے کہ ”یہ مسئلہ جاننے کا ہے بتانے کا نہیں ہے۔ (ناصر الدین صدیقی ص، ۸۶۸)

نعت گوئی کے ضمن میں، ایک بات کہنا چاہوں گا کہ نعتیں تو بہت سے شاعر لکھ رہے ہیں مگر یہاں بھی معیار کا مسئلہ رہتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ ”نعت رنگ“ میں، نعت کا معیار ذرا سخت کیا جائے بھلے کم نعتیں چھاپیں مگر وہ عمدہ ہونی چاہئیں۔ شاعری کی جو صورت حال آج کل سامنے ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مشق کے سہارے یہ کام زوروں پر ہے۔ بہت سی نعتیں مشق کے سہارے کہی جا رہی ہیں یعنی ان کے اندر ادبی حسن کم کم ملتا ہے۔ ”نعت رنگ“ میں اس پہلو پر بھی توجہ دیں۔ ٹھیک ہے سارے شاعر تائب، مظفر وارثی، سلیم کوثر، نسیم سحر یا تمھاری طرح جیسے ٹیلنٹڈ (Talented) نہیں ہو سکتے مگر اس سے تو انکار کوئی نہیں کر سکتا کہ ہر ایک کے پاس ٹیلنٹ کا کچھ حصہ ضرور ہوتا ہے اور یہ کلام میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جب تک نعت میں نظر نہ آئے ”نعت رنگ“ میں اسے جگہ نہ دی جائے۔ ضرورت quantity کی نہیں quality کی ہے۔ (احمد صغیر صدیقی ص، ۶۴)

”نعت رنگ“ کے آئندہ شماروں کے لئے چند تجاویز ہیں (ان سے آپ کا یا قارئین نعت کا متفق ہونا ضروری نہیں)

۱۔ سرورق سے شروع کرتے ہیں سہ ماہی ”آج“ نے سادگی کے ساتھ رسائل کے جرائد کو ایک تازہ جہت سے روشناس کیا ہے اس کے شمارے شال اور لاہریری میں بڑے ہوئے دُور سے

پہچانے جاتے ہیں ہر نئے شمارے پر رنگ کے فرق اور شمارہ کے نمبر سے ”آج“ کے الگ الگ پرچوں کی شناخت ہو جاتی ہے۔ نعت رنگ کے سرورق کو بھی ایک مخصوص شکل دی جاسکتی ہے۔ ہر شمارہ پر نعتیہ خطاطی کے نمونے بھی دیئے جاسکتے ہیں اسلام آباد سے چھپنے والے رسالے پیغام آشنا کی طرح --- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ بھی دیئے جاسکتے ہیں۔ صوفی برکت کی مرتب کردہ کتاب ”اسمائے نبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم“ میں اسماء مبارکہ کی خطاطی حافظ یوسف سدید مرحوم نے کی ہے میں نے اپنی نعتیہ کتابوں سیدنا احمد ”سیدنا محمد“، سیدنا الرجم، سیدنا الکریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سرورق کی خطاطی اسی کتاب سے لی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ کتابوں کے عنوانات اور خطاطی بھی حافظ یوسف سدید مرحوم سے (بہ جذبہ تشکر و دعا) اخذ کرنے کا آرزو مند ہوں۔ --- نعت رنگ کے سرورق پر مستقلاً ایک خاص ساز کے بکس میں اس مبارک خطاطی سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ --- حرمین شریف کی تاریخی تصاویر وغیرہ بدل بدل کر آتی رہیں اور باقی تمام سرورق ریورس میں ایک جیسے پس منظر (”آج“ وغیرہ کی طرح) کے ساتھ ہر بار مختلف رنگ میں آتارہے پڑتے پر شمارہ وار نمبر کے اندراج کے ساتھ۔۔۔ (غلام رسول عظیم ص، ۸۷/۲۵)

۲۔ نو تصنیف --- کے عنوان سے غزل کے علاوہ نعتیہ قصائد اور مثنویات یا دوسری صنف سخن کی اشاعت کی طرح ڈالی جائے یہ حصہ تین چار صفحہ پر مشتمل کسی بھی صنف میں نو تصنیف نعت پارہ پر مشتمل ہو اس طرح غیر محسوس طور پر ایک دوسالوں میں نعت کے باب میں پُر شکوہ اور محاسن شعری کی حامل اصناف (عام غزلیہ نعتوں کے علاوہ) تخلیق ہوں گی اور ان کی جمع آوری ہو سکے گی۔

۳۔ اس نعت میں --- جیسے کسی عنوان سے بعض نعتوں کے فکری و فنی تجزیاتی مطالعے کی گنجائش پیدا کی جائے۔ نئی اور آزاد نظم کے تعارف کے لئے بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں کئی رسائل نے نظموں کے تجزیاتی مطالعے شروع کئے تھے ایک ایک نظم پر تین تین چار چار اہل قلم کی آرا کو اس نظم کے ساتھ شائع کیا جاتا اس سے نظم کے کئی بے پہلو سامنے آتے۔ میراجی کی کتاب اس نظم میں ایسے ہی جائزوں پر مشتمل ہے بعد میں مولانا صلاح الدین کے زیر اہتمام نکلنے والے جریدے ”ادبی دنیا“ لاہور میں بھی ایسے جائزے شامل ہوتے رہے۔۔۔ بعض بلیغ مفاہیم کی حامل نعتوں پر ایسے جائزوں سے تنقیدات نعت کی نئی جہتیں سامنے آئیں گی۔

۴۔ توضیحی مطالعات --- کسی خاص شاعر کی آٹھ آٹھ دس دس نعتیں مختصر تعارف اور تنقیدی کلمات کے ساتھ شائع کرنے کے لئے آنے والے شماروں میں ایک خاص گوشہ وقف کیا جاسکتا

ہے۔ (مختلف شاعروں کی ایک ایک نعت کے علاوہ) ایسے گوشوں کی اشاعت سے کسی شاعر کی تخلیقی مساعی کا ایک بھرپور تاثر سامنے آئے گا اور یوں زیر مطالعہ شاعر کے فکرو فن کے کئی رخ بیک نظر سامنے آئیں گے۔ میری نظر میں نعت رنگ کا اب تک سب سے توجہ طلب حصہ نعتیہ شاعری سے تعلق رکھتا ہے اس حصہ پر مزید محنت کی ضرورت ہے۔ فکرو فن میں بلاغت نادرہ کاری، ہیئت، لفظیات اور طرزِ زاد کی تازگی کے پیش نظر اس حصہ کو مقدارِ سامان کی بجائے معیار آشنا کرنے اور رکھنے کی ضرورت ہے۔

۵۔ تدوین کا پہلو نظر انداز ہو رہا ہے ۱۸۴۰ء سے ۱۹۴۰ء تک سینکڑوں نعتیہ گلدستے نامے کی مناسبت سے نظمیں (میلادنا، وفات نامے، معجزات نامے، معراج نامے، پیغمبر نامے، جنگ نامے وغیرہ) شائع ہوئیں بیس چوبیس صفحات سے لے کر اسی، سو صفحات تک یہ نعتیہ سرمایہ فراموش ہو رہا ہے اگر نعت رنگ میں ہر بار ایک کاپی سولہ صفحات تدوین نعت کے ذیل میں محفوظ کئے جائیں تو ایسے مختصر نعتیہ کتابچوں کے تعارف کا سلسلہ شروع کیا جاسکتا ہے۔ (ڈاکٹر ریاض مجید ص، ۸۷/۲۵)

۶۔ ’نعت رنگ‘ کے ذمے ’نعت نما‘ کے عنوان سے اب تک کے شائع شدہ نعتیہ اثاثے کی سائنٹیفک بنیادوں پر مبسوط اشاریہ کتب کی تدوین ہے اس کے لئے الگ مضمون درکار ہے۔ جس میں اس کے لئے رہنما اصول اور ضروری تجاویز کی تفصیلات دی جائیں۔۔۔۔۔ سو یہ کام پھر سہی۔ (ڈاکٹر ریاض مجید ص، ۸۷/۲۵)

۷۔ میرے خیال میں ”نعت رنگ“ جیسے پرچے میں اس قدر فرقہ واریت کو فروغ نہیں ملنا چاہیے۔ ”نعت“ تو محبت کی بہترین تبلیغ اور زمزمہ محبت کا خوش ترین ترانہ ہے۔

لہذا جس نے بھی نعت کہی ہے، یقین کرنا چاہیے کہ اس نے حضور سے ٹوٹ کر پیار کیا ہے۔ ان سے وابستگی کا حق ادا کیا ہے۔ میرا یقین ہے کہ جس مسلک کے آدمی نے بھی نعت کہی ہے وہ حضور کی ختم المرسلین کو بے مثال اور ان کی رحمۃ للعالمین کو بے نظیر سمجھتا ہے۔ ظفر علی خان، محمد علی جوہر اور سید نفیس الحسن شاہ، حضرت کوکب نورانی کے ہم مسلک تو نہیں لیکن ان کی نعتیں اس قدر عشق رسول (۷) میں ڈوبی ہوئی ہیں کہ انھیں پڑھ کے حضور سے وابستگی اور والہانہ پن زیادہ اجاگر اور دل نشین ہونے لگتا ہے۔ لہذا نعت کے حوالے سے اس قدر کرخت فقہی بحثیں شاید سودمند نہ ہوں۔“

(سید ریاض زیدی ص، ۳/۳۴۶)

مدیر نعت رنگ: معاصرین کی نظر میں

ڈاکٹر جمیل جالبی:

آپ نے جس سلیقے اور عمدگی سے ’نعت رنگ‘ مرتب و شائع کیا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ معیار اور حسن طباعت کے اعتبار سے بھی ایسا کوئی دوسرا سالہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ آپ نے نعت گو شعرا کے اندازِ نظر کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا ہے وہ بھی یقیناً قابل تعریف ہے۔ شرک ہر صورت میں روحِ اسلام کے منافی ہے۔ رسالے کے معیار اور طباعت کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ آپ کا رسالہ نہ صرف کامیابی سے ہم کنار ہوگا بلکہ بہت مقبول بھی ہوگا۔ جادہ و رحمت کی شاعری بھی دل پذیر اور پراثر ہے۔ آپ کے اندر شعر گوئی کی بہت اچھی صلاحیت ہے۔ (نعت نامے ص ۲۶۸-۲۶۷)

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو:

صرف نعت گوئی کے موضوع پر اتنے ضخیم نمبر نکالنا اور مفید اور قیمتی مضامین شائع کرنا آسان کام نہیں۔ آپ نے بڑی ہمت کی۔ (نعت نامے ص ۷۹۵)

کالی داس گپتا رضا:

مجھے ’نعت رنگ‘ کے چار شمارے موصول ہو چکے ہیں، مگر ان میں سے ایک نسخہ بھی میرے پاس نہیں رہا۔ اس کے شائقین اتنے ہیں کہ دیکھتے ہی اٹھالے جاتے ہیں۔ میں بھی ان کا ہاتھ نہیں روکتا۔ اسے کارِ ثواب سمجھتا ہوں اور شمارے بھی نکل چکے ہوں گے۔ پرچہ اتنا خوب صورت اور مبارک ہے کہ حدِ بیاں سے باہر۔ آپ اس کے باطنی اور خارجی حسن کا بہت دھیان رکھتے ہیں۔ اس نیک کام کا اجرا آپ کو ضرور ملے گا۔

’نعت رنگ‘ کتاب نمبر ۴ ملی۔ ’نعت رنگ‘ جس شان سے نکالا ہے وہ جناب آپ اور آپ کے رفقاء کا رہی کا حصہ ہے۔ جو کچھ بھی رسولِ عالی مقام کے تعلق سے لکھا جائے گا وہ محترم تو ہو ہی جائے گا۔ ان معنوں میں ’نعت رنگ‘ احترام سے پڑھی جانے والی کتاب ہو گی۔ (نعت نامے ص ۷۶۶، ’نعت رنگ‘ شمارہ نمبر ۵، ص ۳۶۱)

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری:

’نعت رنگ‘ اور آپ کے سفر کو دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ میں آپ کی ابتدائی زندگی سے واقف نہیں کہ قلم اٹھاؤں تو آپ کی شخصیت کے ذکر کے چھیڑتے ہی بول اٹھوں کہ ’’ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات‘‘، لیکن اگر ایسا نہ کروں تب بھی آپ کی موجودہ زندگی کا رکھ رکھاؤ بول اٹھتا ہے کہ آپ کے ذوق و مزاج کا علم کیا ہے؟ آپ کا شوق و مطالعہ ادب و فنون لطیفہ سے دل چسپی شعر کہنے اور پڑھنے کے اسلوب سے بروا کی ہونہاری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے اگر دس پندرہ سال پہلے کی اٹھان نہ دیکھی تھی تو اس کا غم نہ تھا میں اسی قریبی مدت سے آپ کی زندگی کے انداز کو دیکھ کر رہا ہوں اور اسی دیدہ و مطالعے نے میرے دل میں ایک ایسا آئینہ بنا دیا ہے جس میں آپ کے گزشتہ دور کے تمام حسن و زیبائش کے ساتھ آپ کی تمام باتیں اور نظارے دل کے آئینے میں دیکھ سکتا ہوں۔ زمانہ طالب علمی ہی میں آپ کی شاعری شہرت ہو چکی تھی خواہ کسی بڑے حلقے میں نہ سہی مگر آپ کے سامعین اور شائقین کا ایک حلقہ ضرور پیدا ہو گیا تھا لیکن نعت خوانی کی مجالس کے تعلق سے آپ کے حسن بیان کی خوشبود و دور تک پہنچ چکی تھی۔

اسی زمانے میں آپ نے خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور تذکار مقدسہ کے مقصد سے ایک مجلہ علمی و دینی ’’نعت رنگ‘‘ کے اجرا کا فیصلہ کیا اگرچہ یہ کام نہ اس وقت آسان تھا اور نہ آج کے بہت ترقی یافتہ دور میں یہ کام آسان ہے میرا اشارہ مجلے کے کاغذی مجموعے کی اشاعت نہیں بلکہ علمی و دینی پہلو سے اس کی جامعیت، تحقیق کے معیار زبان و بیان کی لطافت اور پیش کش حسن کی رنگینوں اور دل آویزوں کی طرف تھا اور سچ یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ آپ اس مقام کو کبھی حاصل نہ کر سکیں گے لیکن آج میں شرمندہ ہوں، میں بھول گیا تھا کہ:

لیس الانسان الاماسعی (النجم ۵۳-۳۹)

انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

عزیز محترم آپ نے جس چیز کی آرزو کی تھی خدا سے جس چیز کو مانگا تھا اور پھر اس کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے پورا کر دیا۔ آپ نے اپنی سعی و عمل سے خدا کو راضی کر لیا اور آپ کو کامیابی نصیب ہوئی اور میں اپنے تصورات میں کھویا اور خیالات میں ڈوبا رہا اور شرمندگی سے دوچار ہوا۔ (نعت رنگ ص ۸۷۶، ۲۵)

ڈاکٹر معین الدین عقیل:

’نعت رنگ‘ کا آغاز..... سامنے کی بات ہے، پھر ساتھ ساتھ دیگر متعلقہ مطبوعات بھی نظر سے گزرتی رہی ہیں لیکن اب جو ’نعت رنگ‘ کو دیکھتا ہوں تو حیرت و مسرت کا احساس ہوتا ہے کہ آپ نے صرف اپنے رسالے ہی کو نہیں، اس کے وسیلے سے اپنے سلیقے و محنت اور ترقی و اہتمام سے خود نعت کو اب کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں، یاد کرتا ہوں کہ دو تین دہائیوں قبل تک نعت کو اس حسن اور دل نشینی کے ساتھ کوئی کہاں پیش کرتا تھا۔ بطور صنف، بڑی سست روی سے جیسے جیسے یہ ارتقا پزیر تھی، لیکن آپ نے ’نعت رنگ‘ کو کس قدر تیز تر، وسیع تر اور جاذبیت و قبولیت عام سے اسے ہم کنار کر دیا ہے! اب یہ تو ایک مستقل صنفِ سخن اس طرح بن گئی ہے کہ اس نے محض تخلیق کی حدود میں اپنے آپ کو اب قید نہیں رکھا ہے۔ تجزیہ و تنقید، بلکہ تحقیق کے وسیلے سے متعدد نئے آفاق اس نے تلاش کر لیے ہیں اور ہمارے ادب کی مستقل اصناف کی طرح اور دامنِ دل می کشد کی جاساں جاست کے مصداق، جذبہ و عقیدت کی نئی جہات کو تخلیقی وسعت، گہرائی، چٹنگی اور رنگینی عطا کر رہی ہے۔ یہ مبالغہ نہیں، کہ یہ سب آپ کی تنہا محنت اور جاں فشانی اور سلیقہ و حسن کاری کے باعث ممکن ہوا ہے۔

دراصل رسالہ یا مجلہ نکالنا ایک عمومی دل چسپی کا عمل بھی ہے لیکن جو اپنے موضوع یا موضوعات میں اضافے، اس کے وقار کی بلندی اور اپنے موضوع کی روایت کو فروغ دینے کے باعث بنے، ایسا مجلہ ہی تاریخ میں یادگار رہتا ہے اور اپنی جگہ فرض کفایہ ادا کرتا ہے۔ آپ نے ’نعت‘ کے زمرے میں ایسی مثال قائم کر دی ہے جو یقین ہے کہ آپ کی ایسی ہی محنت و لگن اور کوشش و جستجو سے مزید فروغ پائے گی اور آئندہ اس نوعیت کے رسائل کے لیے ایک نمونے اور معیار کا کام دے گی۔ (نعت نامے ص ۸۲۲، ۸۲۷)

پروفیسر سحر انصاری:

۱۔ ”نعت رنگ“ کا سلور جوبلی نمبر اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔ سب سے پہلے تو اس قدر خیم اور مفرد شمارہ ترتیب دینے پر دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ ”نعت رنگ“ کا کوئی تازہ شمارہ جب بھی نظر نواز ہوتا ہے تو مجھے بھائی حنیف اسعدی مرحوم کی قیام گاہ پر ہونے والی وہ ابتدائی صحبتیں یاد آ جاتی ہیں جن میں اس مجلے یا کتابی سلسلے کی اشاعت کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کیا

- جاتا تھا۔ میں آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ چند نکات پیش کرنا چاہوں گا:
- ۱۔ موجودہ زمانے میں عام موضوعات کا جریدہ یا کتابی سلسلہ شائع کرنا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ چہ جائے کہ خاص موضوعاتی رسالہ اور وہ بھی نعت کے موضوع پر اس اہتمام اور پابندی سے شائع کیا جائے۔
 - ۲۔ آپ نے اردو کی نئی بستیوں میں جوڑو کیو سے لاس انجلس تک پھیلی ہوئی ہیں، اپنے ہم نوا پیدا کر لیے ہیں۔ یعنی معتبر لکھنے والوں کا ایک نیا حلقہ ”نعت رنگ“ سے وابستہ ہو گیا ہے۔ یہ کارنامہ اس سے قبل اپنے اپنے زمانے میں سرسید احمد خاں (تہذیب الاخلاق)، نیاز فتح پوری (نگار)، شاہد احمد دہلوی (ساقی)، صلاح الدین احمد (ادبی دنیا)، صہبا لکھنوی (افکار)، ڈاکٹر جمیل جالبی (نیادور)، احمد ندیم قاسمی (فنون) اور ڈاکٹر وزیر آغا (اوراق) وغیرہ سرانجام دے چکے ہیں۔ اس صف میں شمولیت کوئی کم اہم پیش رفت نہیں ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ آپ ان بزرگوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔
 - ۳۔ نعت گوئی کے معیار اور اس سے متعلق تحقیق و تنقید کا ایک باب آپ نے ”نعت رنگ“ کے ذریعے واکر دیا ہے۔ اس سے قبل کسی رسالے میں اس معیار اور تازہ تر عنوانات کے حامل مضامین کم ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔
 - ۴۔ آپ نے نعت گوئی کے آداب، شائستگی، حفظِ مراتب اور روایات کی صداقت اور لفظیات کے ضمن میں جن مباحث کو ”نعت رنگ“ میں جگہ دی ہے، ان سے مبتدی اور منتہی دونوں روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔
 - ۵۔ آپ ”نعت رنگ“ میں روایتی انداز کی نعتوں اور روایتی معلومات کے سرسری مضامین کی اشاعت سے گریز کرتے ہیں، اس طرح نعت رنگ کی ادبی، علمی اور تحقیقی اہمیت میں روز افزوں اضافہ ہوا ہے۔
 - ۶۔ دورِ حاضر کے معروف ادیبوں اور نقادوں میں پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر معین الدین عقیل، امین راحت چغتائی، ڈاکٹر یحییٰ خلیط، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر انوار احمد زئی کے نام بہ طور مثال امر پیش کر رہا ہوں کہ یہ تو عرصہ دراز سے لکھ رہے ہیں اور دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ ”نعت رنگ“ کے لیے خصوصی مقالے بھی تحریر فرماتے ہیں۔

۷۔ میں اب بہ طور خاص مبین مرزا، ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، ڈاکٹر شہزاد احمد، ڈاکٹر داؤد عثمانی کے نام پیش کرتا ہوں جنہوں نے نعت گوئی کے ضمن میں تازہ نگاری کا ثبوت دیا ہے اور انہیں میں ”نعت رنگ“ کے خصوصی مقالہ نگاروں میں شامل کرتا ہوں۔ (نعت رنگ، ص ۲۶، ۲۷، ۲۸-۶۱۹)

ملک الظفر سہرامی:

آپ نے نعتیہ شاعری کے دامن میں نئی لفظیات جدید تراکیب اور خوب صورت استعاروں کے جوگل بوٹے کھلائے ہیں۔ اس کی قدر شناس جوہریوں نے خوب خوب پزیرائی فرمائی ہے۔ نعتیہ ادب پر یوں تو انفرادی نوعیت کا کام ہو ہی رہا تھا لیکن سفر شعر کے تعین کے ساتھ اجتماعی شعور کی کمی تھی۔ الحمد للہ ”نعت رنگ“ کے ارباب فکر نے نعت شناسوں کا ایک قافلہ تیار کیا جو فکر و فن کے گل بوٹے سے نعتیہ ادب کے دبستان کی آرائش و زیبائش میں مستقل مصروف سفر ہے۔

یہ تمام باتیں اس امر پر شاہد عادل ہیں کہ صنف نعت کے تعلق سے آپ کے سینے میں ایک حساس دل ہے اور آپ کا ہر تائفس اس مقدس صنف سخن کے لیے وقف ہو چکا ہے رب قدر آپ کے پاکیزہ جذبات کا خوب سے خوب تر صلہ عطا فرمائے۔

نقشِ اوّل میں آپ نے صحیح فرمایا ہے کہ ایک مقام پر ٹھہرنے یا دایرے میں چکر لگانے کے بجائے ”نعت رنگ“ کا ہر شمارہ ٹھہرتا نہیں کاروان وجود کی حقیقت کا مظہر ہے۔ خطوط کی تعداد اور دنیا کے چاروں کھونٹ سے آنے والے مکاتیب کے معیار و مزاج کو دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے کہ ”نعت رنگ“ کی ایک واضح اور مستحکم برادری بن گئی ہے جو رسولِ برحق کی محبت و عقیدت کے اٹوٹ رشتے میں بندھی ہوئی ہے۔ خدا کرے یہ مبارک سلسلہ دراز تر ہو اور دنیا و آخرت میں خیر و برکت کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ باہمی یگانگت اور بھائی چارے کا سبب ہو۔

صبحِ رحمانی صاحب! آپ نے ”نعت رنگ“ کے ذریعے نعتیہ ادب کے لیے جس فکری انقلاب کا خواب دیکھا تھا اب دھیرے دھیرے اس کے شرمندہ تعبیر ہونے کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ لیکن پھر بھی منزلِ دور ہے۔ اس صنفِ سخن کو جب تک ہم صنفِ سخن کا درجہ نہ دلا دیں ہمارا خواب شرمندہ تعبیر نہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ نے اس میں کہیں پہلو تہی کی ہے چوں کہ جو کام ایک ادارے کا

تھا اسے آپ تنہا انجام دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس صورتِ احوال میں خامیوں اور کمیوں کا در آنا ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ اس شمارے میں بھی کتابت (پروف ریڈنگ) کی غلطیاں خاصی ہیں۔ آپ اس بات کو فراموش نہ کریں غیر اختیاری طور پر آپ نعتیہ ادب اور نعتیہ شاعری کی ایک تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ بعد کے ادوار، میں ہی نہیں بلکہ ابھی دورِ حاضرہ میں ”نعت رنگ“ کے شمارے نعتیہ ادب پر کام کرنے والے محقق اور اسکالر اس کے لیے ایک معتبر، معتمد اور قابلِ قدر ماخذ کے طور پر مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے میں آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ آپ ذمہ داریوں کی کس نازک شاہراہ سے گزر رہے ہیں۔ آپ کی ادنیٰ سی لغزش بھی تاریخی روایت کا حصہ بن جائے گی اور پھر لہجوں کی اس خطا کی سزا صدیوں کے مقدر میں جائے گی۔ خود کو آپ ”نعت رنگ“ کا صرف مرتب تصور نہ کریں بلکہ آپ اس جریدے کے قابلِ احترام مدیر ہیں۔ آپ کی ذمہ داری ایڈیٹنگ کی بھی ہے۔ رطب و یابس خشود و زائد سے اس رسالے کو پاک ہونا چاہیے۔

(نعت نامے ص ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵)

تالش دہلوی:

”نعت رنگ“ کا چوتھا شمارہ ملا، میں نے اس رسالے کو آپ کے ذوقِ سلیم اور آپ کی ترویج صنف نعت گوئی اور فروغ نعت کی کوششوں کا صلہ پایا۔ آپ اس سلسلے میں جو کام کر رہے ہیں وہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ تعجب ہے کہ ارباب نقد و نظر نے صنف نعت کو اپنی تحریروں میں وہ مقام اور درجہ نہیں دیا جو دوسری اصنافِ سخن کو دیا ہے۔ آخر کیوں؟ غالباً اس کی وجہ مذہب سے کم تعلق اور رسول ۷ کی تعریف و توصیف کے حوالے سے اس کو (نعوذ باللہ) یک رخہ سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ صنف نعت پر جتنہ جتنہ کام ہوا جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ نعتوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں اور ایک آدھ کتاب تاریخ نعت کے حوالے سے منظر عام پر آئی ہے جس سے سیری نہیں ہوتی۔ آپ کا کام ٹھوس ہے اور آپ نے نعت کو ادبیات کی اعلیٰ اصناف میں شامل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ (نعت نامے ص ۲۴۲)

نصیر ترائی:

گئے وقتوں میں نعت ایک معتقداتی اور ثنوی صنف تھی لیکن ادھر تم نے اسے ایک ادبی وصف امتیاز سے ایسا کچھ کر دیا ہے کہ بس اللہ اللہ۔ تمھاری اس ریاضت سے یہ عقدہ کھلا کہ آگہی،

حقیقت کو اُس کے اعتباری مقام پر پہنچانے کا دوسرا نام ہے۔

صبح تمہارا عشق سراسر انجذاب اور استغراق ہے مگر ”نعت رنگ“ کے ذریعے نمود و شہود محض تمہارے عشق کو حق کے آئینے میں اپنا حسن سراپا دیکھنے کی ایک لاشعوری مجبوری ہے۔

بقول غالب: پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

”نعت رنگ“ کی تہذیب دیکھ کر احساس ہوا کہ تمہارا عشق لحوں کے چاک پر پوری صدی تخلیق کرنے کی سکت رکھتا ہے۔ یعنی تمہاری تشنگی لمحہ حال کی سیرابی سے چشمہ فردا تک رسائی چاہتی ہے۔ تم کو یہ تشنگی مبارک ہو۔ (نعت نامے ص ۸۷، ۸۷-۸۷)

ڈاکٹر عزیز احسن:

تمہارا ارادہ ہے کہ کوئی ایسا سالہ نکالو جس کے ذریعے نعت کے مضامین پر سنجیدگی سے غور کرنے اور انہیں تنقیدی کسوٹی پر پرکھنے کی راہ ہموار ہو۔ تمہاری ”پذیریائی“ کے حوالے سے جاری ہونے والا مجلہ اور گل بہار نعت کونسل کے مجلوں میں تمہارا Contribution دیکھ کر مجھے اطمینان ہے کہ ان شاء اللہ تم ضرور کوئی باقی رہنے والا کام کر گزرو گے!

”نعت رنگ“ کتابی سلسلے کے اجراء کا تمہارا خواب ان شاء اللہ ضرور شرمندہ تعبیر ہو گا! میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک تم خلوص سے اس کام میں منہمک رہو گے میں اپنا قلمی تعاون بھی جاری رکھوں گا اور بساط بھر دیگر امور میں بھی تمہاری معاونت سے روگردانی نہیں کروں گا۔ اللہ تمہیں عزم و حوصلہ عطا فرمائے اور نعتیہ شاعری کے لیے جو خلوص تمہارے دل میں پیدا ہو گیا ہے اس کی شمع ہمیشہ روشن رکھے۔ (نعت نامے ص ۶۸۳-۶۸۳)

ریاض حسین چودھری:

’نعت رنگ‘ کی اس اشاعت دل پذیر پردہ مبارک با قبول فرمائیے، اگر آپ نعت گو نہ بھی ہوتے اور دورِ نعت خوانی کا اعزاز بھی آپ کو حاصل نہ ہوتا تب بھی آپ ’نعت رنگ‘ کے ان بیس شماروں کے حوالے سے کائناتِ نعت میں زندہ رہتے، اللہ آپ کو عمرِ خضر عطا فرمائے۔ اسی لگن اور تڑپ کے ساتھ آگے بڑھتے جائیے۔ جہان نو کے مقفل دروازے خود بہت کھلتے جائیں گے اور ’نعت رنگ‘ کی خوش بو چارہ رنگ عالم میں پھیل جائے گی۔

ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنے ابتدائے اور اظہارِ یے میں جن گراں قدر خیالات کا اظہار

کیا ہے اُسے جدید نعت نگاری کے نصاب کا درجہ حاصل ہے۔ نعت کے اسلوبیاتی پس منظر میں نئے امکانات کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے آپ کا مختصر مگر فکر انگیز ادارہ یہ بھی شعور کے اُن گنت مقفل دروازوں پر دستک دے رہا ہے، نعت شناسی کے حوالے سے شعرا کی انفرادی تفہیم ایک نئے جہان معنی کے تخلیق کا کارنامہ سرانجام دے رہی ہے جو آگے چل کر نعت کے جدید اور قدیم رجحانات کو مزید مضبوط کرنے کا باعث بنے گی اور ادبی تاریخ کی حرارت میں بھی آپ کو سرخ رونے کا اعزاز بخشے گی۔

آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ نے نعت رنگ کے پلیٹ فارم پر ممتاز اہل قلم کو جمع کر لیا ہے جو ہر شعبہ زندگی کی نمائندگی کرتے ہوئے نعت رنگ کے قیمتی صفحات کو مزید ثروت مند بنا رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر فتح ملک، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر افضال احمد انور، پروفیسر محمد اقبال جاوید، امین راحت چغتائی، ڈاکٹر شہزاد احمد، ڈاکٹر اشفاق احمد انجم، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر انوار احمد زئی، ڈاکٹر داؤد عثمانی، پروفیسر شفقت رضوی، گوہر ملسیانی، منظر عارفی، سعید بدر، تنویر پھول، بزمین مرزا، کس کس کا نام لوں فکر و نظری ایک کہکشاں جو محبت رسول کے ان گنت درجوں پر مشتمل ہے دور دور پھیلی ہوئی ہے۔ اللہ کرے انفرادی اور اجتماعی شعور کی یہ دلاویز یاں تا ابد سلامت رہیں۔ (نعت نامے ص ۳۸۳، ۳۸۶، نعت رنگ، ص ۲۶۱/۲۶۱)

ڈاکٹر سلیم اختر:

صبح صاحب! منہ دیکھی بات نہیں، نعت کے حوالے سے سنجیدہ فکری پر مبنی آپ کی یہ کاوش لائق تحسین ہے۔ گزشتہ شماروں کی مانند تازہ شمارے (نمبر ۴) میں بھی نعت کے فن کے بارے میں بعض مقالات پڑھنے کو ملے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، نور احمد میرٹھی، احمد ہمدانی، مجید بیدار کے مقالات خصوصی تذکرہ چاہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مقالات کی اساس تحقیقی مواد پر استوار ہے اور اس میں ان کی افادیت مضمر ہے۔ ان کے علاوہ دیگر مقالات بھی موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے خوب ہیں۔ ظاہر ہے اس نوع کا پرچہ مرتب کرنے کے لیے محنت اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے جس کی آپ کے پاس کمی نہیں اور اسی لیے ’نعت رنگ‘ فکری اعتبار سے قابل توجہ جریدہ ثابت ہوتا ہے۔ (’نعت رنگ‘ شمارہ نمبر ۵، ص ۳۶۲)

عاصی کرنا لی:

صبحِ رحمانی کو میں ایک روحِ بے تاب سمجھتا ہوں جو بہت سے صاحبانِ عزم کے وجود میں متحرک ہے۔ آپ کی مرکزی شخصیت سے وابستہ ہو کر کئی باہمت اور باعزمیت اصحابِ کراچی میں حمد و نعت کے فروغ میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ آپ نے نعت میں ”تحقیق“ کا جو رخ اختیار کیا، اس انقلابی اقدام کے سبب آپ کا اور آپ کے رفقا کا نام اور کام ایک تاریخ ساز حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

موجودہ ’نعت رنگ‘ (شمارہ نمبر ۲) پہلے شمارے ہی کی طرح آپ اور آپ کے رفقا کی محنت، ریاضت اور ذاتی لگن کا شکر شریں ہے۔ اس میں مضامین و مقالات کا تنوع اور تحریروں کا علمی مزاج اس کے معیار کی بلندی کا ضامن ہے۔ ایک قاری جب اسے پڑھ لیتا ہے تو وہ یقیناً اپنے شعور و بصیرت میں اضافہ محسوس کرتا ہے اور اس کا دامن طلب علم و تحقیق کے قیمتی جوہر پاروں سے معمور ہوتا ہے۔ آپ نے ’نعت رنگ‘ میں بعض اچھوتے موضوعات پر لکھ کر یا لکھوا کر اس کی قدر و قیمت کو بڑھا دیا ہے۔

آپ اس قدر معیاری، وقیع اہم مضامین کیسے جمع کر لیتے ہیں جن میں ابداع بھی ہے اور علم افروزی بھی اور خرد افزائی بھی اور پھر اتنی کثرت کے ساتھ ان کا حصول اور جمع و ترتیب آپ کے ’معجزاتِ فن‘ میں شامل ہے۔ آپ کے رفقا کا ایثار و اعانت لائق تحسین ہے تاہم آپ روح رواں ہیں اور آپ کی ریاضت مہارت اور لیاقت ’شاد باش‘ کے قابل ہے۔

صبحِ رحمانی خود تو ہزاروں سال تک زندہ رہیں تے لیکن انھوں نے نعت پر تنقیدی اور تحقیقی ذائقوں کے مضامین کی تحصیل و ابلاغ کا جو نیارخ نکالا ہے اور واقعی حمد و نعت بلکہ دینی ادب میں جو ایک جدت اختیار کی ہے اس کے سبب ان کا نام اور کلام قید ماہ و سال سے آگے تک جائے گا۔ اللہ اس جہاد و عزمیت کا قائم رکھے۔

(نعت نامے ص، ۶۰۸، ’نعت رنگ‘ شمارہ نمبر ۳، ص ۳۳۴، شمارہ ۵، ص ۳۶۳)

شکیل عادل زادہ:

کسی ایک موضوع پر رسالہ شائع کرنے کے مسائل و مراحل کا تھوڑا بہت اندازہ ہے۔ اردو میں موضوعی رسالے نکتے بالعموم بڑے جوش و خروش سے اور دم جلد ہی توڑ دیتے ہیں۔ ایک

نہیں، بے شمار مثالیں ہیں۔ ایسی پیچیدہ، حوصلہ شکن صورتِ حال میں آپ نے فنِ نعت پر ایک رسالہ شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور وہ کام کیا ہے جو دوسروں نے نہیں کیا جو دوسرے نہیں کر پاتے، وہ کام یقیناً دشوار ہوتا ہے۔

نعت ہمارے ادب کی ایک مستقل صنفِ سخن ہے۔ قریباً ہر شاعر نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور کمال کمال کیا ہے، صرف کلمہ گو یاں ہی نہیں، دیگر مذاہب کے شعرا نے بھی یہ قول شصے، کچھ یوں اپنی عاقبت کا سامان کر لیا ہے۔ نعت بڑی نازک صنف ہے۔ شاعری کی تمام اصناف میں شاید سب سے زیادہ نازک۔ سواس موضوع پر رسالہ شائع کرنے کا کام کچھ کم احتیاط نہیں چاہتا۔ آپ کو پھونک پھونک کے قدم رکھنے، قدم اٹھانے پڑیں گے۔

اب تک ’نعت رنگ‘ کے تین شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی وقعت اور جامعیت کا ہر گوشے میں اعتراف کیا گیا ہے۔ ’نعت رنگ‘ کی جلوہ نمائی کے بعد احساس ہوتا ہے کہ کتنی بڑی بھول ہوتی رہی ہے۔

ہر اردو رسالے کے لیے مہم جوئی کی خدمات درکار ہوتی ہیں۔ یہ تو ایک خاص رسالہ ہے۔ آپ اسی تن و دہی، مستعدی سے، کوئی تحریک، کوئی کارنامہ سمجھ کر بٹے رہے تو مجلہ ’نعت رنگ‘ اردو کے موضوعی رسالوں میں یادگار حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ ساری بات اس کام میں یقین اور خلوص نیت کی ہوتی ہے۔ مکمل شاید کوئی چیز نہیں ہوتی اور یہی گنجائش تخلیق کاروں، ہنر کاروں کا حوصلہ فزوں رکھتی ہے۔ مجھے آپ کے وسائل کی تنگی کا علم ہے لیکن وسائل والوں کو آج تک اس طرف توجہ دینے کا خیال کب اور کہاں آیا۔ وسائل والے تو مسائل اور بڑھانے کا ورد کرتے ہیں۔ آپ کے پاس اور خوبیاں بے پناہ ہیں۔ تکلم ترنم، سخن کاری و خوش نوائی، جذبہ فراواں، عمر بھی آپ کے ساتھ ہے۔ کام کرنے کے لیے تین بنیادی اوصاف شمار کیے جاتے ہیں۔ محنت، دیانت اور راست سمت میں جستجو، اقدام اور ہاں ایک اور چیز عشق۔ آپ کے ہاں عاشقی کی خو ہے اور سب سے بڑا عشق تو ایک ہی ہوتا ہے اور اسی عشق کا اظہار ’نعت رنگ‘ ہے۔ (نعت نامے ص، ۵۰۹-۵۰۸)

ڈاکٹر شبیر احمد قادری:

صبح بھائی! آپ کی اب تک کی خدمات کو دیکھتے ہوئے مجھے تو کم از کم یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام آپ خود نہیں کرتے بلکہ یہ کام آپ سے لیا جا رہا ہے۔ بالفاظِ دگر آپ کو اس کام کے

لیے جن لیا گیا ہے۔ اللہ کریم قبولیت کا یہ سلسلہ جاری رکھے۔ آمین۔ دس سال اور سترہ شمارے گل ہائے تبریک قبول کیجیے۔

صبیح بھائی! آپ نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے یہ بڑا پُر خار ہے اور پُر پیچ ہے۔ اس میں بہت مشکلات ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ باوجود مخالف سے نہ گھبرائیں اور آپ وہی کریں جو کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نعت کے میدان میں انقلابی سوچ رکھنے والے مدیر ہیں، 'خوف کا سایہ' خود بخود دھٹ جائے گا اور کوئی 'بہت بڑا مسئلہ' بھی کھڑا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ سترہ شماروں کے ذریعے آپ لوگوں کے ذہن تیار کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں۔ اختلافِ رائے بقول آپ کے 'بری چیز نہیں مگر شرابیت کی ضروری ہے'۔

'نعت رنگ' صوری اور معنوی ہر دو حوالوں سے بڑا معیاری اور دل آویز کتابی سلسلہ ہے۔ ایک مسلک سے منسلک ہوتے ہوئے بھی آپ نے 'نعت رنگ' کو 'مسلکی جریہ' نہیں بننے دیا۔ اس میں ہر طبقے کو نمائندگی دے کر اسے آپ نے ایک دلچسپ مرقع بنا دیا ہے۔

(نعت نامے ص ۴۷۶-۴۷۵)

ڈاکٹر نذر عابد:

حضرت صبیح الدین نے دورِ حاضر میں اس کام کو جس طرح آگے بڑھایا ہے قابلِ تحسین ہے۔ برصغیر میں درجنوں ادارہٴ اردو ادب کے حوالے سے کام کر رہے ہیں مگر اردو ادب کے اس شعبہ 'نعت' میں حضرت والا نے ۲۵ سال میں اتنا تحقیقی و علمی کام جمع کر لیا ہے کہ اگر ادارے کے افراد 'اردو نعت انسائیکلو پیڈیا' تیار کرنا چاہیں تو بآسانی یہ کام چند ضخیم جلدوں میں مکمل کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ برصغیر کی ان تمام جامعات میں جہاں شعبہٴ اردو قائم ہے وہاں گوشہٴ نعت قائم کر کے M.A کی سطح پر اردو ادب میں نعت گوئی پر Specialization بھی کر سکتے ہیں۔

(نعت رنگ، ص ۲۶، ۶۵۸)

اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے روحانی تسکین ہوتی ہے کہ آپ کے ادارے نے اب تک نعت جیسی مقدس صنفِ سخن کے حوالے سے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کی گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس سلسلے میں آپ اور آپ کے رفقاء کی مساعی، جمیلہ لائقِ صد تحسین ہیں۔ بلاشبہ یہ خدمتِ توفیقِ الہی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی نگاہِ التفات کے بغیر ممکن نہیں۔

اللہ کریم آپ کو توفیقِ مزید ارزانی فرمائے۔ (نعت رنگ، ص ۲۷، ۵۱۷)

ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد:

راقم نے 'نعت رنگ' کے دونوں نمبروں کو سرسری طور سے دیکھا۔ آپ کی گراں بہا شخصیت و اقدار لائقِ صد تہنیت ہے کہ آپ اتنا موقع کام افادہٴ خاص و عام کے لیے انجام دینے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کا یہ بہتر اور بہتر سے بہترین کا یہ سفر جاری ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ بد تو سل نبی رحمت ﷺ آپ کی ہمت کو سدا بلندی اور تازہ حوصلہ اور آپ کے قلم کو کبھی نہ تھکنے والی توانائی عطا فرمائے۔ اللہم آمین! (نعت نامے ص ۹۹)



نعت ریسرچ سینٹر کی مطبوعات

- 1- اُردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر 600/- ڈاکٹر عاصی کرنالی
- 2- اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ 350/- رشید وارثی
- 3- نعت میں کیسے کہوں (تنقید) 200/- پروفیسر محمد اقبال جاوید
- 4- غالب اور نئے نوجوان (تنقید) 200/- صبیح رحمانی
- 5- نعت کی تخلیقی سچائیاں (تنقید) 150/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 6- ہنرنازک ہے (تنقید) 150/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 7- اردو نعت اور جدید اسالیب (تنقید) 120/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 8- نعت نگر کاہاسی (تنقید) 150/- صبیح رحمانی
- 9- جادۂ رحمت کا مسافر (تنقید) 80/- ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی
- 10- بہشت تضافین (شعری مجموعہ) 250/- حافظ عبدالغفار حافظ
- 11- خیر البشر (میلاد نامہ) 200/- نور بانو محبوب
- 12- نعت اور تنقید نعت (تنقید) 300/- ڈاکٹر ابوالخیر کشفی
- 13- فنِ اداریہ نویسی اور ”نعت رنگ“ (تنقید) 200/- ڈاکٹر افضل احمد انور
- 14- ”نعت رنگ“ اہل علم کی نظر میں (مضامین) 300/- ڈاکٹر شبیر احمد قادری
- 15- فہرست کتب خانہ نعت ریسرچ سینٹر (کتابیات) 300/- محمد طاہر قریشی
- 16- زبورِ حرم (کلیات نعت) 450/- اقبال عظیم
- 17- شہرہ لولاک (شعری مجموعہ) 150/- امان خان دل
- 18- جادۂ رحمت (انگریزی مجموعہ) 200/- جسٹس منیر مغل
- 19- اشاریہ ”نعت رنگ“ (بیس شمارے) 300/- ڈاکٹر سہیل شفیق
- 20- سرکار کے قدموں میں (انگریزی ترجمہ) 500/- سارہ کاظمی
- 21- شہرہ توفیق (شعری مجموعہ) 200/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 22- قوسین (شعری مجموعہ) 200/- آفتاب کریبی
- 23- نزول (شعری مجموعہ) 100/- شفیق الدین شارق
- 24- آنکھ بنی شکول (شعری مجموعہ) 100/- آفتاب کریبی
- 25- آپ (شعری مجموعہ) 150/- حنیف اسعدی
- 26- کرم و نجات کا سلسلہ (شعری مجموعہ) 150/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 27- نعت اور سلام (شعری مجموعہ) 20/- وحیدہ نیم
- 28- مددِ روحِ خلاق (شعری مجموعہ) 200/- آفتاب کریبی
- 29- مرقعِ چہل حدیث (مجموعہ احادیث) 300/- پروفیسر محمد اقبال جاوید

- 30- نعتیہ ادب کے تنقیدی فنون (تنقید) 250/- پروفیسر محمد اکرم رضا
- 31- نعت کے تنقیدی آفاق (تنقید) 150/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 32- مثنوی رموزِ پنجودی کا فنی و فکری جائزہ (اقبالیات) 200/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 33- اُمیدِ طہر (شعری مجموعہ) 150/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 34- نعت شناسی (تنقید) 300/- ڈاکٹر ابوالخیر کشفی
- 35- اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیق مطالعہ (تحقیقی مقالہ) 700/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 36- پاکستان میں اُردو نعت کا ادبی سفر (تنقید) 300/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 37- نعت نامے بنام صبیح رحمانی (مجموعہ مکاتیب) 1000/- ڈاکٹر محمد سہیل شفیق
- 38- نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے (تنقید) 350/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 39- تعلق بالرسول a کے تقاضے اور ہم (سیرت) 52/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 40- دل جس سے زندہ ہے (ظفر علی خان کی نعتیہ تب و تاب) 100/- ڈاکٹر محمد اقبال جاوید
- 41- نعت رنگ کے پچیس شمارے (ایک اجمالی تعارف) 50/- ڈاکٹر شہزاد احمد
- 42- وفیات نعت گو یانِ پاکستان 200/- ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیم
- 43- ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعاتِ حمد و نعت 400/- صبیح رحمانی
- 44- اُصول نعت گوئی 200/- حلیم حاذق
- 45- نعت اور جدید تنقیدی رجحانات 400/- کاشف عرفان
- 46- زمزمہ سلام 400/- سیما منیر
- 47- مدحت نامہ 600/- صبیح رحمانی
- 48- کراچی کا دبستانِ نعت (صاحبِ قلب نعت گو شعرا کا تذکرہ) 1000/- منظر عارفی
- 49- مناقب امام حسین اور شعرا کراچی 500/- منظر عارفی
- 50- کلامِ رضا فکری و فنی زاویے 500/- صبیح رحمانی
- 51- عطرِ خیال (نعتیہ مجموعہ) 200/- شبنم رومانی
- 52- یہ روح مدینے والی ہے 250/- رئیس احمد
- 53- پاکستانی زبانوں میں نعت 500/- صبیح رحمانی
- 54- کلیاتِ عزیز احسن 900/- صبیح رحمانی
- 55- نعتیہ شاعری کے فروغ میں ”نعت رنگ“ کی خدمات 500/- حلیمہ سعدیہ منگھوری
- 56- اُردو شاعری میں نعت 500/- ڈاکٹر محمد اسلم علی آزاد فتح پوری
- 57- حمد و نعت کے معناتی زاویے 400/- ڈاکٹر عزیز احسن
- 58- تحمید و تحسین (حمید اور نعتیہ مضامین) 500/- پروفیسر محمد اقبال جاوید